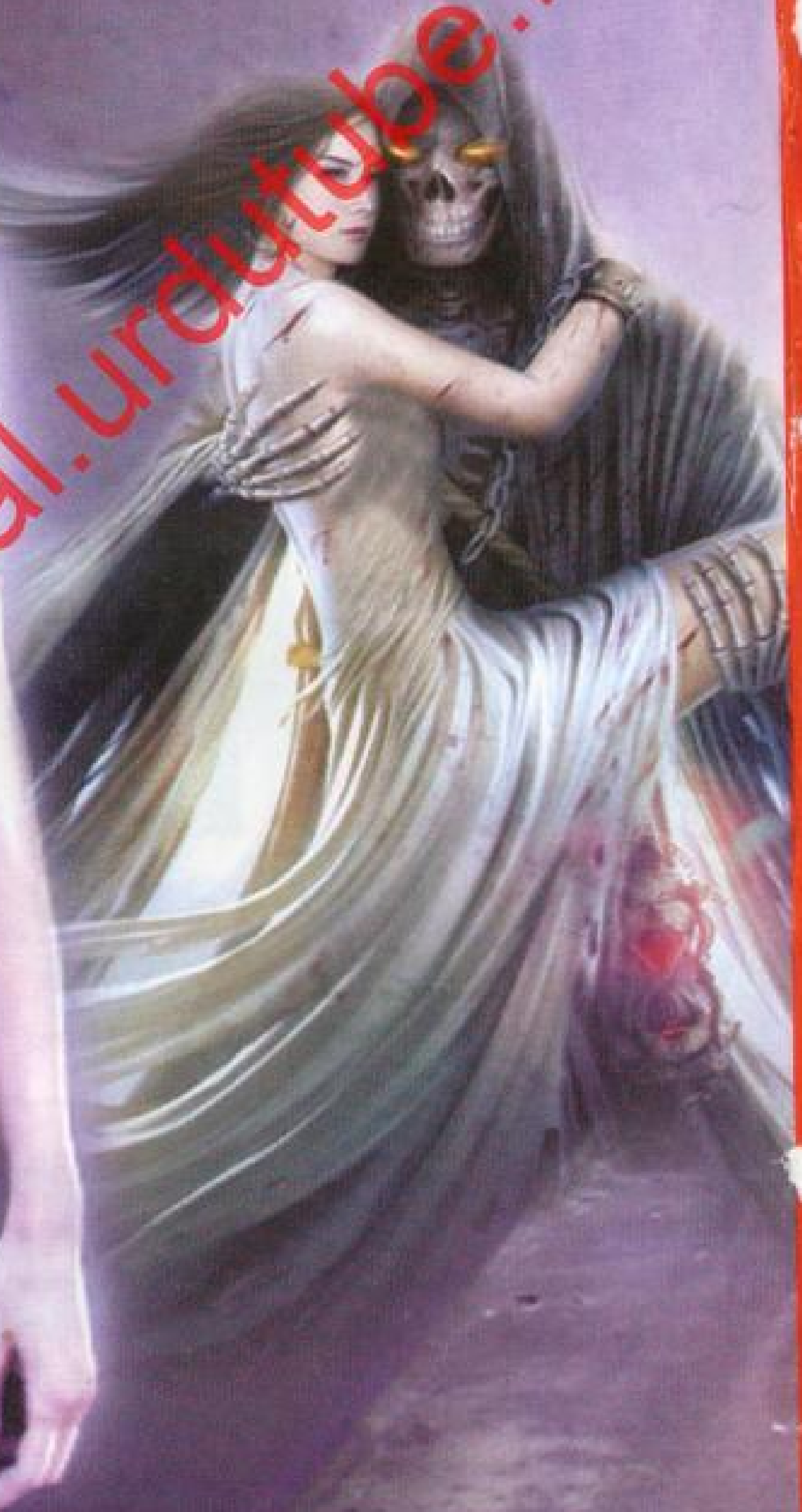
چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

ڈر ڈائجسٹ

کراچی

ستمبر 2015



September 2015 REGD.NO.S

قیمت -/60 روپے

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی

مینجنگ ایڈیٹر خالد علی
چیف ایڈیٹر آصف حسن
ایڈیٹر شاہد علی
سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت -/60 روپے
سالانہ قیمت -/1080 روپے

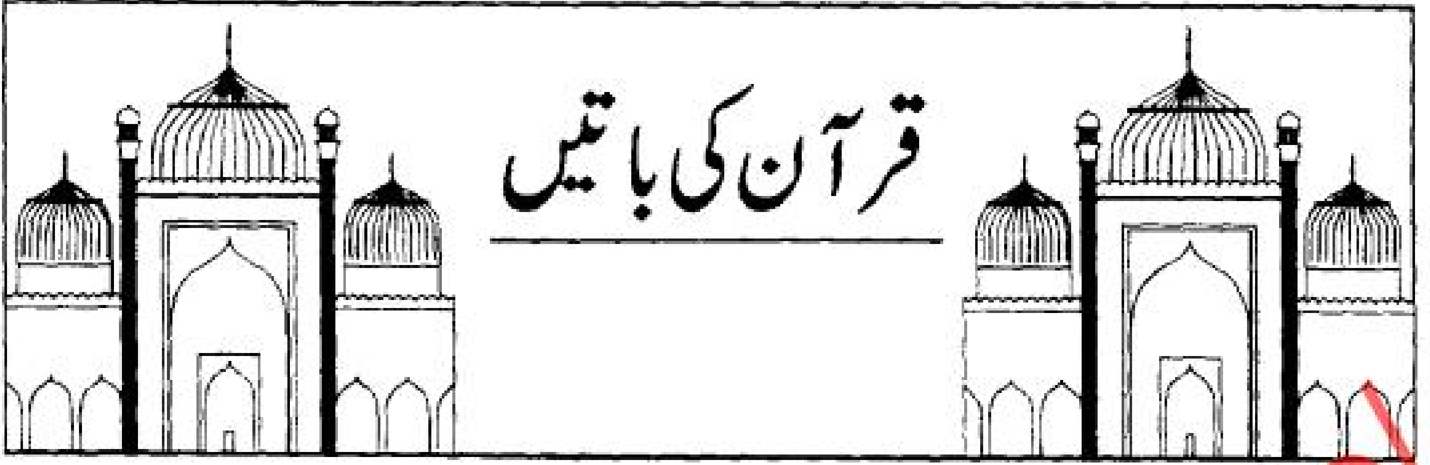
جلد نمبر 16 شمارہ نمبر 12 ستمبر 2015ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com



ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیوار دو بازار کراچی: 32744391



قرآن کی باتیں

☆ اسی نے آسمان سے مینہ برسایا پھر اس سے اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے بہ نکلے پھر نالے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا۔ اور جس چیز کو زیور یا کوئی اور سامان بنانے کے لئے آگ میں پتاتے ہیں اس میں بھی ایسا ہی جھاگ ہوتا ہے اس طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتا ہے۔ سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور (پانی) جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔ اس طرح اللہ صحیح اور غلط کی مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ (سورۃ رعد 13 آیت 17)

☆ جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا شرک کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے اسی طرح ان لوگوں نے تکذیب کی تھی جو ان سے پہلے تھے یہاں تک کہ ہمارے عذاب کا مزہ چکھ کر رہے۔ کہہ دو کیا تمہارے پاس کوئی سند ہے اگر ہے تو اسے ہمارے سامنے نکالو۔ تم محض خیال کے پیچھے چلتے اور اٹکل کے تیر چلاتے ہو۔ (سورۃ انعام 6 آیت 148)

☆ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم بنجر زمین کی طرف پانی رواں کرتے ہیں۔ پھر اس سے کھیتی پیدا کرتے ہیں جس میں سے ان کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ بھی کھاتے ہیں تو یہ دیکھتے کیوں نہیں۔ (سورۃ سجدہ 32 آیت 27)

☆ کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے آدمی اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو اور مکانات جن کو پسند کرتے ہو اللہ اور اس کے رسولؐ سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے تمہیں زیادہ عزیز ہوں تو ٹھہرے رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (یعنی عذاب) بھیجے۔ اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ (سورۃ توبہ 9 آیت 24)

☆ اور تم خواہ کتنا ہی چاہو عورتوں میں ہرگز برابری نہیں کر سکو گے تو ایسا بھی نہ کرنا کہ ایک ہی کی طرف ڈھل جاؤ۔ اور دوسری کو (ایسی حالت میں) چھوڑ دو کہ گویا ادھر میں لٹک رہی ہے اور اگر آپس میں موافقت کر لو اور پرہیز گاری کرو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ نساء 4 آیت 129)

☆ اے جہاد سے ڈرنے والو! تم کہیں رہو موت تو تمہیں آ کر رہے گی خواہ بڑے بڑے محلوں میں رہو۔ اور ان لوگوں کو اگر کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر کوئی گزند پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ گزند آپ کی وجہ سے ہمیں پہنچا ہے۔ کہہ دو کہ رنج و راحت سب اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔ اے آدم زاد تجھ کو جو فائدہ پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی شامت اعمال کی وجہ سے ہے اور اے محمدؐ ہم نے تم کو لوگوں کی ہدایت کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اور اس بات کا اللہ ہی گواہ کافی ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 78 سے 79)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

قارئین کرام! السلام علیکم۔ ہماری دعا ہے بلکہ تمام محب وطن پاکستانیوں کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے وطن پاکستان کو خوش حال بنادے، ہمارے ملک سے ہر طرح کی دہشت گردی، غنڈہ گردی اور ہر طرح کے ظلم وستم کا خاتمہ کردے۔ ہمارے ملک میں ایک بھی ایسا شخص نہ ہو جس کی منفی سوچ سے قوم کو نقصان ہو، ہر شخص اپنی اپنی جگہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرے اور تن من دھن سے اپنے وطن کو خوش حال بنانے میں لگ جائے۔ قانونی گرفت، سخت ہو جائے قانون کا بول بالا ہو، کوئی بھی منفی سوچ رکھنے والا کوئی بھی جرم یا قانون شکنی کرتے وقت قانون کی گرفت اور انصاف کے تقاضے کے تحت دہل جائے۔ ہر شخص سکھ کا سانس لے۔ ہر شخص بے خوف وخطر اپنی زندگی گزارے، کسی بھی غریب اور کمزور کو صاحب ثروت لوگوں سے ذرہ برابر بھی ڈر وخوف نہ رہے، ہمارے ملک سے جرائم ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے، لوگ اپنے اپنے گھروں میں کم کھائیں اور غم نہ کھائیں، عدالتوں میں انصاف کرنے والے کھلے دل کے ساتھ مجرم کو کڑی سے کڑی سزا دل کھول کر دیں۔ فرمان الٰہی کے مطابق، مہنگائی کی چکی ملک سے بالکل نیست ونابود ہو جائے، ملک کے کونے کونے میں چین کی بانسری بجنے لگے، (آمین ثم آمین) قارئین کرام...... ہمارے ملک پاکستان کا سب سے اہم مسئلہ مہنگائی، بجلی کی لوڈشیڈنگ اور پھر سیلاب کی تباہ کاریاں ہیں، تو ہر سال برسر اقتدار، اور کرتا دھرتا لوگوں کے جب سر پر پڑتی ہے تو یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ''آئندہ سال ایسا نہیں ہوگا، ہم تمام پریشانیوں پر قابو پالیں گے۔'' مگر پھر جب وہ سال گزر جاتا ہے اور دوسرا سال آتا ہے تو ڈھاک کے تین پات نظر آتے ہیں، دنیا کے لوگ چاند اور دیگر سیاروں کو تسخیر کر رہے ہیں، مگر ہم ملکی مفاد کو پس پشت ڈال کر اپنے آپ میں لگے رہتے ہیں اور پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ کوئی بھی بڑا اپنے ماتحت یا چھوٹے سے باز پرس نہیں کرسکتا، بجلی کی لوڈشیڈنگ، مہنگائی اور سیلاب کی تباہ کاریوں کے متعلق کوئی بھی سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کرتا، ہر سال سیلاب کی وجہ سے اربوں کھربوں کا نقصان ہو جاتا ہے مگر اس سیلابی ریلے کو روکنے کے لئے ہم کوئی مضبوط حل تلاش نہیں کرسکتے، اور یہی ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ جب ہم سیلاب کی روک تھام کے لئے کچھ نہیں کرسکتے تو ہم کر کیا سکتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہم حالت نماز میں ہاتھ اوپر نیچے باندھنے پر دست وگریباں ہیں اور ہمارا دشمن ہمارے ہاتھوں کو کاٹنے پر تلا ہوا ہے اور اس کے لئے منصوبہ بناتا رہتا ہے اور کافی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوتا رہتا ہے۔ ویسے اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو بہت سارے وسائل سے نوازا ہے، مگر ہم اس سے فائدہ اٹھانے کے موڈ میں نہیں۔ قارئین کرام یہ یاد رکھیں کہ جب تک ہمارے ملک میں قانون سخت نہیں ہوگا چھوٹے بڑے کا فرق نہیں مٹ جاتا اس وقت تک ہم ترقی نہیں کرسکتے بلکہ دنیا والوں کی نظر میں ہماری عزت بڑھنے کے بجائے کم ہوتی رہے گی۔ اور پھر ایسا نہ ہو کہ۔ روتا دھوتا کیا ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

خالد علی، مینجنگ ایڈیٹر

فلک ناز لاہور سے۔ السلام علیکم اگست کا شمارہ بذریعہ ڈاک ملا۔ فہرست میں اپنی کہانی کو دیکھ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ساتھ میں عید کارڈ بھی موصول ہوا۔ میری کہانی کو ڈر میں جگہ دینے کے لئے بہت بہت شکریہ، اوپر سے قارئین کے خوبصورت خطوط نے محنت وصول کروادی۔ اتنی ساری خوشیوں کو کن الفاظ میں بیان کروں سمجھ نہیں آرہی۔ بس یوں سمجھ لیجئے بہت بڑا خواب پورا ہو گیا ہے۔ خیر کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہیں تو۔ ایس امتیاز احمد کی کہانی۔ آسیبی گھر، زندہ روح، اور روح کا فریب، دلفریب تحریر انگیز زبردست کہانیاں تھیں پڑھ کر مزہ آ گیا۔ ویلڈن امتیاز صاحب ایسے ہی لکھتے رہیں اور ہمیں اپنی خوبصورت تحریریں پڑھنے کا موقع یونہی دیتے رہیں۔ ماہ جولائی کے شمارے میں آپ کا زبردست تجزیہ شامل تھا۔ جس میں آپ نے مجھے ڈر میں خوش آمدید کہا ہے ساتھ میں کہانی کی تعریف کی ہے۔ ان سب کے لئے بہت بہت شکریہ۔ آپ جیسے رائٹرز حوصلہ دیتے رہے تو انشاء اللہ ڈر میں لکھتی رہوں گی۔ آپ کی صحت یابی کے لئے دعا گو ہوں۔ ضرغام محمود صاحب، ایس امتیاز صاحب کے بعد دوسرا نام آپ کا ہے جن کی کہانی پڑھنے کے لئے نام ہی کافی ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ آپ نے کئی ماہ میں کافی ترقی کرلی ہے۔ میں اور میری بہن آپ کی بہت بڑی فین ہیں دراصل ہم ڈر پڑھتے ہی ایس امتیاز صاحب کی کہانیوں کی وجہ سے تھے مگر اب آپ کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ آپ دونوں ہر ماہ فکر کی کہانیاں لے کر حاضر ہوتے

ہیں۔ فی الحال آپ کی کہانیاں ـ ''ابدی زندگی اور زہریلی حسینہ'' لاجواب تحریریں تھیں کہ دل عش عش کر اٹھا۔ جب کہ ''خونی مخلوق'' ایک مزاحیہ کہانی تھی۔ جس نے ہنسنے پر مجبور کردیا۔ اس کے ساتھ ہی ''نہلے پہ دہلا'' اور پچھتاوا دل موہ لینے والی شاہکار کہانیاں تھیں۔ ویلڈن خدا کرے اور زور قلم زیادہ، بوگی مین ناصر محمود فرہاد صاحب قبر کی چوری کے بعد ایک بار پھر زبردست تحریر لے کر آئے۔ ویری گڈ۔ آپی بلقیس خان، آپی ساحل دعا بخاری اور ایس حبیب خان صاحب پلیز کم بیک۔ اس کے ساتھ ہی اپنی نئی کہانی ارسال کر رہی ہوں امید ہے مایوس نہیں کریں گے۔ نئی کہانی بھی جلد بھیج دوں گی اللہ حافظ۔

☆☆ فلک صاحبہ: بہت بہت شکریہ آپ کو ڈر کی کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔ ایس امتیاز اور ضرغام صاحب واقعی قابل تعریف ہیں۔ کہانی موصول ہوگئی ہے بہت جلد جلوہ گر ہوں گی۔

کرن شہر جاتی سے، السلام علیکم میری ڈر ڈائجسٹ والوں سے گزارش ہے پلیز مجھے یہ بتائیں کہ اگر بہت ساری کہانیاں ایک ساتھ شائع کرانا چاہیں تو کس طرح کرا سکتے ہیں۔ اس کا طریقہ بتاؤ کس طرح چھپتی ہیں۔ کتنے پیسے لگتے ہیں۔ پلیز مہربانی کر کے ہمیں بتائیں تاکہ پھر اپنی کہانیاں چھپوا سکیں۔ میں نے بہت ساری کہانیاں لکھی ہوئی ہیں۔ ویسے تو ڈر کی تمام کہانیاں اپنی مثال آپ ہوتی ہیں تمام رائٹر محنت و لگن سے کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ قسط وار کہانیاں بھی زبردست ہیں۔ میں نے ایک کہانی آدم خور شیر بھیجی تھی وہ ابھی تک نہیں چھپی جواب ضرور دیں۔

☆☆ کرن صاحبہ: آپ کی کہانی موصول نہیں ہوئی کوئی اور کہانی ارسال کردیں۔ لکھتے لکھتے ہی لوگ لکھاری بن جاتے ہیں۔ آئندہ ماہ بھی آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔ کہانیاں بھیج دیں ایک ایک کر کے چھپتی رہیں گی۔ شکریہ

صبا شرمین جاتی سے، ڈر کی تمام لکھنے پڑھنے والوں کو اور ایڈیٹرز کو میرا اسلام، جولائی کے ڈر میں اپنا شعر اور خط کو دیکھ کر کافی خوشی ہوئی۔ میں اس کے لئے شکریہ ادا کرتی ہوں مگر کہانی کو نہ پا کر تھوڑا افسوس ہوا۔ پھر اگست میں اپنی کہانی چھپنے کی پوری امید تھی مگر اگست میں بھی میری کہانی نہیں چھپی۔ جس کا مجھے کافی دکھ ہوا۔ مگر ڈر میں میری جگہ ہے یہ جان کر خوشی ہوئی اور یہ بھی دیکھ کر خوشی ہوئی کے آپ لوگ نئے لکھاریوں کو بھی ڈر میں جگہ دیتے ہیں اور انہیں خوشی سے ویلکم کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں بھی مایوس نہیں ہوئی بلکہ پھر کہانی بھیج رہی ہوں۔ جانتی ہوں کہ آپ کے دلوں میں ہر لکھاری کے لیے محبت ہے۔ میں ڈر بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ اور تقریباً سبھی میرے گھر میں ڈر شوق سے پڑھتے ہیں۔ کہتے ہیں ڈر ڈائجسٹ اور کتابیں تنہائی کی ساتھی ہوتی ہیں اور میں بھی ڈر ڈائجسٹ پڑھتی ہوں تو میری تنہائی ختم ہو جاتی ہے پہلے میری بہن کرن نے کہانی کچھ ماہ پہلے آدم خور شیر بھیجی تھی نہ کہانی چھپی اور نہ جواب ملا۔ میں پوچھنا چاہوں گی کے کیا آپ کو وہ کہانی ملی تھی میری گزارش ہے کہ پلیز ستمبر کے ماہ میں میری دونوں کہانیوں میں سے ایک کہانی ضرور شائع کریں جو آپ کو پسند آئے۔ مجھے جتنی خوشی ہوگی بتا نہیں سکتی۔ اور مجھے امید ہے کہ اس بار آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ اور میں مایوس ہونا بھی نہیں چاہتی کیونکہ مایوسی کفر ہے۔ ڈر میں سبھی کہانیاں اچھی ہوتی ہیں۔ آخر میں یہی کہوں گی ڈر ڈائجسٹ ہمیشہ ترقی کرتا رہے۔

☆☆ صبا صاحبہ: گھبرائیں نہیں آپ کی کہانی بھی ضرور شائع ہوگی۔ لیکن اپنی باری پر آپ کی باتوں سے اندازہ ہے کہ آپ حوصلہ اور ہمت والی ہیں ہمت والے ہی زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں، بہن کی کہانی نہیں ملی۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنا نہیں بھولیں گی۔

ملک این اے کاوش سلانوالی سے، السلام علیکم! سب سے پہلے محترم جناب ایڈیٹر صاحب آپ سے معذرت کہ اگست کے شمارے کے لئے آپ کو کہانی موصول نہ ہوسکی۔ دوست کو یو ایس بی میں کاپی کر دی تھی تاکہ آپ کو میل کر دے وہ کہتا تھا کہ میل کر دی لیکن اس کے سینٹ آئیٹم میں نہیں تھا۔ واللہ اعلم اس نے کیا کیا۔ میں نے یو ایس بی ڈیلیٹ کر دی تھی اور اتفاق سے کمپیوٹر کی ونڈو دوبارہ کی تو وہاں سے بھی ڈیلیٹ کر بیٹھا۔ اس لیے معذرت طلب ہوں۔ ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کی طرف سے عید کارڈ موصول ہوا یقین مانیے بچپن کے دن یاد آ گئے۔ جب ہم سب دوست کزن وغیرہ ایک دوسرے کو عید کارڈ بھیجا کرتے تھے۔ ادارہ کی طرف سے اس عزت افزائی کا بہت مشکور ہوں جو بندہ ناچیز کو ادارہ کی طرف سے مل رہی ہے۔ اگست کے شمارے میں رائٹرز حضرات اپنے اپنے قلم کے نایاب جوہر دکھائے۔ سمجھ نہیں آتی کس پہ تنقید کروں کسی نے کوئی تنقید کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ لہٰذا تمام بھائیوں کی تعریف کرتا ہوں کہ آپ لوگ بہت اچھا لکھ رہے ہو۔ محمد خالد شاہان بھائی (گریٹ رائٹر) ایس امتیاز احمد (فیورٹ رائٹر) سیدہ عطیہ زاہرہ، اے

وحید صاحب (آپ کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں) چوہدری قمر جہاں۔ طارق محمود فرہاد، ضرغام محمود، عثمان غنی، ایم اے راحت (یو آر سو گریٹ) مدثر بخاری، عروج سنبل طیبہ، ایم الیاس صاحب (فیورٹ رائٹر۔ آپ کی علالت کا سن کر دکھ ہوا۔ دعا ہے رب جہان سے کہ آپ جلد صحت یاب ہو جائیں اور اپنے چاہنے والوں کے لیے اپنے قلم کے کمالات ظاہر کرتے رہیں۔ آپ کے چاہنے والوں کی تعداد میں دن دگنی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے اور خاص کر میں بندہ ناچیز تو اپنے سینئرز سے سیکھنا چاہتا ہوں۔) فلک زاہد حسین، حیدر شاہین، اور خاص کر شہزادہ چاند زیب عباسی صاحب (آپ تو واقعی کمال ہو۔) تمام رائٹرز نے کیا خوب قلمی جوہر دکھائے یقین مانیے عید منانے کا مزہ آ گیا۔ ڈر ڈائجسٹ کے ساتھ قلبی لگاؤ ہے۔ عید کے فارغ اوقات میں پڑھتا رہا دل خوش ہو گیا۔ یہ آپ لوگوں کی اپنے قارئین اور چاہنے والوں کے لیے عید کی عیدی تھی۔ علاوہ ازیں آمنہ سحر، منعم اصغر اور طارق محمود صاحب آپ کی پسند کا مشکور ہوں۔ ماہ ستمبر کے لیے ''الفت پری'' کے نام سے ایک کہانی ارسال کی ہے۔ امید ہے ادارہ ہذا کو مل گئی ہوگی۔ قارئین کرام کی چاہت کو مدنظر رکھتے ہوئے انشاء اللہ دوبارہ کسی ماہ غیر حاضری نہیں ہوگی۔ بلکہ کوشش کروں گا کہ جلد سے جلد ہر ماہ ادارہ ہذا کو کہانی ملتی رہے۔ آخر میں تمام دوستوں، بھائیوں، اور بہنوں کو ایک بار پھر سلام کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔

☆☆ کاوش صاحب: قلبی لگاؤ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔ کاش کہ آپ ہر ماہ نوازش نامہ ارسال کر دیا کریں۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! ماہ اگست 2015 کا فریش شمارہ سامنے ہے خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ تمام رسالہ خوب رہا۔ آرٹیکلز لگانے کا شکریہ۔ میٹرز آپ کے پاس ہیں۔ پلیز دیکھئے گا! مزید ایڈوانس میں۔ پراسرار دھندلکا (ترجمہ) کالانگ، اور ہائیکو ارسال خدمت ہیں۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ڈر ڈائجسٹ کے تمام خوبصورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوبصورت پڑھنے والے وویورز کو دعا سلام۔ پلیز اپنا خیال رکھئے گا۔

☆☆ امتیاز صاحب: ابھی بھی ہم اور قارئین آپ کی صحتیابی کے لئے دعاگو ہیں۔ کہانی شامل اشاعت ہے اور نئی کہانی کا انتظار ہے۔ شکریہ۔

اسحاق انجم کنگن پور سے، السلام علیکم! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ خالد صاحب آپ نے اگست کے حوالے سے جو تحریر فرمایا ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور خدا سے دعاگو ہیں آپ کے والد محترم اور بھائی صاحب کے لیے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبر آمین ثم آمین۔ محترم ہمارا ڈر ڈائجسٹ سے تعلق ایک فیملی ممبر کی طرح ہے۔ ایک تعلق ہے جو ہماری زندگی کے ساتھ ساتھ آپ سے رہے گا ہم نے بہت افراد کو ڈر ڈائجسٹ کا تعارف کروایا۔ شاید آپ کو نہیں معلوم شمع بک ایجنسی اور ادارہ ڈر ڈائجسٹ سے شائع ہونے والے تمام میگزین سے رابطہ رکھا ہے دوستوں اور پڑھنے والوں کو پرچے دیے ہیں تاکید کی ہے کہ دوستوں کو دیجئے خود پڑھیے! ان سب کا اور آپ کا بھی شکریہ کہ آپ ٹوٹی پھوٹی نگارشات کو شامل اشاعت فرماتے ہیں! ہماری دعا ہے کہ آپ کا ادارہ اور ترقی کرے۔ شمارہ اگست کا کچھ مطالعہ کیا ''رولوکا'' روح کا فریب، نشانات ماضی، پراسرار انسان، خونی سفر زندہ صدیاں عشق ناگن۔ سب تحریر پسند آئیں۔ آج کل میری طبیعت ناساز ہے اس لئے اکثر اسپتالوں کا چکر لگتا رہتا ہے۔

☆☆ اسحاق صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اور اہل خانہ پر اپنا فضل و کرم کرے۔ اور آپ کو کلی صحت عطا کرے۔ ہم آپ کی صحت کے لئے دعاگو ہیں۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم، خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں۔ چند دن ہوئے عید کے بعد شہر گیا۔ وہاں بک اسٹال پر ماہ اگست کے پرچے سے ہماری ملاقات ہوگئی سرورق بڑے کمال کا تھا جو کہ پرچے کی جان ہوتا ہے۔ ڈر ڈائجسٹ نے ہمیں مسکرا کے ہمارا استقبال کیا۔ ہم نے بھی اسے دیکھ کے مسکرائے پیار سے اسے چوما اندر جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات ہوگئی۔ رحمتوں اور برکتوں کی فضا ہم سے رخصت ہوگئی مگر ہم اس کی قدر نہ کر سکے ہمارے دل کو زندگی میں افسوس ہی رہے گا۔ عید آ کے گزر گئی تجھے اے دوست کیا بتائیں ہر حال میں اچھی بری بیت گئی خط اشعار غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ آپ کی عنایتیں اور خلوص ہمیں خط تحریر کرنے پر مائل کرتا ہے آپ ہم سے ہزاروں میل دور ہیں مگر ہمارے دل میں ہیں سر آپ کے لیے عقیدت رہے گی۔ میں ڈر ڈائجسٹ کا بہت پرانا قاری ہوں۔ سترہ تاریخ کا بڑی بے تابی سے انتظار ہوتا ہے۔ سب کچھ دنیا میں رہ جائے گا یادیں زندگی کا سرمایا ہوتی ہیں۔

☆☆ اسلم صاحب: آپ کا خط پڑھ کر دلی خوشی ہوتی ہے۔ آپ کی بات بالکل صحیح ہے کہ سب کچھ یہیں رہ جاتا ہے۔ انسان دنیا سے کیا لے جاتا ہے سوائے عمل صالح اور لوگوں کی دعاؤں کے کاش کہ ہم پاکستانی ان باتوں پر غور کریں۔ تو ہمارا ملک خوشیوں کا گہوارہ بن جائے۔ آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ ضرور ارسال کیجئے گا۔

محمد ابو ہریرہ بلوچ بہاولنگر سے۔ ڈر سے منسلک تمام قارئین اسٹاف اور رائٹرز کو دلی سلام۔ امید ہے سب خیر و عافیت سے ہوں گے۔ اگست کا ڈر 27 جولائی کو بک اسٹال سے خریدا خطوط میں شامل میرا لیٹر جولائی کے شمارے کے لئے تھا لیکن لگا اگست میں خیر جی ہم اس کا ذمہ دار ڈاک کی تاخیر کو ہی ٹھہرا سکتے ہیں۔ اس دفعہ تمام خطوط زبردست رہے لیکن شاہد رفیق سہو کو اس محفل سے غائب پایا وجہ جو بھی ہو لیکن یہ اچھا نہیں۔ ایس امتیاز احمد صاحب خدا آپ کو جلدی تندرستی عطا فرمائے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر شاہین گروپ کے تمام ممبرز اس محفل میں شرکت کرتے۔ قرآن کی باتیں لاجواب تھیں۔ کہانیوں کی فہرست میں سب سے پہلے اپنے فیورٹ رائٹر بھائی خالد شاہان کی اسٹوری بھیانک موت پڑھی۔ تمام کہانی سسپنس اور ڈر سے بھرپور تھی ان کی یہ ڈر میں دوسری کہانی ہے کیا ہی بہتر ہوتا بھائی خالد اگر آپ مستقل ہو جائیں اور کوئی قسط وار اسٹوری لکھیں۔ ایس امتیاز احمد نے بہت خوب لکھا۔ عثمان غنی پشاور کی خوفناک انجام بھی اچھی تھی۔ اس کے علاوہ عروج سنبل صاحبہ کی ڈھائی بجے، مدثر بخاری کی خونی سفر، عطیہ زاہرہ کی نشانات ماضی بھی زبردست رہی۔ قسط وار کہانیوں میں رولو کا اے وحید صاحب جو کہ 123 قسط لکھ چکے ہیں رولو کا زبردست جارہی ہے۔ ایم اے راحت کی زندہ صدیاں۔ اور عشق ناگن الیاس صاحب بھی بہتر جارہی ہیں۔ اشعار اور غزلیں بھی زبردست رہی۔ جشن آزادی کی آمد ہے خوشی کے اس پرمسرت موقع پر ان کو بھی اپنی دعاؤں اور خوشیوں میں یاد رکھیں جن کی بدولت ہمیں یہ وطن عزیز ملا۔ آپ نے مجھے نئی اسٹوری لکھنے کو کہا اس کے لئے کوشش کروں گا۔ ابوذر غفاری اور عبداللہ بلوچ برادرز کو سلام ڈر کی ترقی کے لئے نیک تمنائیں اور ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اجازت والسلام۔

☆☆ ابو ہریرہ صاحب: کوشش اور کوشش سے ستاروں پر انسان کمند ڈال رہا ہے لکھتے لکھتے آدمی لکھاری بنتا ہے گھٹنوں چلنے والے بچے ایک دن اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کوشش کریں آپ بھی اچھا لکھ سکتے ہیں۔ امید ہے نوازش نامہ بھیجنا بھولیں گے نہیں۔ Thanks۔

عامر زمان عامر بورے والا سے۔ سلام خلوص، ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کے جملہ اسٹاف رائٹرز، اور قارئین کے نام بہت ساری دعائیں! الفاظ کا ریشم بنتے عرصہ بیت گیا مگر ذات کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی واردات میں کچھ کمی نہیں ہے حرف و معنی سے بہت پرانا رشتہ ہے آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ دور حاضر کے مقبول ترین ادبی و ملکی کمرشل میگزین میں میری تحاریر نگارشات افسانے وشاعری کو سند اشاعت سے نوازا جا چکا ہے ماہنامہ ڈر کا اگست کا شمارہ معروف کہانی نویس جناب ساحل ابڑو نے بطور گفٹ عنایت کیا جس کی بدولت ڈر جیسے معیاری جریدے سے آشنائی ہوئی۔ بعد از مطالعہ ڈر ڈائجسٹ کو پاکستان کے صف اول کے معیاری پرچوں کی صف میں پایا۔ بہترین تزئین و آرائش عمدہ سرورق اور سب سے بڑھ کے اردو ادب سے مایہ ناز نامور رائٹروں کی کہانیاں شامل اشاعت دیکھ کر ادبی جذبوں کو تقویت ملی۔ عرصہ دراز سے ڈر کی مسلسل اشاعت اور ہر خاص و عام میں یکساں مقبولیت ادارہ کے جملہ اراکین کی شبانہ روز محنت اور ادب پروری کا ثبوت ہے۔ نامور رائٹر جناب ایس امتیاز احمد کے قلم سے روح کا فریب پڑھ کر مزہ آ گیا۔ زبردست معیاری تحریر تھی۔ ایم الیاس صاحب کے اچھوتے قلم سے عشق ناگن کی موجودہ قسط پڑھی ایک ہی قسط میں نفس مضمون کا یقین کا ممکن نہیں ہے مگر جتنا پڑھا بہترین تھا امید ہے اگلی اقساط میں کہانی کا حسن مزید بڑھے گا۔ طارق محمود صاحب اور عروج سنبل کی کہانیاں انوکھا آئیڈیا اور ڈھائی بجے اس ماہ کی شاہکار تخلیقات ہیں پرچے کے تمام رائٹر اور سلسلے من پسند ہیں علاوہ ازیں اے وحید فلک زاہد اور مدثر بخاری ساحل ابڑو سمیت تمام لکھاری حضرات کی خدمت میں درجہ بدرجہ سلام اور ڈھیروں دعائیں ساحل سے وعدے کے مطابق تازہ ترین کاوش گرداب اور شاعری ارسال خدمت ہے امید ہے قریبی اشاعت میں جگہ دیں گے۔

☆☆ عامر صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم ڈر میں شائع کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ۔ آپ کوشش کریں کہ تمام ارسال شدہ کہانیاں ڈر کے موضوع پر ہوں۔ کہانی اگلے ماہ شائع ہوگی۔ لیکن نوازش نامہ ارسال کرنا بھولئے گا نہیں۔ Thanks۔

محمد جواد احمد رحیم یار خان سے۔ ماہ اگست کا رسالہ ہمیں اپنے پورے وقت میں ملا۔ جسے دیکھ کر ہماری عید کی خوشی دوبالا

ہوگئی۔ اسلامی صفحہ پڑھ کر ایمان میں اور مضبوطی ہوئی۔ اور خطوط کی محفل بھی تیز و میزہ کے ساتھ اچھی رہی۔ کہانیوں میں زندہ صدیاں ایم اے راحت ایک بہترین تحریر تھیں۔ جسے کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ اس کے بعد رولو کا اے وحید ہر بار کی طرح لاجواب تحریر لگی۔ عشق ناگن ایم الیاس دل کو چھو لینے والی کاوش تھی۔ بلیدان شہزادہ چاندزیب خوف و اسرار میں ڈوبی ہوئی تحریر تھی۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ اور آخر میں ہمارے فیوریٹ رائٹر محمد خالد شاہان بھیانک موت جو کہ پراسراریت کے ساتھ ساتھ تجسس بھری اسٹوری تھی۔ انکل یہ حقیقت ہے کہ ہمیں ڈر ڈائجسٹ سے متعارف کرانے کا شاہان بھائی کا ہاتھ ہے۔ جس کی ہمیں اب تک خوشی ہے۔

☆☆ جواد صاحب: خلوص دل کے لئے ویری ویری تھینکس۔ امید ہے آپ ہر ماہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ جہاں تک بھیدوالی بات ہے تو خالد شاہان نے یہ مفصل نہیں بتایا کہ اس کی مکمل کتنی قسطیں ہیں۔ اور پھر ایک رائٹر کے لئے یہ مشکل نہیں کہ وہ دوسرا نام رکھ کر کہانی لکھے۔ امید ہے آپ تفصیل معلوم کرکے ضرور جواب دیں گے۔ اس شمارے میں بھی خالد شاہان کی ناگ بھون شامل ہے۔ اب یہ خالد شاہان پر منحصر ہے کہ وہ ہر ماہ کہانی ارسال کرتے ہیں کہ نہیں۔ خیر آپ کے نوازش نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

نادر شاہ شجاع آباد سے، میری طرف سے تمام قارئین رائٹر حضرات اور پورے اسٹاف کو پیار و محبت بھرا اسلام قبول ہو۔ سب سے پہلے ڈر والوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے میرا خط شائع کیا۔ اور مزید ایک دو کہانیاں لکھنے کے لیے کہا۔ ٹھیک ہے میں نے ایک کہانی اسٹارٹ کی ہوئی ہے جیسے ہی مکمل ہوگئی بھیج دوں گا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ بھیانک موت، بلیدان، زندہ صدیاں، اور عشق ناگن نمبر ون ہیں۔ دوسرے نمبر پر خوفناک انجام، رولوکا، اور گڑیا تھیں۔ تیسرے نمبر پر، خونی سفر، روح کا فریب، پراسرار انسان ہیں، باقی سب بھی اچھی تھیں۔ ٹائم تھوڑا کم ہے اس لیے خط مختصر لکھا ہے۔

☆☆ نادر شاہ صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ۔ آئندہ ماہ بھی خط ضرور بھیجئے گا۔ اس کے لئے شکریہ قبول کریں۔

ریاض حسین قمر منگلا ڈیم سے، سلام مسنون! اگست 2015 کا ڈر ڈائجسٹ پیش نظر ہے۔ ٹائٹل پر ایک حسینہ کو ڈرانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مگر اس کی مسکراہٹ اس کے بالکل برعکس ہے۔ قرآن کی باتیں پڑھ کر گویا میگزین کی قیمت وصول ہوگئی اللہ کریم آپ کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین سب کہانیاں اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ مگر محترمہ سیدہ عطیہ زاہرہ کی نشانات ماضی، نے بہت متاثر کیا انہوں نے عرق ریزی سے تحقیق کی ہے اور تاریخ ماضی سے گوہر نکالے ہیں۔ قوس قزح کا انتخاب خوب ہے ایک غزل لے کر حاضر ہورہا ہوں۔ اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو انشاء اللہ ہر ماہ حاضر ہوا کروں گا۔

☆☆ ریاض صاحب: خط لیٹ موصول ہوا۔ اور صرف خط ہی شامل اشاعت ہوسکا۔ غزل آئندہ ماہ پلیز! آئندہ ماہ وقت کی پابندی کا خیال رکھتے ہوئے خط ضرور ارسال کریں گے۔ Thanks

ساحل ابڑو ڈیرہ اللہ یار، بلوچستان سے، السلام علیکم، امید بلکہ مزاج بخیر ہوں گے۔ دیگر احوال زیر قلم بلکہ، ماہ اگست کا تازہ شمارہ ڈر ڈائجسٹ عید کے بعد آ کر ملا جسے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ اس ناچیز کو یاد رکھا۔ بہت بہت شکریہ۔ وقت کی بہت کمی ہے جس کی وجہ سے تمام کہانیوں پر تبصرہ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ڈاکخانہ کی لمبی چھٹیوں کی وجہ سے پرچہ کافی لیٹ ملا۔ اور تبصرہ نذر آپ کے ہاں تاخیر نہ ہوجائے۔ آمنہ سحر کا خط مجھے بہت اچھا لگا کہ انہوں نے سچائی کا انتخاب لیا۔ آمنہ سحر ہمیشہ کے لئے خوش رہو اور خوشیاں پاؤ۔ ایس امتیاز احمد اب آپ کی طبیعت کسی ہے۔ اور ہم دعا گو ہیں الیاس صاحب کے لئے بھی۔ ایک تحریر ''تنہا مکان'' ارسال خدمت ہے اگر ڈر ڈائجسٹ کے معیار پر پورا اتریں تو قریبی اشاعت میں جگہ دے کر ہمیں شکریہ کا موقع دیں۔

☆☆ ساحل صاحب: خط لکھنے کے لئے شکریہ۔ آئندہ کہانی ڈر کے موضوع پر لکھا کریں۔ اور صفحات مزید بڑھا دیں۔ اگر آپ چاہیں تو کاغذ کے دونوں طرف لکھ سکتے ہیں۔ کہانی اگلے ماہ جلوہ گر ہوگی مگر خط ضرور ارسال کریں۔

طارق محمود کامرہ کلاں اٹک سے، السلام علیکم امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! اگست 2015 کے تجزیے کے ساتھ حاضر خدمت ہوں۔ ٹائٹل ہلکا پھلکا سا تھا۔ قرآن کی باتیں۔ اس کے بعد خطوط کی محفل میں سب سے پہلے اداریہ پڑھا مینجنگ ایڈیٹر خالد علی صاحب بہت ہی اچھے طریقے سے آپ نے ہمارے بزرگوں کی قربانیوں کا ثمر اور ان کے خون سے سینچے ہوئے اس پودے کو جو کہ اب اک تناور درخت بن چکا ہے اور جس کی ہمیں اپنی جان سے بڑھ کر حفاظت کرنی چاہئے ہمارے پیارے پاکستان کے بارے میں ایک اچھا تجزیہ کیا۔ خطوط کی محفل میں آمنہ سحر صاحبہ کی تنقید مجھے پسند آئی۔ لیکن آمنہ صاحبہ میں نے کبھی نہیں کہا کہ میں ایک اچھا رائٹر ہوں ابھی تو رائٹر بن

رہا ہوں یہ تو ادارہ کی ذرہ نوازی ہے جو ہمیں رائٹر بننے کا موقع دے رہے ہیں اور جہاں تک کہانیوں کی پسند نہ پسند کی بات ہے تو ہر کسی کی اپنی اپنی پسند ہوتی ہے۔ بھیانک موت، خالد شاہان، ہارر اور سسپنس ٹائپ تھرل بھری کہانی خوبصورت انداز اک اچھی کہانی۔ روح کا فریب، ایس امتیاز احمد، دلچسپ رہی۔ نشانات ماضی، واقعی سبق آموز کہانی تھی۔ رولو کا بہت ہی اچھے طریقے سے لکھی جانے والی کہانی جس کی ہر قسط ضرور پسند آتی ہے۔ گڈ اے وحید صاحب۔ چوہدری قمر جہاں صاحب ملتان سے لے کر آئے پراسرار انسان مختصر اور انوکھی دلچسپی سے بھرپور کہانی پہلی ہی کوشش اچھی ثابت ہوئی۔ اور میری کہانی انوکھا آئیڈیا پلیز دو یورز سے گزارش ہے کہ پڑھ کر ضرور اپنی رائے کا اظہار کیجئے گا۔ پچھتاوا اضر غام صاحب نے خوب لکھا۔ خوفناک انجام، عثمان غنی صاحب عمدہ کہانی تھی۔ مدثر بخاری صاحب کی خونی سفر اک عجیب سی لیکن سبق آموز کہانی تھی۔ ڈھائی بجے، عروج سنبل طہ راولپنڈی خوش آمدید ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم۔ عشق ناگن ایم الیاس صاحب پرانے رائٹر کی اچھی کہانی ہے اور ان کے لئے میری دل سے دعا ہے کہ اللہ انہیں صحت دے آمین۔ فلک زاہد صاحب کی گڑیا بھی اچھی رہی۔ ادھورا انتقام حسنین حیدر شاہین خوش آمدید پہلی ہی کہانی بہت اچھی پلاٹ اور اس پہ تحریر بھی بہترین۔ بلیدان ابھی زیر مطالعہ ہے۔ قوس قزح میں لکھنے والوں کے لئے بھی ویلڈن ڈر ڈائجسٹ کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆☆ طارق صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، کہانی اگلے ماہ جلوہ گر ہوگی اور اب ایک اور نئی کہانی ارسال کرنا بھولئے گا نہیں۔

یاسر وکی دیالپور سے۔ میری طرف سے پہلے تو سب قارئین کو عید مبارک امید ہے کہ سب لوگوں کی عید اچھی گزری ہوگی اور اب میں ادارے کا شکریہ ادا کرتا چاہوں گا کہ ادارے نے پہلی مرتبہ میری اتنے اچھے طریقے سے حوصلہ افزائی کی میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے میری حوصلہ افزائی کر کے مجھے پہلے والا یاسر وکی بنا دیا ہے آج جب میں نے ڈر ڈائجسٹ میں اپنا لیٹر دیکھا تو مجھے میرا ماضی یاد آ گیا کہ جیسے پہلے میرا نام رسالے وغیرہ میں آتا تھا ویسے ہی اب بھی آنا شروع ہو گیا خیر اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف تماشۂ فطرت، طاہرہ آصف کی اسٹوری کمال کی تھی، زندہ روح، ایس امتیاز احمد ہو آپ کی اسٹوری اچھی لگی، گل حیات، رضوان علی کافی بہتر تھی ظالم آتما ملک فہیم ارشاد کی اسٹوری نے دل پہ وار کیا ہے۔ آخر میں اسحاق انجم صاحب آپ تو ٹھینگ موڑ میں تھے لیکن یہ اسحاق انجم قصور کیوں لکھتے ہیں کہیں آپ قصور شفٹ تو نہیں ہو گئے۔ سر آپ کی بہت یاد آتی ہے کافی دیر ہو گئی ہے آپ سے ملے ہوئے پلیز! کبھی آؤ نا میرے پاس ذرہ خدمت کا موقع دو نہیں تو مجھے آنا پڑے گا آخر میں میرے کزن سرفراز، نعیم سرور لاہور، شعیب گلزار لاہور، عبدالرزاق ٹھینگ موڑ، طاہر ٹھینگ موڑ، طیب جمیل ٹھینگ موڑ، سب کو عید مبارک باقی اگلے شمارے تک کے لیے اللہ حافظ۔

☆☆ یاسر صاحب: چلئے اچھا ہوا کہ آپ کا نام بھی رسالے میں نظر آنے لگا اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہر ماہ نام نظر آئے تو پلیز ہر ماہ نوازش نامہ ضرور بھیجتے رہئے گا۔

طاہر عباس شجاع آباد سے، امید ہے تمام رائٹرز اور ڈر کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ بہت بہت شکریہ کہ ہمارا خط شائع ہوا۔ اور دوسری کہانی لکھنے کا کہا گیا۔ ورنہ ہم تو بہت مایوس ہو چکے تھے اور لکھنا بھی چھوڑ دیا تھا آپ کے کہنے پر میں ایک کہانی لکھ کر بھیج رہا ہوں ''خونی درخت'' اور اگر آپ کو کوئی اور اچھا سا نام ملے تو آپ خود کہانی کا نام رکھ دینا۔ میں نے یہ کہانی بڑی محنت سے لکھی ہے اور اگر آپ ابھی بھی کہیں گے کہ اصلاح طلب زیادہ ہے تو پھر یہ افسوس کی بات ہے اگر میری یہ کہانی شائع ہوئی تو میں اور لکھوں گا انشاء اللہ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے بھائی خالد شاہان کی کہانی بھیانک موت بہت بلکہ بہت ہی اچھی تھی۔ واہ آپ نے تو کمال کر دیا۔ روح کا فریب ایس امتیاز کی کہانی بھی اچھی تھی۔ نشانات ماضی سیدہ عطیہ زاہرہ کی تاریخ کے متعلق ویری گڈ، رولو کا، اے وحید پراسرار انسان، چوہدری قمر جہاں، عشق ناگن، ایم الیاس، بلیدان، شہزادہ چاندزیب، ڈھائی بجے، عروج سنبل، کی کہانیاں نمبر ون تھیں۔ انوکھا آئیڈیا، گڑیا دوسرے نمبر پر جب کہ خونی سفر، تیسرے نمبر پر تھیں۔ شعر اور غزلیں بھی بہت پسند آئیں۔ اب مجھے اپنی کہانی کا انتظار رہے گا۔ اللہ حافظ

☆☆ طاہر صاحب: ابھی آپ کی کہانی پڑھی نہیں، اچھی ہوئی تو یقیناً شائع ہوگی دل برداشتہ نہ ہوں۔ مایوسی کفر ہے کوشش کئے جائیں ضرور کامیاب ہوں گے۔

سلطان باقر علی ضلع لکی مروت خیبر پختونخواہ سے، ڈر کے تمام اسٹاف اور تمام رائٹرز کو میرا تہہ دل سے پیارا سلام۔ میں کافی عرصے سے ڈر ڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں۔ ہمیشہ ڈائجسٹ کے آنے تک بے چین رہتا ہوں۔ کئی بار سوچا کہ خط لکھنا چاہیے اور کہانی بھی بھیجنی چاہیے لیکن پھر بھول جاتا تھا۔ وہی بات ہے کہ ''روز کہتا ہوں بھول جاؤں تجھے......روز یہ بات بھول جاتا ہوں'' ڈر ڈائجسٹ کے تمام رائٹرز بہت اچھا لکھتے ہیں۔ سبھی کی کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ اے وحید صاحب کی ''ردلوکا'' انتہائی اچھی لگی۔ ہر قسط میں ایک نیا پن ہوتا ہے۔ باقی سب کی کہانیاں بھی بہت اچھی لگیں۔ ہمیشہ خوبصورت کہانیوں کا انتظار رہتا ہے۔ خیر اب خط اس لئے ارسال کر رہا ہوں کہ زندگی کا کچھ پتا نہیں کب ڈور کاٹ لی جائے۔ ایک کہانی ارسال خدمت ہے اچھی لگے تو شائع کر دیجئے گا۔

☆☆ سلطان صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید کہانیوں کی تعریف کے لئے Thanks کہانی ابھی پڑھی نہیں اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ گھبرائیں نہیں کوشش پر کوشش کرتے رہیں کامیابی قدم چومے گی۔

ظہور احمد صانم مانگا منڈی لاہور سے، محترم مدیر صاحب امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ مگر میرے مزاج بالکل بھی بخیر نہیں۔ اگست کا شمارہ میرے سامنے پڑا ہے۔ اور جس طرح میں نے اسے حاصل کیا وہ میں ہی جانتا ہوں۔ مشکلات کے ہزاروں دریا عبور کر کے جب شمارہ ہاتھ میں آیا تو تب ایک نیا درد دل دے گیا۔ اب اگر ایک ماہ انتظار یار کے بعد یار دغا دے جائے تو پھر بندہ مسکین کی جو حالت ہوتی ہے وہ آپ جانتے ہی ہیں۔ بہر حال مجھے دکھ ہے اس بار مجھے مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا۔ آپ کے دفتر فون کیا تو کسی صاحب نے یہ خوشخبری سنائی کہ آپ کی نگارشات ہم تک پہنچی نہیں، شاید محکمہ ڈاک کی مہربانیوں کی نظر ہوگئیں۔ بہر حال یہ تو ایک بات ہوگئی۔ چلیں اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ مگر دوسرا معاملہ جو میرے ساتھ ہوا وہ خاصا ہولناک ہے۔ میری غزل شائع نہیں ہوئی مگر مجھے مسلسل کچھ لوگوں نے مائنڈ اپ سیٹ کیے رکھا وہ یوں کہ ڈر ڈائجسٹ کے آفس سے میرا نمبر لے کر مجھے یہ کہہ کر پریشان کرتے رہے کہ ڈر ڈائجسٹ میں شائع شدہ آپ کا کلام نقل شدہ ہے۔ مگر جب ڈائجسٹ میرے ہاتھوں میں آیا تو اس عجب داستان مختصر تھی۔ ڈائجسٹ میں میری غزل شامل اشاعت تھی ہی نہیں۔ اب آپ ہی بتائیں کہ میرا ڈسٹرب ہونا بنتا ہے۔ مجھے یہ چکر سمجھ نہیں آیا۔ مہربانی اس معاملے کی وضاحت فرما دیں اور اس بات کی بھی تصدیق کر دیں کہ کیا واقعی میری تحریریں آپ تک نہیں پہنچیں یا پھر کوئی اعلیٰ قسم کا ڈرامہ رچایا گیا ہے۔

☆☆ ظہور صاحب: ڈرامہ رچا کر یا جھوٹ بول کر کیا آپ سے انعام لینا ہے اور نہ ادارے سے کسی کو آپ کا نمبر دیا گیا ہے۔ اور اگر کسی کا خط ہم تک نہیں پہنچے تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا۔ آپ ایسی تمام باتوں کا آئندہ خیال رکھیے گا۔ جو آپ کے ذہن میں آئی ہیں۔ مگر نوازش نامہ بھیجنا نہ بھولیے گا۔ Thanks

مدثر بخاری شہر سلطان سے، دنیا کے بڑے بڑے عظیم انسان عظیم ہونے سے پہلے عام انسان تھے بالکل سادہ، عام مگر جب انہوں نے محنت کی اور کسی خاص فیلڈ میں عقل و علم کے ذریعے محنت کی تو عظیم بن گئے۔ انگلش مصنف رائیڈر ہیگرڈ، کی عمر جب 90 سال ہوئی اور انہوں نے کمال ناول تخلیق کیے دنیا پڑھتی تھی ان کو۔ 90 سال کی عمر میں وہ کہنے لگے۔ جب 18 سال کا تھا تو تب سے ناول لکھنا شروع کیا۔ 70 سال کی ادبی محنت کے بعد آج پتہ چلا ہے کہ ادب کی دنیا اصل چیز کیا ہے۔ مجھے آج پتا لگا ہے کہ ناول کس چیز کو کہتے ہیں۔ اگست کا پرچہ ملا۔ ٹائٹل اچھا تھا۔ آمنہ سحر کا تنقید برائے تنقید خط پڑھ کے ایک ہی بات محسوس ہوئی کہ محترمہ نے کسی بھی رائٹر کو نہیں بخشا۔ مجھے تو سائیڈ پر رکھیں میں تو ہوں ہی قابل تنقید مجھے تو صرف شوق ہے۔ جب دل میں کٹھن ہوتی ہے اور کسی کو تکلیف میں دیکھتا ہوں تو لکھتا ہوں۔ شہرت کی ضرورت ہے نہ ہی تعریف کی۔ میری ذات تو قلندری سی ہے۔ مگر مجھے اپنا ذرا سا افسوس نہیں البتہ اپنے پختہ دوستوں کا احساس ضرور ہے۔ خیر آمنہ صاحبہ آپ نے جو کچھ بھی لکھا، آپ اپنی رائے کا مکمل حق رکھتی ہیں۔ مگر ایک عرض ہماری بھی ہے آمنہ صاحبہ، آپ بھی اسٹوری لکھیے ناں۔ ہم آپ سے سیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کو پڑھ کے اچھا لگے گا۔ کچھ ہمیں بھی سیکھنے کا موقع ملے گا۔ ہم آپ کی تحریر کا انتظار کریں گے۔ شکریہ کے ساتھ۔ ابھی تک صرف دو کہانیاں پڑھی ہیں۔ ایس امتیاز احمد کی۔ روح کا فریب، اور عطیہ زاہرہ کی نشانات ماضی، دونوں اچھی تھیں۔ خونی سفر لگانے کا شکریہ۔ زندگی ہوگی تو اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔

☆☆ مدثر صاحب: امید ہے آمنہ صاحبہ آپ کی باتوں پر سنجیدگی سے غور کریں گی۔ اور کہانی لکھنے کی کوشش بھی کریں گی۔ ویسے ڈونٹ مائنڈ ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہانی شامل اشاعت ہے پھر ملیں گے۔

☆☆

درندہ

این اے کاوش۔ سلانولی۔ سرگودھا

دولت کے حرص و طمع میں نوجوان سرگرداں ہوگیا اور پھر وہ اپنے دین سے دھرم سے مبرا ہوگیا، وہ اپنے پرائے کو بھول بیٹھا، دن رات ہائے دولت کے چکر میں سر پٹ دوڑنے لگا کہ پھر اچانک وہ کچھ ہوگیا جو وہ تصور نہیں کرسکتا تھا۔

سطر سطر رونگٹے کھڑی کرتی اور انگشت بدنداں کرتی عجیب و غریب لہولہو عبرت ناک کہانی

میں نے اپنی ساری زندگی کا نچوڑ نکالا تو صرف ایک ہی بات سامنے آئی اور آپ لوگ بھی اقرار کریں گے کہ میری اس بات میں دروغ گوئی نہیں بلکہ حقیقت پنہاں ہے کہ دنیا میں صرف پیسے کی قدر و قیمت ہے انسان کی نہیں۔ انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان سب باتوں کے پیچھے اس کا حرص کارفرما ہے۔ یہ تو شکر ہے رب کعبہ کا کہ جس نے رزق اور تقدیر کو اپنے ہاتھ میں رکھا ورنہ لوگ تو اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی نہ صرف تقدیروں کے فیصلے کرنا شروع کردیتے بلکہ ان کے حصے کا رزق بھی اپنے حصے میں لکھ لیتے۔

انسان کا دنیا میں آنے کا مقصد روپیہ پیسہ قطعاً نہ تھا۔ پھر نجانے کیوں لوگوں نے روپے پیسے کو اپنا دھرم بنالیا ہے۔ دنیا میں ہمارے آنے کا مقصد تو اس خالق کائنات کی عبادت کرنا تھا۔ اس کے دیئے پر اس کا شکر ادا کرنا تھا لیکن ہم ان سب باتوں کو بالائے طاق رکھ کر صرف یہ ہی کیوں سوچتے ہیں کہ ہمیں تھوڑے پر صبر شکر نہیں کرنا چاہیے بلکہ مزید کے لیے تگ و دو کرنی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تگ و دو میں صبر و شکر کا نام و نشان نہیں رہتا اور انسان ایسے ایسے کام کرجاتا ہے کہ اپنی دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی آخرت کا بھی بیڑا غرق کر بیٹھتا ہے۔

میرا نام حافظ محمد بلال ہے۔ میں نے اپنے ہی شہر کے ایک مشہور مدرسے میں اللہ پاک کے کلام کو حفظ کیا۔ اس کے بعد اپنی زندگی خلق خدا کی خدمت میں گزار رہا۔ اس بات کا ہر کس و ناکس گواہ ہے کہ میری زندگی کا کوئی اور مشغلہ نہیں ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے اس کے بعد کبھی میری نماز قضا ہوئی ہو۔ یہی نہیں تہجد کی نماز بھی کبھی قضا نہیں ہوئی ہوگی۔ اس کے علاوہ نوری علم کی بدولت عوام الناس کی خدمت بھی کر رہا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں کوئی بہت پہنچا ہوا انسان ہوں لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ رب کے کلام میں اتنی برکت ہے کہ بیان نہیں کرسکتا اور یہ میرے اللہ تعالیٰ (عزوجل) کی مجھ پہ مہربانی ہے کہ اس نے مجھے اپنے کلام کی بدولت لوگوں کے مسائل حل کرنے کی طاقت عطا فرمائی ہے۔

وقت گزاری کے لیے میں کتابوں کا مطالعہ بھی کرتا رہتا ہوں اور کبھی کبھار چھوٹی موٹی کاوشیں مختلف میگزین میں لکھتا رہتا ہوں۔ میری کاوش سچائی سے گوندھی ہوئی ہوتی ہے۔ میری کسی بھی کاوش میں دروغ گوئی



کا ذرہ بھی عنصر موجود نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ مجھے ایک رائٹر کے طور پر بھی جانتے ہیں۔ مارکیٹ میں پانچ سات کتابیں بھی آچکی ہیں۔ جن کی وجہ سے بہت پذیرائی ملی۔ آج بھی ایک کاوش کے ساتھ آپ لوگوں کے سامنے حاضر ہورہا ہوں۔ یہ کاوش کسی اور کی نہیں میرے ایک بہت ہی قریبی دوست ستار کی ہے۔ میں نے زندگی میں ایک ہی دوست بنایا تھا لیکن افسوس کہ اپنے اس دوست کو اپنے ہی ہاتھوں ابدی نیند سلا دیا تھا۔

اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ ایک حافظ قرآن انسان پانچ وقت کا نمازی تہجد پڑھنے والا اور لوگوں کے مسیحا کا اصلی روپ ایک قاتل کا روپ ہے تو بات یہ نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میرا وہ دوست دنیا کے لیے ایک ناسور بن گیا تھا۔ اگر اسے ابدی نیند نہ سلایا جاتا تو نجانے کتنے بے گناہ انسان اس درندے نما انسان کے ظلم کی بھینٹ چڑھ جاتے۔ میں اپنے دوست سے بے پناہ الفت رکھتا تھا جس وقت میں اسے ابدی نیند سلا رہا تھا اس وقت میری آنکھیں آبشار کی مانند برس رہی تھیں۔ ساون بھادوں کی سی کیفیت تھی۔ جس وقت میرے دوست کا نام و نشان اس دنیا سے مٹا اس وقت میں دنیا و مافیا سے بے خبر بے ہوش ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

''یار بلال کوئی ایسا کام بتاؤ کہ میں راتوں رات کروڑ پتی بن جاؤں ـــــ۔ ستار نے ماچس کی تیلی دانتوں تلے دبا کر کہا۔

اس وقت ہم دونوں اکیلے مدرسے میں براجمان تھے۔ میں مدرسے میں حفظ کی کلاس بھی لیتا ہوں۔ اسی مدرسے میں میں نے حفظ قرآن کیا تھا اور آج کل اسی مدرسے میں مدرس کی خدمات سرانجام دے رہا ہوں۔ اس وقت بھی میں اپنی کلاس لے رہا تھا جب ستار یکبارگی آن دھمکا۔ اس کی بات سن کر مجھے نہ تو تعجب ہوا نہ ہی انگشت بدنداں ہوا کیونکہ یہ اس کی ڈیلی کی عادت تھی۔ ناشکری تو اس کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔ میں نے بچپن سے لے کر آج تک کبھی اس کی زبان پر شکرانے کے الفاظ نہ سنے تھے۔

ستار کی ذات مغل تھی۔ اس کے والد صاحب ایک پرائیویٹ فرم میں کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے تین بھائی اور سات بہنیں تھیں۔ اتفاق سے باقی تینوں بھائی اس سے بڑے تھے۔ خیر سے تعلیم چاروں میں سے کسی نے بھی میٹرک سے آگے حاصل نہ کی تھی۔ یہ اتفاق سمجھا جائے یا پھر ان کی قسمت۔ اس کے تینوں بھائی ایک ہی کاٹن فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ گھر کی ضروریات اچھے سے پوری ہو رہی تھیں۔ اس کی والدہ ہاؤس وائف تھیں۔ بہنیں بھی عزت دار ہونے کے ناطے گھر میں ہی رہتی تھیں۔ میں نے جب سے جوانی کی دہلیز پر قدم نکالا تھا اس کی کسی بھی بہن کو گھر سے باہر نہ دیکھا تھا۔ ستار کا گھرانہ ویسے تو مذہبی گھرانہ تھا لیکن نجانے کیوں ستار خود ایک ناشکرا انسان ثابت ہوا تھا۔ میں نے ہمیشہ کی طرح اس کی بات سنی اور مسکرا دیا۔

''دیکھو میرے بھائی ایسی بات نہ سوچا کرو آخر تم چنتا کس بات کی کرتے ہو۔ تمہارے والد صاحب اور تمہارے بھائیوں نے تو تمہیں کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی پھر نجانے کیوں تم ہر وقت ناشکری کے کلمات ادا کرتے پھرتے ہو۔ قناعت کرنا سیکھو۔ زندگی پیسے سے نہیں بنتی بلکہ اعمال اچھے بناؤ اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے تو مجھ سے کہہ دیا کرو لیکن خدارا ایسے ناشکری کے کلمات منہ سے نہ نکالا کرو ـــــ۔'' میں نے ستار کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھ میں تھام کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں بلال تم کبھی بھی میری فیلنگز سے آشنا نہیں ہو سکتے تم نہیں جانتے کہ میں کتنا خود غرض انسان ہوں۔ میں کسی طور یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میں اپنے خرچ کے لیے دوسروں کی محتاجی اپناؤں میں چاہتا ہوں کہ میری اپنی ایک پہچان ہو۔ لوگ مجھے میرے باپ یا بھائیوں کے نام سے نہ پہچانیں بلکہ میری اپنی ایک شناخت ہو اور میرے باپ اور بھائیوں کو لوگ میرے نام سے پہچانیں۔ تم لوگوں کی مدد کرتے ہو مجھے بھی کوئی ایسا تعویذ دو یا ایسا عمل بتاؤ جس سے میں راتوں رات

کروڑ پتی بن جاؤں۔۔۔۔'' ستار نے ہوس بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھے اس کی آنکھوں میں شیطانیت کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ پیسے کی خاطر میرا پیارا دوست کوئی بھی قدم اٹھانے سے دریغ نہیں کرے گا اور یہی بات مجھے گوارہ نہ تھی کہ میرا دوست کوئی ایسا قدم اٹھائے جس کی وجہ سے اسے بعد میں پچھتانا پڑے۔

''اے میرے اللہ! میرے دوست کے اندر سے احساس محرومی اور لالچ کے پرورش پاتے مادے کو ختم فرما دے۔ میرے اللہ اس کی مدد فرما۔''

میں نے دل ہی دل میں اپنے خالق و مالک سے اس کے لیے دعا مانگی لیکن شاید اس وقت قبولیت کا وقت نہ تھا۔ میری دعا کو قبول ہونا ہی نہیں تھا۔ میرے دوست کو ایک ایسے راستے پر چلنا تھا جس پر اس کی زندگی داؤ پر لگنے والی تھی۔ اس کی دنیا کے ساتھ ساتھ اس کی عاقبت بھی خطرے میں پڑنے والی تھی۔ اور میں اپنے دوست کا سب سے زیادہ دل عزیز اور راز دار بھی بے بس ہونے والا تھا۔ شاید میرے کسی تعویذ یا دم کا اس پر کوئی اثر نہیں ہونے والا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب انسان جذبات کے گھوڑے کی لگام تھام لے تو ہوش و حواس کی دنیا میں پلٹنے تک وہ اپنا بہت کچھ کھو بیٹھتا ہے۔

''یہ تمہاری خام خیالی ہے میرے بھائی! باپ ہی انسان کی پہچان ہوا کرتا ہے۔ تم جتنے بھی بڑے آدمی بن جاؤ کوئی بھی تمہیں یہ نہیں کہے گا کہ ستار کا باپ اپنے بیٹے کی وجہ سے جانا جاتا ہے بلکہ ہر کس و ناکس کی زبان پر یہی بات رہے گی کہ یہ خلیل الرحمن کا بیٹا ستار ہے۔ اس لیے تم محنت کرو ایمانداری کا دامن تھام لو وہ وقت دور نہیں جب کامیابی تمہارے قدم چومے گی ستار۔ اچانک کے لفظ کو ذہن سے نکال پھینکو ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں اس میں کسی کے پاس کوئی الہ دین کا چراغ نہیں ہے کہ وہ اسے رگڑ کر اپنی ہر خواہش پوری کرتا ہوگا بلکہ ہر شخص اپنی شناخت خود بناتا ہے۔ تم دنیا میں جس انسان کی تاریخ بھی پڑھ لو کسی انسان کی تاریخ زیست

سالگرہ نمبر

قارئین کرام ہر سال کی طرح ڈر ڈائجسٹ اکتوبر 2015ء کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا، لہٰذا آپ لوگ اپنی خود نویست کہانیاں اور دیگر کاوشیں جلد از جلد ارسال کریں تا کہ آپ کی اچھی تحریریں سالگرہ نمبر میں جلوہ گر ہوسکیں۔ شکریہ۔

ادارہ، ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ

میں یہ الفاظ درج نہیں ہیں کہ وہ شخص رات کو سویا تھا اور صبح اٹھا تو اس کا تکیہ پیسوں اور ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا ملا اور وہ دنیا میں امیر بن گیا۔ اس لیے اچانک کے لفظ کو بھول جاؤ اور اپنی زندگی ایمانداری کی پگڈنڈی پر لے جاؤ یہی ایمانداری کی پگڈنڈی تمہیں ایک دن تمہاری منزل کے پاس لے جائے گی۔۔۔۔'' میں نے ستار کو ایک بار پھر سمجھاتے ہوئے کہا۔

اس نے شاید میری بات کو سنی ان سنی کر دیا۔ بات تو اس نے میری بغور سنی تھی لیکن اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی گہری سوچ میں غوطہ زن تھا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا میں اس بات سے آشنا نہیں تھا۔ میرے پاس علم غیب نہیں تھا نہ ہی میرے پاس کوئی ایسی شکتی تھی کہ جس کے بل بوتے پر میں اس کا دماغ پڑھ سکتا۔ لیکن میں اتنا جان ہی چکا تھا کہ اس کے دماغ میں جو بھی چل رہا تھا غلط ہی چل رہا تھا اور غلط کا انجام بھی غلط ہی ہونا تھا۔

☆......☆......☆

''سنو پتر۔۔۔۔'' میں اس وقت مدرسے کے میس میں ایستادہ تھا اور میس انچارج سے پوچھ گچھ کر رہا تھا جب مجھے اپنے پیچھے سے ستار کے والد صاحب کی بازگشت سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ان کے

چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''کیا بات ہے انکل آپ اتنے مضطرب کیوں دکھائی دے رہے ہیں۔۔۔۔۔؟'' میں نے ان کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات دیکھتے ہوئے پوچھا

''پتر ستار کا کچھ پتہ ہے کیا۔۔۔۔۔؟'' ستار کے والد صاحب نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے ایک اور سوال داغا۔

میں نے محو حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں چمکتے گوہر ہائے آبدار ان کی اندرونی کیفیت عیاں کر رہے تھے۔ ان کی حالتِ زار دیکھ کر مجھے رونا آرہا تھا۔ بے شک وہ ایک باہمت انسان تھے لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ ان کے دل میں اپنی اولاد کے لیے بے انتہا محبت تھی۔ اور وہی محبت ان کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔

''نہیں انکل! ستار سے میری ملاقات ہوئے چار دن بیت گئے ہیں۔ پل دو پل کے لیے آیا تھا اس وقت میں کلاس روم میں تھا پھر تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد چلا گیا۔ پھر نہ اس نے رابطہ کیا نہ مجھے ٹائم مل سکا میں نے اس بات کا خاص نوٹس نہیں لیا کیونکہ پہلے بھی اکثر و بیشتر ایک ایک دو دو ہفتے ہماری نہ تو ملاقات ہوتی ہے اور نہ ہی بات۔۔۔۔۔'' میں نے حیران و ششدر ہو کر انکل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

''پتر اسے بھی چار دن ہو گئے ہیں گھر سے گئے بنا بتائے۔ نجانے کہاں گیا ہے موبائل بھی گھر رکھ کے گیا تھا۔ اس کی ماں بتا رہی تھی کہ شام کا کھانا کھا کر باہر نکلا تھا۔ اس دن اتفاق سے میں اور میرے تینوں پتر گھر لیٹ آئے تھے۔ گھر پہنچتے ہی اس کی ماں نے اس کا پوچھا تو میں نے پہلے تو کوئی نوٹس نہ لیا کیونکہ عموماً وہ رات کو دیر سے ہی گھر لوٹتا تھا لیکن اس رات اس کو نہ لوٹنا تھا نہ وہ لوٹا۔ رات دیر گئے تک جب وہ واپس نہ آیا تو ہمیں چنتا ہونے لگی اور اس کی وجہ سے بھاگ دوڑ شروع کر دی آج مجھے تمہارا یاد آیا کہ تمہارے پاس اکثر آ بیٹھتا تھا۔۔۔۔۔'' انکل نے یکبارگی ٹپکتے آنسو صاف کیے۔

وہ اپنے دل کی کیفیت پر قابو پانے کی سعی کر رہے تھے لیکن شاید ان کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ وہ باوجود چاہنے کے بھی اپنی قلبی کیفیت پر قابو نہیں رکھ پا رہے تھے۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام تک نہ لے رہے تھے۔ رم جھم کی مانند آنسو ان کی شہد رنگ آنکھوں سے ٹپک رہے تھے۔ ان کی اس کیفیت کو دیکھ کر میرا دل بھینچ کر مٹھی میں آگیا تھا۔

''آپ فکر مت کریں انکل! وہ جہاں کہیں بھی ہوگا جلد ہی آجائے گا۔۔۔۔۔'' میں نے آگے بڑھ کر ان کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

''جھوٹی تسلیوں سے دل تو بہل سکتا ہے لیکن امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی پتر۔ میرا پتر نجانے کہاں اور کس حال میں ہوگا۔۔۔۔۔؟'' بات پوری کرتے کرتے انکل دھواں دھار رونے لگے تھے۔

ان کو سنبھالنا میرے بس سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ میں نے میس انچارج کو اشارہ کیا تو اس نے بڑھ کر میرا ساتھ دیا اور ہم دونوں نے انکل کو ساتھ ہی پڑے بینچ پر بٹھایا۔

''آپ بالکل فکر نہ کریں انکل، حافظ صاحب نورانی علم سے آشنائی رکھتے ہیں۔ یہ آج رات آپ کے پتر کے لیے استخارہ کریں گے۔ انشاء اللہ بفضل خدا جلد ہی اس کا اتہ پتہ لگ جائے گا۔۔۔۔۔'' میس انچارج نے انکل کے آنسو اپنے پگڑی کے پلو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

''سیف اللہ جاؤ انکل کے لیے پانی لاؤ پلیز۔۔۔'' میں نے میس انچارج کو کہا تو وہ بھاگم بھاگ پانی لے آیا۔ جسے انکل ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پی گئے۔

''آپ فکر مت کریں انکل جی۔ میں انشاء اللہ کل آپ کو سب کچھ بتاؤں گا۔ میں استخارہ بھی کروں گا اور رات ایک عمل بھی کروں گا صبح تک آپ کا ستار جہاں بھی ہوا وہ انشاء اللہ واپس لوٹ آئے گا۔۔۔۔۔'' میں نے انکل کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو انہوں نے تشکرانہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''یہ تمہارا ہم غریبوں پر احسان ہوگا میرے پتر۔۔۔'' انکل نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے پرامید نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا

''اس میں احسان کی کون سی بات ہوئی انکل۔ ستار میرا بھی دوست ہے۔ آپ کی بات سن کر تو یقین مانیے میں خود تذبذب کا شکار ہوگیا ہوں۔ مجھے بھی اس کی فکر کھائے جارہی ہے لیکن وہ جیسا بھی ہے جہاں بھی ہے انشاء اللہ بفضل خدا صبح ہمارے درمیان ہوگا۔۔۔'' میں نے انکل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو انکل منہ سے تو کچھ نہ بولے لیکن ان کی آنکھوں میں میں نے اپنے لیے اپنائیت محسوس کی۔

☆......☆......☆

میں جیسے ہی چارپائی پر لیٹا اسی وقت مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہوگیا۔ پتہ ہی نہ چلا کس وقت یکبارگی نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہوئی اور میں نیند کی وادی میں گم ہوگیا۔ جیسے ہی میں گہری نیند سویا میں نے ایک نہایت ہی بھیانک خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک کنویں کے پاس کھڑا ہوں۔ اس کنویں کا پانی بہت ٹھنڈا اور میٹھا ہے۔ یہ کنواں ایک ایسے صحرا کے درمیان میں ہے جس کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ اس کنویں کا پانی قسمت والوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اور ہر گھنٹے بعد یہ کنواں ایک انسان کا خون پیتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ ایک طرف سے کچھ نقاب پوش تیز رفتار گھوڑوں پر سوار اس کنویں کی طرف لپک رہے ہیں۔ ان سب کے چہرے چاند کی چاندنی کی طرح چمک دمک رہے ہیں۔ میں انگشت بدنداں انہیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہوں۔ تبھی میں دیکھتا ہوں کہ ان کی مخالف سمت سے ان کی ہی تعداد کے گھوڑوں پر کچھ سوار آتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے گھوڑے بھی بجلی کی سی سرعت سے دوڑتے چلے آرہے ہیں۔ پہلے آنے والے نورانی چہرے والے لوگ اپنے گھوڑوں کا رخ بعد میں آنے والوں کی طرف موڑ دیتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کے درمیان خونی جنگ کا آغاز ہوجاتا ہے۔ دونوں مخالف گروہ ایک دوسرے کو مولی گاجر کی طرح کاٹنا شروع کردیتے ہیں۔ دوسرے ہی لمحے دونوں گروہوں کے سارے کارندے ابدی نیند سوچکے ہوتے ہیں۔ بس ایک ہی شخص بچ جاتا ہے۔ وہ بھی نقاب پوش ہوتا ہے۔ اس کی شمشیر خون لگنے کی وجہ سے سرخ دکھائی دے رہی ہوتی ہے۔ اس پر سے خون کے ٹپکتے قطرے مترشح دکھائی دیتے ہیں۔ اس شخص کی شعلہ اگلتی آنکھیں مجھ پر ٹک جاتی ہیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھنے لگتا ہے۔ اس کے دیکھنے کا انداز مجھے شک میں مبتلا کردیتا ہے۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگتی ہیں۔ دوسرے ہی لمحے میں دیکھتا ہوں کہ وہ ننگی شمشیر جس پر سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہوتے ہیں لیے میری طرف بڑھتا ہے۔ میں بھاگنے اور چیخنے چلانے کی لاکھ سعی کرتا ہوں لیکن بے سود۔

وہ نقاب پوش میرے سر پر پہنچ جاتا ہے۔ اس نے متواتر شمشیر ہوا میں لہرائی۔ یوں لگتا ہے جیسے پلک جھپکتے میں میری گردن بھی تن سے جدا کردے گا۔ پھر ایک ناقابل فراموش منظر میری آنکھوں کے سامنے آیا ہے۔ وہ نقاب پوش اپنے چہرے سے نقاب ہٹاتا ہے تو میں یہ دیکھ کر شش وپنج میں مبتلا ہوجاتا ہوں کہ وہ کوئی اور نہیں میرا جگری یار ستار ہے۔

''تو میرا یار نہ ہوتا تو انہی لوگوں جیسی تمہاری گردن بھی تمہارے تن سے بہت دور پڑی ہوتی۔ میں نے کہا تھا ناں کہ میں راتوں رات امیر بننا چاہتا ہوں اور مجھے راہ مل گئی ہے۔ اب تم غور سے سن لو کہ اگر میں اپنوں سے کنارہ کشی اختیار کرسکتا ہوں تو تم کون سے باغ کی مولی ہو۔ اس لیے آج سے یہ بات ذہن نشین کرلو کہ ہمارے راستے الگ ہیں۔ میں جس راستے پر چل رہا ہوں یہ خونی راستہ ہے۔ اور مجھے اپنی منزل تک پہنچنا ہے چاہے اس کے لیے اپنوں کی قربانی بھی کیوں نہ دینی پڑ جائے۔ میرے راستے میں جو بھی آیا اسے مولی گاجر کی طرح کاٹ کر رکھ دوں گا۔ دوبارہ کبھی بھی میرے راستے میں آنے کی سعی مت کرنا ورنہ سپنوں سے نکل کر حقیقت میں تمہارے

سامنے آجاؤں گا اور تمہارے پرخچے اڑادوں گا۔ تمہارے پاس نورانی علم ہے اور میرے پاس کالا علم۔ اور اس کالے علم کی بدولت میں نے کچھ ہی دنوں میں بہت کچھ حاصل کرلیا ہے۔ بہت جلد میں امر ہوجاؤں گا اور مجھے امر ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں خون کی ہولی کھیلوں گا۔ میری اپنی ایک شناخت ہوگی اور میں اپنے ہی نام سے مشہور ہونا چاہتا ہوں اور اس کے لیے سب سے پہلے ان سب کو بلی چڑھانا میرے لیے لازمی امر ہے جس کی وجہ سے میری عارضی شناخت ہے۔۔۔'' اتنا کہہ کرستار گدھے کے سر سے سینگ کے جیسے غائب ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔

میرا پورا جسم پسینے میں شرابور ہوچکا تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ حقیقت پر مبنی ہوگا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ سب کچھ مکمل طور پر حقیقت پر مبنی ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میں انکل کو کیسے سمجھاؤں گا کیسے ان کا سامنا کرپاؤں گا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ تو علی الصبح میرے پاس پہنچ جائیں گے۔ ان کی آنکھوں میں اولاد کے لیے محبت دیدنی تھی جبکہ ستار کی آنکھوں میں اپنوں کے لیے نفرت کے ابھرتے جذبات میری سمجھ سے بالاتر تھے۔ اس نے جو راستہ اپنالیا تھا وہ سوچ و بچار سے بالاتر تھا۔ جہاں میرا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا وہیں آنکھیں بھی ساون بھادوں کی طرح برس رہی تھیں۔ مجھے یقین نہیں ہورہا تھا کہ میرا جگری اور لنگوٹیا یار ایسے راستے کا انتخاب کرے گا جس پر سوائے پچھتانے کے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔

اب تو اس کے ہاتھ بے گناہوں کے خون سے رنگ جائیں گے۔ نجانے کتنے ہی بے گناہ اس کے ظلم کی بھینٹ چڑھ جائیں گے؟ ایسے کتنے ہی سوال تھے جو میرے دل ودماغ پر دستک دے رہے تھے۔ میرا دل کرچیاں کرچیاں ہوگیا تھا۔ میں خود کو بے حد مجبور اور بے بس سمجھ رہا تھا۔ ایسی بے بسی تو مجھے کبھی زندگی میں نہ ہوئی تھی۔ اب تو اس نے اپنے ایمان کا بھی جنازہ نکال دیا تھا۔ اس نے شیطان کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی اور ایسے لوگوں کا انجام میں بخوبی جانتا تھا۔ پھر بھی میں اپنے دوست کو بچانے کے لیے تگ ودو کرنے کا متمنی تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کام میں سوائے میرے مرشد کے کوئی بھی میری مدد نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ میں صبح ہر حال میں اپنے مرشد صاحب کی خدمت میں حاضری دوں گا اور ان کو اپنی بے بسی سے آشنا کروں گا اور بتاؤں گا کہ کیسے میرا جگری یار گناہوں کے راستے پر چل پڑا ہے۔

☆......☆......☆

میں نماز فجر پڑھ کر جیسے ہی فارغ ہوا انکل نے مجھے آن گھیرا۔ میں ان سے نگاہیں نہیں ملا پا رہا تھا۔ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کروں تو کیا کروں۔ میرا دل ان کی کیفیت دیکھ کر بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ اگر یہ کہوں کہ دل خون کے آنسو رو رہا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ انکل کی نگاہیں مجھ پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ میری طرف ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی نوید سننے کے لیے بے تاب ہوں۔

''آپ خاطر جمع رکھیں انکل۔۔۔۔۔'' میں نے بالآخر مشکل سے کہا

''مطلب۔۔۔۔۔؟'' انکل نے میری طرف سوالیہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ان کی آنکھوں میں جھلکتی خوشی یکبارگی مفقود پڑگئی تھی۔

''میں ابھی تھوڑی ہی دیر میں اپنے مرشد صاحب کے پاس جانے کی تیاری کررہا ہوں۔ آپ خاطر جمع رکھیں انشاء اللہ بہت جلد ستار کو لے کر آپ کے پاس آؤں گا اور اس وقت تک میں واپس نہیں لوٹوں گا جب تک ستار میرے ساتھ نہ لوٹا۔۔۔۔۔'' میں نے انکل کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا

''پتر تمہارے استخارے کا کیا بنا۔۔۔۔۔؟''

انہوں نے میری بات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دوسرا سوال داغا۔

''میں تمہاری باتوں سے یہ تو اندازہ لگاچکا ہوں کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے لیکن اب مجھے تمہاری مدد کی میرے پتر کوئی ضرورت نہیں میں اپنے پتر کی تلاش میں سرتوڑ تگ ودو کروں گا اور اس وقت تک چین سے بیٹھنے

والا نہیں جب تک اپنے پتر کو لے کر نہ آؤں اور آج تمہیں یہ بھی بتا تا چلوں کہ جو کام تمہارے استخارے نے نہیں کیا وہ میری محنت ضرور کرے گی۔ میں جانتا ہوں کہ میرا پتر کسی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔ لیکن اسے اس مصیبت سے میں ضرور چھٹکارا دلواؤں گا چاہے اس کے لیے مجھے اپنی جان کی ہی کیوں نہ بازی لگانی پڑ جائے۔''

انکل کی نگاہیں پیہم مجھ پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ بول رہے تھے تو ان کے الفاظ میرے قلب و ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔ میں اس وقت خود کو کس قدر بے بس سمجھ رہا تھا بتانے سے قاصر تھا۔ میرا من چاہ رہا تھا کہ کوئی وزنی چیز اٹھا کر اپنے سر پر ماروں اور سر پھوڑ ڈالوں۔ دھواں دھار روؤں اور انہیں بتاؤں کہ میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ بتانے سے قاصر ہوں کیونکہ شاید آپ اس سب کو سن کر حوصلہ نہ کر پائیں۔

انکل تو جا چکے تھے لیکن مجھ سے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میں اپنی کیفیت پر قابو نہیں پا رہا تھا۔ آنکھیں برس رہی تھیں۔ اتفاق سے میس انچارج وہاں سے گزرا اور میری کیفیت دیکھ کر میری طرف لپکا۔

''کیا ہوا حافظ صاحب۔۔۔۔؟'' اس نے آتے ساتھ ہی سوال کیا۔ میں نے بے بسی اور بے چارگی کی کیفیت میں اس کی طرف دیکھا اور اس کے گلے لگ کر دھواں دھار رونے لگا۔

''میں بہت بے بس ہو گیا ہوں سیف اللہ۔۔۔ میں نے زندگی میں کبھی خود کو اتنا بے بس نہیں دیکھا۔۔۔ میرا جگری یار کھو گیا ہے اور میں۔۔۔۔ میں اسے تلاش نہیں کر پا رہا۔۔۔ نجانے کیسے حال میں ہو گا۔۔۔؟'' الفاظ تھے کہ حلق سے نیچے اترنے کا نام تک نہ لے رہے تھے۔ بمشکل الفاظ ادا کر رہا تھا۔

''آپ خاطر جمع رکھیں حافظ صاحب۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو علم عطا فرمایا ہے اس کی بدولت انشاء اللہ آپ جلد ہی اپنے دوست کو تلاش کر لیں گے۔ آپ اگر ہمت ہار جائیں گے تو آپ کے چاہنے والوں کے حوصلے بھی پست ہو جائیں گے۔۔۔'' سیف اللہ نے میری ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

سیف اللہ کی بات میں وزن تھا۔ میں نے آنسو صاف کیے۔ سیف اللہ نے مجھے میرے کوارٹر تک چھوڑا۔ یہ کوارٹر مدرسہ انتظامیہ کی طرف سے مجھے ملا ہوا تھا۔ اور اس کوارٹر میں مجھے تقریباً ضروریات زندگی کی ہر چیز میسر تھی۔ یہ تھا تو فیملی کوارٹر لیکن ابھی میں سنگل ہی تھا۔ میں نہا دھو کر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ سیف اللہ میرے لیے ناشتہ کوارٹر میں ہی لے آیا تھا۔ ایک بھی نوالہ حلق سے نیچے اتارنے کو من نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی سیف اللہ نے زبردستی اچھا بھلا ناشتہ کروا دیا۔ سیف اللہ نے بھی میرے ساتھ جانے کی ضد کی۔ پہلے تو میں نہ مانا لیکن اس کے اصرار کے سامنے بالآخر مجھے ہتھیار ڈالنا پڑے۔

سیف اللہ کے ساتھ میری یہاں بہت بنتی تھی۔ ویسے تو سب کے ساتھ بنتی تھی اور شکر کرتا ہوں اس ذات کا کبھی کسی کے ساتھ کوئی اونچ نیچ نہیں ہوئی لیکن سیف اللہ کے ساتھ تو کچھ زیادہ ہی بنتی تھی۔ میں اپنی ہر پرسنل بات بھی اس سے شیئر کر لیا کرتا تھا۔ اب اس سے شیئر کیا کرتا وہ سب کچھ خود ہی جانتا تھا۔

☆......☆......☆

دوسری طرف ستار کالے علم کے ماہر رام داس کے ہتھے چڑھ گیا۔ رام داس کی عمر کا اندازہ کبھی کسی کو نہ ہو سکا تھا۔ وہ شروع سے لے کر آج تک ویسے کا ویسا ہی تھا۔ اس کے خدوخال میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی تھی۔ اس بات سے بس وہ خود ہی آشنا تھا کہ اس کی عمر ایک صدی کے قریب پہنچنے والی تھی۔ وہ نوے سے اوپر جا چکا تھا۔ کوئی بھی اسے دیکھ کر اس بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا کہ ان کے سامنے موجود انسان نوے سے اوپر پہنچ چکا ہو گا۔ اس کے چہرے پر جھریوں کے نشان بھی عیاں نہ ہوئے تھے۔ اور اس بھید کا اس کے علاوہ کبھی کوئی راز دار نہ بن سکا تھا۔

اسے شیطان کی پوجا پاٹ کرتے ایک لمبا سمے بیت چکا تھا۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ اگر وہ سو جوان اور کنواری لڑکیوں کو شیطان کے چرنوں میں بھینٹ

چڑھادے تو اس پر کبھی بڑھاپا نہیں آئے گا۔ پھر اس نے وقت کا ضیاع نہیں کیا اور یکے بعد دیگرے سو جوان اور کنواری لڑکیوں کو بلی دینے کے بعد اس نے اپنی جوانی کو برقرار رکھ لیا۔ اب وہ دم آخر تک جوان ہی رہے گا۔ اب اسے ایک نہایت ہی مرحلے سے دوچار ہونا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ کام تھوڑا دقت طلب ہے اور اس کے لیے تگ ودو بھی زیادہ کرنی پڑے گی۔ وہ امر ہونا چاہتا تھا اور اس کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اجل سے گتھم گتھا ہو کر اجل کو شکست دے دے تاکہ پھر رہتی دنیا تک موت اس کے قریب تک نہ بھٹک سکے۔

اس کام کے لیے اس نے زائچہ نکالا تو زائچہ میں ستار دکھائی دیا۔ یہ ایسا انسان تھا جس کے اندر حرص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اور یہی چیز اس کے لیے کامیابی کا راستہ تھا۔ اسے ایسے ہی لوگوں کی تلاش تھی جن کی بدولت وہ اپنی منزل کو باآسانی حاصل کر سکتا تھا۔ اسے تین دن کا ایک عمل کرنا تھا جس کے اندر اسے تین ایسے نوجوانوں کو بلی چڑھانا تھا جو اماوس کی کالی رات کو پیدا ہوئے ہوں۔ اماوس کی کالی رات کو جنم لینے والے انسان کے ماتھے پر ایک ستارہ ہوتا ہے جسے اہل علم کے علاوہ کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ اس نے اپنے عمل سے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ وہ انسان اسے کہاں ملیں گے لیکن اس کام کے لیے وہ اپنی شکتیوں کا استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ اس کے لیے شرط بھی یہی تھی کہ اگر وہ امر ہونا چاہتا ہے تو تین ایسے نوجوانوں کی بلی دے جو اماوس کی کالی رات کو پیدا ہوئے ہوں لیکن ان کو وہ خود نہیں لائے گا نہ ہی وہ اپنی شکتیوں کا استعمال کرے گا۔ اور عمل کے مکمل ہونے تک وہ اپنے کھینچے گئے حصار سے باہر بھی نہیں نکل سکے گا۔ اگر دورانِ عمل وہ اپنے حصار سے باہر نکلا یا اس نے اپنی کسی شکتی کا استعمال کیا تو حصار کے اندر ہی وہ جل کر بھسم ہو جائے گا۔ یہی نہیں اس کے لیے ایک اور بھی امتحان تھا کہ عمل کے مکمل ہونے تک وہ نہ تو کچھ کھائے گا اور نہ ہی پیئے گا۔

بے شک مشکل مراحل سے اسے دوچار ہونا پڑ رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ منزل کو پانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو تگ ودو کرنا ہی پڑتی ہے۔ پاؤں پہ پاؤں دھرے کبھی منزل نہیں ملا کرتی۔ منزل کو آسان سمجھنے والے ہی ہمیشہ دھوکہ کھاتے ہیں اور اپنی منزل سے اتنے دور ہو جاتے ہیں دوبارہ کبھی بھی اپنی منزل کو نہیں پا سکتے۔ یہی نہیں اکثر و بیشتر ان کے ایام زیست ختم ہو جاتے ہیں لیکن منزل کو نہیں پا سکتے۔ اس نے جلد ہی ستار کو آن گھیرا۔ اس وقت ستار پارک میں بیٹھا کسی گہری سوچ میں غوطہ زن تھا جب وہ اس کے پاس جا کر براجمان ہوا۔ ستار نے اسے پرتشویش آنکھوں سے دیکھا۔

''کون ہو تم.....؟'' ستار نے چونک کر اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا

''لکشمی.....'' اس نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یوں سمجھ لو کہ تمہارے دیرینہ سپنے کی تعبیر ہوں میں۔ تم اپنے شناخت بنانا چاہتے ہو اور میں اپنی۔ تمہیں پیسے سے پیار ہے اور مجھے اپنے کام سے اپنی منزل سے۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو میں تمہیں اتنا پیسہ دے سکتا ہوں کہ تمہاری سات پشتیں تو درکنار درجنوں پشتیں بھی دھڑا دھڑ لٹانے پہ لگ جائیں تو وہ پیسہ ان سے ختم نہیں ہو سکے گا۔''

''کیا مطلب.....؟'' ستار نے حیران وششدر ہو کر اس کی طرف دیکھ کر پوچھا

''مطلب یہی کہ لکشمی خود چل کر تمہارے دروازے پہ آئی ہے اب چاہو تو اسے اپنے لاک اپ میں مقید کر لو اور چاہو تو کھلی فضا میں آزاد کر دو فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے.....!'' رام داس نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ستار کی آنکھیں حیرت وخوشی کے ملے جلے تاثرات سے چمک اٹھی تھیں۔ اسے اپنی قوت سماعت پر وشواس نہیں ہو رہا تھا۔

''مجھے کرنا کیا ہے.....؟'' اس نے دوبارہ سوال داغا۔

''کچھ خاص نہیں بس تھوڑی سی چند منٹوں کی

محنت اوراس کے عوض میں تمہیں اتنا کچھ دوں گا کہ تمہاری عقل دنگ رہ جائے گی۔۔۔۔۔'' رام داس نے ایک اور تیر چھوڑا جو نشانے پر لگا۔

''لیکن یہ تو بتاؤ کہ آخر مجھے کرنا کیا ہے۔۔۔؟'' اس نے چنداں غصے سے لیکن دھیمے لہجے میں پوچھا

''تمہیں تین لڑکوں کو مجھ تک پہنچانا ہے چاہے ایک دن میں پہنچاؤ چاہے تین دنوں میں اوران تین لڑکوں کے عوض میں تمہیں دوکروڑروپیہ دوں گا اگر تھوڑے دنوں میں تو چار کروڑ لے لو۔۔۔۔۔'' رام داس نے یہ ایسا تیر چھوڑا تھا جس نے ستار کو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہونے پر مجبور کردیا تھا۔اسے اب تو واقعی اپنی قوت سماعت پر وشواس نہیں ہورہا تھا۔ چار کروڑ اتنی زیادہ رقم اور صرف تین لڑکوں کے عوض۔ یہ بھی کوئی کام ہے بھلا۔

''چار کروڑ۔۔۔۔۔؟'' اس نے محوحیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں اگر تم ہمیشہ میرا ساتھ دیتے رہو گے تو دولت کا انبار لگادوں گا۔۔۔۔۔'' رام داس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے کہا۔

''لیکن ان نوجوانوں کے اندر ایسی بھی کیا خاص بات ہے کہ تم صرف ان تین لڑکوں کی خاطر اتنا کچھ دینے پر تلے ہوئے ہو اور یہ کام تو تم کسی اور سے بھی کرواسکتے تھے جب تمہارے پاس اتنا کچھ ہے تو۔۔۔؟'' ستار نے اس کی طرف مشکوک آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہاری دونوں باتوں کا جواب دیتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ نوجوان میرے لیے اتنے قیمتی ہیں کہ ان کو حاصل کرنے کے لیے میں پوری دنیا کو نیست نابود کرسکتا ہوں وہ میرے لیے کیوں اہم ہیں یہ وقت آنے پر تمہیں معلوم پڑ جائے گا اور دوسری بات بے شک میں دوسروں سے یہ کام کرواسکتا تھا لیکن جب بھی میں کوئی کام کرتا ہوں تو یہ سوچ کر کرتا ہوں کہ میرے کام سے کسی کا بھلا ہوجائے اور اگر تمہارا من کام کرنے کو نہیں چاہ رہا تو کوئی بات نہیں۔۔۔۔'' رام داس نے اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ تشریف رکھیں۔۔۔۔'' ستار نے جلدی سے رام داس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''نہیں اب فی الحال میں جارہا ہوں شام کو تم میرے پاس آجانا میں زیادہ دور نہیں رہتا تمہارے پاس ہی رہتا ہوں۔'' اوراس نے پتہ سمجھادیا۔اورپھر وہاں سے چلتا بنا۔جبکہ ستار پیہم ٹکٹکی باندھے اسے جاتا دیکھتا رہا۔

☆......☆......☆

شام کا کھانا کھاتے ہی ستار گھر سے نکلا اور رکشہ پکڑ کر رام داس کے پاس جا پہنچا۔رام داس کا گھر کسی محل سے کم نہ تھا۔وسیع وعریض رقبے پر محیط ایک خوبصورت اور پرتاثیر حویلی جس کے اندر سبزہ بھی لگایا گیا تھا۔پھولوں کی کیاریاں بھی بنائی ہوئی تھیں۔واچ مین کو جب اس نے اپنا انٹروڈکشن کروایا تو واچ مین نے بنا کوئی پوچھ تاچھ کیے اسے اندر بھیج دیا اور بتایا کہ رام داس ڈرائنگ روم میں اس کا ہی منتظر ہے۔گیٹ سے حویلی تک سبزہ ہی سبزہ لگایا گیا تھا۔وہ حیران وششدر تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ نجانے اس شخص کے پاس کتنا پیسہ ہوگا جو اس طرح لٹا رہا ہے اگر وہ چند روپوں کی بات کرتا تو وہ تو اسے بھی قبول کرلیتا لیکن اس نے تو ڈائریکٹ ہی پہلے دوکروڑ اور پھر چار کروڑ کہہ کر اس کے قدموں تلے سے زمین ہی کھینچ لی تھی۔اسے تو اس بات کا یقین ہی پہلے نہ ہو پارہا تھا کہ وہ شخص واقعی ٹھیک کہہ رہا ہے یا کہیں اس کا دماغ تو نہیں چل گیا۔یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ کہیں اسے مورکھ بنارہا ہو۔

''مسٹر ستار۔۔۔۔۔'' اچانک اس کی قوت سماعت سے رام داس کی بازگشت ٹکرائی تو اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔رام داس اس کے سامنے ایستادہ اپنے پیلے بھدے دانت نکالے مسکرا رہا تھا۔

''ہم تمہارا خیر مقدم کرتے ہیں ہمیں وشواس

تھا کہ تم ضرور آؤ گے اور تم واقعی آ گئے۔''

''جب آپ ساری بات خود سمجھتے ہیں تو آپ کو یہ بات بخوبی جان لینی چاہیے کہ میں پیسے کی خاطر کچھ بھی کرسکتا ہوں اور اتنے زیادہ پیسے کی آفر کی خاطر تو اپنوں کا بھی خون کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔۔۔۔''

ستار نے اس کی بات سن کر جواب دیا۔

''ہوں۔۔۔۔۔رام داس زیرلب بڑبڑایا۔

''اندر آؤ مسٹر ستار اب یہیں کھڑے کھڑے ہی تو ساری باتیں کرنی نہیں ہیں۔''

اتنا کہہ کر وہ آگے آگے اور ستار اس کے پیچھے ہولیا۔ دونوں سیدھے ٹی وی لاؤنج میں جا کر براجمان ہوگئے۔ ٹی وی لاؤنج کیا تھا چاروں طرف سے کمروں کے درمیان گھرا ہوا اور عقبی طرف سے زینہ اوپر جارہا تھا۔ سامنے ہی دیوار پر ایک بڑی سی ایل سی ڈی آویزاں کی گئی تھی۔ ستار نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو ماحول میں چنداں سکوت محسوس کیا۔ نجانے کیوں اس کا دل اس ماحول میں ڈوبنے لگا تھا۔ ابھی وہ براجمان ہی ہوئے تھے کہ ملازم ایک لوازمات سے سجی ٹرے اٹھائے ایک طرف سے نمودار ہوا۔

ملازم نے لوازمات ان کے سامنے سجادیے۔ ایک جگ کے اندر سرخ رنگ کا سیال مادہ نما شربت تھا۔ جبکہ اس کے ساتھ کچھ لوازمات تھے۔

ایکسکیوزمی رام داس صاحب۔ میں تو ابھی پیٹ بھر کے کھانا کھا کر آرہا ہوں اور فی الحال طلب محسوس نہیں کررہا۔۔۔۔'' ستار نے اتنا کچھ سامنے دیکھ کر فوراً ہی کہا۔

کوئی بات نہیں۔ تمہیں ابھی اس شربت سے آشنائی کہاں ہے۔ تم نے جتنا کچھ بھی کھایا ہے بس ایک گلاس شربت کا حلق سے نیچے انڈیلنے کی دیر ہے کہ سارا کھایا پیا ہضم اور نئے سرے سے بھوک محسوس کروگے۔ پیٹ میں چوہے دوڑنے لگیں گے۔۔۔۔'' رام داس نے ملازم کو اشارہ کیا تو اس نے سرعت سے دونوں سامنے رکھے گلاسوں میں شربت بھرا۔ پھر اشارہ پا کر وہاں سے چمپت ہوگیا۔

ستار نے جیسے ہی ایک گھونٹ شربت کا حلق سے نیچے اتارا اسے یوں لگا جیسے ابھی کے ابھی اسے متلی آئے گی۔ لیکن قبل اس کے کہ ستار کی حالت خراب ہوتی رام داس نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے کوئی منتر پڑھ کر پھونک ماری تو فوراً ہی ستار کی طبیعت ٹھیک ہوگئی۔ یہ سب کچھ رام داس نے اتنی پھرتی سے کیا کہ ستار کو بھنک تک نہ لگ پائی۔

''کیا ہوا۔۔۔۔؟'' رام داس نے ایکٹنگ کرتے ہوئے پوچھا

''پتہ نہیں کیوں یوں لگا جیسے اس شربت کا ذائقہ بڑا عجیب تھا یہی نہیں اس کے اندر سے بھینی بھینی لیکن زہریلی بساند بھی آرہی تھی جیسے ہی ایک گھونٹ حلق سے نیچے اترا یوں لگنے لگا جیسے کھایا پیا سب کچھ باہر آنکلے گا لیکن جلد ہی خود بخود طبیعت درست ہوگئی۔۔۔۔'' ستار نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا

''ہاں تھوڑا سخت قسم کا شربت ہے لیکن پی کر دیکھو، کبھی جسم میں تھکان نہیں محسوس کروگے اور نہ ہی اب کوئی ذائقہ یا بساند ہوگی۔۔۔۔'' رام داس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کرکے میز پر رکھتے ہوئے کہا تو اس کی دیکھا دیکھی ستار نے بھی ایک ہی سانس میں سارا گلاس حلق سے نیچے اتار دیا۔ دوسرے ہی لمحے اسے یوں لگا جیسے اس کے پورے جسم میں اتنی توانائی آگئی ہو کہ اس کے جسم کی تمام تھکن دور ہوگئی ہو اور یہی نہیں پلک جھپکتے میں اسے اپنے پیٹ میں چوہے دوڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔ بھوک کی شدت سے بے حال وہ خود ہی لوازمات پر بھوکے بھیڑیے کے جیسے ٹوٹ پڑا اور پلک جھپکتے میں لوازمات کا خاتمہ کر ڈالا۔

''تو تم کام کرنے کے لیے تیار ہو مسٹر ستار۔۔۔۔؟'' پیٹ پوجا کر کے جیسے ہی ستار نے صوفے کی پشت سے کمر لگائی تو رام داس نے پوچھا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔۔۔۔'' ستار نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ اس کے لب ولہجے سے عیاں

ہو رہا تھا کہ وہ پیسے کی خاطر بہت کچھ کرگزرنے کی جسارت رکھتا ہے۔

''تمہارے ایک سوال کا جواب تو اس دن میں نے دے دیا مسٹر ستار اور دوسرے سوال کا جواب آج تمہیں دوں گا۔ میں تم سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کیونکہ میں نے تمہیں دل سے دوست مانا ہے تو پھر دوستوں سے بھید چھپانا انسانیت کا تقاضا نہیں ہے۔۔۔'' رام داس نے ستار کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ستار اس کی بات سن کر بغور اسے دیکھنے لگا۔ منہ سے تو کچھ نہ بولا لیکن کان اسی کی طرف لگالیے۔

''میں کالا جادو کرتا ہوں ستار اور یہی میرا پیشہ ہے۔ تم نہیں جانتے کہ اس کالے جادو کی وجہ سے اب کچھ بھی میرے بس سے باہر نہیں ہے۔ میں چاہوں تو اس دنیا کو اپنی انگلی کے پور پر رکھ کر پھونک مار کر خاکستر کردوں لیکن میں خود بھی اس دھرتی پے جنم لینے والا ایک عام سا منش ہوں۔ میں یہ کام انسانیت کی خدمت کے لیے کرتا ہوں۔ میں ہندو ہوں لیکن میں نے کبھی مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی تضاد نہیں جانا میں سب کے لیے یکساں ہی کام کرتا ہوں۔ میں بلامعاوضہ کام کرتا ہوں اور یہ سب کچھ بھگوان کی کرپا ہے اور میرے پاس ایسا علم ہے کہ جس کی وجہ سے میں جو چاہوں کرسکتا ہوں۔''

''تو پھر ان لڑکوں کو اغوا کرنے کے لیے میرا سہارہ کیوں لے رہے ہو۔''؟ ستار نے اسے ٹوکا۔

''کیونکہ مجھے اجازت نہیں ہے کہ میں خود ان نوجوانوں کو اپنی شکتیوں کے بل بوتے پر حاصل کروں بلکہ اس کے لیے یہ شرط لازمی ہے کہ میں یہ کام کسی انسان سے کرواؤں اور اس کے لیے مجھے تم سے بہتر کوئی دکھائی نہیں دیا کیونکہ تم مجبور اور بے بس بھی ہو اور خودغرض بھی۔ تمہیں اپنی شان و شوکت اور جاہ وجلال کی چنتا ہے اور مجھے ایسے ہی انسان کی ضرورت ہے جو میرا کام لگن سے کرے۔۔۔۔'' رام داس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''لیکن ان نوجوانوں کا تم کروگے کیا۔۔؟''

بالآخر ستار نے دل کی بات کو لفظوں کی مالا پہنائی۔

''میں ان نوجوانوں کو شیطان دیوتا کے چرنوں میں بھینٹ چڑھاؤں گا اور اس کے بدلے شیطان دیوتا مجھے ایسی شکتیوں سے نوازیں گے کہ جن کے بارے میں تم کبھی تخیل میں بھی نہیں سوچ سکتے۔۔۔۔۔''

رام داس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا تو اس کی بات سن کر ستار کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کر رہ گئی۔

''یعنی تم ان لوگوں کو اپنے شیطان دیوتا کے سامنے ذبح کروگے۔۔۔۔۔؟'' ستار نے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوکر پوچھا

''تم ٹھیک سمجھے۔۔۔۔۔'' رام داس نے اس کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

''ایک طرف تم کہتے ہو کہ تم انسانیت کی خدمت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہو اور دوسری طرف تم کہہ رہے ہو کہ تم انسانوں کو اپنے شیطان دیوتا کے چرنوں میں ذبح کروگے تم انسان ہو یا حیوان۔۔۔۔؟'' ستار نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔ اس کی حیرت دیدنی تھی لیکن رام داس کو اس سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔

''تمہیں پیسہ چاہیے کہ نہیں؟ تم یہ بات مت سمجھنا کہ تمہارے علاوہ میرا کوئی کام نہیں کرے گا۔ تم سے زیادہ مجبور لوگ اس دنیا میں موجود ہیں چٹکی بجانے کی دیر ہے اور دیکھنا لوگوں کا تانتا بندھ جائے گا اور بلامعاوضہ لوگ میرا یہ کام کردیں گے اور پھر تم ہاتھ ملتے رہنا۔ یاد رکھنا کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے اور کبھی کبھی تو سب کچھ کھو کر کچھ حاصل ہوتا ہے۔۔۔۔'' رام داس نے غصے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

اس کی بات سن کر ستار سوچوں کے بھنور میں پھنس گیا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ کام ٹھیک نہیں ہے لیکن دل کے اندر بھرا ہوس کہہ رہا تھا کہ اس سے بہتر کوئی کام

نہیں ہے۔اسے آموں سے غرض ہونی چاہیے نہ کہ گٹھلیوں سے۔اس لیے زیادہ بحث مباحثے میں وہ یہ موقع غنیمت ہاتھ سے کھو بیٹھے گا اوراس کا بہتر حل یہی ہے کہ وہ بلاچوں چراں اس کی بات مان لے۔اسی میں اس کا بھلا ہے۔ورنہ رام داس کے لیے اس کام کے لیے انسان تلاش کرنا کوئی سا مشکل ہے۔لوگ تو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔پلک جھپکتے میں ایک ہجوم کربلا اس کام کوکرنے کے لیے اکٹھا ہوجائے گا۔

''میں ضرور کروں گا یہ کام۔۔۔۔۔'' ستار نے اب کی بار کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا

''تم چنتا کی بات ہی نہ کرو۔تم ایک دن اس دنیا کی مایہ ناز ہستی بن جاؤ گے۔تمہاری ایک شناخت ایک پہچان ہوگی اورتم سے تمہارے خاندان کی پہچان ہوگی۔۔۔۔'' رام داس نے اندھیرے میں تیر چھوڑا جو سیدھا عین نشانے پر لگا اور رام داس اس کی بات سن کر دل ہی دل میں خوشی سے پھولے نہ سما پا رہا تھا۔

''یہی تو میں چاہتا ہوں۔۔۔۔۔'' ستار نے دل ہی دل میں کہا۔

☆......☆......☆

تم نے آنے میں بہت دیر کردی ہے بلال اب پانی سر سے اوپر نکل گیا ہے۔تمہارا دوست ایک درندہ بن چکا ہے۔اس کے اندر سے انسانیت نام کی چیز تو بالکل ہی ختم ہوچکی ہے۔اورایسا انسان دنیا کے لیے ناسور بن جاتا ہے۔اس کا حل صرف ایک ہی ہوتا ہے کہ اسے ابدی نیند سلادیا جائے۔ورنہ اس کی ظلم کی بھینٹ ہزاروں لوگ چڑھ جاتے ہیں۔رام داس نے اسے اپنا آلہ کار بنالیا ہے۔وہ بہت جلد ایک عمل کرنے والا ہے اوراگر اس عمل میں وہ سپھل ہوگیا تو قہر برپا کردے گا اورایسے لوگوں سے اچھے کی امید تمہیں رکھنی چاہیے حافظ جن کے اندر دین کی دولت نہ ہو۔۔۔'' پیر صاحب نے میری آنکھوں سے میری کہانی پڑھ کر کہا۔

میں نے پیر صاحب کے سامنے ابھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ویسے بھی میں جانتا تھا کہ پیر صاحب پہنچی ہوئی ہستی ہیں ان کے سامنے کچھ بیان کرنے کی ضرورت پیش ہی نہیں آتی وہ خود ہی سب کچھ جان جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ان کو علم غیب کی دولت سے نوازا ہوا تھا۔پیر صاحب کے مریدوں کی تعداد کا کوئی تخمینہ نہ تھا۔میں نے بھی چھوٹی عمر میں اس وقت پیر صاحب کے ہاتھوں پر بیعت کی تھی جب وہ ایک بار ہمارے مدرسے کی سالانہ دستار بندی کی تقریب میں آئے تھے اوراس وقت میرے سمیت سینکڑوں لوگوں نے ان کے ہاتھوں پر بیعت کی تھی۔

''میں نے استخارہ کیا تھا اورسب کچھ میرے سامنے عیاں ہوگیا تھا لیکن میں اپنے دوست کو بچانا چاہتا ہوں میں اسے واپس لانا چاہتا ہوں گناہوں کی دلدل سے نکال کر نیکی کے راہ پر گامزن کرنا چاہتا ہوں خدارا پیر سائیں میری مدد فرمائیے۔۔۔۔۔'' میں نے بلک بلک کر روتے ہوئے کہا۔

''تمہاری آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے حافظ۔تم ایک باہمت انسان ہو اور تمہیں نیکی اور بدی کی بھی بہت شناخت ہے۔تم یہ بات بھی بخوبی جانتے ہو کہ جب ایک مسلمان ایک بار اپنے مذہب سے روگردانی کرکے غیر مسلم بنتا ہے تو دوبارہ بے شک وہ جتنی بار کلمہ شریف کا ورد کرتا رہے وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔اورایسے شخص کے لیے جہنم واجب ہے۔اس لیے سرابوں کے پیچھے دوڑنے کی بجائے اس ناسور کا خاتمہ تم ہی کروگے۔اس کی موت تمہارے ہی ہاتھوں لکھی ہے حافظ اورنیکی کے کام میں دیر اچھی نہیں ہوتی۔رام داس چاند کی چودھویں رات کو جب چاند پورے جوبن سے چمک دمک رہا ہوگا اپنے عمل کا آغاز کرے گا اوراگر وہ اس عمل میں کامیاب ہوگیا تو وہ تہلکہ مچادے گا۔تہس نہس کرکے رکھ دے گا۔بے شک ظلم کی شام زیادہ اندھیرا نہیں چھپا سکتی لیکن پھر بھی اس کی

تاریکی اتنی ضرور ہوتی ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا۔قبل اس کے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب وکامران ہوجائے ابھی ہمارے پاس اچھا خاصہ وقت ہے۔تمہیں اپنے مشن کا آغاز کرنا ہوگا۔

بے شک وہ تمہارا دوست تھا لیکن اب دوست نہیں ہے۔وہ اب انسانیت کا دشمن بن چکا ہے اور قبل اس کے کہ اس کی وجہ سے بے گناہوں کا خون بہے ہمیں اس ناسور کو ہی اس کائنات سے ختم کردینا چاہیے اور امید واثق ہے کہ تمہیں کوئی اعتراض بھی نہیں ہوگا۔۔۔‘‘پیر صاحب کی بات سن کر میرے قدموں تلے زمین سرک گئی تھی۔

میں پیر صاحب کو بھلا کیسے انکار کرسکتا تھا لیکن یہ بات بھی سچ تھی میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔یہ حالات نے یکبارگی کیسا پلٹا کھالیا تھا کہ مجھے اپنے ہی جگری یار کو اب موت کے گھاٹ اتارنے کا فریضہ سونپا جارہا تھا۔کس راستے کا اس نے انتخاب کرلیا تھا۔کس چیز کی اس کو کمی تھی۔انا سب کچھ ہونے کے بعد اپنی شناخت ،اپنی پہچان کا لفظ اسے لے ڈوبا۔انا کی خاطر اس نے اپنی تقدیر اپنے ہی ہاتھوں سے بدل ڈالی تھی۔اس نے ایسے راستے کا انتخاب کرلیا تھا کہ جس پر سوائے موت اور پچھتاوے کے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔

☆......☆......☆

ستار یہ چار کروڑ میں تمہیں ایڈوانس دے رہا ہوں اور اگر میں اپنے عمل میں سپھل ہوگیا تو تمہیں انعام کے طور پر دس کروڑ روپیہ دوں گا۔تمہیں شاید اب تک گنتی بھی نہ آتی ہو۔تم پیسے گنتے گنتے تھک جاؤ گے،ستار تمہاری انگلیوں کے پوروں میں سوراخ ہوجائیں گے لیکن پھر بھی تم پیسوں کی گنتی نہیں کرپاؤ گے اتنے پیسے میں تمہیں دوں گا۔بس یہ سمجھ لو کہ تم جس قدر مخلص ہوکر اپنے فریضے کو سرانجام دوگے میں اسی قدر تم پر روپے پیسے کی بارش کرتا رہوں گا بس ایک بات یاد رکھنا کہ اگر کوئی مسئلہ درپیش ہوا تو میں تمہاری جان لے لوں گا۔۔۔۔‘‘ رام داس نے پیسوں سے بھرا بیگ اس کے سامنے کھول کر رکھتے ہوئے کہا۔

’’کیا چار کروڑ تم مجھے ایڈوانس دے رہے ہو لیکن ہمارے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس کے مطابق ٹوٹل تم مجھے چار کروڑ دوگے۔۔۔۔؟‘‘ ستار نے حیرت سے کھلی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ذہن نہیں کھپاتے ستار بس تم اب تیار رہو کیونکہ بہت جلد تمہیں ان پیسوں کے عوض طے پائے جانے والے معاہدے پر پورا اترنا ہے۔۔۔‘‘رام داس نے کہا۔

’’کیا تم مجھے بھی یہ کالا جادو سکھا سکتے ہو میں ان سے بھی زیادہ پیسے کمانا چاہتا ہوں۔۔۔۔؟‘‘ ستار نے بیگ کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا تو اس کی بات سن کر رام داس کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔وہ تو چاہتا بھی یہی تھا اسے وشواس نہیں ہورہا تھا کہ جس کام کے لیے ستار کو تیار کرنے میں اسے کچھ وقت لگنا تھا وہ خود بخود ہی ہوگیا تھا۔

’’کیا تم حقیقت میں اس کام کے لیے تیار ہو۔۔۔؟‘‘ اس نے بے یقینی کے عالم میں ستار کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’کوئی شک ہے تمہیں۔۔۔۔‘‘ ستار نے آہستہ سے جواب دیا۔جبکہ رام داس کو ابھی تک اس کی بات پہ یقین نہیں ہورہا تھا کہ آیا جو کچھ وہ سن رہا ہے حقیقت ہے یا پھر اس کی سماعت کا دھوکہ۔

☆......☆......☆

مجھے تین دن کا ایک عمل کرنا تھا جس میں مجھے بہرصورت کامیابی حاصل کرنا تھی۔میرا دل کرچیاں کرچیاں ہوچکا تھا۔بہت ہی نازک مرحلہ آن پڑا تھا۔اپنے ہی ہاتھوں سے مجھے اپنے دوست کو ابدی نیند سلانے کا فریضہ سونپا گیا تھا۔پیر صاحب کے علاوہ اگر کوئی اور مجھے یہ بات کہتا تو میں اس کی گردن تن سے جدا کردیتا لیکن پیر صاحب کے لیے تو میرا تن من دھن تک قربان تھا۔ان کا حکم تو سر آنکھوں پر تھا۔میں مکمل

طور پر تیار ہو چکا تھا۔ پیر صاحب کے حکم کے مطابق مجھے آج سے ہی اپنے اس مشن کا آغاز کرنا تھا۔ اس کے لیے پیر صاحب نے مجھے اپنے زیر نگرانی عمل کرنے کا حکم دیا تھا۔ پیر صاحب کی خانقاہ کے تھوڑی دوری کے فاصلے پر ایک قبرستان تھا۔ جو اتنا پرانا نہیں تھا۔ لیکن چند ایک قبریں ایسی تھیں جن کو دیکھ کر ان کی حالت پر ترس آتا تھا۔ شاید ان کا کوئی اپنا نہ تھا اسی لیے ان قبروں کی مٹی تقریباً زمین کی تہہ کے ساتھ ملتی جا رہی تھی۔

اسی قبرستان کے وسط میں تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ جہاں دس بارہ قبریں بنائی جا سکتی تھیں۔ وہاں گھاس پھوس کی بہتات تھی۔ دن کے سمے پیر صاحب کے حکم پر میں نے اس جگہ کی صفائی ستھرائی کا فریضہ سرانجام دیا۔ کوثر بھی میرا معاون تھا۔ پیر صاحب کا ہی مرید خاص تھا۔ پیر صاحب کا اپنے علاقے میں ایک نام چلتا تھا۔ لوگ جوق در جوق ان کی بیعت کر رہے تھے۔ خدمت اسلام میں ان کا ایک اہم کردار تھا۔ دین کی خدمت کو وہ اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ ایک خاص بات کہ ان کے مرید فرقہ واریت کو نہ مانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے مریدوں میں ایسے احباب بھی تھے جو مسلمان تو نہ تھے لیکن حد درجہ آپ سے چاہت رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تھوڑے ہی عرصے میں پھر وہ بھی اسلام قبول کر لیا کرتے تھے۔

اس جگہ کی اچھی خاصی صفائی ستھرائی کرنے کے بعد میں پیر صاحب کی خانقاہ میں ان کے ساتھ واپس آ گیا۔ وقت بیتنے کا پتہ ہی نہ چلا اور عشاء کی نماز بھی میں نے پیر صاحب کے پیچھے ادا کر لی۔ عشاء کی نماز کی ادائیگی کے بعد پیر صاحب نے چند ایک ہدایات دیں۔ اور پھر میں ان سے اجازت لے کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

☆......☆......☆

ستار نے ایک نہایت ہی خطرناک عمل کو بہ حسن و بخوبی انجام تک پہنچایا۔ اس عمل کے دوران اسے تین جوان لڑکیوں کو تین دن اپنے عمل کے دوران شیطان کے چرنوں میں بھینٹ چڑھانا تھا۔ پھر دونوں درندوں نے عمل کے آخیر میں وقتاً فوقتاً ان لڑکیوں کے شریوں سے اپنے پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔ جس وقت وہ درندوں کی طرح لڑکیوں کے شریوں نوچ نوچ کر کھا رہے ہوتے تھے اگر اس وقت ایک عام انسان ان کو اس حالت میں دیکھ لیتا تو امید واثق تھی کہ ہارٹ فیل کر بیٹھتا اور سورگباش ہو جاتا۔

ستار پوری طرح سے رام داس کے چنگل میں پھنس چکا تھا۔ رام داس نے اسے ایسے ایسے سبز باغ دکھائے تھے کہ ستار کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود پڑ چکی تھیں۔ اسے سوائے اس بات کے اور کسی بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ اسے دنیا میں اپنی ایک الگ سے پہچان بنانی ہے۔ لوگ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کو یاد رکھیں۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کا ایک امیر ترین انسان بنانا چاہتا تھا۔ امراء ورلڈ کی لسٹ میں سرفہرست اپنا نام دیکھنے کا متمنی تھا۔ حرص اور شک دو ایسی الگ الگ بیماریاں ہیں جو انسان کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے۔ انسان اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی آخرت بھی تباہ کر بیٹھتا ہے۔

ستار نے جو عمل کیا تھا اس کی بدولت شیطان نے اسے ایک ایسی شکتی سے نوازا تھا جس کی بدولت وہ کسی بھی کوئی بھی روپ اپنا سکتا تھا۔ لوگوں کی نظروں کے سامنے سے غائب ہو سکتا تھا اور یہی نہیں اگر وہ چاہے تو کسی کو بھی اس کے سامنے یا خواب میں جا کر مل سکتا تھا۔ ستار کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ شیطان سے زیادہ رام داس کو پوجتا تھا۔ بھی اس کے عمل کی کامیابی پر رام داس نے اسے اپنا نام ستار سے تبدیل کر کے بھگوان داس رکھنے کا مشورہ دیا جسے اس نے بلا چوں چرا قبول کر لیا۔ اور پھر اس کی شناخت بھگوان داس کے نام سے ہونے لگی۔

بھگوان داس عرف ستار اپنے عمل کی کامیابی کے دوسرے دن ممبئی شہر میں منعقد ہونے والی ایک نائٹ پارٹی میں شریک ہوا۔ پارٹی پی ایم (پرائم منسٹر) کی

صاحبزادی کی سالگرہ کی خوشی میں منعقد کی گئی تھی۔

بھگوان داس نے شہر میں ہی اپنا کام شروع کرلیا تھا۔وہ مختلف چیزوں کی امپورٹ ایکسپورٹ کرنے لگا تھا۔اس کے پاس روپے پیسے کی تو کمی نہ تھی۔اس لیے اس نے چٹ منگنی پٹ بیاہ کی طرح فوراً سے بھی پیشتر لے دے کر کے اپنی کمپنی کو رجسٹر کروالیا۔اس نے اپنی کمپنی کا نام بھی اپنے نام سے منسوب کیا اور پھر جلد ہی اس کے نام کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔اس نے جلد ہی بڑے بڑے لوگوں سے علیک سلیک بنالی تھی۔اور یہی علیک سلیک اس کی پی ایم کے ساتھ بھی تھی۔تبھی پی ایم نے سب سے پہلے اسے ہی مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا تھا۔بھگوان داس نے رام داس کی شاگردی میں علم سحر پر بھی مکمل عبور حاصل کرلیا تھا۔

جب بھگوان داس نائٹ پارٹی میں پہنچا تو سب کو اپنا منتظر پایا۔مہمان خصوصی ہونے کے ناطے سب کو اس کا انتظار کرنا پڑ گیا تھا۔اس کے پہنچنے کی دیر تھی کہ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔اپنی اس قدر حوصلہ افزائی پر اس کا دل پھدک رہا تھا۔خوشی کے مارے وہ پھولے نہیں سما رہا تھا۔اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اپنی خوشی پر کنٹرول کس طرح کرے؟

کیک کاٹا گیا اور سب نے پی ایم کی صاحبزادی کو مبارکباد دی۔وہ بھی آگے بڑھا اور کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک خوبصورت گڑیا نکالی۔گڑیا کی آنکھوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان آنکھوں میں زندگی کے آثار ہوں۔پی ایم کی دختر نے بغور اس گڑیا کو دیکھا تو حیران وششدر رہ گئی۔کیونکہ اس گڑیا نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھیں جھپکائی تھیں۔اسے اپنی قوت بینائی پر وشواس نہیں ہو رہا تھا اس نے دوبارہ اس گڑیا کی طرف دیکھا لیکن اس کی آنکھیں اب کی بار سے ساکت و جامد دکھائی دیں۔اس نے اپنا وہم سمجھ کر سر کو جھٹکا اور بھگوان داس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''آپ کا گفٹ مجھے بہت پسند آیا ہے بھگوان داس یوں لگتا ہے کہ جیسے اس گڑیا کی شہد رنگ آنکھوں میں زندگی کے آثار ہیں۔۔۔۔۔''پی ایم کی دختر نے تعریفانہ نگاہوں سے ایک بار گڑیا کو اور پھر بھگوان داس کو دیکھتے ہوئے کہا اور گڑیا کو دائیں ہاتھ میں پکڑ کر سینے سے لگالیا۔

''آپ کی پسند کا شکریہ یہ میرے لیے قابل فخر بات ہے کہ آپ نے میرے گفٹ کو سراہا۔۔۔''بھگوان داس نے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا

''آپ پارٹی کو انجوائے کیجئے یہاں آپ کے انجوائے منٹ کے لیے بہت کچھ ہے۔۔۔۔۔''پی ایم کی دختر نے ایک سائیڈ پہ رکھی شراب کی بوتلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں ہم یہاں آئے بھی تو انجوائے منٹ کے لیے ہی ہیں۔۔۔۔''بھگوان داس نے پی ایم کی دختر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو پی ایم کی دختر نے فوراً سے بھی پہلے اپنی آنکھوں کو جھکالیا۔وہ بھگوان داس کی آنکھوں کی تاب نہ لاسکی تھی۔اسے بھگوان داس کی آنکھوں میں شیطانیت دکھائی دی۔

''معاف کرنا میں اپنا انٹروڈکشن کروانا بھول گئی۔۔۔۔''پی ایم کی دختر نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔''میرا نام چاندنی سریش ملہوترا ہے۔''

''ہوں۔ویری نائس۔۔۔۔''بھگوان داس نے سراہتے ہوئے کہا۔

''او کے آپ انجوائے منٹ کیجئے میں ذرا اپنی فرینڈز اور باقی احباب کو کچھ ٹائم دے لوں بائے۔۔۔''

اتنا کہہ کر چاندنی سریش ملہوترا ایک طرف ایستادہ اپنی فرینڈز کے پاس جا پہنچی۔جبکہ وہ برانڈی کے کئی پیگ حلق میں انڈیل گیا۔

''دو نائم سب کو چاندنی سریش ملہوترا۔کیونکہ اب تمہارا ٹائم ختم ہونے والا ہے بہت جلد تم اپنے اس حسین وجمیل جسد خاکی سے نجات حاصل کرنے والی ہو۔۔۔''برانڈی کا ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے کے بعد وہ

منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور پھر ایک ساتھ ہی باقی کا سارا پی گیا۔

''بھگوان داس صاحب آپ یہاں اکیلے کھڑے انجوائے منٹ کیے جا رہے ہیں ہم آپ کا وہاں انتظار کر رہے ہیں آیئے ناں ذرا ہمارے کچھ احباب ابھی تشریف فرما ہوئے ہیں آج آپ کا ان سے بھی کچھ انٹروڈکش کروائے دیتے ہیں۔۔۔'' بھگوان داس جو بے خیالی میں برانڈی کے پیگ پہ پیگ حلق میں انڈیلے جا رہا تھا یکبارگی اس کی قوت سماعت سے سریش ملہوترا (پی ایم) کی بازگشت ٹکرائی تو اس نے مڑکر اس کی طرف دیکھا اور منہ سے کچھ بولے بغیر اس کے ساتھ ہولیا۔ سریش ملہوترا اسے لیے اپنے احباب کے پاس جا پہنچا جبکہ دوسری طرف چاندنی جیسے ہی اپنی سکھیوں کے بیچ پہنچی ان کی طوطے جیسی زبانیں بے لگام ہوگئیں۔

''یہ صاحب بہادر کون ہیں۔ پہلی بار ہی دیکھا ہے بڑے غور سے جناب کے سراپے کا طواف کر رہے تھے۔۔۔؟'' اس کی ایک سہیلی نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا تو اس نے قطعاً اس کی بات کا برا نہیں مانا نہ ہی اس کی پیشانی پر کوئی سلوٹ عیاں ہوئی بلکہ اس کی بات سن کر وہ زیر لب مسکرادی۔

''یہی تو بھگوان داس صاحب ہیں میری سالگرہ کی پارٹی کے مہمان خاص۔۔۔'' اس نے ایک نظر اپنے پتاجی کے ساتھ ایستادہ بھگوان داس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''لگتا ہے سب کے تحفوں سے زیادہ اس کا تحفہ پسند آیا ہے جو دیکھو تو کیسے سینے سے چپکا کر رکھا ہوا ہے۔۔۔'' ایک اور فرینڈ نے گڑیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں یار میں نے یہ کب کہا مجھے تو سب کے تحفے بہت پسند آئے ہیں بس ایسے ہی انہوں نے یہ گفٹ مجھے تھمایا تو مجھے کسی کے سپرد کرنا یاد نہیں رہا۔۔۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں بھلا یاد بھی کیسے رہے گا آخر مہمان خصوصی کا گفٹ جو ہوا۔۔۔'' پہلے والی دوست نے بدستور اسے چھیڑنے والے انداز میں کہا

''ویسے مہمان خصوصی صاحب سے کونسی خصوصی گفتگو چل رہی تھی جناب کی۔۔۔؟'' اب کی بار چپ سادھے اس کی دوست نے لقمہ دیا۔

''کچھ نہیں بس انہوں نے گفٹ تھمایا اور میں نے جسٹ ان کا تھینکس ادا کیا اور پھر۔۔۔'' اس کے فقرہ ادا کرنے سے پہلے ہی ایک دوست نے اسے ٹوکا۔

''پھر۔۔۔؟'' اس نے سوالیہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پھر کیا پھر میں تم لوگوں کے پاس چلی آئی۔۔۔'' اس نے وضاحت کی۔

''لگتا تو نہیں کہ۔۔۔'' پہلے والی دوست نے اسے چھیڑا تو اس کی بات پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

دوسری طرف بھگوان داس کو لیے سریش ملہوترا اپنے دوستوں کے پاس جا پہنچے۔ وہ سب اس وقت اکٹھے کھڑے شراب بھی پی رہے تھے اور آپ میں ہلسی مذاق بھی کر رہے تھے۔ سریش ملہوترا بھگوان داس کو لیے ان کے پاس پہنچے اور ان سے بھگوان داس کا تعارف کروایا۔

''میرے پیارے دوستوں یہ ہیں ہمارے مہمان خصوصی بھگوان داس صاحب باقی ساری معلومات تو آپ لوگوں کے پاس ہے ہی۔۔۔'' اس نے اپنے دوستوں کو بھگوان داس کا مختصر تعارف کرواتے ہوئے کہا شاید وہ پہلے ہی وضاحت سے اس کے بارے میں اپنے دوستوں کو آگاہ کر چکا تھا۔ پھر اس نے بھگوان داس کی طرف دیکھا اور اپنے دوستوں کا اس سے تعارف کروانے لگا۔

''بھگوان داس صاحب یہ ہیں مسٹر گوپال صاحب۔ یہ سی ایم ہیں اور سماج سیوا میں دن رات مصروف رہتے ہیں۔''

''نمستے۔۔۔'' سی ایم گوپال نے ہاتھ

جوڑ کر بھگوان داس کو نمسکار کیا تو اس نے بھی جواباً اسے نمستے کے الفاظ سے نوازا۔ پھر پی ایم نے یکے بعد دیگرے سب کا اس کے ساتھ انٹروڈکشن کروایا لیکن سب سے آخر میں اس نے اپنے جس دوست کا اس کے ساتھ تعارف کروایا اسے دیکھ کر نجانے کیوں بھگوان داس کا دل حلق کو آن لگا تھا۔

''یہ ہمارے بہت ہی قریبی دوست چندر مہیش صاحب ہیں۔ علم نجوم اور دیگر کئی علوم پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ ان کے علم کا بہت چرچا ہے۔ قرب وجوار میں ان کے مریدین ہی مریدین ہیں۔ چہرہ شناسی کے فن پر بھی مکمل عبور حاصل ہے ان کو۔ یہی نہیں ان کے شاگرد بھی دنیا کے چپے چپے میں پھیلے ہوئے ہیں اور لوگوں کی خدمت خلق میں ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔۔۔۔'' سریش ملہوترا نے چندر مہیش کا تعارف کروایا۔

چندر مہیش نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ بھگوان داس اس سے نگاہیں ملانے کی جسارت نہیں کر پا رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کرے تو کیا کرے۔ چندر مہیش نے شاید اس کا دماغ پڑھ لیا تھا اور وہ اس پر کچھ مترشح نہیں ہونے دینا چاہتا تھا اسی لیے اس نے اس سے ہاتھ ملایا۔

''بھگوان داس صاحب سریش ملہوترا صاحب آپ کی شان میں ہمہ وقت گنگناتے دکھائی دیتے ہیں نجانے آپ نے ان پر کیا سحر کر دیا ہے۔ ویسے بھی آپ کی شخصیت پرتاثیر ہے کسی کو بھی اپنا گرویدہ کر سکتی ہے۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔۔۔'' چندر مہیش نے اپنے جام والے ہاتھ کو آگے کیا تو جواباً بھگوان داس نے بھی ہاتھ میں پکڑے جام کے گلاس کو اس کے گلاس کے ساتھ ٹکرایا۔

''یہ تو ان کی محبت ہے۔۔۔'' بھگوان داس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''ویسے آپ امپورٹ ایکسپورٹ بزنس کے علاوہ اور کیا کام کرتے ہیں۔۔۔؟'' چندر مہیش نے اس کے قریب آ کر سرگوشیانہ لہجے میں کہا

''م۔۔۔میں۔۔۔وہ میں اور تو کچھ نہیں کرتا۔۔۔بس۔۔۔یہی کرتا ہوں ٹائم ہی بھلا کہاں درکار ہوتا ہے۔۔۔۔'' بھگوان داس نے اضطرابیت بھرے لہجے میں کہا۔

اسے چندر مہیش کا سوال تیر کی مانند دل میں پیوست ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ گویا وہ چندر مہیش کا سوال نہ تھا بلکہ ہتھوڑا تھا جو اس نے اس کے سر پر دے مارا تھا۔ اسے اپنا حلق خشک ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد وہ وہاں سے ادھر ادھر ہو جائے تاکہ چندر مہیش کی نگاہوں سے دور ہو سکے تبھی اس کی نگاہ پی ایم کی دختر چاندنی پر پڑی جو اکیلی ایک طرف ایستادہ تھی۔ اس کی نگاہیں بھی بھگوان داس پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک بھرپور نگاہ سے چاندنی سریش ملہوترا کی طرف دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ چاندنی اس کے سحر میں پوری طرح جکڑ چکی تھی۔ وہ گڑیا جس پر اس نے ایک خاص سحر کر کے اسے پکڑا تھا اس گڑیا کا ہی کمال تھا کہ چاندنی اب اسی کی منتظر تھی۔ جیسے ہی وہ اس کی طرف مڑا چاندنی نے اپنا داہنا ہاتھ ہلا کر اسے متوجہ کیا۔ حالانکہ وہ دیکھ اسے ہی رہا تھا لیکن اس نے اسے نہ دیکھنے کا ناٹک کیا اور جب چاندنی نے ہاتھ ہلایا تو جواباً اس نے بھی ہاتھ ہلایا اور اس کی طرف بڑھا۔

وہ اس بات سے آشنا تھا کہ چندر مہیش کی نگاہیں بدستور اس کی پشت میں کھب رہی تھیں۔ شراب کی کثرت کی بدولت اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ جبکہ دوسری طرف چندر مہیش وہ سب کچھ جان چکا تھا جو بھگوان داس اس سے چھپانا چاہتا تھا۔ بھگوان داس باغ کی مولی تھی وہ تو بڑے بڑوں کو ناکوں چنے چبوا چکا تھا۔ بس ایک رام داس تھا جو اس کو مات دے گیا تھا۔ وہ بھی اچنبھے میں پس پشت اسے دھوکہ دے گیا تھا۔ آستین کے سانپ کے جیسے اس نے اس کی پشت میں خنجر گھونپا تھا۔ اگر کبھی اس نے دنیا میں کسی پر اعتماد کیا تھا تو وہ رام داس ہی تھا جس پر اس نے دل وجان سے

زیادہ اعتماد کیا تھا۔ لیکن اس نے ہی اسے دھوکہ دیا تھا۔ اس کی محبوبہ رانی سبھاش کو اس نے مار ڈالا تھا اور پھر گدھے کے سر سے سینگ کے جیسے غائب ہوگیا تھا۔

یہ بات بھی اپنی جگہ بجا تھی کہ رام داس اس سے کئی گنا زیادہ طاقتور تھا لیکن شاید اس میں اس سے نظریں ملانے کی جسارت نہ بچی تھی۔ لیکن اس کے دل میں اس کے لیے نفرت کے آلاؤ بھڑک اٹھے تھے۔

پھر اس نے دن رات شیطان دیوتا کی پوجا پاٹ کر کے وہ مقام حاصل کرلیا تھا کہ رام داس اس کے سامنے کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ لیکن وہ اس تک پہنچ نہیں سکتا تھا کیونکہ رام داس جہاں رہتا تھا وہاں رام داس نے ایک نہایت ہی خطرناک حصار قائم کر رکھا تھا اور یہ ایسا حصار تھا کہ اس کو صرف وہی شخص توڑ سکتا تھا جس نے اس حصار کو قائم کیا تھا اور یہ اسی طور ممکن تھا اگر رام داس اپنے قائم کیے اس حصار کو خود ہی ختم کرتا علاوہ ازیں کوئی بڑے سے بڑا اسادھو، جادوگر یا کوئی بھی اس حصار کے قریب بھی بھٹکتا تو جل کر راکھ ہونے سے اسے دنیا کی کوئی بھی شکتی نہ بچا پاتی۔

آج اسے رام داس کو حصار میں ہی ابدی نیند سلانے کے لیے آلہ کار مل گیا تھا۔ وہ بھگوان داس کا دماغ پڑھ چکا تھا اسے سوائے پیسے کے اور کسی چیز سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ وہ اپنا ایک الگ سے مقام چاہتا تھا اور اس کے لیے یہ چٹکی بجانے کی دیر تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ پلک جھپکتے میں بھگوان داس کو اپنی مٹھی میں مقید کرسکتا ہے۔ سب آپس میں گفت وشنید میں مصروف تھے تبھی اس نے سب سے معذرت کی اور بھگوان داس کی طرف چل پڑا۔ بھگوان داس اس کی طرف پشت کیے ایستادہ چاندنی سے گپ شپ میں اس قدر مگن تھا کہ اسے احساس بھی نہ ہوا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے بھی آن ایستادہ ہوا ہے۔

''ارے انکل آپ ۔۔۔؟'' چاندنی نے چندر مہیش کو بھگوان داس کے پیچھے ایستادہ دیکھ کر چہک کر کہا تو بھگوان داس چونکے بنا نہ رہ سکا۔

اس نے فوراً سے بھی پیشتر پیچھے مڑ کر دیکھا اور چندر مہیش کو اپنے پیچھے ایستادہ دیکھ کر اس کے قدموں تلے زمین سرک گئی۔ اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ اسے اپنی نس نس میں خون منجمد ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ پاؤں پھولتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ حلق یکبارگی خشک ہوگیا تھا اور سارے کا سارا نشہ کافور ہوگیا تھا۔

''بھگوان داس معذرت چاہتا ہوں آپ لوگوں کو تکلیف دی لیکن مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے اگر آپ کے پاس کچھ ٹائم ہو تو۔۔۔؟'' چندر مہیش نے معذرت خواہانہ لہجے میں بھگوان داس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو بھگوان داس نے چاندنی کی طرف سوالیہ آنکھوں سے دیکھا۔

''کوئی بات نہیں آپ لوگ بات کرلو ویسے بھی مجھے اب کافی بھوک لگی ہے میں بھی پیٹ پوجا کرلوں۔۔۔'' چاندنی بات مکمل کرتے ساتھ ہی ان کے درمیان سے چلی گئی۔ تو بھگوان نے تھوک نگلتے ہوئے سوالیہ آنکھوں سے چندر مہیش کو دیکھا جس کی الفت بھری نگاہیں بھگوان داس پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''بھگوان داس تم چنتا مت کرو میں تمہارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں لیکن میں تمہارے بارے میں یہاں موجود کسی بھی ذی روح سے کوئی بات نہیں کروں گا یہ بات صرف ہم دونوں کے مابین ایک راز کی طرح راز ہی رہے گی لیکن تم یہ بات سوچو کہ اگر یہ سب کچھ طشت ازبام ہوجائے تو تمہارے لیے تو کچھ بھی نہیں رہے گا لیکن تم چنتا مت کرو ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا لیکن جو ہونے والا ہے اس بات سے قطعاً آشنا نہیں ہو کہ تمہاری زندگی کو کتنا بڑا خطرہ لاحق ہے۔۔۔'' چندر مہیش نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا تو اس کی بات سن کر بھگوان داس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ بولا لیکن بدستور سوالیہ اور حیرت بھری آنکھوں سے اسے تکنے لگا۔

☆......☆......☆

میرے عمل کی آج پہلی رات تھی دل ہڈیوں کے پنجرے میں بری طرح سے پھڑک رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی سینہ چیر کر باہر آن گرے گا۔ میری حالت تو ''کاٹو تو بدن میں لہو نہیں'' والی ہو چلی تھی۔ میرے حواس باختہ ہو چکے تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کروں تو کیا کروں۔ حالانکہ میں اپنے حصار میں بالکل محفوظ تھا لیکن پھر بھی دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلے ایسے حالات سے کبھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ میں کونسا کوئی عامل یا سادھو تھا جو وقتاً فوقتاً عملیات کرتا رہتا تھا۔ میں تو زندگی میں کبھی تنہا شام کے بعد قبرستان کے قریب بھٹکنا گوارہ نہیں کرتا تھا۔

آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ پھر میں تعویذ وغیرہ کیسے دیا کرتا تھا یا میرے مریضوں میں دن بدن اضافہ کیوں ہوتا جارہا تھا تو یہ اس خالق کے پاک کلام کی برکت تھی۔ میں دل وجان سے قرآن مجید پر یقین رکھنے والا انسان ہوں میں آج بھی اگر کسی مریض پر دم کردوں تو اللہ اپنے فضل سے اسے صحت یاب فرمادیتے ہیں۔ ایسے ہی قرآنی آیات پر میرا کامل یقین تھا۔ پھر نماز اور تہجد کا بھی پابند تھا لیکن میں نے اس سے قبل زندگی میں کوئی عمل یا وظیفہ وغیرہ ایسا نہیں کیا تھا جس کی تکمیل شہر خموشاں میں بیٹھ کر ہوتی تھی۔ یہ میری زندگی کا پہلا واقعہ تھا جب میں تن تنہا شہر خموشاں میں براجمان ایک عمل کررہا تھا۔ اور اس عمل وجہ بھی میرا دوست تھا جو دن بدن کالی شکتیوں پر عبور حاصل کرنے لگ گیا تھا اور دن بدن اس کے ہاتھوں بے گناہوں کا خون ہورہا تھا۔ مجھے اس خون کی ہولی کو روکنا تھا۔

میرا پورا بدن وائبریٹ کررہا تھا۔ یہی نہیں پورا بدن پسینے میں شرابور ہوچکا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کروں تو کیا کروں ٹائم کچھوے کی اسپیڈ سے پیہم گزرتا چلا جارہا تھا۔ مجھے حصار میں بیٹھے ایک گھنٹے سے زیادہ بیت چکا تھا میں دھیرے دھیرے قرآنی آیت جو بیر صاحب نے بتائی تھی اسے پڑھ رہا تھا۔ تبھی میری قوت سماعت پر ایک عجیب سی بازگشت نے دستک دی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دور براجمان سسک رہا ہو۔ میں نے حقیقت کے سمندر میں غوطہ زن ہوکر ادھر ادھر دیکھا لیکن کوئی دکھائی نہ دیا۔ چاند کے اوائل دن تھے اور اب چاند بھی نکل آیا تھا اس کی مدھم سی روشنی چہار سو پھیل چکی تھی۔ اور اس روشنی میں قبرستان میں دور دور تک دیکھنا مشکل نہ تھا۔

آواز ایک بار پھر میری قوت سماعت سے ٹکرائی۔ اب کی بار آواز چنداں قریب سے سنائی دی۔ آواز سن کر اندازہ لگانا قطعاً وقت طلب نہ تھا کہ سسکنے والا کوئی اور نہیں کسی لڑکی کی آواز تھی۔ کبھی آواز تیز ہوجاتی تو کبھی بالکل مدھم۔ میں اپنا عمل چھوڑ کر آواز کی طرف کان لگائے بیٹھا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آواز آخر آ کہاں سے رہی تھی۔ اب کی بار بازگشت مجھے اپنے بہت ہی قریب سے سنائی دی۔ میں نے کان دھر لیے اور پھر اگلا لمحہ میرے حواس باختہ کرنے کے لیے کافی تھا کیونکہ جب میں نے اس آواز کو بغور سنا تو وقت کا ضیاع کیے بنا میں جان چکا تھا کہ آواز اور کہیں سے نہیں بلکہ جس جگہ عمل کررہا تھا میرے حصار سے کچھ فاصلے پر واقع ایک قبر میں سے آرہی تھی۔

میرے قدموں تلے زمین سرک گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آسمان سر پر آگرا ہو۔ میرا حلق خشک ہوگیا تھا اور سانس تک لینا دشوار ہوگیا تھا۔ دل کررہا تھا کہ عمل کو درمیان میں ہی چھوڑ دوں اور یہاں سے چمپت ہوجاؤں۔ میں نے خود ہی اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری تھی۔ بلاوجہ خود کو مصیبت میں پھنسا لیا تھا۔ اب خوف کے مارے برا حال ہوچکا تھا۔ تبھی میں نے ایک نہایت ہی بھیانک منظر دیکھا جسے دیکھتے ساتھ ہی میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کررہ گئی۔

میں نے دیکھا کہ اس قبر کی مٹی آہستہ آہستہ دائیں بائیں سرکنے لگی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ساری مٹی ادھر ادھر بکھر گئی اور قبر میں رکھے تختے دکھائی دینے لگے۔ پھر یوں لگا جیسے کسی نے ان تختوں کو اٹھا لیا ہو۔ یکبارگی

سارے تختے فضا میں معلق ہوگئے تھے لیکن ان کو اٹھانے والا کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ تختے قبر سے دور زمین پر جا گرے۔ پھر اگلا منظر ناقابل فراموش تھا۔

اس ہر میں سے میں نے کفن میں لپٹی ایک لاش کو کھڑا ہوتے ہوئے دیکھا لاش پوری طرح سے کفن میں لپٹی ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کفن کی گرہ کھلی اور کفن گردن تک سرک کر نیچے آگیا۔ پھر چاندکی مدھم روشنی میں میں نے دیکھا کہ وہ اس کفن سے ایک لڑکی کا منہ گردن تک باہر نکل آیا۔ لڑکی کے لمبے لمبے بال بھی یکدم کفن سے باہر نکل آئے۔

میں لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں کہ وہ لڑکی اس قدر حسین و جمیل تھی کہ دنیا میں اس کا کوئی ثانی نہ ہو اس لڑکی نے پہلے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں اور پھر اس کی نگاہیں دور فلک پر چمکتے مہتاب پر جا ٹکیں دوسرے ہی لمحے اس کے بازو مانند جسم پر لپٹا کفن قبر میں جا گرا اور وہ مکمل طور پر برہنہ ہوگئی۔ اس کا دودھ کے جیسا رنگ چاندکی چاندنی میں گوہر آبدار کی مانند چمک رہا تھا۔ میں یہ بھول چکا تھا کہ میں شہر خموشاں میں کس مقصد کے لیے براجمان تھا میں تو بس اس مہ جبیں کو ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔ نظریں تھیں کہ اس کے جسم پر سے ہٹنے کا نام تک نہ لے رہی تھیں۔

تبھی اس نے اپنی نگاہیں جھکائیں اور پھر یکدم اس کی نگاہیں مجھ پر آن ٹکیں تو مجھے دیکھ کر مبہوت سی رہ گئی۔ پھر اس نے قبر سے باہر قدم نکالے اور قبر سے باہر نکل آئی۔ اب وہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ میرے سامنے ایستادہ میرے ہوش اڑا رہی تھی۔ اس کے جسم کے ابھرے ابھار اور اس کے علاوہ جسم کا ایک ایک عضو متزلزل دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا بھرا ہوا پرتاثیر جسم کسی کو بھی اپنی گرفت میں لے سکتا تھا۔ پھر اس کے قدم آناً فاناً اٹھنے لگے اور میں نے دیکھا کہ وہ میری طرف بڑھنے لگی تھی۔ مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اب وہ میرے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ اس کے جسم کا ایک ایک عضو میرے سامنے تھا۔ قبل اس کے کہ میں اپنے حواس کھو بیٹھتا میری قوت سماعت سے پیر صاحب کی بازگشت ٹکرائی۔

''اپنے عمل پر دھیان دو برخوردار یہ سب نظر کا دھوکہ ہے اگر تم اسی طرح بھٹکتے رہے تو وقت بیت جائے گا اور تمہارا عمل ضائع ہوجائے گا پھر ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے اس لیے اپنے عمل پر دھیان دو۔''

پیر صاحب کی بازگشت میری قوت سماعت سے ٹکرانے کی دیر تھی کہ جیسے میں ہوش میں آگیا تھا۔ میں نے آنکھوں کو مسلا اور پھر اس کی طرف دیکھا تو ایک بار پھر میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ اب کی بار سارا منظر ہی تبدیل ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں قبرستان کی بجائے سمندر کے ایک خطے میں براجمان تھا۔ یہ خطہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ بس اتنی سی جگہ تھی کہ جس میں میں براجمان تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ سب کچھ یکبارگی کیسے ہوگیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا میں سپنا دیکھ رہا تھا۔ میں نے یقین دہانی کے لیے اپنے داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی پر دانتوں تلے رکھ کر تھوڑا دبایا تو میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

''اوہ میرے خدا! یہ کیسی حقیقت ہے میں تو شہر خموشاں میں براجمان تھا یہاں کیسے آگیا؟'' میرے ذہن میں خوف سرایت کر چکا تھا۔ میرا پورا جسم ایک بار پھر بری طرح سے کانپنے لگ گیا تھا۔ چہار سو کالی رات نے اپنے پر پھیلائے ہوئے تھے حالانکہ شہر خموشاں میں چاند کی چاندنی پھیلی ہوئی تھی لیکن یہاں تو پوری طرح سے کالی چادر ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ اور سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کالی رات میں بھی مجھے ہر چیز متزلزل دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اچانک سمندر کے پانی میں بھونچال سا برپا ہوگیا تھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے میں ایک ساتھ تین شارک مچھلیوں کو سرعت سے اپنی طرف لپکتے ہوئے دیکھا۔ میں نے سنا ہوا تھا کہ شارک مچھلیاں اپنے شکار کو زندہ ہڑپ کر جاتی ہیں چاہے وہ انسان ہی

کیوں نہ ہو۔

شارک مچھلیوں کو سرعت سے اپنی طرف لپکتے دیکھ کر میرے حواس باختہ ہو چکے تھے۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ یہ سب اچانک ہو کیا گیا تھا۔ پانی کی تیز شور برپا کرتی لہروں کی آواز میں مترنم طور پر سن رہا تھا۔ تیز لہروں کا شور کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔ دل بری طرح سے دھک دھک کر رہا تھا۔ شارک مچھلیاں اتنی قریب آ چکی تھیں کہ موت قریب محسوس کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں ان تینوں مچھلیوں میں سے کسی کا لقمہ بنتا میں نے خوف کے باعث آنکھیں موندھ لیں۔ جب کافی دیر تک کچھ نہ ہوا تو میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا کہ میں شہر خموشاں میں ہی براجمان تھا۔ اور وہ لڑکی میرے سامنے براجمان تھی۔

''میں چاہوں تو تمہیں پلک جھپکتے میں یہاں سے اٹھا کر نذر آتش کر دوں لیکن میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی کیونکہ تم جو کچھ بھی کر رہے ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تمہیں اس سے کچھ بھی استفادہ ہونے والا نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ سرابوں کے پیچھے دوڑتے پھر رہے ہو۔ اگر دوست کو بچانا ہی ہے تو خود اعتمادی کی طاقت سے بچاؤ۔ تمہارا دوست عملیات سے واپس آنے والا نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ اپنے وقت کا ضیاع کر رہے ہو۔ اس لیے عقل کے ناخن لو اور وقت ضائع کرنے کی بجائے میدان جنگ میں اتر جاؤ اور ہر مد مقابل کو نیست و نابود کر کے رکھ دو۔ قبل اس کے کہ تمہارا دوست دنیا کے لیے ناسور بن جائے جاؤ اس کو ملیامیٹ کر دو۔ چاہو تو ابھی اٹھ کر یہاں سے چلے جاؤ یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی اور چاہو تو ساری رات یہیں بیٹھ کر گزار دو اب اس کے بعد تمہارے ساتھ کوئی واقعہ رونما نہیں ہونے والا نہ آج اور نہ باقی دو دنوں میں۔

یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں حصار سے باہر نکالنے کے لیے پر تول رہی ہوں یہ تو حقیقت ہے کہ تمہارے دوست کا وجود اب اس دنیا کے لیے کسی ناسور سے کم نہیں ہے لیکن جتنی جلدی ہو سکے اس کو ختم کر دو جتنی دیر کرو گے اتنی مشکل سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس کی موت تمہارے ہی ہاتھوں سے لکھی ہوئی ہے لیکن تم جتنی لیٹ کرو گے تمہیں اتنا ہی مشکل بھی ہونا پڑے گا تمہارا دوست اب خود بہت طاقتور بن چکا ہے۔ جس کا قلع قمع کرنے کے لیے تم تگ و دو کر رہے ہو وہ از خود ابدی نیند سو چکا ہے کیونکہ اسے تمہارے دوست نے ابدی نیند سلا دیا۔ اب اپنے وقت کا ضیاع مت کرو اور چاہو تو چلے جاؤ اور چاہو تو اپنا وقت پورا کر لو میرے جانے کا وقت ہو رہا ہے۔

جاتے جاتے تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ تم ایک دردمند اور دوسروں کا احساس کرنے والے انسان ہو۔ ایسے انسان دنیا میں شاذ و نادر ملتے ہیں۔ تم حقیقت میں کسی نعمت سے کم نہیں ہو۔ افسوس! کہ تمہارا دوست تمہاری باتوں کی گہرائی کو نہ سمجھ پایا اور اپنے حرص کی بھینٹ چڑھ چکا ہے۔ اپنے ایمان اور اپنی آخرت کو اس نے داؤ پر لگا دیا ہے۔ اس وقت تو تم بے اعتمادی کی آگ میں تپ رہے ہو اس لیے مجھ پر اعتماد نہیں کرو گے لیکن رات بتاتی ہے تو میں تمہارے پاس رک جاتی ہوں کیونکہ مجھے بھی تم سے کچھ مطلب ہے۔''

وہ لڑکی مسلسل بولے جا رہی تھی اور میں سنے جا رہا تھا۔ نجانے کیوں اب میرے دل سے اس کا خوف ختم ہو چکا تھا۔ میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ کوئی اور نہیں بلکہ اس سے میرا کوئی قریبی سمبندھ ہو لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ ایسی کوئی لڑکی فی الحال تک میری آنکھوں کے سامنے میرے عزیز و اقارب میں کسی کی نہ دیکھنے کو ملی تھی۔ میرے دل سے موت کا خوف یکسر ختم ہو چکا تھا۔ میں اس بات کو بھی فراموش کیے براجمان تھا کہ میں شہر خموشاں میں براجمان تھا جہاں رات تو درکنار دن کو بھی کوئی بھٹکنا بھی گوارہ نہیں کرتا تھا۔ اور میں رات کے پچھلے پہر بیٹھا تھا۔

میرے سامنے ایک جوان دوشیزہ براجمان تھی جو پہلے میرے سامنے آن وارد ہوئی تو برہنہ تھی لیکن اب

پتہ نہیں یکدم کہاں سے اس نے آسمانی رنگ کا ایک ڈریس زیب تن کرلیا تھا جس میں اس کا مکھڑا اور بھی حسین اور نکھر انکھرا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ لڑکی مجھ سے ایسے باتیں کررہی تھی جیسے دو دوست آپس میں گفت وشنید کرتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میں اب عمل نہیں پڑھ رہا تھا۔

لیکن پیر صاحب کی بازگشت نے بھی میری قوت سماعت پر دستک نہیں دی تھی ایک بار تو میں نے سوچا کہ کہیں یہ مجھے بہکا تو نہیں رہی میں نے دل ہی دل میں آیت مبارکہ کا ورد کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر تبسم زیرلب مسکرائے جارہی تھی۔ پھر اس نے مجھے اپنی روداد سنانی شروع کردی جسے سن کر میں حیرت کدہ رہ گیا تھا۔ میں اپنا عمل بھول کر اپنا پورا دھیان اس کی روداد سننے پر مرکوز کیے ہوئے تھا۔ جب اس کی روداد ختم ہوئی تب تک تہجد کا وقت ہوچکا تھا۔ ابھی فجر کی آذانیں نہیں ہوئی تھیں لیکن پیر صاحب نے فرمایا تھا کہ تہجد کا وقت جیسے ہی ہو تم واپس لوٹ آنا اس وقت کوئی بھی تمہارا بال تک بیکا نہیں کرپائے گا۔‘‘

☆......☆......☆

چندر مہیش بھگوان داس کو لیے ایک طرف بیٹھ گیا جہاں وہ تھے تو سب کی نظروں کے سامنے لیکن سب سے تھوڑے ہٹ کر ان کی باتوں کو سننے والا کوئی نہ تھا۔ ویسے بھی ان کے درمیان ہونے والی گفت وشنید سرگوشیانہ انداز میں ہورہی تھی بادجود اس کے کوئی بھی ان کے قریب تک نہ بھٹکا تھا۔ دوران گفتگو چندر مہیش نے بھگوان داس کو شروع سے آخر تک اس کی روداد سناڈالی تھی اور یہ بھید بھی اس پر طشت ازبام کردیا تھا کہ رام داس اسے کیسے استعمال کررہا ہے جیسے ہی وہ اپنے مقصد میں سپھل ہوگا وہ اس کو بھی شیطان دیوتا کے چرنوں میں بھینٹ چڑھادے گا اور پھر وہ مہاشکتی مان بن جائے گا پہلے تو بھگوان داس کو اس کی بات پر بالکل وشواس نہیں آرہا تھا لیکن جب اس نے کچھ ایسے بھیدوں کا پردہ چاک کیا جن کا بھگوان داس اور رام داس کے علاوہ کسی کو علم بھی نہ تھا تو بھگوان داس تھوڑا پریشان ہوگیا۔

وہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ آیا چندر مہیش جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سب کچھ حقیقت پر مبنی ہے یا اس کی من گھڑت کہانی ہے۔ حتیٰ کہ چندر مہیش نے بھگوان داس کو پوری طرح اعتماد میں لے لیا اور اس کے دل ودماغ میں یہ بات بیٹھادی کہ وہ وقت دور نہیں جب رام داس اسے بھی شیطان دیوتا کے چرنوں میں بھینٹ چڑھادے گا اس لیے جتنی جلدی ہوسکے اس کا کام تمام کردے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بھگوان داس یہ کام ازخود نہیں کرسکتا کیونکہ رام داس پہلے سے ہی بہت شکتی شالی ہے لیکن فی الوقت وہ بھی اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا جب تک کہ اس حویلی کے چہار سو قائم کیے گئے حصار کو ختم نہ کیا جاتا اور یہ کام بھگوان داس نے اپنے ذمہ لے لیا تھا کہ وہ فوراً سے بھی پیشتر اس حصار کو ختم کرواکے رہے گا۔

باقی کام چندر مہیش نے اپنے ذمہ لے لیا تھا کہ وہ کس طرح رام داس کو ابدی نیند سلائے گا۔ پھر جب اس نے بھگوان داس پر یہ بھید طشت ازبام کیا کہ جو بھی دوسرے اپنے جیسے شکتی شالی شیطان دیوتا کے پجاری کو شیطان دیوتا کے چرنوں میں بھینٹ چڑھاتا ہے تو اس کی ساری شکتیاں اس کو مل جاتی ہیں۔ کالی دنیا کا یہی اصول ہے کہ کامیابی اسی کے قدم چومتی ہے جو دوسروں پر برتری حاصل کرتا ہے۔

رام داس کو بھگوان داس اور چندر مہیش کے درمیان ہونے والی گفت وشنید سے متعلق کوئی انفارمیشن نہ تھی نہ ہی وہ بھگوان داس کی کوئی خاص نگرانی کرتا تھا۔ یہی بات اسے نقصان دے گئی۔ آخر ایک دن بھگوان داس نے جب اسے کہا:

’’کہ میں حویلی میں داخل ہونے لگتا ہوں تو اکثر و بیشتر یوں لگتا ہے جیسے آگ کے بڑے بڑے گولے میری طرف لپک رہے ہوں مجھے اس حویلی سے ڈر لگنے لگ گیا ہے لہٰذا اس حویلی سے میرا دل اچاٹ

ہونے لگا ہے میں یہاں نہیں رہنا چاہتا کہیں اور جا بسیرا کرلوں۔“

اس کی بات سن کر رام داس چنداں تذبذب کا شکار ہوا پھر بولا:

”تم چنتا کیوں کرتے ہو یہ آگ تمہیں کچھ نہیں کہے گی یہ آگ تمہارے اور میرے دشمنوں کو ختم کرے گی۔ یہ آگ ایک حصار کی طرح پوری حویلی کو چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ اگر تمہارے، میرے اور ہمارے ملازموں کے علاوہ کوئی اور اس حویلی میں داخل ہوا تو یہ آگ پلک جھپکتے میں اسے جلا کر بھسم کردے گی۔“

مجھے حیرت ہورہی ہے کہ ایک شکتی شالی انسان اپنی حفاظت آگ سے کروارہا ہے کیا اسے خود پہ بالکل اعتماد نہیں ہے۔۔۔۔؟“ بھگوان داس نے سوال داغا۔

”بات ایسی نہیں ہے بھگوان داس دشمن ہمیشہ پس پشت حملہ آور ہوتا ہے اس لیے اپنی احتیاط لازمی ہوتی ہے۔۔۔“ رام داس نے وضاحت کی۔

”ایسی احتیاط سے تو ڈوب مرنا لازمی ہے۔ کیا فائدہ ان شکتیوں کا پھر جو وہ حفاظت ہی نہ کرپائیں۔۔۔“ بھگوان داس پیہم اس بات پر زور دے رہا تھا کہ کسی طرح رام داس اس حصار کو ختم کرے لیکن رام داس بھی اپنے پیروں پر پانی نہیں آنے دے رہا تھا۔

”یہ حصار بھی تو ہماری شکتیوں کا ایک حصہ ہے یہ ہمارے شکتیاں ہی ہیں بھگوان داس جو ہماری حفاظت کررہی ہیں۔۔۔“ رام داس نے اسے عجیب نظروں سے گھورتے ہوئے کہا

”لیکن مجھے خوف آتا ہے رام داس اس حصار سے ختم کردو اسے ایسا بھی کونسا ہمارا دشمن ہے جو ہمارے اس حصار کی وجہ سے ہم پر ہی نگاہیں مرتکز کیے ہوئے ہے کہ کب ہم اس حصار کو ختم کریں اور کب وہ ہم پر حملہ آور ہو۔۔۔“ بھگوان داس نے منہ پھیر کر کہا۔ اس کا من چاہ رہا تھا کہ فوراً سے بھی پیشتر رام داس کا گلہ اپنے ہاتھوں سے گھونٹ ڈالے۔ اسے رام داس سے حد سے زیادہ نفرت محسوس ہورہی تھی۔ وہ تو اسے دیوتا کے جیسے پوجتا تھا۔ لیکن اس کی حقیقت جب اس پر عیاں ہوئی تو اس کے قدموں تلے زمین سرک گئی تھی اور اس کی نس نس میں اس کے لیے نفرت کے تاثرات عیاں ہوگئے تھے۔

”تم اسے ختم کردو رام داس اپنی شکتیوں پر بھروسہ رکھو اور خود پر اعتماد رکھو۔ تم حقیقت میں ایک شکتی شالی انسان ہو۔ مجھے تم جیسے بہادر انسان کی شاگردی حاصل ہے یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے لیکن اگر تم آج ایسی بزدلانہ باتیں کرو گے تو تمہاری باتیں تو میرے حوصلے بھی پست کریں گی۔ رام داس مجھے ایک مقام بنانا ہے جیسا کہ تم نے اپنا بنایا ہے اور مجھے دنیا کے سامنے رہنا ہے نہ کہ تمہاری طرح چوہوں کی بل میں چھپ کر رہنا ہے۔ کیا فائدہ برسوں کی پوجا پاٹ کا کہ پھر بھی تم تہہ خانے میں چھپے رہو اور حویلی کو چاروں طرف سے حصار لگا کے رکھو۔“

بھگوان داس کی تلخ و شیریں باتیں سن کر رام داس کو غصہ ضرور آیا لیکن وہ اپنے غصے پر ضبط کرگیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ ایک شکتی شالی انسان کو ایسی باتیں کہاں زیب دیتی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بھگوان داس اس سے بدزن ہو کر کہیں رفو چکر ہوجائے اور کسی اور کے ہتھے چڑھ جائے اس لیے اسے بھگوان داس کی بات مان لینی چاہیے تھی۔ وہ کونسا ایک عام انسان تھا اس کے سامنے بڑے بڑے شکتی شالی انسان گھٹنے ٹیکتے تھے پھر اسے چنتا ہی کس بات کی تھی حصار نہ بھی ہو تو شیطان دیوتا کی کرپا سے کوئی بھی اس کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھنے کی اپنے اندر سکت نہیں رکھتا۔

☆......☆......☆

میں بھی کبھی تمہاری دنیا کی باسی ہوا کرتی تھی۔ مجھے گھر میں ایسا ماحول میسر آیا تھا کہ کسی کی پوچھ تاچھ یا روک ٹوک والی تو بات ہی نہیں تھی۔ میں بہت چھوٹی تھی لیکن اتنی بھی چھوٹی نہیں تھی سوجھ بوجھ رکھتی تھی جب

میں دیکھا کرتی تھی کہ میرے ابو کی عدم موجودگی میں میری والدہ کو ملنے کبھی کوئی تو کبھی کوئی آجایا کرتا تھا۔ جبکہ دوسری طرف میں نے کئی بار اپنے ابو کو بھی دوسری عورتوں کے ساتھ آتے جاتے اور نازیبا حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔ یہ سب دیکھنے کی میں عادی ہوگئی تھی اور ایک دن وہ بھی آگیا جب میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔

میرے حسن کا چرچا جنگل میں آگ کے جیسے پھیل گیا تھا۔ ہرکس وناکس میرے حسن کا دیوانہ ہوگیا تھا۔ مجھے بہت اچھا لگتا تھا جب کوئی میرے فانی حسن کی تعریفیں کیا کرتا تھا۔ میں فرسٹ ایئر میں کیا پہنچی میرے دوستوں کی تعداد اچانک ہی بڑھ گئی۔ ہائی اسکول تک میری فرینڈز صرف لڑکیاں ہوا کرتی تھیں لیکن جب میں نے شہر کے ایک مشہور پرائیویٹ کالج میں ایڈمشن لیا تو اس کا ماحول دیکھ کر ایک بار تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہاں لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔ وہاں بھی میں نے دیکھا کہ لڑکوں کی ہوس بھری نگاہوں مجھ پر ٹکنے لگ گئی تھیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے میرے دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ میرے دوستوں میں زیادہ تر لڑکے تھے۔

کالج کی دوستی گھر تک آنکلی اور میرے پاس بھی گھر میں لڑکوں نے آنا شروع کردیا۔ جب میرے والدین نے یہ منظر دیکھا تو ورطۂ حیرت میں مبتلا ہوگئے لیکن میرا بھلا کیا قصور تھا اس سب میں میں بھی تو وہی سب کررہی تھی جو یہ لوگ کرتے چلے آئے تھے اور انہی کی دیکھا دیکھی میں بھی اپنے دن رات رنگین کرنے لگی تھی۔ اس بات کی بھنک میرے والدین کو پڑ چکی تھی ایک دن میرے والدین نے مجھے اپنے روم میں بلایا تو میں بلا جھجک اندر چلی گئی۔ دونوں کو سلام کیا لیکن جواب کسی نے نہ دیا۔ دونوں نے کھا جانے والی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

''یہ سب کیا ہورہا ہے کیا یہی تعلیم تم حاصل کررہی ہو تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم کیسے نازیبا کام کرنے لگی ہو تم نے تو ہمارے منہ پر کالک مل کر رکھ دی ہے۔ ہرکس وناکس کی زبان پر تمہارے بارے میں ہی باتیں ہیں آخر تم کرنا کیا چاہتی ہو کیوں ہماری عزت کا جنازہ نکالنا چاہتی ہو۔۔۔۔۔؟'' میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے ابو مجھ پر بھڑک اٹھے تو میں نے بھنویں اچکا کر ان کی جانب دیکھا

''کیا کیا ہے میں نے جو آپ ایسے سرزنش کررہے ہیں۔۔۔۔۔؟'' میں نے سوالیہ آنکھوں سے اپنے ابو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

''اتنی نادان مت بنو۔ یہ سب کیا ہے کبھی تم سے ملنے کوئی آرہا ہے تو کبھی کوئی آرہا ہے آخر یہ سب چل کیا رہا ہے۔۔۔'' اب کی بار والدہ نے مجھے سرزنش کی۔

''میں کچھ غلط نہیں کررہی امی۔ میں سب وہی کررہی ہوں جو آپ دونوں کرتے آئے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آپ سے ملنے والے مرد حضرات ابو کی غیر موجودگی میں آیا کرتے تھے اور ابو سے ملنے والی عورتیں آپ کی عدم موجودگی میں لیکن مجھ سے ملنے والے آپ دونوں کی موجودگی میں آتے ہیں۔۔۔۔''

میری بات سن کر دونوں کی بولتی بند ہوگئی تھی۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت بھری آنکھوں سے دیکھا۔ دونوں کو شاید مجھ سے اس جواب کی توقع نہ تھی اور ویسے بھی دونوں آج تک یہی سمجھتے آئے تھے کہ ان کو ایک دوسرے کے کارناموں کا پتہ نہیں ہے لیکن آج میں نے دونوں کا ایک ساتھ بھانڈہ پھوڑ دیا تھا۔ دونوں میں اب اتنی سکت نہ بچی تھی کہ مجھ سے نگاہیں ملا پاتے۔

''جب میں نے کبھی آپ لوگوں کے معاملات میں انٹرفیرنس نہیں کیا تو آپ لوگوں کو بھی نہیں کرنا چاہیے۔''

اتنا کہہ کر میں وہاں سے چلتی بنی اور وہ دونوں وہیں چپ سادھے بیٹھے رہے۔ دونوں ایک دوسرے سے نگاہیں ملانے کی جسارت نہ کرپارہے تھے۔ لیکن

مجھے کسی بات سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ میں سیدھی اپنے روم میں چلی آئی تھی۔ جیسے ہی میں اپنے روم میں داخل ہوئی تو اپنے ایک کلاس میٹ حفیظ سلطان کو اپنا منتظر پایا۔ مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ ایستادہ ہوگیا اور میں جاکر اس کے گلے لگ گئی۔ حفیظ سلطان کا آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ حفیظ سلطان ہی نہیں اب تو پورا کالج ہی میرے دوستوں کی لسٹ میں شمار ہونے لگا تھا۔ کوئی نہ کوئی تو مجھ سے ملنے آتا ہی رہتا تھا۔

کمرے کو اندر سے مقفل کرکے میں اس کے ساتھ ہی بیڈ پر دراز ہوگئی تھی۔ کچی عمر سے ایسی نازیبا حرکتوں کی عادی ہوگئی تھی میں سمجھتی تھی کہ ایسا کرنے سے جو راحت میسر آتی ہے شاید میں اس کی حق دار ہوں اور ایسا سب کچھ ہی تو میں نے اپنے والدین کو بھی کرتے دیکھا تھا۔ ہم دونوں بیڈ پر لیٹے رومینس کرنے لگے۔ پھر مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا کیونکہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نگاہیں اس کی پھڑکتی شہہ رگ پر جا ٹکیں۔ اور دوسرے ہی لمحے میرے اوپر کے دو دانت باہر نکل آئے تھے۔ حفیظ سلطان ان سب باتوں سے بے خبر اپنے کام میں مگن تھا۔ تبھی میں نے اسے زور سے جکڑا اور پھر اپنے لمبے نوکیلے دانت اس کی شہہ رگ میں اتار دیئے شہہ رگ زور سے پھڑکی اور پھر اس میں سے گرم گرم خون فوارے کی طرح میں حلق میں اترنے لگی۔ عجب مدہوشی محسوس کررہی تھی۔

حفیظ سلطان کی چیخیں بھی اس کے حلق میں پھنس چکی تھیں۔ باوجود کوشش کے وہ خود کو مجھ سے نہ بچا پایا تھا اور میں آن کی آن میں اس کا سارا لہو اپنے حلق سے نیچے اتار لیا۔ حفیظ سلطان سورگباش ہوچکا تھا لیکن مجھے اس بات کی قطعاً کوئی چنتا نہ تھی پیاس تو ختم ہوگئی تھی لیکن بھوک کی وجہ سے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے شریر پر سے گوشت نوچ نوچ کھا گئی۔ اب میرے سامنے صرف اس کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ جسے رات کے پچھلے پہر میں نے ایک تھیلے میں ڈال کر گھر کی چھت سے اچھال کر چنداں دور پھینک دیا۔ مجھے ان نازیبا حرکتوں سے زیادہ اس خون پینے اور گوشت کھانے میں زیادہ مزہ آیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ مرد و عورت کے شریر کا پجاری ہے۔ اس کی محبت کی ابتداء بھی شریر سے ہوتی ہے اور انتہا بھی۔ آتما تک تو اس کی محبت جاتی ہی نہیں ہے۔

اس رات میں بڑے مزے سے سوئی تھی۔ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ تھی کہ حفیظ سلطان کہاں گیا ہے۔ اس کے والدین اس کی تلاش میں سرگرداں تھے لیکن نہ اسے ملنا تھا نہ ملا۔ انہوں نے میرے گھر سے بھی پتہ کروایا لیکن بے سود۔ پولیس میں بھی رپٹ درج کروائی لیکن وہ ہوتا تو ملتا۔ پھر پتہ چلا کہ کسی راہ گیر نے تھیلا دیکھا اور اس میں ہڈیوں کو دیکھ کر پولیس کو انفارم کیا۔ پولیس جائے وقوعہ پر پہنچی اور ہڈیوں کو پولیس کی زیرنگرانی ہسپتال لے جایا گیا وہاں جاکے انکشاف ہوا کہ وہ ہڈیاں کسی اور کی نہیں حفیظ سلطان کی ہیں تو یہ خبر سن کر حفیظ سلطان کے والدین کے پیروں تلے زمین سرک گئی۔

کسی کو کچھ خبر نہ تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے کیا نہیں۔ میں نے ایک ہفتے میں تین لڑکوں کو اپنا شکار بنالیا تھا۔ ایک تو حفیظ سلطان تھا لیکن دوسرے دو پڑوسی تھے جو وقتاً فوقتاً مجھ پر نگاہیں مرکوز کیے رکھتے تھے۔ اب کی بار میں نے ان کی ہڈیوں کو کہیں بھی پھینکا نہیں تھا بلکہ ان کو زمین میں دفن کردیا تھا۔ اور جہاں دفن کیا تھا اس کے بارے میں کسی کو معلوم بھی نہ تھا۔ ہر گزرنے والا دن میرے لیے دشواریاں لانے لگا تھا۔ اب مجھے اپنے شکار کے لیے کافی تگ و دو کرنا پڑتی تھی۔ نوجوانوں کے اچانک یکے بعد دیگرے غائب ہونے کی وجہ سے اب میرے دوستوں نے بھی میری طرف آنا چھوڑ دیا تھا۔ جبکہ دوسری طرف میری بھوک و پیاس کسی اور چیز سے نہیں مٹتی تھی۔ جگہ جگہ پہ دن رات پہرے لگنے شروع ہوگئے تھے لیکن پولیس پیہم ناکام تھی۔ مجرم کا کوئی اتہ پتہ معلوم نہیں ہو رہا تھا جب کہ دوسری طرف مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میں کروں

تو کیا کروں۔
ایک دن جب میں کالج سے چھٹی کے بعد پیدل گھر واپس آرہی تھی تو راستے میں دو پہرے داروں نے مجھے روکا۔ اتفاق سے اس وقت وہاں کوئی بھی نہ تھا۔
''سنو بہت خوبصورت ہو تم اس حسن کی کچھ مٹھاس ہمیں بھی چکھاؤ نہ ترس گئے ہیں تمہیں روز آتے جاتے دیکھ کر۔۔۔'' ایک پہرے دار نے میرے سامنے ایستادہ ہوتے ہوئے کہا۔
''اتنا ہی شوق ہے تو رات کے وقت آجانا اگر تم آگئے تو جیسے تمہاری من مرضی ویسے کرنا۔۔۔'' میں نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے کہا
''رات کو ہی کیوں ابھی کونسا قیامت برپا ہوگئی تھی پل دو پل کی بات ہے آجاؤ۔۔۔'' دوسرے نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی رہائش کی طرف لے جاتے ہوئے کہا
وہ دونوں ہی پولیس اہلکار تھے اور ایسے پولیس اہلکاروں کے لیے جگہ جگہ ایک ایک چھوٹا سا کمرہ بنایا اور ساتھ اٹیچ باتھ بنایا گیا تھا۔ جہاں وہ ضرورت کا سامان رکھ لیتے تھے اور آرام بھی کرلیا کرتے تھے۔ میں نے اس کی اس حرکت پر کوئی چوں چراں نہ کی تھی بلکہ چپ چاپ اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔ دوسرا نوجوان بھی ہمارے پیچھے ہولیا۔ اس نے مجھے پہلے کمرے کے اندر دھکیلا اور پھر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اندر آگیا اور آتے ساتھ ہی بھیڑیے کا روپ دھار لیا۔ لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اس کی زندگی کے ایام گنے جاچکے ہیں۔
پلک جھپکتے میں ہم برہنہ ایک طرف پڑی کھٹکارہ سی چارپائی پر پڑے تھے۔ میں نے کوئی روک ٹوک نہ کی تھی وہ اپنی من مانی کر رہا تھا۔ میں تو بس اس بات کی منتظر تھی کہ کب اس کی ہمت جواب دے اور میں اپنا کام شروع کروں۔ اس کے ہوس کی آگ جیسے ہی ٹھنڈی ہوئی میرے بڑھے دانت اس کی شہ رگ میں گھس چکے تھے۔ دوسرے ہی لمحے ایک مدھم سی چیخ اس کے حلق سے نکلی۔ چیخ اتنی بھی مدھم نہ تھی کیونکہ باہر کھڑے نوجوان نے اس چیخ کو سن لیا تھا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا لیکن مجھے اس کی طرف سے کوئی چنتا نہ تھی۔ اس کو ابدی نیند سلا کر میں دروازے کے ساتھ ہولی۔
''دروازہ کھولو افضل خان کیا ہوا۔ کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔ جلدی کرو دروازہ کھولا۔۔۔'' وہ چیخ چلا رہا تھا اور دروازے کو اندر دھکیل رہا تھا۔
میں جانتی تھی کہ اگر اس کی آواز کسی کی قوت سماعت سے ٹکرا گئی تو میرے لیے قیامت برپا ہوجائے گی لہٰذا میں اسی طرح برہنہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کے پاس آن ایستادہ ہوئی تھی۔ میرے چہرے پر خون کی بوندیں جم سی گئی تھیں۔ میں نے دروازے کی کنڈی کھولی تو نوجوان سرعت سے اندر داخل ہوا وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا میں نے پیچھے سے اس پر حملہ بول دیا لیکن دیر ہوچکی تھی۔ کیونکہ اتفاق سے وہ تھوڑا آگے ہوگیا اور میں زمین پر جا گری۔ اس نے جب اپنے ساتھی کا انجام دیکھا تو غصے سے پیچ و تاب کھا کر میری طرف دیکھا اور پسٹل مجھ پر تان لیا۔
''تو تو ہے سالی ان سب وارداتوں کے پیچھے کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ معصوم اور خوبصورت چہروں کے پیچھے بدصورتی اور درندگی چھپی ہوتی ہے دیکھ اب میں تجھے ایسی موت ماروں گا کہ تیری روح تک کانپ اٹھے گی۔۔۔'' اس نے میری طرف نفرت بھری آنکھوں سے دیکھ کر کہا
''نہیں نہیں مجھے مت مارو میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ کبھی بھی ایسا کوئی کام نہیں کروں گی پلیز مجھے معاف کردو۔۔۔'' میں نے زمین سے اٹھتے ہوئے رحم طلب نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا لیکن آن کی آن میں اس کا پسٹل میرے سینے کو چھلنی کرچکا تھا۔
مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے گرم دہکتی لوہے کی سلاخیں میرے جسم میں گھسیڑ دی ہوں۔ میرے منہ سے دلدوز چیخیں نکل رہی تھیں۔ چیخوں کی آواز سن کر آس پڑوس والے اور پھر پولیس بھی اکٹھی ہوگئی تھی۔ اس کانسٹیبل نے ان کو ساری بات بتائی اور یوں

میرا قصہ تمام ہوگیا۔لیکن اس دن سے لے کر آج تک جہنم کی آگ میں جھلس رہی ہوں بس تم سے ایک فریاد کرتی ہوں کہ ایک بار میرے قبر پر آ کر قرآن خوانی کروا دو مجھ پر سے عذاب الٰہی ختم ہو جائے گا اس تمام میں کہیں بھی تم دیکھو تو میرا کوئی قصور نہیں ہے مجھے تو سوسائٹی سے جو تعلیم ملی یہ اسی کا کیا دھرا تھا اور جس راہ پر میں چل نکلی تھی یہ سب پتہ نہیں کیسے ہوگیا تھا آج تک نہیں جانتی بس تم سے فریاد کرتی ہوں میری مدد کرنا میں تمہاری منتظر رہوں گی اب تم بھی چلے جاؤ میرے بھی جانے کا وقت ہو جاتا ہے اور تمہارے جانے کا بھی لیکن جا کر بھول نہ جانا۔''

اتنا کہہ کر وہ مہ جبیں وہاں سے اٹھ کر قبر میں لیٹ گئی۔دور پڑے تختے خود بخود اٹھ کر اس کی قبر پر اپنی مطلوبہ جگہ آ کر ٹک گئے تھے اور مٹی بھی سرک کر اپنی اصلی جگہ اکٹھی ہوگئی تھی۔تبھی پیر صاحب کی بازگشت نے قوت سماعت پر دستک دی۔''آ جاؤ بیٹا تمہارا وقت پورا ہو چکا ہے میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

میرے اندر سے موت کا خوف ماند پڑ چکا تھا۔ میں بس حیرت کے سمندر میں غوطہ زن اس مہ جبیں کی کہانی پر غور کر رہا تھا۔اس کے الفاظ میرے دل و دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔نہ جانے کیوں میری آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو گرے اور زمین میں دفن ہوگئے۔پھر تو دیکھتے ہی دیکھتے ان گنت آنسو گرتے گئے اور زمین میں دفن ہوتے چلے گئے۔

☆......☆......☆

''تم نے اس حویلی پر سے حصار کو ختم کر کے بہت بڑا دھوکہ کھایا ہے رام داس تم نے از خود موت کو دعوت دی ہے۔شاید تم مجھے بھول چکے تھے لیکن میں نے تمہیں ہر پل یاد رکھا کیونکہ تمہیں مجھے موت کے گھاٹ اتارنا لازمی امر تھا۔آج میں تمہیں ایسی موت ماروں گا رام داس کہ دوبارہ سنسار میں کوئی کسی کے ساتھ ایسی کمینگی کرنے کی سکت نہیں کر پائے گا۔۔۔۔۔'' رام داس کے حصار ختم کرنے کی دیر تھی کہ کمرے میں ایک لخت چندر مہیش حاضر ہوگیا۔

چندر مہیش کو یک لخت کمرے میں پا کر رام داس کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔وہ حقیقت میں اسے بھول چکا تھا۔اسے کیا معلوم تھا کہ چندر مہیش کے دل میں بھڑکتے انتقام کی چنگاری ایک دن ان دونوں کو مد مقابل لا ٹھہرائے گی۔ وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن چندر مہیش کو تکنے لگا تھا۔پھر اس نے ایک کھا جانے والی نگاہ بھگوان داس پر ڈالی۔

''تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے بھگوان داس حالانکہ میں نے تمہیں تمہارے خواب کی تعبیر کے بالکل پاس لا کر کھڑا کر دیا تھا۔۔۔۔۔'' اس نے چندر مہیش کی بات کا جواب دینے کی بجائے بھگوان داس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

''نہیں رام داس نہیں۔تم چشم زدن میں مجھے دھوکہ دے رہے تھے وہ تو بروقت چندر مہیش سے میری ملاقات ہوگئی اور اس نے تمہارا اصلی روپ میرے سامنے عیاں کر دیا۔۔۔۔'' بھگوان داس نے اس کی بات سن کر فوراً جواب دیا جسے سن کر رام داس چونکا نہیں بلکہ اس نے اپنے منتشر ہوتے جذبات کو قابو میں رکھا۔

''نہیں بھگوان داس دھوکہ تمہیں میں نہیں بلکہ اس شخص نے دیا ہے۔مجھ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اس نے تمہیں اپنا آلۂ کار بنایا ہے مجھے افسوس ہے تم پر بھگوان داس کہ تم نے مجھے چشم زدن میں دھوکہ دے ڈالا۔'' رام داس نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا لیکن وہ پھر بھی نشانے پر جا لگا۔

اس کی بات سن کر بھگوان داس سوچوں کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ چندر مہیش اسے استعمال بھی کر سکتا ہے۔اگر رام داس نے اسے بعد میں ختم کرنا ہی ہوتا تو وہ اسے اس کی خواہش کے مطابق سب کچھ کیوں دیتا۔وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی کو بھی استعمال کر سکتا تھا۔یہی سب کچھ وہ کسی اور کو بھی دے سکتا تھا لیکن اس نے اس کا ہی انتخاب کیا تھا۔جبکہ واقعی چندر مہیش نے اسے دھوکہ

دیا تھا۔ دوسری طرف چندر مہیش نے بھگوان داس کا دماغ پڑھ لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حالات کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر فی الفور رام داس کا خاتمہ نہ کیا تو وہ ایک بار پھر سے اسے دھوکہ دے سکتا تھا۔

''تم اس کی باتوں میں مت آؤ بھگوان داس یہ ایک جھوٹا انسان ہے۔ تمہیں ایک بار پھر سے اپنے مکروفریب میں پھنسانے کے لیے پر تول رہا ہے اور اگر تم اس کی باتوں میں آگئے تو یہ اب کی بار تمہیں بھینٹ چڑھائے بنا سانس نہیں لے گا۔۔۔۔'' چندر مہیش نے بھگوان داس کا دماغ پڑھنے کے بعد کہا

''نہیں چندر مہیش۔ دھوکہ مجھے رام داس نے نہیں بلکہ تم نے دیا ہے اور اب تم یہاں تک تو آگئے ہو لیکن یہاں سے تمہارا بچ کر جانا ناممکنات میں سے ہے میں تمہارے ساتھ ہوں میں نے جو کچھ کیا اس کے لیے معذرت خواہ ہوں اب بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے میں تمہاری خاطر اپنی جان تک دینے کے لیے تیار ہوں۔۔۔۔۔''

بھگوان داس کی بات سن کر دونوں کا ماتھا ٹھنکا۔ چندر مہیش نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں بھگوان داس تم اس کا ساتھ نہیں دو گے اگر تم نے اس کا ساتھ دیا تو میں تمہاری شکتیاں ختم کردوں گا اور پھر تم ایک عام انسان رہ جاؤ گے اس لیے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔۔۔۔'' چندر مہیش نے غصے سے پیچ و تاب کھا کر بھگوان داس کو دیکھتے ہوئے کہا

''اس کی باتوں کی طرف دھیان مت دو بھگوان داس یہ یہاں آ ہی گیا ہے تو اب اس کو ابدی نیند سلانا ہی پڑے گا۔۔۔۔۔'' رام داس نے جواباً غصے سے بھڑکتے ہوئے کہا لیکن اس سے قبل کہ بھگوان داس اور رام داس کوئی قدم اٹھاتے چندر مہیش نے اپنا کام کر دکھایا اور بھگوان داس کی شکتیاں اپنے قابو میں لے لیں۔

بھگوان داس نے ان کے درمیان سے غائب ہونے کی اور شکل تبدیل کرنے کی لاکھ سعی کی مگر بے سود وہ اپنی اس سعی میں سپھل نہ ہو پایا۔ رام داس یہ سب دیکھ کر تھوڑا تذبذب کا شکار ہوا۔ بھگوان داس نے ترحم آمیز نگاہوں سے رام داس کو دیکھا لیکن اب وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جبکہ دوسری طرف چندر مہیش کے قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔ عین اسی لمحے رام داس منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور قہقہے لگاتے چندر مہیش کی طرف زور سے اپنے ہاتھ جھاڑے تو چندر مہیش اڑ کر دیوار سے جا ٹکرایا اور ٹکرا کر زمین پر اوندھے منہ گرا۔

چندر مہیش بجلی کی سی سرعت سے اٹھا اور اس نے پینترا بدلتے ہوئے گھوم کر بھگوان داس کے منہ پر لات مارنے کی سعی کی لیکن اس نے بلاک کر کے اس کا وار روکا اور گھوم کر بیک کک اس کے سینے پر رسید کی۔ وہ تھوڑا سا لڑکھڑا کر سنبھلا اور اسٹالنس بنا کر ایستادہ ہوگیا۔ اچانک چندر مہیش نے اسپین کک ماری مگر بھگوان داس نے جھکائی دے کر خود کو بچایا اور اس کے سینے پر سائیڈ کک ماری وہ لڑکھڑا کر گرا۔ چندر مہیش نے اس کے سینے پر پنچ مارنے کی سعی کی مگر اس نے ایک طرف جھکائی لے کر ایک بار پھر خود کو بچایا اور ساتھ ہی فرنٹ کک چندر مہیش کے سینے پر رسید کی تو چندر مہیش لڑکھڑایا۔ اسی لمحے اچھل کر جب بھگوان داس نے سائیڈ کک چندر مہیش کے سینے پر رسید کی تو وہ الٹ کر گرا مگر گرتے ہی پھرتی سے اٹھا اور جمپ لگا کر فرنٹ کک اس کو ماری۔ پھر اچانک ہی چندر مہیش بجلی کی طرح اچھلا اور کمر سالٹ قلابازی کھائی اور اپنے دونوں پیر اس کے سینے پر رسید کیے تو بھگوان داس اڑ کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کے ٹکرانے کی دیر تھی کہ دیوار میں ایک بڑا سا شگاف ہوا اور اینٹوں کے پلندے کے ساتھ بھگوان داس باہر راہداری میں جا گرا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ شگاف پوری طرح بھر گیا۔

دوسری طرف رام داس یہ سب کچھ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ چندر مہیش اس سے زیادہ شکتی شالی نہیں ہے لیکن نجانے کیوں اس کے دل میں اس کے لیے اتنا خوف کیوں بھر گیا تھا۔ وہ چاہتا تو اسے پلک جھپکتے میں نیست و نابود کر سکتا تھا لیکن نجانے کیوں وہ کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ یہی بات اسے پریشان کیے جا رہی تھی۔ وہ بس پیہم ان دونوں کے

http://aanchal.urdutube.info/

درمیان ہونے والی جنگ کو دیکھے جارہا تھا۔ بھگوان داس کے باہر گرتے ساتھ ہی چندر مہیش نے اس شگاف کو بھر دیا تھا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''مجھے معاف کردو چندر مہیش میں جانتا ہوں کہ میں نے جو کچھ بھی کیا وہ ٹھیک نہیں تھا لیکن مجھے اپنے اس کیے پر از حد افسوس ہے۔۔۔۔۔'' رام داس نے رحم طلب آنکھوں سے چندر مہیش کو دیکھتے ہوئے کہا

''تم معافی کے قابل نہیں رہے رام داس نہ ہی اب تم اعتماد کے قابل رہے ہو تمہاری موت لازمی ہے۔۔۔۔'' چندر مہیش نے بھنویں سکیڑتے ہوئے اسے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

قبل اس کے کہ چندر مہیش اس کی طرف قدم بڑھاتا رام داس نے ایک بار پھر اپنے ہاتھوں کو اس کی طرف جھٹکا تو درجنوں ناگ یکدم ظاہر ہوئے اور انہوں نے چندر مہیش کی طرف دوڑ لگائی لیکن شاید چندر مہیش اس حملے کے لیے اب تیار ہو چکا تھا اس نے بھی جواباً اپنے ہاتھوں کو جھٹکا تو سانپوں نے رخ بدلا اور رام داس کی طرف دوڑے۔ اپنے ہی وار کو خالی جاتے دیکھ کر اور پھر ناگوں کو اپنی سمت مڑتے دیکھ کر رام داس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اس نے منہ ہی منہ میں سرعت سے کچھ پڑھ کر ان ناگوں پر پھونک ماری تو ناگ گدھے کے سر سے سینگوں کے جیسے غائب ہو گئے۔

ایک بار پھر رام داس نے پہل کی اور اپنا بایاں پاؤں زور سے زمین پر پٹخا اور اچانک چندر مہیش کو یوں لگا جیسے اس کو کسی نے اٹھا کر دہکتی آگ میں پھینک دیا ہو۔ اس نے دیکھا کہ اس کے چاروں طرف آگ کا ایک حصار بن چکا تھا اور اس آگ کی تپش اس کے من کو جھلسا رہی تھی۔

''اب یہ آگ تمہیں جلا کر بھسم کردے گی چندر مہیش تمہارا انت سنسکار کا میں نے بندوبست کر دیا تھا۔ تمہیں نئی آنے والی زندگی مبارک ہو اب تم بہت سورگباش ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔۔۔۔۔'' رام داس نے چندر مہیش کو آگ کے حصار میں پھنسا دیکھ کر کہا تو اس کی بات سن کر چندر مہیش زیر لب مسکرایا اور دوسرے ہی سے آگ بجھ گئی۔ اب کی بار تو رام داس حقیقت میں مضطرب ہو گیا تھا۔

''نہیں رام داس نہیں اب تمہارا کوئی وار، کوئی حصار میرا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا تم نے جتنے پر پرزے نکالنے تھے نکال لیے جتنی تگ و دو اور ہمت دکھانی تھی دکھالی اب میری باری ہے۔ تم نے سنا تو ہوگا ہی کہ سوسنار کی اور ایک لوہار کی تو آج ویسا ہی ہوگا تم نے اپنی شکتیوں کو آزما لیا لیکن اب میری باری ہے دیکھو میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں۔۔۔۔۔'' اس کے ساتھ ہی چندر مہیش نے اپنا پہلا وار کیا اور دوسرے ہی لمحے رام داس کا پورا شریر آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ رام داس کی چیخیں اور چندر مہیش کے قہقہے فضا میں بلند ہو رہے تھے۔

چندر مہیش قہقہے لگانے میں اس قدر مگن تھا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ رام داس نے پلک جھپکتے میں کس قدر چستی دکھائی اور آکر چندر مہیش سے لپٹ گیا۔ چندر مہیش اس سب کے لیے قطعاً تیار نہ تھا اسی لیے وہ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ نہ کرسکا۔ اپنے بچاؤ کے لیے وہ لاکھ ہاتھ پاؤں مارتا رہا لیکن دوسری طرف رام داس نے بھی اسے بری طرح سے جکڑ کر رکھا ہوا تھا۔ قہقہوں کا سلسلہ تھم چکا تھا اب صرف چیخوں کی بازگشت گونج رہی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی ماند پڑ چکی تھی۔

دوسری طرف بھگوان داس دیوار میں بری طرح سے ٹکرایا تھا اور پھر شگاف ہوا اور اینٹوں کے انبار کے ساتھ وہ غلام گردش میں جا گرا تھا۔ ایک بار تو اسے یوں لگا جیسے اس کے نس نس میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر تو وہ بے سدھ لیٹا رہا کیونکہ اس میں ہمت ہی پیدا نہیں ہو پا رہی تھی کہ وہ اٹھ سکے لیکن جلد ہی اس کی قوت سماعت سے رام داس کی چیخوں اور چندر مہیش کے قہقہوں کی بازگشت ٹکرائی۔ اس کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ پہلی بار وہ کسی کے لیے رو رہا تھا۔ اس نے اپنے محسن کو موت کے شکنجے میں جکڑوا دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب چندر مہیش اس کا بھی خاتمہ کردے گا۔ لیکن اچانک ہی اس کی قوت سماعت سے رام داس کی چیخوں کے

ساتھ ساتھ چندر مہیش کی چیخوں کی بازگشت بھی ٹکرائی۔ اسے کچھ سمجھ نہ آیا کہ اندر ہو کیا ہو رہا ہے۔ اس نے اپنی تمام تر ہمت کو یکجا کیا اور کھڑا ہو گیا۔

پھر تو اس نے دیوانہ وار اس کمرے کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا جس کے اندر موت کا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ آوازیں معدوم پڑ چکی تھیں لیکن وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ پھر اچانک وہ دروازے سے تھوڑا پیچھے ہٹا اور اسپیڈ کے ساتھ دوڑتا ہوا آکر دروازے میں لگا دروازے ایک دم کھلا اور وہ اندر جا گرا۔ اندر جاتے ساتھ ہی اسے کھانسی شروع ہوگئی۔ کمرے میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ اور دھوئیں میں گوشت سڑنے کی بساند شامل تھی۔ اس کے سامنے دو ہڈیوں کے ڈھانچے پڑے تھے جن پر سے گوشت کا نام و نشان ہی ختم ہو گیا تھا۔ وہ بری طرح سے کھانستا ہوا باہر نکلا اور یکے بعد دیگرے کئی ملازموں کو آوازیں لگائیں لیکن ملازم ہوتے تو آتے۔ ملازم تو رام داس کے چیلے تھے جو اس کی موت کے ساتھ ہی ابدی نیند سو چکے تھے۔ اس نے پھر جا کر جلدی سے مین گیٹ کو تالہ اندر سے تالہ لگا دیا۔ پھر مشکل سے دونوں کے آگ میں سڑے ڈھانچوں کو اٹھا کر صحن میں لایا اور ایک بیلچے کی مدد سے زمین کھود کر ان دونوں کو وہیں دفن کر دیا۔

کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں اس نے کھول دی تھیں جس کی وجہ سے جلد ہی سارا دھواں باہر نکل گیا تھا۔ لیکن بساند ابھی تک کمرے میں جاتے ساتھ ہی آتی تھی۔ پھر اس نے خود ہی بمشکل کمرے کی صفائی کی۔ آگ کی وجہ سے کمرے کا فرش بھی تقریباً جھلس گیا تھا۔ کمرے کے در و دیوار پر دھوئیں کی وجہ سے سیاہی آگئی تھی۔ اس نے بازار سے ایک قالین لا کر اس کمرے میں بچھایا اور پھر جلد ہی اس نے اپنی اس حویلی کو سستے داموں فروخت کر دیا اور آج بہت لمبے عرصے بعد اسے پہلی بار اپنوں کی یاد ستائی۔ رام داس کو کھو دینے کا ارمان اس کے دل میں بری طرح سے بیٹھ چکا تھا۔ رام داس کے لیے اس کے دل میں ایک مقام تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اپنوں سے بڑھ کر اسے چاہتا تھا۔

چندر مہیش کی باتوں میں آکر اس نے چشم زدن میں اپنے محسن کو دھوکہ دے کر اپنے ضمیر کو للکارا تھا۔ وہ اب تہی دست ہو چکا تھا۔ اس کے پاس دولت کی فراوانی تھی لیکن ایمان کی لازوال نعمت سے محروم ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ تبھی اس نے ارادہ کیا کہ وہ واپس اپنوں کے بیچ چلا جائے۔ اس کے دونوں بھائی اور باپ نہ ہونے کے برابر مزدوری کماتے ہیں وہ اپنے بزنس کو اپنے باپ اور بھائیوں کے سپرد کر دینا چاہتا تھا۔ اس کا دل دنیا سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ ہر پل رام داس کا الفت بھرا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آجاتا اور احتجاج کرتا کہ میں نے تو تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی تھی پھر پس پشت تم نے مجھے اتنا بڑا دھوکہ کیوں دیا؟

اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ بس وہ ہر پل غم سے چور چور ہو کر رونے لگتا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ ہر پل رام داس کی کمی محسوس کرنے لگا تھا تبھی اس کے ذہن میں ایک نہایت ہی بھیانک منصوبہ بنا۔ اس نے رام داس سے سن رکھا تھا کہ مردوں کو زندہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے تھوڑی تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ بے شک زمین و آسمان ایک ہو جائیں وہ رام داس کو زندہ کر کے رہے گا لیکن اس سے قبل وہ ایک بار اپنوں کے بیچ جانا چاہتا تھا تاکہ کچھ وقت اپنوں کے بیچ بتا سکے۔

☆......☆......☆

''اس دوشیزہ نے تم سے جو کچھ بھی کہا تھا وہ سب کچھ حقیقت پر مبنی ہے لیکن اس کی یہ بات بھی بجا ہے کہ اس سارے میں اس کا بھی قصور نہیں ہے سوسائٹی نے اسے تباہ کر دیا مگر میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا کیونکہ انسان کو اپنے اچھے اور برے کی تمیز تو خود ہی ہونی چاہیے۔۔۔۔۔'' پیر صاحب نے دوشیزہ کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا

''لیکن پیر صاحب اچھے برے کی تمیز تب ہی ہوگی جب کوئی ایسا ماحول میسر ہوگا لیکن اسے تو ماحول ہی

ایسا میسر ہوا تھا جس میں اچھے برے کی تمیز کا کوئی پتہ ہی نہ تھا۔۔۔۔‘‘ میں نے دھیمے سے لہجے میں کہا

’’نہیں میرے بچے یہ بات غلط ہے۔ علم انسان کو اچھائی برائی کا اتہ پتہ بتاتا ہے۔ رہنما کا کام ہوتا ہے صحیح راستے کا تعین کرنا اب رہنمائی کرنے والا جان بوجھ کر ہی اپنے لیے غلط راستے کا انتخاب کرلے تو یہ اس کی غلطی ہے اگر گھر میں اسے ایسا ماحول میسر تھا تو اسکول وکالج اور یونیورسٹی میں تو اس نے تعلیم حاصل کی تھی کیا ایک دن بھی اسے یہ بات کسی نے نہیں بتائی تھی کہ غلط اور صحیح کی پہچان کیسے کی جاتی ہے۔۔۔؟‘‘ پیر صاحب نے میری طرف سوالیہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کی بات میں دم تھا اور اس کا جواب میرے پاس نہ تھا۔

’’بقول اس کے کہ اچانک ہی نجانے اسے کیا ہوا تھا کہ اس نے خون پینا شروع کردیا تھا۔۔۔؟‘‘ میں نے سوالیہ آنکھوں سے پیر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’جب انسان گندگی کی دلدل میں پھنس جاتا ہے تو اسے مزہ آتا ہے اور اپنی تسکین بڑھانے کے لیے وہ اور آگے بڑھتا ہے اور ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ انسان کے خون میں ایک راحت ہے ایک مزہ ہے یہی وجہ ہے کہ یکبارگی اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس پر کسی جن، بھوت یا روح کا قبضہ ہوگیا تھا تو بالکل غلط ہے کیونکہ اس نے از خود اپنی آخرت کو تباہ کردیا تھا۔۔۔۔‘‘ پیر صاحب نے جواب دیا۔

’’اور ستار۔۔۔۔؟ بالآخر میں نے دل کی بات کو لفظوں کی مالا پہنائی۔‘‘

’’کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف دوڑتا ہے اور ایسا ہی کچھ ستار کے ساتھ بھی ہوا۔ اس نے چندر مہیش نامی شیطان کے پجاری کی باتوں میں آکر اپنی حویلی کے گرد لگا رام داس سے اس کا حصار ختم کروادیا پھر چندر مہیش وہاں حاضر ہوا اور دونوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا اور پھر دونوں ہی اپنی شکتیوں کی بھینٹ چڑھ گئے رہ گیا ستار عرف بھگوان داس تو وہ جلد ہی گیدڑ کی طرح یہاں واپس آرہا ہے۔۔۔‘‘ پیر صاحب کی بات سن کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا تھا۔

ایک لمبے عرصے کے بعد میرا دوست مجھ سے ملے گا۔ میرا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا تھا لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میرا دوست اپنی زندگی کا اختتام میرے ہاتھوں سے کروانے آرہا تھا۔ اگر اس بات کا مجھے علم ہوتا تو میں کبھی بھی اسے اپنے علاقے میں نہ آنے دیتا۔ پیر صاحب نے میرے لنگوٹیے یار کی جہاں واپسی کی نوید سنائی تھی وہیں جب اس کی موت کی خبر سنائی تھی تو میرے چودہ طبق روشن ہوگئے تھے۔ میرے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی تھی لیکن میں نے دل ہی دل میں عہد کرلیا تھا کہ میں اپنے دوست کی ہر ممکن مدد کروں گا چاہے اس کے لیے مجھے اپنی جان سے ہی کیوں نہ ہاتھ دھونے پڑ جائیں لیکن دوسری طرف قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

☆......☆......☆

ستار کے لوٹ آنے کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ خبر مجھے سیف اللہ نے دی تھی۔ سیف اللہ اور میں دونوں ہی ستار سے فوراً ملنے چلے گئے۔ لیکن وہاں جاکر یہ طشت از بام ہوا کہ صاحب بہادر ہمیں پہچاننے سے ہی انکاری تھے۔ اور جو دو چار منٹ ہم سے گفت وشنید کی وہ بھی اس طرح جیسے کوئی کسی انجان سے کرتا ہے۔ میں ستار کے اس بدلے ہوئے رویے سے بہت مضطرب تھا اور واپس آکر اپنے کمرے میں بند ہو کے رہ گیا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ستار نے ہم سے ایسا برتاؤ کیا ہی کیوں تھا؟ شاید اس لیے کہ اس کے پاس دو پیسے آگئے تھے۔ اس کی ایک پہچان بن گئی تھی اور میں اب اس سے ہر لحاظ سے کم ہوگیا تھا۔ نجانے کتنے سوال تھے جو یکے بعد دیگرے میرے دل ودماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔ کبھی آنکھیں ابر آلود ہوجاتیں تو کبھی دل گھائل ہونے لگتا۔

دل کررہا تھا کہ فوراً سے بھی پیشتر جاؤں اور جاکر ابھی اس کا گلہ دباڈالوں تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے

بانسری۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
مجھے جس قدر اس سے ملنے کی تمنا تھی اس سے کہیں درجے زیادہ اس سے نفرت ہوگئی تھی۔ میرے دل میں اس کے لیے جتنے بھی احساسات اور تمنائیں تھیں سب مفقود پڑ گئی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ پلک جھپکتے میں اس کی گردن سر سے اڑا ڈالوں۔ وہ انسان جو کبھی میرا یار تھا آج میرے ساتھ ایسے بے رخی سے بات کر رہا تھا جیسے مجھ پر احسان کر رہا ہو۔ میرا دل اس سے اچاٹ ہوگیا تھا۔

اس کی حقیقت سے میں آشنا تھا اور مجھے پتہ تھا کہ جلد یا بدیر وہ اپنی اصلیت پر ضرور اترے گا۔ پہلے جہاں مجھے اس کو بچانے کی خواہش تھی اب وہیں اس درندے کا صفایا کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ پیر صاحب کی بات میرے کانوں میں پگھلے سیسے کی طرح ثبت ہوگئی تھی کہ گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے اور اس کی موت آئی ہے تو خود ہی مرنے آ گیا ہے۔ اور اگر اس کی موت واقعی میرے ہاتھوں سے لکھی ہے تو ایسی موت ماروں گا اسے کہ یاد رکھے گا۔ ساری اکڑ نکال کر رکھ دوں گا اس کی۔

☆......☆......☆

بھگوان داس (ستار) کا دل کسی کام میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ بس اس کے سر پر یہی بھوت سوار تھا کہ وہ کسی طور رام داس کو زندہ کرے اسے نیا جیون دے اور ثابت کردے کہ اس نے نمک حلالی کی ہے۔ وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ جب وہ اپنوں میں آئے گا تو اسے رام داس کی یاد نہیں ستائے گی لیکن یہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی تھی یہاں آکر اور بھی زیادہ اسے وشواس سنگھ کی یاد ستانے لگی تھی۔ وہ حیران و ششدر تھا کہ اس کے ساتھ تو اس کا کوئی خونی رشتہ بھی نہ تھا پھر نہ جانے کیوں وہ اسے اتنا یاد آتا تھا۔

''مر گیا مردود، نہ فاتحہ نہ درود''

لیکن وہ اس کے ذہن سے نکلنے والا نہیں تھا۔ رام داس مر تو گیا تھا لیکن اس کے دل و دماغ کو اپنے کنٹرول میں کر گیا تھا۔ اس کی حالت مرغ بسمل کی سی ہو چلی تھی۔ وہ جلد سے جلد کسی ایسے انسان سے ملنا چاہتا تھا جو اسے کوئی ایسا جاپ بتائے جس کی وجہ سے رام داس کو ایک بار پھر جیون مل سکے اور وہ اس سے معافی مانگ سکے۔

اسی خیال کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر ایک دن وہ اپنے گھر سے کام سے متعلق کہیں جانے کا بتا کر نکلا اور جلد ہی ایک کالے علم والے کے پاس جا پہنچا۔ وہ کالے علم والا کالے علم پر خاص دسترس نہیں رکھتا تھا لیکن اسے یہ پتہ تھا کہ مردوں کو زندہ کیسے کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ یہ عمل بتانے کے لیے بھاری معاوضہ مانگ رہا تھا۔

''دیکھئے آپ کو جتنا کچھ بھی چاہیے ہو میں دینے کے لیے تیار ہوں لیکن مجھے وہ منتر اور اس کا طریقہ ہر حال میں چاہیے۔۔۔۔'' بھگوان داس نے تڑپ کر کہا

''ٹھیک ہے دس لاکھ روپے مجھے دو اور پھر میں تمہیں سب کچھ سمجھا دوں گا۔۔۔۔'' اس نے متواتر اپنی ضد پر قائم رہتے ہوئے کہا

بھگوان داس اس کی شیشوں والی دکان سے باہر نکلا۔ اس کا آفس شہر کے بیچ میں ہی پر ہجوم جگہ پر تھا اور دکان کے شیشوں پر اس نے نہ جانے اپنی شان میں کیا کیا لکھوایا ہوا تھا۔ کہیں محبوب ملانے کا تذکرہ تو کہیں پریشانیوں سے نجات دلانے کا الغرض بہت کچھ لکھوایا ہوا تھا۔ ہندوستان اور بنگال میں ایسے لوگوں کی کثرت پائی جاتی ہے جو کالے علم پر دسترس رکھتے ہیں۔ لیکن اب وہ نام کے جادوگر ہیں حقیقی کالے علم سے وہ بھی آشنا نہیں ہوتے۔ اور نہ ہی ان کے اندر اتنی جسارت ہوتی ہے کہ حقیقی کالے علم پر دسترس حاصل کرسکیں۔

بھگوان داس نے اس کی دکان سے باہر نکل کر ایک ٹیکسی پکڑی اور قریبی بنک جا پہنچا۔ وہاں سے اس نے چیک کیش کروایا اور سیدھا واپس اس کی شاپ میں آ گیا۔ اس وقت اس کی شاپ میں اس کے ملازم کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ ملازم بھی اس کی چیئر پر براجمان خراٹے لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر تو اس نے اس تکلیف کو سہا لیکن جلد ہی اس نے اٹھ کر اسے بازو سے پکڑ کر زور سے ہلایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور محو حیرت سے اسے تکنے لگا۔

''کیا مسئلہ ہے تمہیں اور یہ کیا حرکت ہے۔۔؟''
حواس بحال ہوتے ہی اس نے تقریباً دھاڑتے ہوئے کہا
''اگر سونا ہی ہے تو گھر جا کر سویا کرو دفتر سونے
کے لیے کام کے لیے بنائے جاتے ہیں۔۔۔۔'' اس
نے بھی جواباً غصے سے پیچ وتاب کھاتے ہوئے کہا تو اس
کی بات سن کر ملازم نے چپ سادھ لی۔

پھر وہاں سے اٹھ کر پچھلے کمرے میں چلا گیا اس
کے جانے کی دیر تھی کہ اس کا مالک فوراً آ گیا اور بھگوان
داس کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ شاید اسے اس بات
کی توقع نہ تھی کہ ایک منتر کی خاطر بھگوان داس اسے دس
لاکھ کی رقم دے ڈالے گا۔ وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ
زن آ کر اپنی نشست پر براجمان ہو گیا۔ وہ منہ سے
تو کچھ نہ بولا لیکن اس کی حیرت بھری نگاہیں بھگوان داس
پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ بھگوان داس نے ایک اچٹتی نگاہ
اس پر ڈالی اور کوٹ کی جیب سے پیسوں کی گڈیاں نکال
کر اس کے سامنے پھینکیں۔

''یہ لو تمہاری شرط کے مطابق پورے پیسے ہیں
گنتی کر لو۔۔۔۔'' بھگوان داس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم ایک چھوٹے سے کام
کے عوض اتنی رقم دینے کے لیے کیسے تیار ہو گئے حالانکہ
میں نے تو تم سے جان چھڑوانے کے لیے یہ بات کی تھی
اور مجھے امید نہیں تھی کہ تم واپس آؤ گے۔۔۔۔'' اس نے
جلدی سے ساری رقم دونوں ہاتھوں سے سمیٹتے ہوئے
کہا اور رقم کو اپنی دراز میں مقید کر کے ایک نظر ادھر ادھر
ڈالی کہ کہیں کوئی تیسرا انسان تو انہیں نہیں دیکھ رہا۔

''تمہارے لیے یہ کام کوئی اہمیت نہیں
رکھتا ہو گا لیکن میرے لیے یہ بات بہت اہمیت کی حامل
ہے۔۔۔۔'' بھگوان داس نے اسے غصے سے پیچ
وتاب کھاتے ہوئے کہا۔

''تم آخر کس کے لیے یہ جاپ کرنا چاہتے
ہو۔۔۔؟'' بالآخر اس نے یہ سوال پوچھ ہی لیا۔

''تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے
تمہاری شرط کے مطابق رقم تمہیں مل چکی ہے۔۔۔۔''
بھگوان داس نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میں تمہیں سمجھائے دیتا ہوں۔۔''
اس نے تقریباً بڑبڑاتے ہوئے کہا لیکن اس کی آواز
بھگوان داس کی قوت سماعت کو چھو چکی تھی۔

پھر اس نے کتابوں کے پلندے میں سے ایک
کتاب نکالی اور اس کے ورقے الٹنے لگا۔ تبھی ایک جگہ
جا کر اس کی نگاہ ٹھہر گئی اور پھر اس نے ٹیبل پر ایک
سائیڈ پر پڑے پیڈ میں سے ایک کاغذ پھاڑا اور دراز میں
سے پنسل نکال کر اس پر کاغذ پر لکھنا شروع کر دیا۔ پھر وہ
کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔

''اس کے اوپر میں نے منتر لکھ دیا ہے۔ یہ
منتر تمہیں کسی ایسے قبرستان میں پڑھنا ہو گا جو صدیوں
پرانا ہو اور پرانی سے پرانی قبر کے پاس کرنا ہو گا۔ لیکن
اس منتر سے قبل تمہیں گیارہ لوگوں کو شیطان دیوتا کے نام
پر بھینٹ چڑھانا ہو گا۔ تمہیں کرنا یہ ہو گا کہ اس
قبر کو کھود کر اس میں رکھے تابوت کا ڈھکنا کھولنا۔ پھر ایک
ایک کر کے گیارہ لوگوں کا خون اس قبر میں گرانا اور
پھر ان گیارہ لوگوں کو اس قبر میں ڈال دینا۔ قبر کے اندر
رکھے تابوت میں لیٹا مردہ فوراً ہی ان کا خون چاٹ
جائے گا اور پھر جب ان کو بھی اس کے تابوت میں
پھینکو گے تو صدیوں سے بھوکا مردہ ان کو بھی چٹ
کر جائے گا اور پھر تمہیں یہ منتر حصار کھینچے بغیر ایک پاؤں
پر کھڑے ہو کر صرف سات بار پڑھنا ہے۔ اس کے بعد
تم جس کے لیے بھی یہ عمل کر رہے ہو اس کی
آتما فوراً تمہارے سامنے حاضر ہو جائے گی۔

لیکن ایک احتیاط رکھنا کسی مسلمان کی قبر پر بھول
کر بھی یہ عمل نہ پڑھنا ورنہ تمہارا حصار بھی تمہیں ایک
بھیانک موت سے نہ بچا پائے گا بلکہ تمہیں یہ عمل ایک
عیسائی کی قبر پر کھڑے ہو کر پڑھنا ہے۔۔۔۔'' اس نے
پورا طریقہ اسے بتا دیا تھا۔ اسے سن کر بھگوان داس دل
ہی دل میں خوشی سے باغ باغ ہو گیا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ
تھا کہ بھینٹ چڑھانے کے لیے گیارہ لوگوں کا انتظام
کہاں سے کرے تبھی اس کے شیطانی ذہن میں ایک

ایسا خیال آیا جسے سوچ کر پہلے تو وہ ڈگمگایا لیکن پھر اس نے سوچ لیا کہ وہ اپنی مقصد میں سپھل ہونے کے لیے کسی کو بھی قربانی کا بکرا بنانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ اس نے سوچا یہ تھا کہ اپنے ہی گھر والوں کو وہ شیطان کی بھینٹ چڑھا دے گا۔ کیونکہ اس کی گنتی کے مطابق وہ پورے گیارہ تھے۔ وہ انسان نہیں بلکہ شیطان ہی بن چکا تھا۔ حقیقی رشتوں کو عارضی رشتوں کے عوض بھینٹ چڑھانے جارہا تھا۔ اس کے اندر سے انسانیت حقیقت میں ختم ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

میں اس وقت اپنی کلاس میں براجمان بچوں کو تعلیم دے رہا تھا جب پیر صاحب کا مرید خاص میرے لیے پیغام لے کر آیا۔ اس نے آتے ساتھ ہی فوراً مجھے پیر صاحب کے حضور حاضر ہونے کے لیے کہا۔ وجہ تو اس نے میرے بارہا پوچھنے کے باوجود کوئی نہ بتائی تھی۔ کلاس کو میں دوسرے استاد کے سپرد کرکے فوراً ہی اس کے ساتھ ہولیا۔ پیر صاحب شدت سے ہمارے منتظر تھے۔ مجھے دیکھتے ساتھ ہی میرا ہاتھ پکڑ کر تقریباً کھینچتے ہوئے اندر لے گئے۔ میں حیران و ششدر پیر صاحب کی طرف دیکھے جارہا تھا جبکہ وہ مجھے داہنے ہاتھ سے کھینچتے ہوئے پیہم لیے جارہے تھے۔ اپنے کمرۂ خاص میں پہنچتے ساتھ ہی انہوں نے میرا ہاتھ چھوڑا تو سانس میں سانس آئی۔

''میں نے تمہیں کیا کہا تھا کہ اسے آتے ساتھ ہی جہنم رسید کر دینا لیکن تم کون ہوتے ہو حکم عدولی کرنے والے آخر تم اپنے آپ کو سمجھنے کیا لگے ہو۔۔۔۔؟''

پیر صاحب غصے سے دھاڑتے ہوئے بولے۔ مجھے اپنی رگوں میں لہو منجمد ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ میرے پورے جسم میں تھرتھراہٹ پیدا ہو چکی تھی۔ خوف سے جسم کپکپا رہا تھا۔ آج سے قبل میں نے پیر صاحب کو کبھی اتنے غصے میں نہ دیکھا۔

''تمہاری اس حکم عدولی کا جانتے ہوئے کیا انجام ہوا ہے۔ آج وہ اپنے پورے خاندان کو شیطان کی بھینٹ دینے جارہا ہے۔ اور رام داس کو نیا جیون دینے لگا ہے۔ تم جانتے نہیں ہو کہ اگر رام داس کو نیا جیون مل گیا تو پہلے وہ اپنے لیے شریر مانگے گا۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ رام داس کسی اور کا نہیں بلکہ بھگوان داس کے شریر کا ہی انتخاب کرے گا اور پھر اس کے بعد وہ خون کی ہولی کھیلے گا۔ اسے کوئی بھی روک نہیں سکے گا نہ تم نہ میں۔''

پیر صاحب کی بات سن کر میں انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔ کیا کوئی انسان اتنا بھی گر سکتا ہے۔ یہ سب کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک انسان اپنے ہی پیاروں کو اپنے ہاتھوں سے بھینٹ چڑھا ڈالے۔ لیکن شیطان کے پجاریوں کے اندر دل ہوتا ہی کب ہے۔ شیطان تو پہلی ساعت میں ہی ان کا دل نکال کر چبا جاتا ہے۔ ان کے اندر سے احساس اور درد کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر انہیں اپنے ہی جیسا سفاک اور ظالم درندہ بنا دیتا ہے۔

''میں اپنی اس غلطی کے لیے بہت شرمندہ ہوں پیر صاحب لیکن میں اسے ایسے کیسے قتل کر سکتا تھا میرے پاس کسی کو دکھانے کے لیے کیا تھا کہ یہ انسان شیطان کا پجاری اور دنیا کے لیے ناسور ہے۔۔۔۔'' میں نے اپنی پریشانی سے پیر صاحب کو آگاہ کرتے ہوئے کہا

''لیکن اب کی بار تمہیں اسے ہر حال میں جہنم واصل کرنا ہے اور اگر تم اس کام میں کامیاب نہ ہوئے تو تم دوبارہ کبھی یہاں میرے پاس مت آنا۔۔۔۔''

پیر صاحب نے متواتر غصے سے میری طرف شعلہ اگلتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر پیر صاحب ایک پرانے صندوق میں سے کچھ ڈھونڈنے لگے جلد ہی انہوں نے میان میں ڈالی ایک تلوار اس صندوق میں سے اٹھائی اور پھر اسے میان سے باہر نکالا۔ یہ دو رخی تلوار تھی۔

''یہ تلوار جس کے پاس ہو کالی شکتیاں اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی تم نے اس تلوار سے اس شیطان کو ابدی نیند سلانا ہے۔ اور اب کی بار تمہارے پاس ایک نادر موقع ہے لیکن تم نے اسے ابدی نیند اس وقت سلانا ہے جب وہ قبر کھود کر اس میں رکھے تابوت کا

ڈھکنا کھول دے۔ اسی وقت اسے ابدی نیند سلا تا دینا۔ تا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اگر وہ بچ نکلا تو پھر تم اس کو قابو نہیں کر پاؤ گے وہ تمہاری دسترس سے باہر ہو جائے گا۔ وہ بہت چالاک ہے اور اپنی چالاکی سے تمہیں ابدی نیند سلانے میں کامیاب بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہر ممکن کوشش کرنا کہ جو بھی کرو بچ کر کرنا۔۔۔'' پیر صاحب نے ناصحانہ لیکن متواتر سخت لہجے میں کہا تھا۔

وہ بہت برہم دکھائی دے رہے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے اس سے قبل انہیں ایسے غصے میں نہ دیکھا تھا۔ میں اپنے دوست کو ابدی نیند سلا سکتا تھا لیکن پیر صاحب کو برہم نہیں کر سکتا تھا ویسے بھی اب اس دوست سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہ رہا تھا۔ اس لیے میں نے ایک بار پھر مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اب کی بار تو اس کو جہنم واصل کیے بنا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ پیر صاحب سے تلوار میں نے تھام لی تھی۔

☆......☆......☆

ناہموار پگڈنڈیوں پر گاڑی تیزی سے چلتی جا رہی تھی اور اپنے پیچھے دھول مٹی چھوڑتی جا رہی تھی۔ گاڑی ڈرائیو کرنے والا بھگوان داس تھا اور اس نے اپنی ساری فیملی کو باندھ کر گاڑی میں ڈالا ہوا تھا۔ تیز رفتار گاڑی کی وجہ سے سب کا برا حال ہو چکا تھا۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بھگوان داس ان کے ساتھ کرنے کیا جا رہا تھا۔ وہ تو اس اچانک افتاد کے لیے قطعاً تیار نہ تھے۔ انہوں نے تو کبھی اس کا یہ روپ نہ دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی سوچا تھا کہ اس کا کوئی اتنا بھیانک روپ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ تو اس کی جدائی میں پل پل تڑپ رہے تھے اور اس کی اچانک کامیابی پر انگشت بدنداں بھی تھے لیکن جو کچھ اب وہ کر رہا تھا اس کے بارے میں تو انہوں نے تصور میں بھی نہ سوچا تھا۔

جس وقت اس نے سب کو باندھا تھا اس وقت سب خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے اور اسی چیز کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے سب کو رسیوں میں جکڑ کچھ کو گاڑی کی ڈگی میں اور کچھ کو پچھلی سیٹ پر یوں لا کے پھینکا تھا جیسے انسان گھر کا کوڑا کرکٹ گھر سے باہر اٹھا کر پھینکتا ہے۔ سب کی بری حالت ہو چکی تھی۔ بالآخر گاڑی رک گئی۔ اور اس نے اسی حالت میں سب کو گاڑی سے باہر نکال کر کچرے کی طرح پھینکا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا ایک بار تو سب کو دیکھنے میں دشواری ہوئی لیکن جلد ہی سب کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔

''میں نے تو تم سب سے اسی دن رشتہ ختم کر دیا تھا جب میں گھر سے گیا تھا۔ میرا ایک محسن تھا جس نے میری دلی خواہش کو عملی جامہ پہنایا تھا اور یہ جو ٹھاٹ باٹ تم لوگ دیکھ رہے ہو ناں، یہ سب اسی کی وجہ سے ہی تو ہے۔ اس نے مجھے مالا مال کر دیا تھا اور پھر میری ایک پہچان بن گئی تھی لیکن صد افسوس! کہ میری بے وقوفی کے عوض اسے موت سے ہمکنار ہونا پڑا تھا لیکن آج میں اپنے اس محسن کو ایک نیا جنم دوں گا اس کے لیے مجھے گیارہ لوگوں کو بلی چڑھانا لازمی ہے۔ پھر جب شکار گھر سے ہی میسر ہو تو باہر بھاگ دوڑ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب میں تم سب کو یکے بعد دیگرے بلی چڑھاؤں گا اس کے بعد میرا محسن ایک نیا جنم لے گا۔۔۔'' بھگوان داس نے گاڑی میں سے ایک بیلچہ نکالتے ہوئے وضاحت کی جو اس نے وہاں سے چلتے وقت اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ پھر اس نے ایک قبر کے پاس جا کر اس کی کھدائی شروع کر دی۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے قبر کی مٹی ایک طرف ہٹا ڈالی۔ اب اس کی نظروں کے سامنے ایک تابوت تھا۔ اس نے ایک نگاہ اپنے خونی رشتے داروں کی طرف دیکھا اور پھر ایک بھرپور نگاہ تابوت پر ڈالی دوسرے ہی سمے اس نے جھک کر تابوت کا ڈھکنا کھول دیا۔ تابوت کا ڈھکنا کھلنے کی دیر تھی کہ بدبو کے ایک تیز جھونکے نے اس کا خیر مقدم کیا اور وہ فوراً ہی کھانستا ہوا پیچھے ہٹا۔ اس کو ایک بار تو لگا جیسے پلک جھپکتے میں اس کی سانس اکھڑنا شروع ہو جائیں گی۔ جب اس کی حالت کچھ سنبھلی تو وہ سیدھا کھڑا ہو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اگلا منظر دیکھ کر اس کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ اس کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ پلک جھپکتے میں یہ سب کچھ ہو کیا گیا تھا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام

تر صلاحیتیں مفقود پڑ گئی تھیں۔ وہ اپنے سامنے آن وارد ہونے والی آفت ناگہانی کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔

☆......☆......☆

پیر صاحب نے مجھے اپنے علم کے ذریعے قبرستان کے اس حصے میں پہنچادیا تھا جہاں پر تھوڑی دیر بعد بھگوان داس اپنی فیملی کو لے کر آنے والا تھا۔ جہاں پر وہ اپنے خونی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے والا تھا۔ اور مجھے اس کو روکنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اور آج تو میں بھی عہد کر کے آیا تھا کہ یہ خبیث انسان میرے ہاتھوں سے زندہ بچ جانے کی سعی نہیں کر پائے گا۔ اس کی موت اگر حقیقت میں میرے ہی ہاتھوں لکھی ہے تو اسے مرنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا پائے گی۔ تبھی میں نے دیکھا کہ ایک تیز رفتار گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی قبرستان میں داخل ہوئی۔ قبرستان میں گھپ اندھیرا تھا لیکن کافی دیر سے میں براجمان تھا اور گھپ اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی۔ پھر گاڑی کے رکتے ہی میں نے دیکھا کہ اس میں سے بھگوان داس نیچے اترا۔

گاڑی کی ہیڈ لائٹس اس نے اس قبر کی طرف کیں جس کو اس نے کھودنا تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی نے قبرستان میں دن کا سا اجالا پیدا کر دیا تھا۔ پھر میں نے مزید دیکھا کہ بھگوان داس نے یکے بعد دیگرے اپنے فیملی ممبران کو گاڑی میں سے ایسے نکال کر پھینکا گویا وہ انسان نہ ہوں کوئی فالتو چیز ہوں۔ پھر بھگوان داس کے ہاتھوں میں ایک بیلچہ دکھائی دیا اور اس نے آتے ساتھ ہی سرعت سے قبر کی مٹی ہٹا کر قبر میں رکھے تابوت کا ڈھکنا کھول دیا۔ تابوت کھلتے ہی بدبو کے جھونکوں نے اسے بے حال کر دیا اور وہی وقت تھا جو میرے لیے کسی غنیمت سے کم نہ تھا۔ میں بھی پلک جھپکتے میں اس کے سر ہو لیا۔ اس وقت جب اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو وہ سیدھا کھڑا ہوا اور مجھے اپنے سامنے ننگی تلوار لیے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''تمہارا خونی کھیل ختم ہو گیا بھگوان داس۔ تم نے آج تک جو کچھ بھی کیا اس کے عوض آج تمہیں بھی اپنے محسن رام داس کے پاس جانا ہی ہوگا۔۔۔۔'' اسے حیرت میں سمندر میں غوطہ زن دیکھ کر میں نے کہا۔

''بھگوان داس اتنی جلدی کسی سے مات کھانے والا نہیں ہے۔ اس خام خیالی کو اپنے ذہن سے کرید کر نکال پھینکو اور یہاں سے چلتے بنو ورنہ ان میں سے (اپنی فیملی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لیکن رخ میری طرف ہی رکھ کر) ایک کی جان بخشی ہو جائے گی اور اس کی جگہ قربانی کا بکرا تم بن جاؤ گے۔۔۔۔'' بھگوان داس نے جلد ہی اپنے منتشر ہوتے حواس پر قابو پایا اور گویا ہوا۔

''تم بھی اس خام خیالی کو دماغ سے نکال پھینکو بھگوان داس کیونکہ مرنے والے دوبارہ دنیا میں لوٹا نہیں کرتے اور خاص کر رام داس۔ تو وہ اس وقت جہنم میں اپنے کرموں کی سزا پا رہا ہوگا۔۔۔۔'' میں نے شمشیر ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔

''بکواس بند کرو اور دفع دور ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔'' بھگوان داس تقریباً چلاتے ہوئے بولا اور دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی دائیں ٹانگ گھمائی اور میرے پیٹ میں دے ماری۔

میں اس اچانک حملے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا نہ ہی مجھے امید تھی کہ بھگوان داس کوئی ایسی چال چلے گا۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ میں آسانی اسے تابوت میں کاٹ پھینکوں گا لیکن یہ میری خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔ بھگوان داس کی ٹانگ کیا پڑی کہ میں تقریباً ہوا میں اڑتا ہوا دور جا گرا۔ تلوار میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر ایک طرف جا گری تھی۔ بھگوان داس نے تلوار چھوٹ کر ایک طرف گرتے دیکھ کر ہلا بول دیا۔ اس میں بہت طاقت آ گئی تھی۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ پہلے اس میں اتنی طاقت اور چستی بالکل نہ تھی۔ بھگوان داس نے آتے ساتھ ہی مجھ پر گھونسوں اور لاتوں کی برسات کر دی۔ میں درد سے کراہ اٹھا تھا۔

"اب پہلے تجھے ہی بھینٹ چڑھاؤں گا آیا بڑا مجھے روکنے والا۔۔۔۔۔" بھگوان داس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا۔

مجھے اپنی موت حقیقت میں دکھائی دے رہی تھی۔ میں اسے موت کے گھاٹ اتارنے آیا تھا اور خود مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے تھے۔ تبھی بھگوان داس کے قدم خود بخود رک گئے۔ اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں حیرت سے اسے تکنے لگا تبھی پیر صاحب کی بازگشت نے میری قوت سماعت پر دستک دی۔

"جلدی سے اٹھ کر اپنی تلوار سنبھالو اور اس ناسور کا خاتمہ کردو۔"

آواز سننے کی دیر تھی میں فوراً اٹھا۔ بھگوان داس حیرت سے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ وہ ادھر دیکھ رہا تھا لیکن اس میں جیسے حرکت کرنے کی شکتی ماند پڑ گئی تھی۔ تلوار اٹھاتے ساتھ ہی میں اسے گھسیٹ کر قبر کے لایا۔ وہ حرکت تو نہ کر رہا تھا لیکن نفرت آمیز آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ جیسا بھی تھا آخر میرا دوست تھا۔ اس کی آنکھوں میں موت کا خوف دیکھ کر میری آنکھیں اشکبار ہوگئی تھیں۔ دل موم ہوگیا تھا۔ اور دوسرے ہی لمحے "اللہ اکبر" کا نعرہ لگا کر میں نے اس کی گردن تن سے جدا کردی۔ اس کی گردن سیدھی تابوت میں جا گری اور پھر میں نے اس کے جسم کو بھی تابوت میں پھینک دیا۔

خون اس کی گردن سے فوارے کی طرح نکل رہا تھا۔ میرا جسم اور لباس بھی اس کے خون کی بوندوں سے تر ہوگیا تھا۔ اس کا جسم تابوت میں گر کر تڑپنے لگا تھا۔ پھر جلد ہی ٹھنڈا ہوگیا۔ دوسرے لمحے میں نے تابوت کا ڈھکنا بند کیا اور قبر پر مٹی ڈالنے کی بجائے گاڑی کے پاس رسیوں میں جکڑے اس کے فیملی ممبران کے پاس آ گیا۔ خوف سے سب کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ وہ انگشت بدنداں آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے تلوار کو میان میں ڈال لیا تھا۔ میں نے پھر میان سے تلوار نکال کر اس سے ہی ان کی رسیاں کاٹی تھیں۔

انکل مجھ سے لپٹ کر دھواں دھار رونے لگے تھے۔ پھر میں نے ان کو علیحدہ کیا اور گاڑی میں بیٹھا کر ان کے گھر کی طرف چل دیا۔ پورے راستے میں میری آنکھیں ساون بھادوں بنی رہیں۔ آج میں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے قریبی دوست کا کام تمام کردیا تھا۔ اس کی فیملی اس بات کی شاہد تھی لیکن کوئی بھی میرے خلاف نہ تھا بلکہ سب میرے حق میں تھے۔

"تمہیں یاد ہے کہ نہیں کہ ابھی تمہارا ایک کام باقی ہے۔۔۔؟" پیر صاحب نے میری طرف سوالیہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا

"کونسا کام پیر صاحب۔۔۔۔؟" میں نے سوالیہ آنکھوں سے پیر صاحب کو تکتے ہوئے پوچھا۔

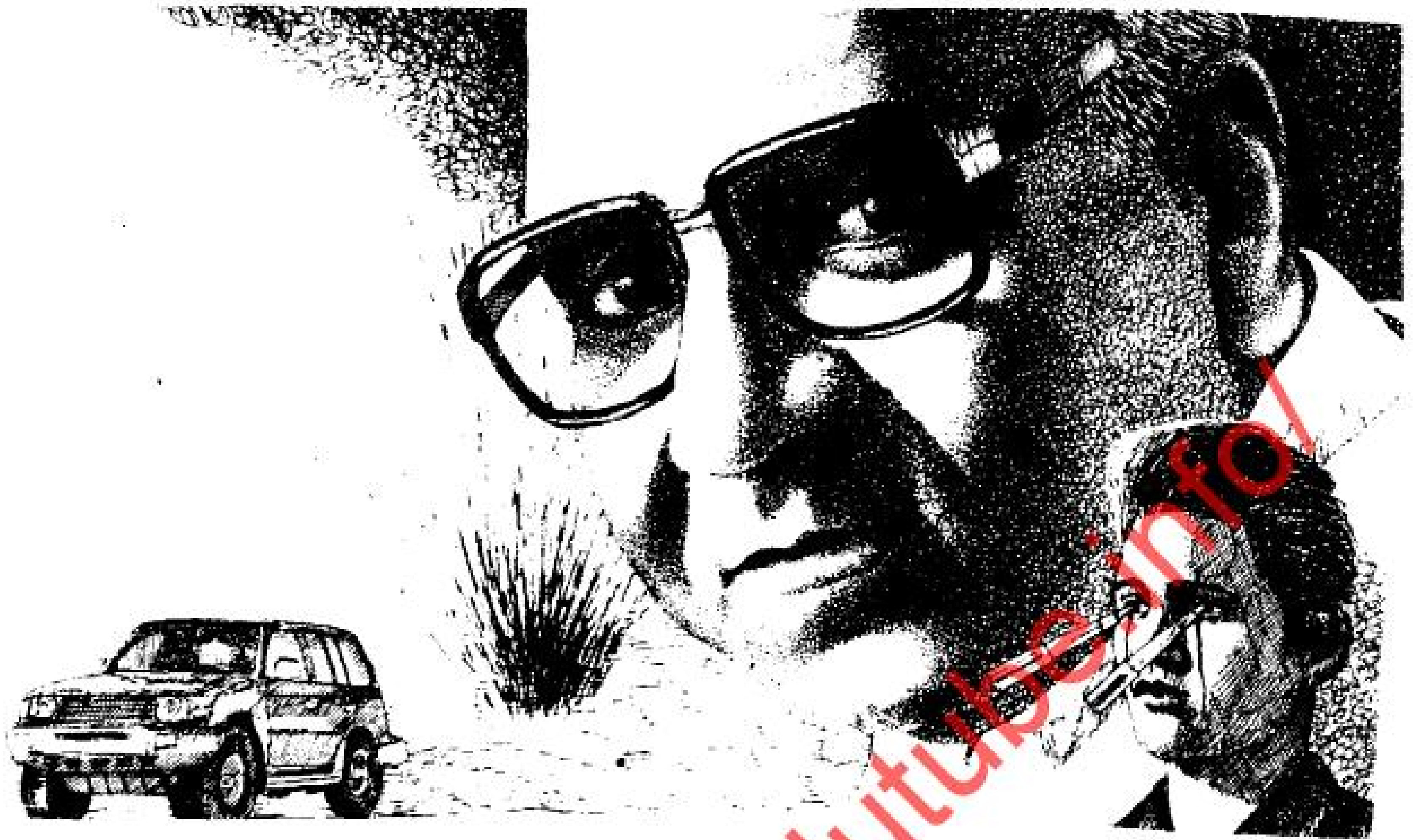
"قبرستان والی اس لڑکی نے تم سے ایک التماس کی تھی اور اب اس وعدے کو تم نے پورا کرنا ہے۔۔" پیر صاحب نے مجھے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں کیوں نہیں، میں ضرور اس وعدے کو پورا کروں گا۔۔۔" میں نے دھیمے سے لہجے میں جواب دیا۔

"کھانا تیار ہے جا کر کھالو۔۔۔" پیر صاحب نے میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا اور میں وہاں سے اٹھ کر تھکے قدموں چلتا ہوا اس کمرے کی طرف چل پڑا۔ جہاں لنگر کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ وہاں مجھے پہلے سے ہی سیف اللہ بیٹھا مل گیا جو مجھے ہی لینے آیا ہوا تھا۔ میرے اچانک بنا بتائے وہاں سے آنے کی خبر اس کو بھی مل گئی تھی۔ اور وہ فوراً ہی میرے پیچھے آ گیا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے کے ساتھ ہی کھڑا ہوگیا۔ شاید اسے پتہ چل چکا تھا کہ میں نے اپنا کام کردکھایا ہے۔ اس نے مجھے اپنے سینے سے لگالیا اور پھر نجانے کتنی دیر تک میں اس کے سینے سے لگا زاروقطار روتا رہا تھا۔

☆......☆......☆





ہوائی مخلوق

شکیل نیازی۔میانوالی

بے شمار پولیس والے چیکنگ پوسٹ پر موجود تھے اور ہر ایک گاڑی کو سخت چیکنگ کے تحت آگے جانے کی اجازت دیتے کہ اچانک ایک ٹیکسی بغیر چیکنگ کے آگے بڑھ گئی اور پولیس والوں کو نظر نہ آئی پھر……

انسانی عقل حیران ہے قدرت کے رازوں کو جاننے سے اسی کے مصداق حقیقت پر مبنی کہانی

''**دیکھیں** لیڈیز اینڈ جینٹلمین بہت سی چیزیں نہ تو ہمیں نظر آتی ہیں اور نہ ہی ہم انہیں چھو سکتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ چیزیں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ مثلاً ہوا۔''

پروفیسر اسمتھ نے یہاں تک کہا اور پھر ایک نظر ہال پر دوڑائی، ہال میں موجود نوجوان جوڑے آپس میں رومانس کرتے نظر آئے اور ادھیڑ عمر حضرات یا تو سو چکے تھے یا پھر بری طرح سے اونگھ رہے تھے۔ وہ ایک گھنٹے سے مسلسل ہوائی مخلوق کا اس دنیا میں ہونے کو ثابت کرنے پر دلائل پر دلائل دیتے جا رہے تھے لیکن اب انہیں اس بات کا اچھی طرح احساس ہو رہا تھا کہ وہ کسی پتھر سے اپنا سر پھوڑ رہے ہیں۔ وہ لوگ ان کی باتوں کو ایک ہارر اسٹوری سے زیادہ کی اہمیت دینے کو تیار نہیں تھے اور پھر وہ ٹھہرے نیویارک کے روشن خیال شہری،

اگر وہ ان باتوں کو اہمیت دینے لگتے تو ان میں اور تیسری دنیا کے لوگوں میں کیا فرق رہ جاتا۔

پروفیسر اسمتھ نے حسرت سے ایک گہری سانس لی اور اپنا چشمہ اتار کے جیب میں ڈالا اور سامنے پڑی فائلوں کو سمیٹ کے بغل میں دبایا اور ہوٹل کے اس ہال میں سے باہر آ گئے۔

''ہیلو پروفیسر کیسے ہو تم اور کیسا رہا آج کا خطاب؟'' ان کے ایک پرانے دوست اور ہوٹل کے مالک نے پوچھا۔

''ہمیشہ کی طرح بور۔'' پروفیسر نے کہا اور ساتھ ہی لائٹر کی مدد سے سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گئے۔

''آخر تم کب تک ہوائی مخلوق کے اس دنیا میں موجود ہونے کے لوگوں کو دلائل دیتے رہو گے۔'' ان کے دوست آئزک نے کہا۔

''جب تک دنیا مان نہیں لیتی تب تک۔'' یہ کہہ کر پروفیسر آگے بڑھ گئے۔

''لیکن دنیا اس پر یقین کرتی ہے جو سامنے ہو۔'' آئزک کی آواز انہیں پیچھے سے سنائی دی لیکن ان کے قدم نہ رکے۔

''ڈرو اس وقت سے جب وہ سب تمہیں نظر آنے لگیں گی۔'' وہ بڑبڑائے اور ہوٹل سے باہر آ گئے۔

رات کے 9 بج چکے تھے اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، پروفیسر نے اپنے اوور کوٹ کا کالر اوپر کرلیا اور سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے ٹیکسی کا انتظار کرنے لگے۔ ایک ٹیکسی رینگتے ہوئے ان کی طرف بڑھی، NYR9901 انہوں نے اس کا نمبر ذہن نشین کرلیا۔ ان کی شروع دن سے عادت رہی تھی کہ جس ٹیکسی میں سفر کرتے تھے اس کا نمبر ضرور ذہن نشین کرلیا کرتے تھے کیوں کہ وہ اکثر اپنی کوئی نہ کوئی فائل یا سامان ٹیکسی میں بھول جایا کرتے تھے اور نمبر یاد ہونے کی وجہ سے وہ اس ٹیکسی کو ڈھونڈ نکالتے تھے۔

ٹیکسی ان کے پاس آ رکی اور وہ اس کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئے، انہوں نے ڈرائیور کو پتہ بتانا چاہا ہی تھا کہ ڈرائیور نے ان کا پتہ انہیں بتا دیا تو وہ حیران رہ گئے۔ ''تمہیں کیسے پتہ چلا میرے گھر کے ایڈریس کا۔'' انہوں نے حیران ہو کے پوچھا۔

''دراصل میں آپ کا بہت بڑا فین ہوں، آپ کا ہر لیکچر میں باقاعدگی سے سنتا ہوں۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے ان کی طرف منہ موڑ کے دیکھتے ہوئے کہا تو انہوں نے دیکھا وہ ایک نوجوان آدمی تھا جس کی عمر تقریباً تیس سال کے قریب رہی ہوگی۔

''کمال ہے میں تو سمجھتا تھا کہ اس شہر میں میری باتوں کو کوئی بھی ایک قصے کہانی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔'' پروفیسر نے کہا۔

ان کی بات ڈرائیور کے کانوں تک پہنچ گئی تھی اس لئے ڈرائیور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''ہاں آپ کسی حد تک ٹھیک ہی کہتے ہیں، لوگ جس چیز کو دیکھ نہ لیں اس پر یقین کرنا ان کے لئے قدر مشکل ہوتا ہے۔'' اس نے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

پروفیسر اسمتھ باہر کی جھلملاتی روشنیاں دیکھنے لگے۔

''ایک بات پوچھوں آپ سے۔'' ڈرائیور نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں نوجوان پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' انہوں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

''میرا آپ سے سوال ہے کہ آپ جن چیزوں کی موجودگی کو دنیا پہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، خود آپ کو ان کی موجودگی کا کتنا یقین ہے؟'' سوال ایسا تھا کہ وہ چونکے بغیر نہ رہ سکے، وہ اس کا چہرہ دیکھنا چاہتے تھے تاکہ یہ علم ہو سکے کہ سوال کتنی سنجیدگی سے کیا گیا ہے۔ لیکن ڈرائیور چونکہ آگے بیٹھا ہوا تھا اس لئے وہ اس کے چہرے کو نہ دیکھ سکے لیکن لہجے نے سوال کی سنجیدگی کو واضح کر دیا تھا۔

''ففٹی ففٹی مجھے ہوائی مخلوق یعنی جن، بھوت، پریوں، چڑیلوں، نیک اور بدروح کی موجودگی کا یقین ہے بھی اور نہیں بھی۔'' پروفیسر نے دھیرے سے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی میں سمجھا نہیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' ڈرائیور نے حیران ہو کر کہا۔

''جب میں روحانی کتب کا مطالعہ کرتا ہوں تو دنیا کا تقریباً ہر مذہب نہ نظر آنے والی مخلوقات کے تذکروں سے بھرا پڑا ہے لیکن اس جدید دور میں جب اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر ڈالتا ہوں تو مایوس ہو جاتا ہوں کیوں کہ سائنس ہر طرح سے اس مخلوق کی موجودگی کی نفی کرتی نظر آتی ہے اور پھر میں نے بھی تو وہ تمام کالے علوم اور روحانی طریقوں سے کسی مخلوق کی موجودگی کو دیکھنا چاہا لیکن ناکام ہوا، ہر طریقہ چاہے وہ نورانی تھا کہ کالا، ہر طرح سے بے کار ثابت ہوا، اس لئے میرا ایمان آہستہ آہستہ خود ان چیزوں سے اٹھتا جا رہا ہے اور مجھے لگتا ہے اپنی 60 سالہ زندگی میں سے میں نے جو دس سال اس ریسرچ پر گزارے ہیں وہ صرف وقت کا نقصان تھا اور کچھ نہیں۔'' پروفیسر نے جی بھر کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور خاموش ہو گئے اب صرف گاڑی کے انجن کی ہلکی ہلکی آواز گونج رہی تھی۔

''ویسے ان دیکھی مخلوق کے بارے میں تمہارا کیا نظریہ ہے، کیا تمہیں ان کے ہونے پر یقین ہے؟'' پروفیسر نے ڈرائیور کے نظریہ کو جاننے کے لئے سوال کیا۔

''میرا اس مخلوق کے وجود پر اتنا یقین ہے جیسے اس وقت گاڑی میں اپنے آپ کو موجود ہونے کا یقین ہے۔'' ڈرائیور نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

''واقعی میں تمہیں اتنا یقین ہے۔'' پروفیسر نے طنزیہ انداز میں مسکرا کے کہا۔

''ہاں شاید اس سے بھی زیادہ یقین ہے۔''

''اچھا... تو پھر کیا تم نے کبھی بھوت دیکھا یا کوئی ایسا جن جس کے سر پر دو عدد سینگ ہوں؟'' پروفیسر کا لہجہ بدستور طنزیہ ہی تھا ان کے سوال پر ڈرائیور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور پروفیسر شیشوں پر گرنے والی بارش کی بوندوں کو دیکھنے لگے۔

''بعض چیزوں کا نہ دیکھنا بھی ہمارے لئے فائدہ مند ثابت ہو جاتا ہے اور بعض اوقات ہم جس چیز کو دیکھنے کے لئے بے قرار ہوتے ہیں وہ چیز سامنے ہوتے بھی نظر نہیں آ رہی ہوتی۔'' ڈرائیور نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے کہ پروفیسر کچھ کہتے آگے پولیس کا چیکنگ پوائنٹ آ گیا تھا۔ پروفیسر نے دیکھا کہ پولیس کی وردی میں ملبوس چیکنگ آفیسر کوئی اور نہیں ان کا ہونہار شاگرد ہیری ہے۔ ''ہیری... ہیری کیسے ہو؟'' انہوں نے ہیری کو آواز دی لیکن ہیری گاڑیوں کے کاغذات دیکھنے میں اتنا مصروف تھا کہ ان کی آواز پر توجہ نہ دے پایا۔

''ہیری...'' انہوں نے کافی زور سے دوبارہ آواز دی لیکن ہیری ٹس سے مس نہ ہوا، گاڑی رک چکی تھی، کیوں کہ پولیس والے آگے کھڑی گاڑی کی تلاشی لے رہے تھے۔ پھر انہوں نے اس گاڑی کو پیچھے ہی چلنے کا اشارہ کیا تو پروفیسر نے دیکھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے بھی گاڑی آگے بڑھا دی۔ ''ارے ارے دیکھو وہ سادی گاڑیوں کی چیکنگ کر رہے ہیں اگر تم نے گاڑی نہ روکی تو وہ تمہیں گرفتار کر لیں گے۔'' پروفیسر نے گھبرا کے کہا اور پیچھے گردن موڑ کے دیکھا لیکن پولیس والوں نے شاید ان کا تعاقب کرنا ضروری نہ سمجھا۔

''تم بہت بڑے بے وقوف انسان ہو تم نے بغیر

ترکیب استعمال

شوہر کا انتخاب کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ وہ عقل میں زیادہ کچا اور عمر میں زیادہ پکا نہ ہو۔ شادی کے بعد اسے دھوپ، تنقید اور تیز آواز سے بچاؤ ورنہ وہ اندر سے ترش ہو جائے گا۔ اسے زیادہ دیر کولڈ اسٹور میں مت رکھو کہیں وہ سخت اور ناقابل ہضم نہ بن جائے۔ اسے صبر کے پانی سے دھو کر الفت کی ہلکی آنچ پر رکھو۔ پھر نمک والی گفتگو لگا کر قسطوں میں استعمال کرو۔ پھر وہ سالہا سال تک خراب نہ ہوگا۔ اس ترکیب استعمال سے ایک شوہر زندگی بھر کے لئے کافی ہے۔

(عارفہ۔نوابشاہ)

تلاشی کے گاڑی آگے کیوں بڑھائی، تمہیں اندازہ ہے کہ تم نے قانون توڑا ہے اس کی سزا کتنی سنگین ہوسکتی ہے۔'' پروفیسر نے ڈرائیور کو جھاڑ پلاتے ہوئے کہا۔

''پہلی بات کہ میں بے وقوف تو ایک طرف، سرے سے انسان ہی نہیں اور دوسری بات قانون انسانوں کے لئے ہوتے ہیں میرے لئے نہیں۔'' ڈرائیور نے اس بار قدرے سنجیدگی سے کہا۔

''واہ..... کیا بے ہودہ مذاق ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم سپر مین قسم کی کوئی چیز ہو اور تم قدم قدم پر دنیا کے قانون کو چیلنج کرسکتے ہو۔'' پروفیسر نے منہ بڑا سا کیا لیکن ڈرائیور نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہا۔

پانچ منٹ بعد ٹیکسی پروفیسر اسمتھ کے گھر کے سامنے آن رکی تو پروفیسر نیچے اترے اور کرایہ دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

''نہیں رہنے دیجئے اس کی کوئی ضرورت نہیں، میں خود بھی، آپ سے ملنا چاہتا تھا سو اسی بہانے ملاقات ہوگئی۔'' ڈرائیور نے مسکرا کے کہا اور گاڑی آگے بڑھادی اور پروفیسر اسے حیرت سے جاتا دیکھتے رہ گئے اور کچھ کہہ بھی نہ پائے۔

دوسری صبح پروفیسر کالج کے لئے روانہ ہوئے تو راستے میں چیکنگ پوائنٹ پر اتر گئے، ان کا دل ہیری کے کان کھینچنے کے لئے ہو رہا تھا کیونکہ ان کے دوبار پکارنے پر بھی ہیری نے توجہ نہیں دی تھی، ویسے بھی پروفیسر جب بھی ملتے تھے ہیری کے کان ضرور کھینچتے تھے۔ ''ہائے ہیری مائے بوائے..... کیسے ہو آج کل؟'' پھر پروفیسر نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہوں سر آپ کیسے ہیں؟''

ہیری نے بھی خوب خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

''نہیں تم ٹھیک نہیں ہو، تمہارے کان سیٹ کرنے پڑیں گے کیونکہ کل میرے دوبار پکارنے پہ بھی تم نے کوئی جواب نہ دیا، پروفیسر نے لاڈ بھرے لہجے میں کہا۔

''کب؟'' ہیری نے حیران ہوکر کہا۔

''کل رات کو اور تو اور تم نے اس ٹیکسی کی تلاشی لینا بھی گوارا نہیں کیا، جس میں میں سوار تھا، تم غالباً اپنی ذمہ داری سے بھی جان چھڑانے لگے ہو۔'' پروفیسر نے اس کے سر پر چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔

''سر یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی گاڑی اس چیکنگ پوائنٹ سے بغیر تلاشی اور شناخت کو آگے بڑھ جائے، آپ کو یاد ہے آپ کس ٹیکسی میں سوار تھے، ہیری نے سنجیدگی سے کہا۔

''غالباً اس کا نمبر NYR9901 تھا، ہاں یاد آ گیا 100 فیصد اس کا نمبر NYR9901 تھا، پروفیسر نے جلدی سے کہا تو ہیری اور اس کے ساتھی پولیس آفیسر انہیں عجیب نظر سے دیکھنے لگے۔

''کیوں خیریت تو ہے، ناں تم گھور کیوں رہے ہو مجھے۔'' پروفیسر نے حیران ہوکر کہا تو ہیری نے اپنے ایک ماتحت کو اشارہ کیا تو وہ سر ہلاتے ہوئے اندر بڑھ گیا اور کچھ دیر بعد واپس آیا۔'' سر میں نے اچھی طرح کیمرے کا ریکارڈ چیک کیا ہے، اس دوران کوئی ٹیکسی نہیں آئی اور یہ رہی فائل۔'' ماتحت نے ایک فائل ہیری کو دیتے ہوئے کہا۔

ہیری نے فائل کھول کر پروفیسر کو دکھائی۔'' یہ فائل اس حادثے کی ہے جو NYR9901 کے ساتھ پیش آیا تھا، اس حادثے میں سواریاں تو بچ گئیں لیکن ڈرائیور نے موقع پر ہی دم توڑ دیا یہ رہی اس ڈرائیور کی تصویر۔'' ہیری نے تصویر پروفیسر کو تھمادی۔

اور پروفیسر نے جب تصویر دیکھی تو وہ کوئی اور نہیں بلکہ وہی ڈرائیور تھا جس کی ٹیکسی میں وہ رات کو سفر کر چکے تھے۔ پروفیسر کا دماغ چکرا کر رہ گیا......''اب آپ کے کان کھینچنے پڑیں گے کیوں کہ آپ بھی شاید ضرورت سے زیادہ پینے لگے ہیں۔'' ہیری نے مسکرا کے کہا۔

پروفیسر کو ہیری کے الفاظ دور سے آتے ہوئے محسوس ہوئے اور اس کے ساتھ وہ حواس باختہ ہوتے چلے گئے۔







اندھیری رات

پیا سحر۔ گجرات

ھاتھ کو ھاتھ سجھائی نہ دینے والے رات کے اندھیرے میں ایک خوفناک آواز سنائی دی اور پھر اس آواز نے قرب و جوار کو دہلا کر رکھ دیا، ہر کوئی اپنا ہوش کھونے لگا کہ پھر ایک دلخراش منظر رونما ہوا۔

خوف وہراس کے گرداب میں بل کھاتی ہوئی ناقابل یقین اور جسم وجاں پر سکتہ طاری کرتی کہانی

جنگ کا زمانہ تھا چچا جان کی ڈیوٹی ان دنوں دریائے چناب کے کنارے تھی۔ فوجی جوانوں کے شب و روز بہت مشکل ہوتے ہیں، کئی دفعہ ان کو موت سے چشم دید واسطہ پڑتا ہے۔ فوجیوں کے حوالے سے میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں، چچا جان کے ساتھ پیش آنے والا یہ واقعہ مجھے چچی جان نے سنایا تھا کیونکہ چچا جان کی وفات جب ہوئی تب میں بہت چھوٹی تھی۔

ہم سارے کزن مل کر بیٹھے تھے ہنسی مذاق چل رہا تھا کہ باتوں باتوں میں چچا جان کا ذکر نکل آیا۔

اور ان کی بہادری کے قصے بیان ہونے لگے۔ آج کل تو جدید سہولتوں نے آرمی میں بہت ساری آسانیاں پیدا کردی ہیں، مگر اس وقت کی آرمی ایسے ایسے مشکل حالات سے گزرتی تھی کہ عقل دنگ رہ جائے، ہمارے جانباز فوجی جوان کیسی کیسی مشکلات کا شکار ہوتے ہیں۔

چچا جان کی ڈیوٹی چناب کے کنارے تھی ان کے ساتھ ان کا ایک ساتھی نواز نامی نوجوان تھا۔ چچا جان

جسمانی طور پر بہت لمبے تڑنگے اور کڑیل جوان تھے۔ رات کی ڈیوٹی دینا ویسے بھی آسان کام نہیں۔ پھر ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والا اندھیرا، اس پر قرب و جوار میں نہ آدم اور نہ آدم زاد۔

چار سو ویرانی، ہو کا عالم اور سو طرح کی مشکلات ہوں، جنگلی جانوروں سے تو جسمانی طاقت اور ہتھیاروں کے زور پر نمٹا جاسکتا ہے لیکن جب ماورائی و پراسرار واقعات پیش آجائیں تو بڑے بڑے بہادروں کی سٹی گم ہوجاتی ہے۔

اس لئے ایسی جگہوں پر ڈیوٹی دینے کے لئے بڑے دل گردے والے لوگوں کو تعینات کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی بہادروں میں جانے مانے ایک بہادر میرے چچا جان بھی تھے۔

ہوا کچھ یوں کہ سردیوں کا موسم تھا۔ چچا جان اور ان کا ساتھی نواز اپنی جگہ پر چوکنا اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ شدید سردی میں دریا کے کنارے بنیادی سہولتوں سے محروم ادھر ادھر سے جھاڑ جھنکار جمع کرکے آگ جلا کر ہمیں تو ایڈونچر لگے گا لیکن جن پر گزرتی ہے یہ تو وہی جانتے ہیں کہ موسم کی سختیوں کو اپنے بدن پر جھیلنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔

ایسی ہی صورتحال سے دوچار چچا جان اور نواز آگ تاپ رہے تھے کہ معاً ہیڈ کوارٹر سے ایک ضروری پیغام آگیا جس کو دریا پار چھاؤنی میں پہنچانا اسی وقت ضروری اور لازمی و ملزوم تھا۔

اب تو نواز اور چچا جان میں تکرار ہوگئی کہ پیغام لے کر کون جائے گا۔ بالآخر طے یہ پایا کہ چچا جان دریا پار چھاؤنی میں پیغام لے کر جائیں گے وہ فوراً سے پیشتر روانہ ہوگئے۔ انہوں نے قمیض اتار کر کندھے پر رکھی اور دریا میں اتر گئے۔

ان دنوں دریا میں پانی گردن بھر تھا اور کہیں کہیں اس سے بھی زیادہ، پانی میں زیادہ بہاؤ بھی نہ تھا۔ دریا کا پانی اتنا ٹھنڈا اور برفیلا تھا کہ لہو رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہوا۔ رات کے اس پہر کوئی کشتی بھی دستیاب نہ ہوسکی تھی کیونکہ تمام ملاح اپنے اپنے گھروں کو جاچکے تھے۔

اس لئے چچا جان نے اللہ کا نام لے کر پانی میں قدم رکھ دیا اور آہستہ آہستہ آگے ہی آگے بڑھنے لگے، جب وہ زیادہ گہرے پانی میں پہنچے تو پانی ان کی گردن سے بھی اوپر ہونٹوں کو چھونے لگا تو انہوں نے رائفل اور قمیض دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر ہاتھ بلند کرلئے اور ایک خاص طریقے سے پیروں کی مدد سے آگے بڑھنے لگے، دریا کا چوڑا پاٹ شروع ہوگیا تھا اب اگر یہاں احتیاط سے کام نہ لیا جاتا تو کچھ بھی حادثہ پیش آسکتا تھا۔

وہ محتاط انداز سے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک پانی میں زور کی ہلچل ہوئی جس کی وجہ سے پانی کی لہروں نے چچا کو بھی ادھر ادھر دھکیل دیا۔

چچا فوراً رک گئے انہوں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا تو ان سے کچھ ہی فاصلے پر کوئی بھاری بھرکم چیز تیر رہی تھی اور کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی، جیسے ہی وہ چچا جان کے مقابل آئی تو چند ثانئے کو رک گئی۔

چچا اپنی جگہ تھم سے گئے انہوں نے اونچا سانس لینے سے بھی گریز کیا۔ چند لمحے رکنے کے بعد اس چیز نے پھر سے آگے چلنا شروع کردیا۔

چچا جان بھی اپنی رفتار کم رکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ وہ چیز آگے آگے تیرتی ہوئی کنارے پر پہنچ گئی۔ کنارے پر جھاڑیوں کی وجہ سے اندھیرا ذرا گہرا تھا۔ چچا جان نے اس چیز سے مناسب فاصلہ رکھا تاکہ وہ چیز جلد اپنی منزل مقصود تک پہنچے اور چچا کا راستہ صاف ہوجائے۔

اسی لئے وہ کنارے سے کچھ دور پانی میں رکے رہے جب ان کو یقین ہوگیا کہ وہ چیز اب کنارے سے دور چلی گئی ہوگی تو انہوں نے اللہ کا نام لے کر جھاڑیوں کو پکڑا، کنارے کی مٹی نرم اور پھسلنے والی تھی مگر جھاڑیاں کافی مضبوط تھیں، فوجی جوانوں کے لئے پھسلن کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہوا کرتا سو وہ اس مہارت سے جھاڑیوں کو پکڑ کر کنارے پر آگئے اور اس دوران کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ انہوں نے کنارے پر آتے ہی سب سے پہلے اپنی قمیض پہنی۔

ابھی وہ قمیض پہن ہی رہے تھے کہ ان کو دائیں سائیڈ پر زبردست سرسراہٹ سی محسوس ہوئی تو ان کے بدن میں

سنسنی کی تیز لہر دوڑ گئی۔

جنگ کا زمانہ تھا دشمن بھی موقع کی تاک میں تھا اور اس وقت ان کے پاس ان کی قمیض کی جیب میں ایک اہم دستاویز بھی تھی جس کو جلد از جلد چھاؤنی تک پہنچانی تھی۔ ان کی رگوں میں خون جوش مارنے لگا کیونکہ وہ سمجھ گئے تھے کہ ضرور دشمن کا کوئی جاسوس ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ اور ہر قسم کی صورتحال کے لئے انہوں نے ذہنی طور پر خود کو تیار کرلیا۔

چاندنی زرد مدھم سی روشنی ناکافی تھی ان کی جیب میں ایک واٹر پروف ٹارچ موجود تھی مگر وہ اس وقت اس کو جلانے کا رسک نہ لے سکتے تھے۔

وہ اپنی جگہ پر بے حس کھڑے رہے اور جھاڑیوں کا ارد گرد کا جائزہ لیتے رہے جب ان کی تسلی ہوگئی کہ سرسراہٹ ان کا وہم تھی تو انہوں نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا، ابھی وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ زمین نے ان کے قدم روک لئے۔

ان کے سامنے ایک بہت موٹا اور لمبا اژدھا موجود تھا جو کہ سالم آدمی کو نگل لیتا اور ڈکار بھی نہ لیتا۔ چچا جان جہاں تھے وہیں کھڑے رہ گئے، ہلکی سی جنبش بھی ان کی موت کی وجہ بن سکتی تھی۔

انہوں نے اژدھے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، اژدھے کی آنکھوں میں جیسے انگارے دہک رہے تھے اور اس کے منہ سے نکلتی پھنکاریں دہشت پیدا کر رہی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے ڈٹ کر کھڑے جانی دشمن کی طرح ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں میں تولتے رہے۔ چچا چونکہ بنیادی طور پر ایک نڈر انسان تھے، پھر بھی ان کے دل میں یہ خوف ضرور پیدا ہوا کہ موذی جانور پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا جانے کب حملہ کردے، اژدھا کی آنکھوں سے جیسے شرارے پھوٹ رہے تھے۔ رفتہ رفتہ اژدھا کی آنکھوں سے نکلتی چنگاریاں ماند پڑتی گئیں اور پھر رینگ کر سائیڈ پر سو گیا۔

اب چچا جان نے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے شروع کئے۔ بالآخر وہ بخیریت گزر گئے، باقی کا راستہ انہوں نے تقریباً بھاگتے ہوئے طے کیا کیونکہ پہلے ہی بہت وقت

زندگی کیا ہے؟

ہم سمجھتے ہیں زندگی ایک کھیل ہے لیکن پو پھٹتے ہی پرندوں نے میٹھی آواز میں کہا۔ ''زندگی قدرت کی خوبصورتی کا اظہار ہے۔''

غروب ہوتے سورج نے کہا۔ ''زندگی میں رنگ بقا نہیں۔''

مرجھائے ہوئے پھول کی سسکی سنی۔ ''زندگی چند گھنٹوں کی کہانی ہے۔''

کانٹے نے کہا۔ ''زندگی ایک چبھن ہے۔''

سائنسدان کہتا ہے۔ ''زندگی ایجادات کا نام ہے۔''

ناکام عاشق کے نزدیک ''زندگی ایک بوجھ ہے۔''

بستر پر پڑے مریض نے کہا۔ ''زندگی ایک روگ ہے۔''

اداکار کہتا ہے۔ ''زندگی ایک ڈرامہ ہے۔''

مصنف کا خیال۔ ''زندگی ایک کتاب، حال، ماضی مستقبل کی۔''

دولت مند نے کہا۔ ''زندگی پیسے سے خریدی جاسکتی ہے۔''

لیکن کبھی کبھار ایسے حسین اور دلکش واقعات جنم لیتے ہیں کہ مردہ دلوں میں جینے کی آرزو جاگ اٹھتی ہے اور کبھی کبھار یہ حادثے سنگین اور خطرناک ہوتے ہیں کہ انسان کے گلشن حیات کو بڑی بے رحمی سے کچل دیتے ہیں، زندگی ایک طویل ترین پر پیچ اور خارزار پگڈنڈی ہے جو مختلف نشیب وفراز سے گزرتی ہوئی بظاہر بالکل بے معنی اور بے مقصد نظر آتی ہے مگر پھر بھی اپنے اندر کسی مخفی خواہش یا خواب کا اہتمام کرتی ہے۔ یا پھر خوب تصورات وخیالات کے خاکوں میں رنگ بھرنے کا نام زندگی ہے۔

دل سے آواز آئی زندگی عبادت ہے محبت ہے حسن ہے رعنائی ہے۔

(شاہدہ رحمٰن۔ بہاولپور)

ضائع ہو چکا تھا۔

وہ پیغام پہنچا کر وہاں رکے نہیں بلکہ الٹے پاؤں واپس پلٹ آئے۔ واپسی پر پھر اژدھا کی فکر دامن گیر ہوئی۔

آدھی رات کا وقت اور بیابان علاقہ اور راستے میں ایسا خوفناک اژدھا موجود ہو کہ انسان کو ایک نوالہ بنا کر نگل ڈالے تو ایسے میں کون مائی کا لعل ڈر نہیں جائے گا، چچا جان کی بہادری میں کوئی شک نہیں تھا وہ دیکھنے میں باڈی بلڈر یا ویٹ لفٹر لگتے تھے۔

لمبے تڑنگے مضبوط سی کاٹھی والے، ان کو اگر اژدھا کی فکر ہو رہی تھی تو صرف اس لئے کہ ایسی شدید سردی کے موسم میں دریا پار کرنا پھر ان کا ساتھی بھی ان کے پڑاؤ پر اکیلا تھا ایسے میں اگر پہلے کی طرح اژدھا کی وجہ سے وقت برباد ہو جاتا تو مناسب وقت سے ان کی واپسی ناممکن تھی۔

جنگ کا زمانہ تھا وہ اپنے ساتھی جوان کو زیادہ دیر اکیلا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ انہی سوچوں میں غلطاں وہ آگے کو بڑھے اور کنارے پر تقریباً پہنچنے والے تھے کہ ان کو ایک جھٹکے سے رکنا پڑا کیونکہ ان کے خدشات سچ ثابت ہوگئے کیونکہ اب وہی اژدھا راستے میں اسی طرح حائل تھا کہ اس نے پوری پگڈنڈی گھیر رکھی تھی۔

چچا جان سوچ میں پڑ گئے وہ اژدھے کو کوئی نقصان نہ پہنچانا چاہتے تھے۔ انہوں نے فوج کے ایک دستے کے ساتھ ایک لمبا عرصہ جنگلات میں گزارا تھا ایسے موذی جانوروں سے ان کا اکثر پالا پڑتا تھا۔ ان کی تجربہ کار نگاہ تاڑ گئی تھی کہ اژدھا بوڑھا ہو چکا ہے۔ ان کو اس کی بزرگی پر رحم آتا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق انہوں نے اژدھے کو ڈرانے کے لئے ہوائی فائر کر دیا تاکہ اژدھا ڈر کر راستہ چھوڑ دے مگر اژدھا ٹس سے مس نہ ہوا، چچا جان نے اوپر تلے دو اور فائر کئے، اس زمانے میں حکومت کو چلائی جانے والی گولیوں کا حساب نہیں دینا پڑتا تھا، فائرنگ کا اژدھے پر الٹا اثر ہوا اور وہ غضبناک ہو کر چچا جان پر چڑھ دوڑا، چچا جان پہلے ہی الرٹ تھے اس سے پہلے کہ اژدھا درمیانی فاصلہ طے کر پاتا، چچا جان نے اس پر فائر کھول دیا، اندھیرے میں بھی ان کا نشانہ کمال کا تھا، اژدھے کے عین سر اور پھن پر تین گولیاں لگیں اور اژدھا لوٹنے لگا۔

چچا جان نے اس کو وہیں چھوڑا اور بھاگ کھڑے ہوئے، بھاگتے بھاگتے ہی دریا میں اترے اور تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے دریا پار کر گئے۔ واپس پہنچ کر انہوں نے رپورٹ کر دی اور اژدھے کا ذکر بھی کر دیا، جس کو صبح ہونے پر انگریزوں کی ایک ٹیم اٹھا کر لے گئی۔

اسی جگہ ڈیوٹی کے دوران چچا جان کے ساتھ ایک اور پراسرار اور خوفناک واقعہ پیش آیا جو کہ ان کی باقی ماندہ زندگی پر گہرے نقوش چھوڑ گیا۔ اگر وہ احتیاط کرنے میں ایک لمحے کو بھی چوک جاتے تو یہ واقعہ ان کے لئے جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔

وہ گھور اندھیری رات تھی، اس رات ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا شاید اماوس کی راتیں تھیں، چناب کے کنارے پہرے پر چچا جان کی ڈیوٹی تھی، وہ اور ان کا ساتھی نواز کوئلوں کی آگ تاپ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ خوش گپیوں میں بھی مصروف تھے۔

کچی سڑک پر دور سے مسافر بس کی ہیڈ لائٹس جلتی ہوئی نظر آئیں، بس گجرات کی طرف سے آرہی تھی، جب بس پل کے سرے پر پہنچی تو وہیں رک گئی اس میں سے ایک بوڑھا آدمی اترا، بس سے اترنے کے بعد وہ اسی طرف آنے لگا جہاں چچا جان اور ان کا ساتھی موجود تھے جب وہ کچھ فاصلے پر آیا تو اس نے دور سے ہی چچا جان کا نام لے کر آوازیں لگانا شروع کر دیں۔ ”اعظم ارے او اعظم میں تم سے ملنے آیا ہوں۔“

چچا جان کو دھڑکا سا لگا کہ ”خدا خیر کرے دادا جان کی طبیعت ناساز تھی کہیں کوئی بری خبر نہ ہو۔“ یہ خیال آتے ہی وہ اٹھ کر تیزی سے اس بوڑھے کی طرف لپکے جو کہ سڑک کے کنارے رک گیا تھا۔

جیسے ہی چچا جان اس کے قریب پہنچے تو اس بوڑھے نے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے کو بڑھایا تو چچا نے بھی مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

ابھی وہ اس کا ہاتھ تھام نہ پائے تھے کہ لاہور کی

طرف سے ایک بس تیزی سے آئی اور گزر گئی۔ اس ایک لمحے میں جیسے ہی اس بوڑھے کے چہرے پر چچا کی نظر پڑی تو سنسنی کی تیز لہریں بجلی بن کر چچا کے بدن میں گھلنے لگیں کہ پھر اچانک ان کو اور کچھ نہ سوجھا تو انہوں نے مصافحے کے لئے بڑھے ہوئے ہاتھ سے ایک بھرپور مکا اس بوڑھے کے سینے پر دے مارا جس کے نتیجے میں وہ کراہتا ہوا دور جا گرا اور پانی پانی چلانے لگا۔

چچا جان کو لگا کہ وہ غلطی کر گئے شاید کسی وہم کی بنا پر انہوں نے بوڑھے کے ساتھ زیادتی کر دی، دراصل جیسے ہی بس نزدیک آئی اس کی روشنی میں چچا جان نے دیکھا کہ جس بوڑھے کے ساتھ وہ مصافحہ کرنے جا رہے تھے۔ اس بوڑھے کا چہرہ بہت خوفناک اور بھیانک تھا۔ لمبا اتنا کہ سینے تک لٹکا ہوا، رنگت ایسی عجیب سی کہ ناقابل بیان، اس خوفناک چہرے والے بوڑھے کو کوئی بلا سمجھ کر انہوں نے پوری جان سے مکا دے مارا کہ وہ اچھل کر دور جا گرا اور چلانے لگا۔

غلطی کا احساس ہوتے ہی چچا جان مڑ کر پانی کی طرف بڑھے تاکہ وہ پانی پلا کر اپنی غلطی کی تلافی کر سکیں۔

ابھی وہ گھڑے سے پیالے میں پانی انڈیل ہی رہے تھے کہ ان کو اپنی کمر کے پیچھے ایک زوردار غراہٹ سی سنائی دی۔

ان کی چھٹی حس نے ان کو خبردار کر دیا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ انہوں نے فوراً سے پیشتر ہاتھ میں خنجر پکڑ لیا جس کو وہ ہمیشہ اپنی کمر کی پیٹی سے باندھ کر رکھتے تھے۔

غراہٹ اب مسلسل ہو رہی تھی وہ پیالہ لے کر جیسے ہی مڑے تو ایک لمحے کو متحیر سے رہ گئے۔ جس کو وہ بوڑھا آدمی سمجھ رہے تھے وہ بہت ہی خوفناک چڑیل کے روپ میں ان کے سامنے تھی۔ انہوں نے فیصلہ کرنے میں دیر کر دی۔

وہ چڑیل چھلانگ لگا کر ان پر جھپٹی، ان کو لے کر زمین پر گری اور ان کو رگیدنے لگی شاید وہ ان کی جسمانی طاقت سے ناآشنا تھی۔ چچا جان مضبوط قوت ارادی کے مالک تھے انہوں نے خنجر ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

جیسے ہی چڑیل کی طرف سے ذرا ڈھیل ملی انہوں نے خنجر کا بھرپور وار کر کے چڑیل کا سر دھڑ سے جدا کر دیا لیکن اس کا سر کٹ کر گرنے کے بجائے ابھی بھی گردن سے ہی جڑا رہا جو کہ خوف کی علامت تھی، چڑیل کی چیخ و پکار ایسی دل دہلا دینے والی تھی کہ چچا جان کا ساتھی نواز بھی بھاگتا ہوا آ گیا اور آتے ہی چڑیل پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی مگر بے سود بھلا وہ چڑیل گولیوں سے کیسے مر سکتی تھی وہ تو ایک اذیت میں مبتلا تھی اور تڑپ رہی تھی۔

چونکہ چچا جان فطری طور پر رحم دل واقع ہوئے تھے، ان سے چڑیل کی تڑپ دیکھی نہ جا رہی تھی، وہ ہمت کر کے آگے بڑھے اور ایک خنجر کا بھرپور وار کیا جس کے نتیجے میں چڑیل کا سر دھڑ سے کٹ کر دور جا گرا۔

ابھی اس کا دھڑ تڑپ رہا تھا کہ اس کے سر اور دھڑ نے آگ پکڑ لی، دبی دبی چیخیں ابھی بھی بلند ہو رہی تھیں۔ آگ بڑھتے بڑھتے شعلوں میں بدل گئی اور چڑیل کے دھڑ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کہ یہ گمان ہو رہا تھا جیسے سوکھی لکڑیاں چیخ چیخ کر آگ میں جل رہی ہوں۔ پھر آگ کے شعلوں نے اوپر اٹھنا شروع کر دیا۔ بلند ہوتے ہوتے آگ آسمان کی وسعتوں میں غائب ہو گئی۔

چچا جان اور نواز دم بخود کھڑے یہ نظارہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے رہے، آگ آسمان کی وسعتوں میں جا کر غائب ہوگئی پھر آ کر چچا جان کو تیز بخار نے گھیر لیا۔

اس واقعہ کے بعد چچا جان جب تک زندہ رہے، یہ واقعہ ان کی کمزوری بن گیا۔ جب بھی کوئی سوتے میں ان کو ہلا کر جگاتا یا ان کو محسوس ہوتا کہ ہاتھ بڑھایا جا رہا ہے تو نیند میں ہی لاشعوری طور پر ان کی حالت خراب ہو جاتی اور اس انسان کو اٹھ کر اس وحشیانہ انداز میں پیٹ اور رگید ڈالتے کہ پھر کبھی اس کی ہمت نہ ہوتی کہ وہ ان کے سوتے میں ہاتھ لگا کر اٹھاتا۔ چچا نے سب کو ہدایت کر رکھی تھی کہ ہمیشہ ان کو جگانے کے لئے آواز دے کر ان کا نام لے کر ان کو جگایا جائے۔



رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 124

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

نوجوان کافی دیر سے خالہ کریمن کا پیچھا کررہا تھا اور خالہ تھیں کہ کہیں بھی ٹھہرنا نہیں چاہتی تھیں وہ متواتر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتی رہیں، ان کی مرضی تھی ان کے پیچھے لگا نوجوان تھک کر چلا جائے مگر نوجوان بھی مضبوط ارادے کا مالک تھا اور جب خالہ کریمن نے اسے ٹھونک بجاکر آزمالیا تو بولیں۔ تو بھی پکا ضدی ہے میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہا، خیر میرے ساتھ چل مگر ہر صورت اپنا منہ بند رکھنا، خالہ آگے آگے اور نوجوان پیچھے پیچھے خالہ ایک گھر میں داخل ہوگئیں اور پھر وہاں کا منظر دیکھ کر نوجوان دہل گیا، وہ بہت دکھی عورت تھی خالہ کو دیکھتے ہی زاروقطار رونے لگی اور بولی۔ ماں میری مدد کرو...... مجھے شانتی چاہئے مجھے اس عذاب مسلسل سے نجات دلاؤ میرے پتی نے مجھے اور میرے بچوں کو بھینٹ چڑھا دیا، ماں جب تک میرا پتی زندہ ہے مجھے اور میرے بچوں کی آتما کو شانتی نہیں ملے گی۔ یہ سن کر خالہ کریمن طیش میں آگئیں اور پھر اس کے پتی کی تلاش میں نکلیں۔ تو اس سے مڈبھیڑ ہوگئی اور پھر زبردست معرکہ ہوا معرکہ کے بعد خالہ کریمن نے اس لالچی اور سفاک شخص کا خاتمہ کردیا۔ ناگری قبیلے میں یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ ناگ دیوتا ہم قبیلہ والوں سے ناراض ہے اور اسی بنا پر اس قبیلہ میں کوئی سندر بچی پیدا نہیں ہوتی تھی خیر ستر سال بعد اس قبیلے میں ایک اپنی مثال آپ بچی پیدا ہوئی اسے دیکھ کر سارا قبیلہ جشن منانے لگا اور ان کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا، اس بچی کی بہت دیکھ بھال ہونے لگی، اس کی تمام خواہشیں پوری کی جاتی تھیں، خیر وہ بچی آہستہ آہستہ جوانی کی دہلیز کی طرف بڑھنے لگی۔ قبیلہ والوں نے اس بچی کو ناگ دیوتا کے لئے وقف کردیا تھا۔ اور یہ بات اٹل تھی کہ وہ بچی ناگ دیوتا کی داسی ہے اور پھر جب وہ مکمل جوان ہوگئی تو ناگ پوجا کی رات کو اس بچی کو ناگ دیوتا کے حوالے کردیا گیا اور وہ بچی اس غار میں رہنے لگی جہاں کہ ناگ دیوتا کی مورتی موجود تھی۔ وہاں کے راجہ رنبیر سنگھ کو اس داسی کی جھلک نظر آگئی تھی۔ راجہ بہت ہی عیاش طبیعت تھا اس نے ٹھان لی کہ وہ ہر صورت ناگ داسی کو اٹھوا کر اپنے محل میں لے آئے گا اور پھر ایسا ہی ہوا، راجہ نے ناگ داسی کو اٹھوالیا۔ ناگ داسی نے راجہ کے آگے بہت منت سماجت کی کہ راجہ صاحب میں ناگ دیوتا کی امانت ہوں، مجھے ہاتھ نہ لگائیں مگر راجہ نشہ میں دھت ناگ داسی کی طرف بڑھتا تاکہ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کرسکے کہ اتنے میں ایک زبردست پھنکار سنائی دی۔ ایک غضبناک حالت میں ایک ناگ راجہ کے سامنے اپنا پھن پھیلائے کھڑا تھا، پھر اس ناگ نے ایک زبردست جست لگائی اور راجہ کی گردن میں لپٹ گیا پھر اس ناگ نے پھنکارتے ہوئے راجہ کے ماتھے پر ڈس لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے راجہ ڈھے گیا اور پھر اس ناگ نے اپنے منہ سے شعلہ اگلا تو راجہ جل کر راکھ میں تبدیل ہوگیا اور پھر ناگ نے پورے محل کو شعلوں سے دوچار کردیا۔ اس کے بعد ناگ ایک وقار کے ساتھ محل سے باہر نکلا۔ داسی اس کے پیچھے تھی اور اس طرح ناگ اور داسی اسی غار میں پہنچ گئے جہاں ناگ دیوتا موجود رہتا تھا۔

(اب آگے پڑھیں)

نسوانی چیخ اتنی زوردار اور فلک شگاف تھی کہ سارا مطب ہل کر رہ گیا تھا مطب کے سارے لوگ اس کمرہ کی طرف دوڑ پڑے تھے جس کمرے سے یہ آواز آئی تھی۔

رولوکا اور حکیم وقار بھی عجلت میں اس کمرے کی طرف دوڑ پڑے تھے۔

کہ اتنے میں مطب کا ایک ملازم دوڑتا ہوا اسی طرف آرہا تھا جس طرف سے رولوکا اور حکیم وقار آرہے تھے ملازم کی نظر ان دونوں پر پڑتے ہی ملازم کے منہ سے صرف اتنا نکلا وہ بھی ہکلاتے ہوئے......''ح...... کی



.....حکیم.....ص.....ا.....ب۔''

اور حکیم وقار سمجھ گئے کہ ملازم کیا کہنا چاہتا ہے۔

حکیم وقار بولے۔''گھبراؤ نہیں.....ہم بھی اسی جگہ جارہے ہیں۔''

جب رولوکا اور حکیم وقار اس کمرے میں پہنچے تو اس منظر کو دیکھ کر حکیم وقار کے ماتھے پر پسینے کے قطرے فوراً نمودار ہوگئے کیونکہ وہ منظر بھی ایسا ہی تھا۔

کمرے میں بستر پر موجود ایک دھان پان سی مریضہ نے ایک خدمت گار عورت کی گردن کو اپنے ہاتھ کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا اور اس عورت کو فرش سے کوئی دو فٹ اوپر کو اٹھا رکھا تھا اور ہاتھ کے شکنجے میں جکڑی بے چاری عورت کے منہ سے کرب واذیت میں ڈوبی آواز بڑی مشکل سے نکل رہی تھی خوف وتکلیف کی وجہ سے عورت کی آنکھیں باہر کو ابل پڑی تھیں۔

اور مریضہ کے منہ سے ڈراؤنی کھرکھراتی ہوئی آواز خارج ہورہی تھی، اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے حقیقت میں چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

''میں تجھے ماردوں گا..... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تیری ہمت کیسے ہوئی مجھے نیند سے جگانے کی.....'' بھاری آواز اور وہ بھی مردانی۔

کمرے میں موجود سارے لوگ انگشت بدنداں تھے اور ایسا لگتا تھا کہ سب پر سکتے کا عالم ہو۔

رولوکا فوراً آگے بڑھا اور مریضہ کی طرف لپکتے ہوئے اپنا سیدھا ہاتھ عورت کی کلائی پر رکھ دیا۔ ہاتھ کا کلائی پر پڑتے ہی اس عورت نے آناً فاناً عورت کی گردن پر اپنی گرفت ڈھیلی کردی تو شکنجے میں جکڑی ہوئی عورت دھپ سے فرش پر گری اور بے ہوش ہوگئی۔

رولوکا بولا۔''اسے لے جاؤ اور ہوش میں لاؤ۔''

چار خدمت گار عورتیں آگے بڑھیں اور اس عورت کو اٹھا کر وہاں سے لے گئیں۔

اور پھر رولوکا اس بیڈ کے چاروں طرف گھوم گیا اپنی شہادت کی انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے پھر رولوکا اس عورت کے سامنے ہوکر بولا۔''اوئے تو کون ہے؟ تیرا نام کیا ہے؟ اور تو نے اس عورت پر ہاتھ کیسے ڈالا اور اس عورت پر تو موجود کیوں ہے؟''

یہ سنتے ہی اس مریضہ عورت کی کرخت آواز گونجی۔

''تو ہوتا کون ہے مجھ سے یہ پوچھنے والا.....تو اپنی خیریت چاہتا ہے تو یہاں سے چلا جا.....نہیں تو پچھتائے گا۔''

یہ سن کر رولوکا بولا۔''میرے سوال کا جواب دے اور اپنی گیدڑ بھبکی اپنے پاس رکھ.....نہیں تو، تو اپنا نقصان کرلے گا۔''

یہ سن کر مریضہ پر سوار وجود بولا۔''تو نے میرے گرد حصار کرکے اچھا نہیں کیا..... میں کسی صورت بھی اس لڑکی کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ اور تو نے اگر زیادہ پریشان کیا تو میں اس کی جان لے لوں گا۔ اور اب تو دیکھ میں کیا کرتا ہوں۔''

یہ بولتے ہی لڑکی بستر پر گر کر بے سدھ ہوگئی۔ ایسا لگتا تھا کہ لڑکی کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی ہے۔

حکیم وقار جو کہ رولوکا کے برابر کھڑے تھے فوراً بولے رولوکا سے۔''حکیم صاحب یہ تو ختم ہوگئی۔''

یہ سن کر رولوکا بولا۔''حکیم صاحب دراصل یہ ہمیں دھوکہ دے رہا ہے، آپ دیکھتے جائیں کہ میں اب اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں آپ کسی سے آدھا گلاس پانی منگائیں۔''

حکیم وقار کے بولنے پر ایک ملازم دوڑتا ہوا گیا اور فوراً ایک گلاس میں پانی لے آیا ملازم کے ہاتھ سے رولوکا نے گلاس لیا اور پھر اس پانی پر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر پھونکا اور پھر اپنے ہاتھ کے چلو میں پانی لیا اور اس پانی کو بے سدھ لڑکی کے منہ پر چھڑک دیا۔

پانی کا چہرے پر پڑنا تھا کہ لڑکی بستر پر فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی ایسے جیسے کہ اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ رولوکا دوبارہ پانی اس کے چہرے پر ڈالنے والا تھا کہ اس کے منہ سے کرخت آواز نکلی۔''اوئے اب پانی نہ ڈالنا۔''

رولوکا بولا۔''تو میرے سوالوں کا جواب دے، نہیں تو میں تجھ پر یہ سارا پانی انڈیل دوں گا، فوراً میرے سوالوں کا جواب دے، اس میں تیری بھلائی ہے، تجھے

اب اچھی طرح میری طاقت کا اندازہ ہوگیا ہے جلدی کرورنہ......'' رولوکا نے یہاں تک ہی بولا تھا کہ۔

لڑکی کے منہ سے آواز نکلی۔ ''میرا نام شنجان ہے اور میرا تعلق کافر جنات سے ہے، میں بلے کی شکل میں موجود تھا سر جھکائے گلی میں آہستہ آہستہ جارہا تھا کہ اس لڑکی نے پتھر اٹھایا اور میرے سر پر پتھر دے مارا۔''

یہ بول کر لڑکی رولوکا کو دیکھنے لگی پھر اس کے منہ سے آواز نکلی یعنی لڑکی پر موجود ہستی رولوکا سے مخاطب تھی۔ ''اب تو ہی بتا کہ تو میری جگہ ہوتا تو کیا کرتا...... میں تو سر جھکائے اپنے آپ میں مگن چلا جارہا تھا۔''

یہ سن کر رولوکا بولا۔ ''یہ لڑکی تیری اصلیت سے ناواقف تھی، اور یہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ پتھر اٹھا کر کتے یا بلی کو ہنکانے کے لئے...... ہش...... ہش...... آواز یا پھر کسی مٹی کے ڈھیلے یا چھوٹے پتھر اس پر پھینک دیتے ہیں...... خیر جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا...... اگر بقول تیرے کہ تو اس لڑکی کو نہیں چھوڑے گا تو اس سے تجھے تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور نہ ہی تیری چوٹ واپس آئے گی۔

بھائی بندی کی بات تو یہ ہے کہ میری بات مان لے اور اس لڑکی پر سے چلا جا...... اور بحث تکرار یا پھر زور آزمائی سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

ہر حال میں تجھے اس لڑکی کو چھوڑنا ہی پڑے گا...... اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طاقت کو دیکھ لیا ہے...... لہٰذا میری بات مان لے اور خاموشی سے چلا جا...... اور ہاں اگر تیری کوئی خواہش ہے تو یہ بھی بتادے...... چل جلدی کر...... ورنہ میں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے سے گریز نہیں کروں گا۔''

یہ سن کر وہ بغور رولوکا کو دیکھتا رہا...... پھر بولا۔'' خیر میں تیری بات مان لیتا ہوں...... لیکن مجھے دو سیر رس گلے اور دو سفید بکرے چاہئیں۔''

یہ سن کر رولوکا بولا۔ ''تیری بات مانتے ہوئے تیرے لئے صرف ایک سیر رس گلے اور ایک بکرے کا انتظام کرائے دیتا ہوں۔ یہ دونوں چیزیں لے کر فوراً رفو چکر ہوجا...... اور آئندہ کبھی بھی اس علاقہ کی طرف الٹ کر بھی نہ دیکھنا اور اس کا تجھے وعدہ کرنا ہوگا۔''

لڑکی کے گھر والے وہاں موجود تھے...... ایک گھنٹے کے اندر اندر ایک سیر مٹھائی اور ایک سفید بکرے کا انتظام ہوگیا تو دونوں چیزیں کمرے میں رکھ دی گئیں اور اس کے بعد رولوکا نے وہاں موجود سب سے بولا۔ ''آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں۔'' اور پھر سارے لوگ اس کمرے سے نکل گئے مگر حکیم وقار موجود رہے۔

پھر لڑکی کے جسم سے گاڑھا گاڑھا سفید دھواں اٹھنے لگا، پھر وہ دھواں مٹھائی اور بکرے کے گرد پھیلنے لگا، چند منٹ میں سارا دھواں ان دونوں چیزوں کے گرد پھیل گیا اور اس دھوئیں میں دونوں چیزیں چھپ گئیں تو آواز آئی۔''اب میں اپنی دونوں چیزوں کو لے کر جارہا ہوں...... اور یہ بھی وعدہ ہے کہ آئندہ اس علاقے کی طرف کسی بھی صورت رخ نہیں کروں گا۔''

اور پھر فوراً ہی دھواں اس جگہ سے چھٹ گیا جب دھواں چھٹا تو رولوکا اور حکیم وقار نے دیکھا کہ اس جگہ سے مٹھائی اور بکرا غائب تھا۔

بستر پر لڑکی بے سدھ پڑی تھی۔

رولوکا بولا۔ ''حکیم صاحب یہ جب تک اپنی نیند سوئے سونے دینا اور جب یہ خود سے اٹھ جائے تو اس کے گھر والوں کو بول دینا کہ وہ اسے لے جائیں۔ اب یہ بالکل ٹھیک ہوگئی ہے۔

دراصل پہلے یہ سمجھ میں آنے والی بیماری کا شکار تھی دراصل اس پر سوار جن اسے اندر سے کمزور کررہا تھا اور ایک وقت آتا کہ یہ اپنی جان سے چلی جاتی۔''

پھر رولوکا اور حکیم وقار اپنے کمرے میں آگئے۔

حکیم وقار نے ملازم کو آواز دی اور چائے کے لئے کہا چند منٹ میں چائے آگئی تو دونوں نے چائے پی، چائے پینے کے بعد رولوکا بولا۔ ''حکیم صاحب آپ نے پہلی کہانی میں خالہ کریمن کی روحانی طاقت کے متعلق پوچھا اور پھر دوسری کہانی میں ناگری قبیلے میں ستر سال بعد ایک بچی پیدا ہوئی اور پھر اس کے بعد جو حالات سامنے آئے وہ کیا تھے۔''

''اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں بے شمار ایسے لوگ ہیں کہ ان میں ناقابل یقین مخفی قوتیں موجود ہیں اور یہ قوتیں ان کی محنت اور ریاضت سے حاصل ہوتی ہیں۔ رب کائنات کبھی بھی کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں کرتا محنت کرنے والے کی لگن...... چاہت...... کوشش اور ریاضت سے اس کی محنت کا صلہ ملتا ہے...... رب کائنات جس کو جتنا چاہے نواز دے اور یہی بات خالہ کریمن میں تھی، رب کائنات نے ان کو ان کی محنت اور ریاضت کے حساب سے نواز آ ہے۔

اور رہی ناگری قبیلے والی بات تو یہ بھی حقیقت ہے۔ کہ وہ قبیلہ ناگ دیوتا کی پوجا کرنے والا تھا قبیلے والوں کی کسی بات پر ناگ دیوتا کی ناراضگی ان پر غالب آگئی جس کی وجہ سے ناگری قبیلہ پریشانیوں کا شکار ہوگیا اور پھر ناگری قبیلے والے اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے لگے اور اس طرح ستر سال بیت گئے تب کہیں جاکر ناگ دیوتا کو ان پر رحم آگیا۔

پھر وہ لڑکی چندا آفتاب...... چندا ماہتاب پیدا ہوئی۔

اور پھر اس لڑکی پر ناگ دیوتا کی نظر شروع سے تھی...... لہٰذا وہ لڑکی ناگ دیوتا کی دیوداسی ہوگئی اس کے دل ودماغ میں ناگ دیوتا کی پرستش بیٹھ گئی۔

اور پھر ایک مقررہ وقت پر ناگری قبیلہ کے رسم ورواج کے مطابق وہ لڑکی ناگ دیوتا کے سپرد کردی گئی اور ناگ دیوتا نے اس لڑکی کو قبول کرلیا۔

تو ایسی صورت میں یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ ناگ دیوتا کی پسند اور امانت میں کوئی خیانت کرے...... اور پھر اپنی امانت میں خیانت ہوتے دیکھ کر مجسم ناگ وہاں پہنچ گیا اور مہاراج اور پورے محل کا ستیاناس کردیا...... اور یہی نہیں بلکہ اپنی دیوداسی کو بھی ساتھ لے گیا۔

اب میں چندواقعات آپ کے گوش گزار کرتا ہوں...... ''رولو کا حکیم وقار سے بولا۔'' اس دنیا میں ہمارے آپ کے اردگرد بے شمار ایسی ہستیاں ہیں جو کہ چھپی ہوئی ہیں اور دیکھنے والے انہیں ایک عام سا آدمی سمجھ کر چشم پوشی کرلیتے ہیں۔

اور کچھ ہستیاں تو ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں لوگ پاگل، خفت الحواس اور کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر سمجھتے ہیں اور ان پر کراہیت کی نظر ڈال کر ان کی طرف سے نظریں پھیر لیتے ہیں جو کہ صرف اور صرف نظروں کا دھوکہ ہوتا ہے۔

لیکن حقیقت میں کچھ اور ہوتا ہے جو کہ عام لوگوں کی نظروں میں پوشیدہ ہوتا ہے اور جب کوئی اصلیت سے واقف ہوجاتا ہے تو دنگ رہ جاتا ہے۔

چندواقعات آپ ملاحظہ کریں جو میں بیان کررہا ہوں۔تو آپ خود بھی دنگ رہ جائیں گے۔

ایک بہت بڑے بزرگ کا مزار تھا رات دن لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ عقیدت مند آتے اور چڑھاوے وغیرہ چڑھا کر چلے جاتے کچھ لوگ تو کئی کئی دن اپنی منت کے حساب سے مزار کے حدود میں رہتے اور پھر جب ان کا دل چاہتا تو واپس چلے جاتے۔

ایک صبح کو لوگوں نے دیکھا کہ مزار سے کچھ فاصلے پر مزار کے راستے میں ایک جوان لڑکی ننگ دھڑنگ لیٹی ہوئی ہے۔

اس لڑکی کی جسمانی ساخت ایسی تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی مرد حضرات اسے دیکھنے پر مجبور ہوجاتے تھے اور ایک ٹک اسے دیکھے جاتے۔ جب عورتوں کی اس پر نظر پڑتی تو عورتیں شرم سے اپنی نظریں پھیر لیتیں اور جلدی سے گزر جاتیں۔

اور یہ سلسلہ دنوں ہفتوں بلکہ مہینوں چلتا رہا۔

ایک دن ایک نوجوان اس طرف سے گزرا تو اس کے دل میں آیا کہ یہ کوئی پاگل ہے اور اس طرح ننگ دھڑنگ جوان لڑکی کا پڑا رہنا زیب نہیں دیتا۔ کیوں نہ میں اس کی ستر پوشی کے لئے اس پر کوئی کپڑا ڈال دوں۔

نوجوان دیہاتی تھا...... نیک طبیعت کا مالک...... وہ ایک دکان پر گیا اور اس نے ایک چادر خرید لی پھر چادر لے کر وہ اس لڑکی کے قریب آیا اور چادر کھول کر چادر کو لڑکی کے پورے جسم پر ڈال دیا جس سے لڑکی کی

ستر پوشی ہوگئی۔

پھر اچانک اچھنبے میں ڈالتا ایک واقعہ رونما ہوا جسے دیکھ کر اس جگہ موجود وہ نوجوان اور سارے لوگ بھی جوکہ چادر لاکر اس لڑکی پر ڈالی تھی حیران وپریشان ہوگئے۔

وہ ایسا منظر تھا کہ ان لوگوں میں سے کسی نے بھی اپنی زندگی میں ایسا منظر نہ دیکھا تھا اور نہ سنا تھا۔

ہوا یوں کہ اس لڑکی کے جسم پر چادر پڑتے ہی ،چادر خود بخود چیتھڑوں میں تبدیل ہوگئی پھر وہ تمام چیتھڑے اڑتے ہوئے اس لڑکی سے کچھ فاصلے پر جمع ہوگئے اور پھر اچانک ان میں آگ بھڑک اٹھی۔

لوگ حیران پریشان وہ دل دہلتا منظر دیکھتے رہ گئے کہ اتنے میں اس لڑکی نے اپنے ہاتھ کے اشارہ سے لوگوں کو وہاں سے جانے کا کہا۔ تو سارے لوگ فوراً سے پیشتر اس جگہ سے ہٹ گئے ان لوگوں میں وہ نوجوان بھی شامل تھا جس نے چادر لاکر لڑکی پر ڈالی تھی وہ نوجوان خاموشی سے مزار کی طرف چلا گیا۔

وہ نوجوان مزار پہنچا اور اپنے عقیدے کے مطابق فاتحہ پڑھی اور کوئی ایک گھنٹہ بعد اسی راستے سے واپس آیا اور اس لڑکی کے سامنے سے گزرنے لگا تو اچانک اس ننگ دھڑنگ پڑی لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ’’اوئے۔‘‘

اوئے کی آواز سنتے ہی نوجوان کی نظر اس لڑکی کی طرف اٹھ گئی۔

اس وقت سڑک کے کنارے موجود دکانوں پر سارے دکاندار موجود تھے اور بہت سارے لوگ بھی ،نوجوان کو لڑکی نے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

نوجوان پہلے تو ادھر ادھر گردن گھما کر دیکھتا رہا کہ اتنے میں ایک دکاندار کی آواز نوجوان کی سماعت سے ٹکرائی...... ’’چلا جا بلا رہی ہے۔‘‘

یہ سننا تھا کہ نوجوان کے قدم اس لڑکی کی طرف اٹھنے لگے۔

نوجوان لڑکی کے قریب پہنچ کر کھڑا ہوگیا تو لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے قریب بیٹھا لیا پھر نوجوان سے چند باتیں سرگوشی میں کرنے لگی اس کے بعد لڑکی نے کوئی چیز نوجوان کے ہاتھ پر رکھی اور نوجوان نے اپنی مٹھی بند کرلی۔

دکاندار وغیرہ یا جو لوگ وہاں سے کچھ فاصلے پر تھے وہ دیکھ رہے تھے۔ نوجوان اپنی جگہ سے اٹھا اور واپسی کے لئے آگے کو قدم بڑھا دیئے کہ اتنے میں لوگوں نے ایک اور دل دہلاتا منظر دیکھا...... اس لڑکی کا وجود ہوا میں تحلیل ہوکر غائب ہوگیا۔

قرب وجوار میں جتنے بھی لوگ تھے ان لوگوں میں سے کسی میں بھی ہمت نہ تھی کہ کوئی آگے بڑھتا اور اس نوجوان سے کوئی سوال کرتا۔

وہ نوجوان چونکہ دیہات سے آیا تھا، اس کے ساتھ اور بھی کئی لوگ تھے جو کہ مل کر گاؤں سے آئے تھے اور ایک جگہ مقیم تھے۔

ان لوگوں میں ایک عمر رسیدہ بزرگ بھی تھے انہوں نے نوجوان سے دریافت کیا کہ تو نوجوان نے بتایا۔

’’چاچا جی، جب میں اس لڑکی کے قریب پہنچا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بیٹھایا تو میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ لڑکی زرق برق لباس میں تھی کہیں سے بھی وہ بے لباس نہیں نظر آرہی تھی، وہ بہت حسین تھی ایسا لگتا تھا کہ اس کے چہرے سے روشنی پھوٹ رہی ہے ایسا حسن میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھا بلکہ فلموں میں بھی نہیں دیکھا۔

وہ سرگوشی میں بولی۔’’نوجوان تمہارا بہت شکریہ کہ میری ستر پوشی کے لئے تم نے چادر میرے جسم پر ڈالی جو دوسرے لوگ دیکھتے رہے وہ حقیقت نہیں بلکہ جو تم دیکھ رہے ہو وہی حقیقت ہے جو اپنے نفس کے غلام ہوتے ہیں وہ کچھ کے اندھے اور بہرے ہوتے ہیں۔

نوجوان تم زندہ دل، نڈر، باہمت اور رحم دل ہو، میں تمہیں یہ انگوٹھی دے رہی ہوں اسے ہمیشہ اپنی انگلی میں پہنے رکھنا، کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔

ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، دھن دولت کے نشہ میں کبھی بدگمان نہ ہونا، دوسروں کے ساتھ ہمیشہ رحم دلی

کے ساتھ پیش آنا، جہاں تک ہو سکے مصیبت میں پھنسے لوگوں کی مدد کرنا، ہمیشہ راہ راست پر چلتے رہنا، دنیا کی شہرت چندروزہ کی ہوتی ہے اب تم جاؤ میں بھی اب چلتی ہوں...... میرا بھی اب یہاں سے جانے کا وقت ہو گیا۔“

پھر رولو کا حکیم وقار سے بولا۔ ”حکیم صاحب دیکھا آپ نے کہ عام لوگوں اور خاص لوگوں کی نظر میں کتنا فرق ہوتا ہے میں ایک اور واقعہ آپ کے گوش گزار کرتا ہوں۔

ایک جگہ بدبودار کچرے کا ڈھیر پڑا رہتا تھا، محلے بھر کا سارا کچرا اور دیگر گند اس جگہ ڈالا جاتا تھا ایک بہت عمر رسیدہ بابا اس کچرے کے ڈھیر کے پاس پڑے رہتے تھے انہیں دیکھ کر اس جگہ سے گزرنے والے لوگ عجیب کراہیت محسوس کرتے تھے اور کبھی کسی وقت جب ان پر نظر پڑتی تو لوگوں کو ابکائی سی آتی کیونکہ وہ بابا ڈھیر پر بیٹھے اپنے سیدھے ہاتھ سے کچرے کے ڈھیر کو ادھر ادھر ہٹاتے اور کچرے میں سے کچھ اٹھا اٹھا کر کھانے لگتے۔

اور جب کوئی بغور دیکھتا کہ بابا کیا کھا رہے ہیں تو دیکھنے والا فوراً اپنی نگاہیں پھیر لیتا اور متلاتا ہوا دل لے کر آگے کو بڑھ جاتا۔

آتے جاتے کچھ منچلے نوجوان آوازیں بھی کستے ۔”بڑے میاں کیا پاگل ہو گئے ہو جو گند کھا رہے ہو۔“ کچھ تو بولتے۔“ ہوش وحواس سے بیگانہ پاگل ہے۔

جب وہ گند کھا رہے ہوتے تو دیکھنے والے دیکھتے کہ گند میں سے کیڑے چن چن کر وہ کھاتے تھے اور جب ایک عام انسان کسی کو اس حالت میں دیکھے کہ کوئی کچرے کے ڈھیر میں سے کیڑے چن چن کر کھاتا ہے تو یقیناً وہ پاگل ہی ہو سکتا ہے۔

ایک دن ایک رحم دل نوجوان ان کے پاس گیا تو دیکھا کہ وہ گند میں سے کیڑے نکال نکال کر بڑی رغبت سے کھا رہے ہیں۔

وہ نوجوان اپنے دل پر جبر کر کے ان کے پاس بیٹھا اور بولا۔”بابا میرے ساتھ چلیں میں آپ کو کھانا کھلاتا ہوں، آپ حمام میں غسل کر لیں، آپ کو کچرے کے اس ڈھیر پر دیکھ کر میرا دل دکھتا ہے۔“

نوجوان کی بات سن کر بابا نے بغور نوجوان کو دیکھا اور جھٹ اس کی گردن پکڑ کر نیچے کو کیا اور چشم زدن میں اپنی دو انگلیوں سے گند سے ایک موٹا سا کیڑا اٹھایا اور نوجوان کے منہ میں زبردستی گھسیڑ دیا اور نوجوان کی حالت بری ہونے لگی۔

مگر لمحہ ہی گزرا تھا کہ نوجوان نے اپنے منہ میں مٹھاس کا احساس پایا، اور پھر نوجوان نے اپنے منہ میں ایسا ذائقہ محسوس کیا کہ دنگ رہ گیا نوجوان نے ایسا ذائقہ ابھی تک اپنی زندگی میں کبھی بھی کسی چیز میں محسوس نہیں کیا تھا۔

یہی نہیں بلکہ نوجوان نے دیکھا کہ جس ڈھیر پر بابا بیٹھے ہیں اور وہ نوجوان بھی جہاں موجود ہے وہ کچرے کا ڈھیر نہیں بلکہ گلاب کے پھولوں کا ڈھیر ہے۔

اور بابا جو کیڑے کھاتے تھے اور نوجوان کے منہ میں بابا نے جو کیڑا ڈالا تھا دراصل وہ کیڑا نہیں بلکہ وہ تو جنت نظیر خوش ذائقہ انگور تھے۔

بابا صاف ستھرے نورانی چہرہ سفید براق لباس میں موجود تھے۔

وہ سب دیکھ کر نوجوان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

کہ اتنے میں بابا کی آواز نوجوان کو سنائی دی۔

”دیکھ لیا تو نے اصل اور نقل میں فرق۔“

پھر نوجوان اس وقت جیسے ہوش سے بیگانہ اپنی راہ پر چلا گیا۔

اور پھر اس دن کے بعد کسی اور نے اور نہ ہی اس نوجوان نے اس کچرے کے ڈھیر پر بابا کو دیکھا۔

یہاں تک بول کر رولو کا رکا، پھر حکیم وقار سے بولا۔”حکیم صاحب دیکھا آپ نے کبھی بھی وہ سب نہیں ہوتا جو ہماری نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔“ اس دنیا میں بڑی بڑی خفیہ شکتی کے مالک لوگ ہیں، وہ دراصل وہ ہوتے کچھ ہیں اور نظر کچھ آتے ہیں۔“

یہ سن کر حکیم وقار رولو کا سے بولے۔” حکیم

صاحب آپ کا کہنا درست ہے۔‘‘

اب اس کے بعد پھر رولو کا بولا۔ ’’حکیم صاحب اب جو میں آپ کو واقعہ سنانے جا رہا ہوں اسے سن کر آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب کوئی انسان اپنے پیدا کرنے والے سے لو لگا لیتا ہے، اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگتا ہے تو دین و دنیا کا مالک اپنے چاہنے والے کو بے پناہ شکتیوں کا مالک بنا دیتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ جس ہستی کو رب کائنات بے شمار خفیہ شکتیوں سے نوازتا ہے اگر اس ہستی کو بھی کوئی مقدم سمجھنے لگتا ہے تو اس ہستی کے عوض چاہنے والا بھی بے پناہ خفیہ طاقتوں کا مالک بن جاتا ہے اور پھر جنم جنم تک لوگ اس کے شیدائی رہتے ہیں اور اس ہستی کو لوگ جیسے پوجتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک حقیقی واقعہ ہے۔

ایک بہت بڑی ہستی تھی وہ ہستی اپنے پیدا کرنے والے کی خوشی میں خوش رہتی تھی اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اس برگزیدہ ہستی نے اپنے خالق و مالک کے حکم پر اپنا سب کچھ لٹا دیا۔

یہی نہیں بلکہ اس برگزیدہ ہستی نے اپنے خالق کی خوشی کے لئے اپنی گردن کٹوالی۔

اب اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو اپنے خالق کی خوشی کے لئے اپنی گردن کٹوالے، اس سے اس کا خالق کس قدر خوش ہوا ہوگا، اور گردن کٹوانے والے کو کس قدر نوازا گیا ہوگا۔

جس نے اپنی گردن کٹوائی تھی اس ہستی کا ایک پرستار تھا۔ اس پرستار کا نام ایسا تھا کہ مسلمان سمجھتے تھے کہ یہ بزرگ ہم میں سے ہیں دوسری طرف ہندو سمجھتے تھے کہ یہ ہم میں سے ہیں۔ وقت گزرتا رہا، اور ان بزرگ کی عزت و احترام ہندو، مسلمان دونوں ہی کرتے رہے اور پھر ایک دن ان بزرگ کا وصال ہو گیا۔

وہ بزرگ اپنے کمرے میں مردہ پڑے تھے۔

ہندو چاہتے تھے کہ ہم ہندو رسم و رواج کے حساب سے ان کی چتا کو جلائیں گے کیونکہ یہ ہم میں سے تھے جبکہ مسلمان بضد تھے کہ ہم اپنے رسم و روایت کے طریقے سے دفن کریں گے۔

معاملہ بہت گھمبیر تھا بات بڑھتے بڑھتے خون خرابے تک جا پہنچی تو ایک بہت ہی عمر رسیدہ بزرگ نے یہ تجویز دی کہ ’’رات کو بابا کو ان کے کمرے میں ہی رہنے دیا جائے۔

چونکہ بابا بہت برگزیدہ ہستی تھے تو یقیناً اپنے چاہنے والوں کے حق میں نیک شگون معاملے طے کر دیں گے اور دنیا کا خالق و مالک بھی برگزیدہ ہستی کی لاج رکھتا ہے۔‘‘

اس بات پر ہندو اور مسلمان دونوں متفق ہو گئے اور بابا کا مردہ جسم کمرے میں رکھ دیا گیا اور لوگ صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

صبح کا سورج طلوع ہوا تو دونوں طرف کے لوگوں کی موجودگی میں دروازہ کھولا گیا، جب دروازہ کھولا گیا تو وہاں موجود تمام ہی لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوئے بنا نہ رہے کیونکہ کمرے میں جس جگہ بابا کا مردہ جسم پڑا تھا وہاں گلاب کے پھولوں کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ عمر رسیدہ صاحب آگے بڑھے جنہوں نے مشورہ دیا تھا کہ بابا کا مردہ جسم رات بھر کے لئے کمرے میں چھوڑ دیا جائے۔

انہوں نے با بلند آواز سے سب کو مخاطب کیا۔

’’بھائیو! دنیا کے خالق نے اپنے چاہنے والے کی خواہش کے لئے فیصلہ کر دیا ہے یعنی مسلمان اور ہندو گلاب کے پھولوں کو دو حصوں میں بانٹ لیں اور ہر ایک آدھا پھولوں کا ڈھیر اٹھا کر لے جائے اور اپنے اپنے عقیدہ و رسم و رواج کے مطابق استعمال کرے۔

مسلمان اپنے حصہ کے پھولوں کو دفنا دیں اور ہندو اپنے حصہ کے پھولوں کو چتا میں جلا ڈالیں۔

اس فیصلے پر مسلمان اور ہندو دونوں خوش ہو گئے اور اپنے اپنے عقیدے و رسم و رواج کے مطابق پھولوں کو آخری منزل تک پہنچا دیا۔‘‘

یہ سن کر حکیم وقار بولے رولو کا سے۔ ’’حکیم

صاحب اللہ والوں کی بات واقعی نرالی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے چاہنے والوں کو دین ودنیا میں دونوں جہانوں کی عزت سے نوازتا ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے چاہنے والے اور اپنے چہیتے بندے کے چاہنے والے کو عزت بخشی اور لوگوں میں ان کے نام سے ہونے والے خون خرابے سے بچالیا۔''

رولو کا حکیم وقار کی بات سن کر مسکرانے لگا پھر گویا ہوا۔''دنیا میں جتنے بھی مذاہب گزرے ہیں اور جتنے بھی مذاہب موجود ہیں ان سب میں خالق کائنات کے چاہنے والے آتے رہے ہیں اور اپنے رب کے حکم پر چلتے ہوئے رب کے حکم کو لوگوں تک پہنچاتے رہے ،اس کے عوض خالق کائنات نے اپنے تمام نیک بندوں کو وہ عزت بخشی ہے کہ وہ عزت اور شان وشوکت رہتی دنیا تک قائم ودائم رہے گا جس کی مثال ہمیں پوری دنیا میں نظر آتی ہے کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں لوگ دور دراز کے علاقوں سے چل کر برگزیدہ لوگوں کے استھان یا مزارات تک پہنچتے ہیں اور اپنی عقیدت کا ثبوت دیتے ہیں۔

دنیا کا خالق ومالک تمام لوگوں کے دلوں میں اپنے برگزیدہ بندوں کی چاہت ومحبت ڈالتا ہے اور اس اسی چاہت ومحبت کے پیش نظر اللہ کے برگزیدہ بندوں کی عزت کا سلسلہ چلتا نظر آتا ہے۔'' یہاں تک بول کر رولو کا خاموش ہوگیا۔

پھر چند لمحے بعد گویا ہوا۔'' حکیم صاحب میں ایک اور ہندو مذہب کا واقعہ سناتا ہوں جو کہ حقیقت پرمبنی ہے ان کے عقیدے کے مطابق اور ان کا کہنا ہے کہ یہ بالکل سچا واقعہ ہے ہندو جاتی کا عقیدہ ہے کہ انسان پیدا ہوتا ہے مرجاتا ہے اس کے بعد پھر دوسرے تیسرے چوتھے بلکہ باربار جنم لیتا ہے، مختلف شکلوں میں، مختلف جگہوں پر اور مختلف گھرانوں میں یا پھر مختلف جانوروں کی شکل بھی پیدا ہوتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ برنم گاؤں ، بیکانیر کی سرحد پر تھا۔ گاؤں کیا تھا آٹھ دس گھروں کا ایک پڑاؤ تھا پکی سڑک وہاں سے سولہ میل دور تھی۔ گاؤں میں ایک شخص پونم تھا جس نے ایک اونٹ بڑے شوق سے خریدا تھا اور وہی اب اس کی روزی کا سہارا تھا۔ وہ ہر روز قصبہ سے سواریاں بیٹھاتا اور انہیں پہنچا کر واپس اپنے گاؤں لوٹ آتا تھا۔

جیت پور کے پڑاؤ پر ایک چھوٹی سی دکان تھی دکان کا مالک ایک بنیا تھا۔ بہت ہی سیدھا سادا اور نیک مزاج اس نے ایک نیم کے پیڑ جھونپڑی ڈال رکھی تھی وہی اس کا گھر تھا اور وہی دکان، یہی جھونپڑی وقت بے وقت آنے والے مسافروں کے لئے سرائے کا کام بھی دیتی تھی۔ گرود اور پونم میں گہری دوستی تھی دونوں بڑے ایمان دار اور خدمت گزار تھے۔ اکثر رات ہوجانے پر پونم گردر کے پاس ہی ٹھہر جاتا تھا۔ روزگار میں بھی وہ ایک دوسرے کے مددگار تھے۔

اس دن پونم ایک دور کی سواری لے کر گیا تھا۔ کلکتہ سے ایک لالہ جی آئے تھے ،اپنے خاندان اور اسباب کے ساتھ، مزدوری اچھی تھی۔ وہ جاتے وقت گردر سے کہہ گیا تھا کہ'' کل شام تک لوٹ آئے گا۔ کوئی سواری آئے تو روک لینا۔''

گردر اپنی دکان کے سامنے بیٹھا حقہ پی رہا تھا کہ سامنے سے دومسافر آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ آگے آگے ایک نوجوان مرد تھا اور اس کے پیچھے ایک نوجوان عورت۔ قریب آنے پر گردر نے مرد کو پہچانا۔

''ارے تم ہو کنور صاحب۔ تاؤ راضی ہو؟ گاؤں میں سب اچھی طرح سے ہیں؟''

''ہاں سب تمہاری دعا ہے۔ گوپالی بہن سسرال جارہی ہے۔ اسے چھوڑنے جارہا تھا۔''

''کوئی فکر کی بات نہیں۔ پونم آتا ہی ہوگا میں اس سے کہہ دوں گا۔ وہ تمہیں پہنچا آئے گا۔ تم خبر کردیتے تو میں اونٹ وہیں بھجوادیتا۔''

''اچھا تم بیٹھو، میں حقہ لاتا ہوں۔ اتنے میں گوپالی اپنی تائی سے باتیں کرلے گی۔''

گوپالی اشارہ پاتے ہی جھونپڑی کے اندر چلی گئی۔ اس کی گود میں تین سال کا ایک بچہ تھا۔ گردر کی بیوی نے اسے ایک پیڑھے پر بیٹھا دیا اور لڑکے کو پیار سے کھلانے لگی۔ دونوں میں ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔

''کیوں ری گوپالی۔ اب تو ادھر کی یاد ہی نہیں کرتی ساس بہت زیادہ لاڈ پیار کرتی ہے کیا؟''

''جب کوئی بلائے گا تب ہی تو آؤں گی تائی۔''

''میں روٹی چڑھاتی ہوں۔ ایسے نہیں جانے دوں گی۔ تو آرام کر۔ میں سامنے کھیت سے ساگ توڑ لاتی ہوں۔''

گردر کی بیوی کھیت کی طرف چلی گئی اور گوپالی ادھر ادھر ٹہلنے لگی، جیسے اسے سواری کے لئے اونٹ کا سخت انتظار ہو اور وہ جلد سے جلد قصبہ پہنچ جانا چاہتی ہو۔

گوپالی کا بچہ ریت کے ایک ڈھیر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا کھیل رہا تھا اچانک ایک خوف ناک کالا سانپ کہیں سے آنکلا بچے نے طفلانہ ڈھنگ سے ریت کی مٹھی بھر کر اس پر پھینک دی۔ سانپ رک گیا اور پھن پھیلا کر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ وہ منظر رونگٹے کھڑا کر دینے والا تھا۔ بچہ فقیروں کی طرح سنجیدہ اور نڈر تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ اس قدر بے خوف تھا جیسے کسی ربڑ کے کھلونے سے کھیل رہا ہو۔ سانپ بھی اپنی قدرتی خصلت کو چھوڑ کر بچے سے کوئی تین فٹ کے فاصلے پر کنڈلی مارے بیٹھا تھا جیسے کسی نے کیل دیا ہو۔

بچے نے پھر ایک مٹھی ریت کی بھری اور سانپ کے اوپر پھینک دی۔ سانپ نے ایک پھنکار کے ساتھ اپنا پھن زمین پر مارا اور دھول کو ہوا میں اڑنے کے ساتھ پھر سیدھا تن کر کھڑا ہوگیا بچہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ اس نے پھر ریت پھینکا۔ سانپ پھر جھک گیا دونوں کا یہ کھیل برابر جاری تھا کہ اچانک گوپالی کی نظر سانپ پر پڑی اور وہ زور سے چیخ اٹھی۔

''ہائے میرا بچہ۔''

چیخ کی آواز سنتے ہی گردر دوڑ کر آیا گوپالی غیبی خطرے سے کانپ رہی تھی۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس نے بچہ کی طرف ناامید نظروں سے دیکھا۔ گردر پلک مارتے ہی سمجھ گیا۔ اس نے اشارے سے گوپالی کو روکا۔ گوپالی دوڑ کر بچے سے لپٹ جانا چاہتی تھی۔ چاہے اسے سانپ ہی کیوں نہ ڈس لے۔ وہ ہر قیمت پر بچے کو بچانا چاہتی تھی۔ ماں کا دل کچھ کرنے کو تڑپ رہا تھا۔ گردر نے اسے زبردستی روک لیا۔ اور آہستہ سے بولا۔

''نادانی مت کرو۔ ایشور پر بھروسہ رکھو۔ جانور بھی بچوں سے محبت کرتے ہیں۔ میں نے ایسی بہت سی کہانیاں سنی ہیں جن میں سانپوں نے بچوں کی حفاظت کی ہے۔ موت اور زندگی کا فاصلہ بہت تھوڑا ہے اگر سانپ کو چھیڑا گیا تو بچے کی جان خطرہ میں پڑ جائے ،شاید کچھ دیر بعد سانپ خود ہی چلا جائے۔''

گردر کہنے کو تو گوپالی کو دلاسہ دے رہا تھا مگر اس کا بھی دل کانپ رہا تھا اور وہ ایشور سے پرارتھنا کے علاوہ کچھ نہ کر سکتا تھا دھیرے دھیرے وہاں ایک چھوٹی سے بھیڑ جمع ہوگئی جسے بھی خبر ملی دوڑا چلا آیا۔ کسی کے ہاتھ میں بھالا کسی کے ہاتھ میں برچھا۔ کسی کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ سب لوگ موت کے اس فرشتہ سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ بچے کو بچانے کے لئے سب کے بازو پھڑک رہے تھے۔ وہ سب لوگ اس وقت بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار تھے۔ مگر سامنے آخر کہ سب بت کی طرح خاموش کھڑے رہ گئے۔ چپ چاپ کھڑے تماشہ دیکھنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ عورتیں رو رہی تھیں جھولی پھیلا پھیلا کر دعا میں مانگ رہی تھیں۔ مرد موقع کے انتظار میں تھے۔

گردر نے بہت سی ترکیبیں سوچیں۔ مگر بچے نے مجمع کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ سانپ کبھی کبھی سر گھما کر ادھر ادھر دیکھ لیتا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا لوگ ناامید ہوتے جا رہے تھے۔

اسی طرح چھ گھنٹے گزر گئے۔ اچانک پونم نے آکر اونٹ بیٹھایا۔ اس کے اترتے ہی کسی نے چلا کر کہا۔

"پونم چاچا سانپ ہے سانپ۔"

پونم نے فوراً اونٹ پر سے اپنی بندوق اتار لی اور بھیڑ کی طرف لپکا ایک لمحہ رک کر بولا۔

"اگر آپ لوگوں کو اعتراض نہ تو سانپ کو گولی مار دوں۔"

بھیڑ میں سے ایک ساتھ کئی آوازیں آئیں۔

"ہاں ماردو۔"

بھیڑ ایک طرف ہٹ گئی۔ پونم نے بندوق کا نشانہ باندھا اور سانس روک کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ لیکن سانپ اپنی جگہ سے ہلے تو وہ بندوق داغے۔ کام بڑا جوکھم کا تھا۔

یکایک دھڑاکا ہوا اور سانپ زمین پر لڑھک گیا۔ گردر نے دوڑ کر بچے کو گود میں اٹھالیا۔ ایک نوجوان نے لاٹھی سے سانپ کو اچھال کر جھاڑی کی طرف پھینک دیا۔ چاروں طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

گوپالی کا صبح کو اپنے سسرال جانا طے ہوا۔ اس جگہ گھنٹوں سانپ کی کہانیاں چلتی رہیں۔ کئی لوگوں نے کہا۔

"گوپالی تیرا لڑکا بڑا خوش قسمت ہے۔"

رات سب نے آرام اور بے فکری سے گزاری۔

سویرا ہوا تو گردر پونم کو جگانے گیا جب وہ بہت کوشش کرنے پر بھی نہیں اٹھا تو گردر بہت گھبرایا اس نے غور سے پونم کو دیکھا اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی سارا جسم نیلا پڑ گیا تھا گردر ایک دم چلایا۔

اسے تو کسی سانپ نے ڈس لیا ہے، کیا سانپ کو کل جلایا نہیں تھا؟ تب تو بہت برا ہوا ہے پرماتما بچے کی جان بچی تو اس کی جان گئی اب کیا کروں؟"

ایک لمحہ سوچنے کے بعد گردر نے اپنا فرض سوچ لیا۔ وہ اپنا سب کچھ دے کر بھی پونم کو بچانے کی کوشش کرے گا فوراً بہت سے لوگ سانپ کا منتر جاننے والوں کو بلانے کے لئے دوڑ گئے۔

گردر نے زمین کو گوبر سے لیپ کر تیار کیا۔ دودھ کے کٹورے بھر کر رکھے کئی گھڑوں میں کانسی کی تھالیاں رکھیں اور سانپ کو بلانے کے راگ شروع کر دیئے۔ گردر خود اس فن کا ماہر تھا۔ بہت سے منتر جاننے والے بغیر بلائے ہی خبر سن کر دوڑے چلے آئے اور اس طرح مسلسل تھالیاں بجنے لگیں اس دردناک ماحول میں تھالیوں کی جھنکار سے ایک عجیب سماں بندھ گیا تھا بیسیوں گلے ایک ساتھ درد بھرے سروں میں گارہے تھے۔

"سینسورے، راجہ داسکی!

آج تو ہے منائیں دھر دھیان

اوکھاری اس جنگل میں رے

کوئی کریوترت سہائے

ہے راجہ داسکی......!"

کتنے ہی سانپ باہر آئے مگر سب نے ہمت چھوڑ دی۔ سب سر ہلا کر رہ گئے۔

"بہت ہی خوف ناک سانپ نے ڈسا ہے ہماری طاقت سے باہر ہے۔"

مگر گردر نے ابھی تک ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ برابر تھالی پر جھکا ہوا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سانپ آیا اور ابھی آیا۔ اسی طرح تمام دن بیت گیا گوپالی کا مسئلہ اب بھی ویسا ہی بنا ہوا تھا۔ وہ کیسے اپنے سسرال پہنچے؟ وہ لوگ کیا سوچتے ہوں گے۔

سانپ کا منتر جاننے والے ایک ایک کر کے کھسکتے جارہے تھے تین گاؤں دور سمیرا بھنگی کے کانوں میں جب یہ بھنک پڑی اس وقت شام کے پانچ بجے تھے وہ اپنی جھونپڑی کے باہر بیٹھا حقہ پی رہا تھا جب گردر کی دکان کی طرف سے آتے ہوئے چھمن نے یہ خبر سنائی تھی سمیرا نے اپنی لاٹھی اٹھائی اور چل پڑا۔

اپنی اس ستر سال کی عمر میں اس نے کتنے ہی لوگوں کی جانیں بچائی تھیں وہ سانپ منتر کا مہاپنڈت تھا اور اسے فن پر اعتماد تھا۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ تھالیاں اب بھی بج رہی تھیں مگر دھیمی آواز میں۔ اسی وقت سمیرا داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر لوگوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ سمیرا نے پونم کے

منہ پر سے کپڑا ہٹا کر دیکھا اور پھر آہستہ سے پیچھے ہٹ گیا۔ گردر نے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔ ''دادا کچھ امید ہے۔؟''

''امید تو نہیں ہے، مگر میں اسے ایک گھنٹے کے لئے زندہ کرسکتا ہوں آگے ایشور مالک ہے۔ بہت تیز ہے تم سب ہٹ جاؤ۔ میں منتر پڑھتا ہوں۔''

سمیرا نے کچھ گنگنانا شروع کیا پانی کے چھینٹے مارے۔ پونم کے بدن میں حرکت پیدا ہوئی۔ لوگوں میں امیدیں لوٹنی شروع ہوئیں۔

سمیرا نے پھر پانی کے چھینٹے مارے۔ پونم اٹھنے کی کوشش کررہا تھا۔ سمیرا نے تیسری مرتبہ منتر پڑھا اور آواز لگائی۔

''کون ہے تو......؟ سامنے آ۔''

سمیرا کی کڑکتی آواز رات کے سناٹے میں دور تک گونج اٹھی۔ پونم بازو کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا تمام جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ سمیرا نے پھر کڑکتی آواز سے پوچھا۔

''بولتا کیوں نہیں۔ کیا چاہتا ہے؟''

سمیرا کی بات کا پونم نے سخت لہجہ میں جواب دیا۔

''یہ میرا دشمن ہے...... میں اس کی جان لے کے رہوں گا۔ تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ۔''

سب لوگ تعجب سے سن رہے تھے۔ سمیرا نے کچھ نرم ہو کر کہا۔

''اے ناگ دیوتا! تو اسے چھوڑ دے جان بخش دے۔ بے چارہ بہت غریب اور نیک ہے۔''

''مگر اس نے مجھے گولی ماری تھی۔ میری جان لینے کی کوشش کی تھی۔ میری خوش قسمتی سمجھو کہ پورب کی ہوا چل رہی تھی کہ میں پھر سے زندہ ہو گیا۔ مجھے اس پر بہت غصہ ہے۔ دشمن کی جان کیسے بخشی جاسکتی ہے؟؟''

''مگر تم نے بھی تو ایک معصوم بچے کو اور اس کی نروش ماں کو گھنٹوں پریشان کیا تھا اور فضول لوگوں کو ستایا تھا اس کا اس میں کیا قصور ہے؟''

''ہاں۔ میں یہ بات مانتا ہوں کہ میں اس بچے کے پاس تھا مگر میں نے اسے کوئی تکلیف نہیں دی۔ اصل میں اس نے ہی مجھے روک رکھا تھا۔''

ناگ دیوتا نے پونم کی زبان سے پھر کہنا شروع کیا۔ دراصل میں اس لڑکے کا مقروض ہوں۔ اس سے تین جنم پہلے کی بات ہے یہ میرا پڑوسی تھا میں کاشتکاری کرتا تھا یہ ساہوکار تھا۔ میرا اس کا دوستانہ تھا میں نے اس سے پانچ سو روپے قرض لئے تھے۔ لیکن قرض ادا نہیں کرسکا۔ اس طرح میرے تین جنم گزر گئے۔ مجھے اس کا قرض ادا کرنے کا موقع نہیں ملا۔ سانپ کے جون میں آئے ہوئے مجھے سو سال ہو گئے۔ میں آج کل گنگا کے کنارے رہتا ہوں۔

سو سال پورے ہو جانے پر میری خواہش یاترا کرنے کی ہوئی تھی اس سے پہلے میں ایک مرتبہ گاؤں پھر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس وقت اپنا گاؤں دیکھ کر واپس لوٹ رہا تھا کہ راستہ میں یہ لالہ مل گئے۔ اس نے روپوں کا تقاضہ کیا۔ میں مجبوری میں معافی مانگ رہا تھا اور یہ مجھے معاف نہیں کررہا تھا بلکہ مجھے لعنت ملامت کرتے ہوئے مجھ پر دھول پھینک رہا تھا۔ میں لاچار تھا۔ اپنی مجبوری بیان کررہا تھا، اتنے میں اس شخص نے مجھے گولی مار کر زخمی کر دیا۔''

سمیرا نے نہایت ادب سے کہا۔

''پھر بھی کوئی ترکیب بتایئے ناگ دیوتا، اس کی جان کیسے بچے؟''

''یہ میرا قرض ادا کردے تو میں اسے چھوڑ سکتا ہوں۔''

سمیرا نے اسی وقت دس روپے کرتے کی جیب سے نکال کر سامنے رکھ دیئے۔

گردر نے جھونپڑی میں جا کر سو روپے کا ایک نوٹ نکالا باقی روپوں کا فوراً چندہ ہو گیا، سمیرا نے سب روپے جمع کر کے گوپالی کے لڑکے کی جھولی میں ڈال دیئے۔ پونم آہستہ سے واپس لیٹ گیا۔ سمیرا نے پھر منتر پڑھا اور ایک کیل زمین میں گاڑ دی۔ چند لمحوں بعد وہی کالا سانپ تیزی سے پھنکارتا ہوا آیا اور اس نے

ایک چکر پونم کے چاروں طرف لگایا۔ پھر اس کے پاؤں کے انگوٹھے سے منہ لگا کر زہر سوچنے لگا۔ اس کے بعد ناگ دیوتا نے تین کٹوریوں میں سے دودھ پیا اور چپ چاپ چل دیئے۔

سب لوگ تعجب سے میرا کی کرامات دیکھ رہے تھے۔ پونم آنکھیں ملتا ہوا اٹھا جیسے وہ بہت دیر تک سوتا رہا ہو۔ تعجب سے اس نے اپنے چاروں طرف جمع ہوئے لوگوں کو دیکھا، مگر اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا تب گردر نے تمام قصہ اس سے بیان کیا۔

پونم نے خدا سے دعا مانگی۔

''اے خدا تو کسی کو مرتے وقت کسی کا قرض دار مت چھوڑنا۔''

اس کے بعد اس نے گردر سے کہا۔

''بھائی میرا اونٹ بیچ دو اور سب کا روپیہ واپس کردو۔'' مجھے خدا اور دے گا تو محنت مزدوری کر کے دوسرا اونٹ خرید لوں گا۔''

اور یہ دوسرا واقعہ ایک انسان اور ایک ناگن کی چاہت کا ہے۔ اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان ہی نہیں بلکہ جانور بھی اپنے دل و دماغ سے متاثر ہو کر کسی کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

ایک دن ایک شخص میرے پاس آیا وہ بہت پریشان تھا میرے پاس بیٹھتے ہی زاروقطار رونے لگا پھر جب وہ شانت ہوا تو اپنی بپتا سنانی شروع کی۔ میں بڑی امید و آس لے کر آپ کے پاس آیا ہوں آپ میری مدد ضرور کریں گے۔ میرا نام بہادر ہے۔

یہ حقیقت جو میں بیان کرنے والا ہوں ایک ایسی ناقابل فراموش حقیقت ہے جسے وقت اپنے سینے پر ہمیشہ محفوظ رکھے گا۔

مجھے اس واقعہ کو کہانی یا داستان کہتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے۔ کیونکہ میں جو گوشت پوست اور حرارت کا ایک جیتا جاگتا پتلا ہوں گزشتہ نصف صدی سے اپنے سانسوں میں اس کہانی کا زہر محسوس کر رہا ہوں لیکن یہ زہر اب میرے جسم اور روح کی احتیاج بن چکا ہے کیونکہ کبھی زہر کی شدت تریاق کا کام کرتی ہے اور کبھی تریاق زہر بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کہانی کے متعلق میں کسی لمبی چوڑی تمہید کا سہارا لے کر آپ کو بور نہیں کرنا چاہتا اسی لئے اب آپ یہ کہانی سن لیجیے۔

میری داستان خوش رنگ پھولوں سے لپٹے ہوئے ایک خوبصورت پتھریلے کانچ سے شروع ہوتی ہے جس میں اپنے بوڑھے والدین کے ساتھ رہتا تھا ہماری پہاڑی بستی سلسلہ کوہ کے نشیب میں پھولوں سے ڈھکی ہوئی ایک ایسی شاداب جنت معلوم ہوتی تھی جسے کسی نے پہاڑیوں کے قدموں میں لا رکھا ہو۔ میرا باپ اس علاقے کا سردار تھا، ساری بستی اس کا دلی احترام کرتی تھی اس کا حکم نہ ماننا گویا موت کو دعوت دینا تھا۔ بڑے بڑے قبائلی سردار اس کے حکم کی سرتابی نہ کر سکتے تھے میری پرورش شہزادوں کی طرح ہو رہی تھی لیکن میں ابھی چھوٹا ہی تھا۔

ایک روز میری ماں کو ایک زہریلے ناگ نے ڈس لیا۔ جوگی بلوائے گئے لیکن وہ کچھ نہ کر سکے میری ماں کا سانپ سے کاٹا جسم تڑپتا رہا میں بے بسی اور حیرت کی تصویر بنا یہ جاں سوز نظارہ دیکھتا رہا ماں کی موت کا یہ نظارہ بڑا ہی کربناک تھا جو میری روح کا زخم بن کر رہ گیا میں لاکھ کوشش کے باوجود اس نظارے کو اپنے تخیل سے ہٹا نہ سکا اور نہ ہی اپنے دل سے فراموش کر سکا میں سہما سہما اور اداس نظر آنے لگا۔ مجھے سانپ کے وجود سے نفرت ہوگئی۔

سانپ اور انسان ایک دوسرے کے ازلی دشمن ہیں۔ انسان سانپ کو دیکھتے ہی اس کا سر کچلتا ہے اور سانپ اسے ایڑی پر کاٹتا ہے، جب میں دس برس کا ہوا تو میرا جذبہ انتقام جنون کے درجے پر آپہنچا۔ میں پہاڑیوں اور جنگلوں میں چلا جاتا اور مختلف اقسام کے چھوٹے بڑے سانپ مار مار کر بے حد خوش ہوتا لوگ کہتے ہیں وقت ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔ لیکن وقت کا مرہم میری ماں کی حادثاتی موت کے زخم کو مندمل نہ کر سکا۔

سانپ سے نفرت اور انتقام کا جذبہ میری عمر کے

ساتھ ساتھ بڑھتا اور پرورش پاتا چلا گیا۔ اب میرے لئے مہلک ترین اور خطرناک سانپوں کو پکڑ لینا ایک معمولی بات تھی اور میں اسے ایک دلچسپ کھیل سمجھتا تھا میں اس کھیل سے اپنی جی بھی بہلاتا تھا اور اپنے جذبہ انتقام کو تسکین بھی پہنچالیتا تھا میں جب بھی کوئی سانپ پکڑتا تو میرا سر فخر سے اونچا ہوجاتا خون کی گردش تیز ہوجاتی آنکھوں میں شرارے رقص کرتے اور جب تک میں اس موذی کو مار نہ ڈالتا مجھے سکون نہ ملتا سانپ کا سر کچل کر مجھے جو روحانی مسرت محسوس ہوتی تھی اسے میں لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

کئی ماہ وسال اسی طرح گزر گئے بڑے بڑے جوگی، ناگپال اور سادھو حیران تھے کہ آخر میں اتنے خطرناک سانپ کیسے پکڑ لیتا ہوں جبکہ سانپ پکڑنے کا ان کے نزدیک ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ بین کی کوئی مدھر لے چھیڑ کر سانپ کو پہلے مست کردیتے اور پھر جب سانپ بانسری کے سحر میں مبتلا ہوکر سدھ بدھ کھو بیٹھتا تو وہ اسے ہولے سے پکڑ کر پٹاری میں بند کرلیتے لیکن بعض سانپ ایسے تھے جو پھن اٹھا کر جھومتے لیکن جب انہیں پکڑنے کی کوشش کی جاتی تو وہ بجلی کی سرعت کے ساتھ اپنا کام کرجاتے اور انہیں پکڑنے والا سپیرا چشم زدن میں موت سے ہم آغوش ہوجاتا۔

لیکن میں نے سانپ کو پکڑتے وقت کبھی بین کا سہارا نہ لیا تھا بلکہ میں سانپ کو ایسے پکڑتا تھا جیسے وہ کوئی بے ضرر کیڑا ہو میں خود حیران تھا کہ وہ کون سی شکتی یا طاقت ہے جو سانپ پکڑنے میں میری مدد کرتی ہے لیکن باوجود بار بار سوچنے اور غور وفکر کرنے کے میری سمجھ میں کوئی بات نہ آسکی تھی۔

بستی میں اب مجھے بہادر خان کی بجائے ناگ مار کہا جانے لگا تھا میں اب جوان ہوکر سانپوں کے متعلق اتنا کچھ جان چکا تھا کہ تجربہ کار مارندری، ناگپال اور سال خوردہ سادھو بھی نہ جانتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ میرے ذخیرے میں سینکڑوں اقسام کے سانپ تھے۔ اگرچہ یہ سبھی مردہ تھے لیکن میں ان سب کو بڑی حفاظت سے رکھتا تھا کیونکہ یہ میرے برسوں پہاڑیوں اور جنگلوں میں بھٹکنے اور جان جوکھوں میں ڈالنے کے نتیجے میں جمع ہوئے تھے۔ ان ایام میں جب میں نے بچپن سے نکل کر جوانی کی حدوں کو چھوا تو میرے دل میں ناگوں کے شہنشاہ شیش ناگ کو پکڑنے کی خواہش چٹکیاں لینے لگی۔

لیکن سانپوں کے بارے میں اتنا کچھ جاننے کے باوجود مجھے یہ علم نہ تھا کہ یہ ناگ کس مقام پر پایا جاتا ہے۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اس ناگ کو کہاں تلاش کیا جائے کہ ایک روز مجھے اپنی وادی کے کچھ فاصلے پر ایک جٹا دھاری سادھو آتا دکھائی دیا اس نے گیروے کپڑے پہن رکھے تھے پاؤں میں لکڑی کا چپل اور گلے میں منکوں کی مالا تھی اس سادھو کے بارعب چہرے سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا کا باسی ہے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی وادی کے قریب آکر اس نے مدھر لے میں بین بجائی تو یہ لے ایک لہر بن کر میرے رگ وریشے میں سرایت کرگئی نہ جانے یہ بوڑھا سادھو کن منزلوں کو طے کرتا ہوا ہماری روح پرور اور شاداب وادی میں داخل ہوا تھا۔ بھوکا پیاسا معلوم ہوتا تھا چنانچہ میں اسے بڑی عزت وتکریم سے اپنے کمرے میں لے آیا۔

ہم قبائلی لوگ مہمان نوازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے مہمان آجائے تو اسے اپنی انتہائی خوش بختی اور اللہ کی رحمت سمجھتے ہیں۔ میں نے سادھو کی تواضع دودھ اور تازہ پھلوں سے کی اور جب کچھ کھا پی کر اس کی جان میں جان آئی تو اس نے کمرے کو سونگھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''بچہ ہم تیری سیوا سے بہت آنند ہوئے ہیں جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں تو ناگ مار معلوم ہوتا ہے۔''

سادھو کی یہ بات سن کر میں حیران وششدر رہ گیا حالانکہ میں نے اسے اپنے بارے میں ابھی کچھ بھی نہ بتایا تھا اور نہ ہی اسے اپنے سانپ دکھائے تھے لیکن وہ کمرے کی بو سونگھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ یہاں بہت سے مردہ سانپ موجود ہیں۔ میں حیرت زدہ ہوکر اس سادھو کے چہرے کی طرف تک رہا تھا کہ سادھو کی ہلکی اور پرتقدس

آواز کمرے میں لہرائی۔ ''بچہ تمہیں اپنے متعلق کچھ بتانے کی ضرورت نہیں میں جان چکا ہوں تو ناگوں کا بیری ہے لیکن اب بیر کرودھ کو ترک کرکے تمہیں میرا ساتھ دینا ہوتا تاکہ ہم دونوں شیش ناگ کی تلاش کریں بچہ شیش ناگ کو پکڑنے کی آرزو میرے من کو بیس سالوں سے بیاکل کئے ہوئے ہے۔''

''شیش ناگ؟'' میرے منہ سے نکلا۔

''ہاں بچہ...... یہ وہ ناگ ہے جس کے نیچے سات بادشاہوں کا خزانہ دفن ہوتا ہے مگر شیش ناگ کو کوئی قسمت والا سادھو یا سپیرا پکڑ پاتا ہے یہ سانپ پراسرار شکتیوں کا مالک ہوتا ہے بس یوں سمجھ لو جس نے یہ ناگ پکڑلیا دنیا جہان کی بادشاہت اس کے قدموں میں آگئی۔ اس شیش ناگ کے سامنے چراغ الٰہ دین کی کوئی حقیقت نہیں میں برسوں گھنے جنگلوں میں اس کو تلاش کرتا رہا لیکن یہ ناگ نہ مجھے جنگلوں میں ملا نہ پہاڑوں میں۔ یہ ناگا پربت کی پہاڑی غار میں رہتا ہے اور پونم کی رات نیچے کھنڈر میں اتر کر اپنی مادہ کے ساتھ ملاپ کا لطف اٹھاتا ہے بچہ! یہ میری زندگی کا راز تھا جو میں نے تمہیں بتادیا بتاؤ تم اس مہم میں میرا ساتھ دوگے؟ لیکن ٹھہرو اس سے پہلے کہ تم کوئی فیصلہ کرو میں تمہیں بڑی سچائی کے ساتھ بتادینا چاہتا ہوں کہ بھگوان کی سوگند یہ سارا سفر پیتا کا سفر ہوگا تمہیں میرے ساتھ مصیبتوں کے پہاڑوں سے ٹکرانا اور بھوکا پیاسا رہ کر اپنے مقصد کا پالن کرنا پڑے گا۔ اب سوچ کر فیصلہ کرو کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟''

میں نے سادھو امرناتھ کی باتیں بڑی دلچسپی اور غور سے سنیں بھلا میں انکار کیسے کرسکتا تھا جبکہ شیش ناگ کو پکڑنے کی میری دیرینہ خواہش پوری ہورہی تھی چنانچہ میں اپنے تمام عزیز واقارب، پیارے چچا اور گھر کے سکھ کو خیر باد کہہ کر نگر نگر بھٹکنے والے سادھو امرناتھ کے ساتھ چل پڑا۔

ہم دونوں نے منزل پر منزلیں طے کیں گھنے جنگلوں کو عبور کیا اور بڑی ہی مصیبتوں، دشواریوں اور کٹھنائیوں کے بعد اپنی منزل کو آلیا۔ ہماری منزل ناگا پربت تھی جو بڑی پراسرار اور عجیب سی جگہ تھی چھوٹی بڑی ان گنت سیاہ پہاڑیوں کے درمیان ایک نیلے رنگ کا فلک بوس پربت کھڑا تھا اس پربت کی بلندی کا کچھ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا نشیب میں چند غار تھے جن کے دہانے بڑے بڑے وزنی پتھروں سے ڈھکے ہوئے تھے ان کے ساتھ ساتھ کچھ عمودی چٹانیں ایسی لگتی تھیں جیسے طلسمی غاروں کے اوپر نوکیلے پتھروں پرنگیرو حبشیوں کی لاشیں لٹک رہی ہوں امرناتھ کے چہرے پر ناگا پربت پہنچتے ہی بہار آگئی تھی وہ سفر کی ساری صعوبتوں کو بھول کر آنے والے خوشگوار دنوں کے تصور میں سرشار تھا کچھ یہی کیفیت میری تھی بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ میں سادھو امرناتھ سے کہیں زیادہ خود پرامید تھا تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

امرناتھ نے ناگا پربت سے کچھ فاصلے پر سنگھاسن جمالیا اور گیان دھیان میں مصروف ہوگیا کیونکہ اسے پونم رین کا انتظار تھا وہ دھونی رمائے بیٹھا رہتا اور میں وادی کے مرغزاروں میں نکل جاتا اور ان مرغزاروں کے شمال جانب سیب اور شفتالو کے درختوں کی بہتات تھی میں ان باغات سے پکے ہوئے سیب اور شفتالو توڑ لاتا اور ہم دونوں ان پھلوں سے اپنا پیٹ بھرلیتے ہمارے پاس اناج کا کچھ ذخیرہ بھی تھا مگر ہم اسے بہت کم استعمال کرتے تھے۔

آپ یقین کیجئے کہ ناگا پربت جیسے ویرانے پر آبادیوں کا حسن قربان کیا جاسکتا تھا اس کے دلکش اور روح پرور نظارے جنت سے کم نہ تھے ناگا پربت سے دو میل پرے تو آبادیوں کے چھوٹے چھوٹے آثار موجود تھے لیکن اس کے قریب کوئی بستی نہ تھی اس لئے جب امرناتھ کا جی سبزی ترکاری یا بھاجی کھانے کو چاہتا تو مجھے دو میل کا یہ سفر طے کرکے آبادی سے چیزیں خرید کر لانی پڑتی تھیں بلکہ میں تو اس بات کا منتظر رہتا کہ امرناتھ سبزی ترکاری کی فرمائش کرے تاکہ میں جی بھر کر سیر وتفریح کرسکوں میں چونکہ قبائلی علاقے کا باشندہ ہونے کی وجہ سے گوشت کا بہت رسیا تھا اس لئے میں

اپنے لئے ہر دوسرے تیسرے روز کوئی نہ کوئی شکار مار لاتا اور بھون کر خوب مزے سے کھاتا سادھو امرناتھ کو میرے گوشت خوری پر کوئی اعتراض نہ تھا البتہ وہ گوشت کھانا تو در کنار اسے ہاتھ لگانا بھی مہاپاپ سمجھتا تھا۔

اسی طرح کئی روز گزر گئے سادھو امرناتھ جاپ کرتا رہا اور جب پونم رین قریب آ گئی تو اس نے کھانا پینا بالکل ترک کر ڈالا اب اس کے چہرے پر ایک عجیب سا جلال آ گیا تھا شیش ناگ پکڑنے کی ساعت اب قریب تھی مگر اس نے میرے استفسار پر مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ جب وہ ساعت آ جائے گی تو میں تمہیں آگاہ کر دوں گا پھر دونوں اکٹھے یہ مہم سر کریں گے۔

راتوں کا وجود انسانوں کے لئے بڑا ہی مفید ہے رات سکون لے کر آتی ہے اور انسان کے تھکے ہوئے قویٰ کو نئی حرارت، نئی تسکین اور نیا جوش دے کر چلی جاتی ہے۔ انسان کی زندگی میں ان گنت راتیں آتی ہیں لیکن بعض راتیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو باوجود لاکھ کوشش کے فراموش نہیں کیا جا سکتا اور حقیقت ہے کہ میں بھی گانا پربت کی وہ حسین و دلفریب رات آج تک فراموش نہیں کر سکا۔

اس الف لیلیٰ رات کا تصور آتا ہے تو میں ایک نشہ سا محسوس کرنے لگتا ہوں۔ اس رات سادھو امرناتھ گیان دھیان میں مصروف تھا چاندنی چٹکی ہوئی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ رات دوسری راتوں سے مختلف ہے میرے دماغ پر گہری چھانے لگی اور میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

لیکن اچانک اس وقت میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جب سادھو امرناتھ نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے ہولے سے کہا۔ ''اٹھو بچہ، آج کی رات بڑی اہم ہے یہ رات پھر شاید کبھی نہ آئے بس دیر نہ کرو پونم کی یہی وہ رات ہے جس کا ہمیں انتظار تھا۔''

میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اور امرناتھ کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا آنکھوں میں امیدوار کامیابی کی ایک عجیب سی چمک تھی۔

ناگا پربت میں پونم کی یہ رات اتنی خوبصورت تھی کہ میں ششدر رہ گیا۔ ہر چیز نور میں نہائی ہوئی تھی سیاہ پہاڑیوں پر مخمل کی نورانی چادریں بچھ گئیں چٹانیں مسکرا رہی تھیں ایک عجیب سا سحر تھا جو چاروں طرف پھیلا ہوا تھا کستوری کی بھینی بھینی خوشبو فضا کو معطر کر رہی تھی۔ پھر رات کے سناٹے میں ناقوس کی گونج نے ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز کر دیں۔ سادھو امرناتھ کے چہرے پر بشاشت پھیلتی چلی گئی۔ اس نے اپنا پٹارا اور بین سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''اٹھو بچہ! شیش ناگ کا جوڑا اب پہاڑیوں سے نکل کر کھنڈر کی طرف آ رہا ہے۔ بھگوان کی سوگند ہم بھاگوان ہیں کہ ہمارے کانوں کو ناقوس کی آواز سنائی دی ورنہ لاکھوں ماندری، سپیرے اور سادھو تو یہ حسرت اپنے سینے میں لئے ہوئے ہی یہاں سے چلے گئے۔''

ہم دونوں اب بڑی تیزی سے پہاڑی راستے کو پھلانگتے کھنڈر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہم دونوں نے پہاڑی سفر کو بڑی آسانی سے طے کیا۔ جوں جوں ہم کھنڈر کی طرف بڑھ رہے تھے پراسرار آوازوں کا شور اور ناقوس کی گونج تیز ہوتی جا رہی تھی ہم بڑھتے رہے کستوری کی خوشبوئیں، چاندنی کے جلوے، فضا کا سحر اور ناقوس کی آوازیں تیز ہوتی چلی گئیں۔ ہم دونوں کھنڈر کے قریب پہنچ کر ایک چٹان کی آڑ میں چھپ گئے۔ اب ہماری نگاہیں کھنڈر کے وسط میں بنے ہوئے اس حوض پر گڑی ہوئی تھیں جس کے پانی پر ہری ہری کائی جمی تھی اس حوض کے سامنے پہاڑی پگڈنڈی کے بائیں جانب خودرو جھاڑیاں تھیں، یہ جھاڑیاں زیادہ لمبی نہیں تھیں۔

سادھو امرناتھ کی نظریں اب حوض سے اٹھ کر جھاڑیوں پر ٹک گئی تھیں میں اس کی بے چینی اور اضطراب کو دیکھ کر حیران تھا اب وہ بالکل مبہوت تھا اس کے سانس لینے کی آواز نہ آ رہی تھی۔ میں نے بھی اپنا سانس روک رکھا تھا۔

پراسرار آوازوں کا شور اور ناقوس کی آوازیں اب

مدھم ہوکررہ گئی تھیں پھردیکھتے ہی دیکھتے یہ آوازیں بالکل ختم ہوگئیں اور سکوت مرگ طاری ہوگیا لیکن اس سکوت کے طاری ہوتے ہی چاندنی پہلے سے پانچ گناہ زیادہ تیز ہوگئی جیسے چانداور ستاروں کا قافلہ پہاڑیوں کومنور کرتا ہوا کھنڈر میں اتر آیا ہو پھر جھاڑیوں میں تیز سرسراہٹ ہوئی فضا میں سیٹیاں بجنے لگیں۔

اور شیش ناگ کا چاند کا شیتل اور روپہلی کرنوں میں نہایا ہوا جوڑا جھاڑیوں سے نکل کر کھنڈر میں رینگنے لگا۔

سادھو امرناتھ ایک دم اچھل پڑا لیکن اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔

شیش ناگ کے اس جوڑے کی خوبصورتی اور سج دھج کو احاطہ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خالق کائنات نے انہیں مختلف رنگوں کے پھولوں سے بنایا ہو یا نور کے سانچوں میں ڈھال کر تخلیق کیا ہو ان دونوں کے جسم ہیرے اور جواہرات سے زیادہ چمکیلے تھے ۔شیش ناگ کے سر پر ایک خوبصورت قدرتی تاج تھا جس میں بیش قیمت نیلم جڑا ہوا تھا اس نیلم کی جگمگاہٹ اور چمک دمک کے سامنے نگاہ نہ ٹھہرتی تھی روشنیوں اور رنگوں کا ایک پراسرار اور سحر طراز جادو حوض کے کنارے سٹ آیا تھا ناگن سرمستی کے عالم میں جھوم رہی تھی اور ناگ کی آنکھوں کے سرخ یاقوت انگاروں کی طرح دہک رہے تھے پھر شیش ناگ کا یہ جوڑا ایک دوسرے سے لپٹ کر رقص کرنے لگا۔ان کا یہ رقص بڑا ہی دلچسپ اور حیرت ناک تھا۔ سانپوں کی ملن دوسرے تمام جانوروں سے نرالی، پرلطف اور حیرت ناک ہوتی ہے یہ بڑے ہی انوکھے انداز سے ایک دوسرے میں جذب ہوکر قربت کا لطف اٹھاتے ہیں جن لوگوں کو یہ ملن دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہی اس منظر کا صحیح لطف اٹھا سکتے ہیں۔

ہم دونوں کافی دیر تک اس جوڑے کی خوش فعلیوں کے منظر سے لطف اندوز ہوتے رہے ،پھر ایکا ایکی یہ منظر پورے جوش وشباب پر آ گیا تو ہم دونوں چٹان کی اوٹ سے نکلے،امرناتھ نے اس جوڑے کو پکڑنے کی ترکیب مجھے سمجھادی تھی اب ہم ایک نزدیکی جھاڑی میں چھپ گئے۔ سادھو امرناتھ نے بین پر منہ رکھ کر ہولے ہولے مدھم سی لے میں ایک بڑی دلفریب ،نشہ آور سحر طراز دھن چھیڑی تو ناگ جوڑا مست ہوکر رقص کرنے لگا۔اب ہم دونوں جھاڑی سے رینگتے ہوئے ان کی طرف بڑھنے لگے جوڑے پر ایک نشے کی کیفیت طاری تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ جوڑا نشے اور سرور سے بےخود ہو چکا ہے۔

سادھو امرناتھ نے بین بجاتے ہوئے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور بین بجاتے ہوئے اس جوڑے کے بالکل قریب کھسک آیا میں نے اس کا اشارہ پاتے ہی اس یک جان دو قالب جوڑے کو اچک کر پکڑا اور جلدی سے پٹاری میں بند کرلیا۔ پھر بین کی مدھر لے رک گئی سادھو امرناتھ نے اپنے ماتھے سے پسینہ خشک کرکے مجھے سینے سے لگالیا۔

''بچہ دھنی ہو آج ہم نے بہت بڑا معرکہ سر کرلیا ہے ناگوں کا شہنشاہ شیش ناگ اور اس کی دلہن اب ہمارے قبضے میں ہے۔روئے زمین کی تمام شکتیاں ہمارے چرنوں میں آپڑی ہیں آؤ اب سنگھاسن واپس چلیں۔'' وہ پٹاری لے کر خوشی سے میرے آگے آگے چلنے لگا میں بھی بےحد خوش تھا اتنی مسرت مجھے زندگی کے کسی بھی حصے میں نصیب نہیں ہوئی تھی ہم دونوں کامرانی کے نشے میں سرشار چلے جارہے تھے۔

اس وقت صبح صادق کے آثار ہویدا ہورہے تھے کہ سنگھاسن کے قریب پہنچ کر سادھو امرناتھ نے ایک بھاری پتھر سے ٹھوکر کھائی پٹاری اس کے ہاتھوں سے نکل کر نیچے آپڑی پٹاری سے سانپ بجلی کی سرعت سے باہر نکلا اور سادھو امرناتھ کو ڈستا ہوا تیزی سے چٹانوں کی طرف چلا گیا، میں یہ منظر دیکھ کر حواس باختہ ہوگیا تھا پھر بھی میں نے جلدی سے پٹاری کو بند کرلیا اور دوسرا سانپ آزاد نہ ہوسکا۔

سادھو امرناتھ کا رنگ ایکدم سیاہ پڑ گیا۔ سانپ آزاد ہوتے ہی چشم زدن میں گم ہوگیا تھا امرناتھ نے موت کی آخری ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔'' بچہ بھگوان کی

ہو میں اس کے بھائی کی لڑکی ہوں ابھی کچھ دن پہلے میرے پتا سورگباش ہوگئے ہیں اب میرا اس بھرے سنسار میں کوئی نہیں سوچا چچا امرناتھ کے ہاں چلوں اس لئے یہاں چلی آئی۔"

"لیکن...... لیکن سادھو امرناتھ تو اب اس دنیا میں نہیں وہ سورگباش ہوچکے ہیں۔"

"سورگباش ہوچکے ہیں؟" اس حور شمائل دوشیزہ کے سینے سے ایک دلدوز آہ نکلی اور میں نے دیکھا اس کی آنکھیں نمناک ہوگئی تھیں میرے ضبط کا بند بھی ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد میں نے اسے سادھو امرناتھ کی موت کا واقعہ سنایا تو وہ اور بھی مغموم ہوگئی اور بڑی دیر تک سوچ کی بھول بھلیوں میں کھوئی رہی آنسو اس کے دہکتے رخساروں پر پھسلتے رہے میں ٹکٹکی باندھے اس کی جانب ایسے دیکھنے لگا جیسے کوئی پجاری عقیدت سے کسی مقدس دیوی کی جانب دیکھ رہا ہو اس نے بھی آنکھیوں سے کئی بار میری طرف دیکھا لیکن جب بھی میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے ملتیں میرا دل لوٹن کبوتر کی طرح تڑپنے لگتا میری نگاہیں اس کی نگاہوں کے سامنے جھک جاتی تھیں اس نے میرا سکون غارت کرڈالا تھا اسے دیکھ کر میں سب کچھ بھول گیا تھا۔

اس کی محبت کا نور میرے رگ رگ میں سرایت کرگیا تھا البتہ میں اس بات پر حیران رہ گیا کہ پٹاری سے شیش ناگ کی مادہ بھی غائب تھی پٹاری بالکل خالی تھی مجھے سورگباشی سادھو امرناتھ اور اپنی محنت کے اکارت جانے کا جو دکھ ہوا تھا اس سے کہیں زیادہ مسرت اس نازنین کے آنے سے ہوئی تھی اس کے تنفس کی خوشبو سے جھونپڑا مہک اٹھا تھا۔ اس کا نام شوشی تھا۔ وہ ایک ملکوتی حسن کی مالک تھی۔

ہم دونوں ایک دو روز میں ایسے گھل مل گئے جیسے ایک دوسرے کو صدیوں سے جانتے ہوں اور پھر میں نے محسوس کیا کہ شوشی کے بغیر میری زندگی ادھوری اور بے مقصدی ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا چنانچہ میں نے اسے جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کرلیا اور جب میں نے اس سے اس خواہش کا اظہار کیا تو شوشی نے شرما کر گردن جھکالی۔ کتنا خوبصورت اقرار تھا یہ...... وہ بھی مجھ سے محبت کرتی تھی والہانہ محبت اس کے سینے میں ایک وفا شعار اور محبت کرنے والا دل تھا چنانچہ میں نے اس سے شادی کرلی۔

سہاگ رات کی رات انسان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن میں تو اسی رات شوشی سے خوف زدہ سا ہوگیا تھا نہ جانے کیا بات تھی جو وہ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہی تھی اور آنکھیں جھپکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے پیشانی پر سانپ کا نشان جسے میں نے پہلے غور سے نہ دیکھا تھا اب بڑا نمایاں تھا اور اس سے نور کے شعلے اٹھ رہے تھے۔ میرا جسم بید مجنوں کی طرح کانپنے لگا تو کیا شوشی ناگن ہے؟

کیا یہ کوئی پراسرار اور مافوق الفطرت ہستی ہے؟ میرے ذہن میں طرح طرح کے خیال آرہے تھے لیکن میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔ وہ بڑی دیر تک ٹکٹکی لگائے میری طرف دیکھتی رہی جیسے اس کی آنکھیں پتھرا گئی ہوں میں نے کئی بار لاتعداد بار آنکھیں جھپکی تھیں لیکن وہ آنکھیں جھپکتی ہی نہ تھی ہاں جب میں زیادہ ہی حیران اور خوف زدہ ہوا تو اس نے آنکھیں پھیر کر بڑی مترنم آواز میں کہا۔ "ڈرو نہیں پیارے میں چاہے کچھ بھی ہوں تمہاری اور صرف تمہاری ہوں میرا دل تمہاری محبت سے لبریز ہے اور ہمیشہ رہے گا۔" اور پھر اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "بہادر میں چاہتی ہوں کہ سالوں کو لمحوں میں بدل دوں اور اس پہاڑی نالے سے پرے پہاڑیوں کے وسیع دامن میں ایک محل تعمیر کراؤں، چھوٹا سا خوبصورت محل جو ہمارے لازوال پیار کی یادگار اور ایک ارغوانی جنت ہو بس دیکھنا کل ہی ہم اس محل میں شب عروسی منائیں گے۔"

میں شوشی کی یہ بات سن کر حیران رہ گیا میں پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر تمہارے ماتھے پر سانپ کا جگمگاتا ہوا نشان کیسا ہے؟ اور تم یہ محل کیسے تعمیر کراؤ گی جبکہ تم کسی

یہی اچھا تھی شیش ناگ آزاد ہوگیا لیکن اس کی مادہ پٹاری میں ہے خبردار، کہیں یہ بھی نہ بھاگ نکلے اور ہاں تم جھیل نگر میں جا کر میری کٹیا میں کچھ روز ضرور قیام کرنا کیونکہ میں نے سوگند کھائی تھی کہ اس کٹیا میں شیش ناگ والی پٹاری ضرور لاؤں گا اس طرح میری سوگند پوری ہو جائے گی اور میری آتما کو شانتی ملے گی۔ ہاں ایک بات اور یاد رکھنا کہ شیش ناگ بڑا ہی کینہ پرور ناگ ہوتا ہے، یہ انتقام لے کر رہتا ہے اس لئے کوشش کرنا کہ یہ کسی طرح پھر تمہاری گرفت میں آجائے۔ اگر تم نے شیش ناگ کو پکڑ لیا تو پھر آنند اور شانتی سے جیون بسر کرنا۔“

سادھو امرناتھ نے بڑی مشکل سے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں یہ چند باتیں مجھے بتائیں اور پھر اس موذی ناگ کے زہر کی تاثیر سے اس کا جسم سیال مادے کی شکل میں بہنے لگا میں سادھو امرناتھ کی حسرت ناک موت کا منظر زندگی کے آخری لمحوں تک فراموش نہیں کرسکتا۔ آج بھی وہ منظر میرے افق تخیل پر آتا ہے تو میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ہڈیاں تک پانی ہوگئی تھیں۔ اوہ میرے خدا کتنا روح فرسا اور دردناک منظر تھا۔

پھر میں سادھو امرناتھ کو اسی حالت میں وہاں چھوڑ کر اپنی گھائل روح اور زخمی پرندے کی طرح تڑپتے ہوئے دل کو لے کر جھیل نگر کی طرف چل پڑا جھیل نگر میں سادھو امرناتھ کی کٹیا مجھے بہت پسند آئی اس کے مقابل ایک پہاڑی نالہ بڑے جوش وخروش سے بہہ رہا تھا ہر طرف موتیے گلاب اور چنبیلی کے پھولوں کی بہتات تھی کٹیا کو چاروں طرف سے کیلے کے درختوں نے ڈھانپ رکھا تھا سبزہ زاروں میں طاؤس ناچ رہے تھے میں نے پٹاری کو مضبوط رسی سے باندھ کر کٹیا کے ایک کونے میں رکھ دیا اور مٹی کے تیل کا دیا جو کٹیا میں موجود تھا روشن کر کے چٹائی پر لیٹ گیا۔

رات زیادہ تو نہ ہوئی تھی لیکن سفر کی تھکان سے میں کسلمندی محسوس کر رہا تھا میرا سارا جسم بوجھل ہو رہا تھا اس لئے میں جھونپڑی میں بچھی ہوئی چٹائی پر لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

نصف شب کے قریب اچانک میری آنکھ کھلی تو جھونپڑی تیز روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ اور اس پٹاری کے گردان گنت سانپ سنپولئے تعظیم سے سر جھکائے کھڑے تھے میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید خوف سے گھگھی بندھ جاتی مگر میں چونکہ ناگ مار قسم کا آدمی تھا اس لئے بڑی دلچسپی اور حیرت سے اس منظر کو دیکھنے لگا۔ میں کافی دیر تک اس منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر میں نے دیکھا کہ صبح کے آثار نمودار ہوتے ہی پٹاری سے پھوٹنے والی روشنی ختم ہوگئی اور بھی رنگ برنگے سانپ سنپولیئے ایک ایک کرکے باہر نکل گئے۔

جھیل نگر کی صبح بڑی دلفریب تھی۔ میں جھونپڑی کا دروازہ بند کر کے پہاڑیوں کے قریب میں پھیلے ہوئے سبزہ زاروں کی طرف نکل گیا اور کافی دیر تک روح کو تازگی سے ہمکنار کرتا رہا پھر جب میں واپس لوٹا تو جھونپڑی کا دروازہ کھلا پایا میں حیران تھا کہ جھونپڑی کا دروازہ کیسے کھلا؟ میں نے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے جھونپڑی میں داخل ہوکر دیکھا تو حیران رہ گیا۔

اوہ میرے خدا میں نے دیکھا نرگس کے تازہ پھولوں کی طرح شفاف آنکھوں، دہکتے رخساروں پھڑکتے ہوئے گلابی ہونٹوں والی ایک پتلی سی نازنین بڑی مانوس نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے متبسم چاند جیسے چہرے نے میری آنکھیں چندھیا ڈالیں۔ اس کے لبوں پر ہلکا ہلکا دلفریب سا تبسم تھا۔ سر پر ننھے منے شگفتہ پھولوں کا تاج رکھے وہ کسی مندر کی دیوداسی معلوم ہوتی تھی۔

میرا دل یکبارگی بڑے زور سے دھڑکنے لگا دھک، دھک، دھکا دھک اس نے شاید میری یہ کیفیت بھانپ لی تھی وہ بڑے ہی دلفریب انداز میں مسکرائی۔ میں اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکا اور میں نے نگاہیں پھیر کر پوچھا..... ”کون ہو تم..... اور یہاں کس لئے آئی ہو؟“

اس پر وہ بولی۔ ”تم سادھو امرناتھ کو جانتے ہی

کسی راجکماری کی خواب گاہ معلوم ہوتا تھا۔ حویری پردوں کے پیچھے خوبصورت پلنگ پر پھول ہی پھول بکھرے ہوئے تھے لیکن اس وقت جب میں نے سرخ پھولوں کی شہزادی کا گھونگھٹ الٹ کر سہاگ کا مزہ لوٹنا چاہا۔

اچانک ایک خوف ناک پھنکار سنائی دی اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے جسم کو کسی نے مضبوط رسیوں سے جکڑ ڈالا ہے میرا سانس گھٹنے لگا محل کی روشنیاں ایکدم گل ہوگئی تھیں اندھیرے اور گرمی سے میرا دم گھٹنے لگا۔

پھر اچانک نیلی نیلی سی روشنی کی ایک لہر میں مجھے یوں دکھائی دیا جیسے میں کسی غار میں ہوں میں نے اپنے بدن میں دکھن محسوس کی اور ہولے ہولے آنکھیں کھول کر دیکھا تو میرا جسم ایک مردم آزاد اژدھے کی خوف ناک لپیٹ میں تھا۔ وہ مجھے اپنے وجود میں جکڑے ہوئے تھا پھر چند لمحوں بعد میری ہڈیاں کڑکڑانے لگیں تو میں چیخ اٹھا۔

اپنی چیخ کے ساتھ ہی مجھے شوشی کی دلدوز چیخیں سنائی دیں۔ اب وہ میرے سامنے کھڑی تھی اور اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ میں اس کے ماتھے پر جگمگانے والے سانپ کے نشان کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا وہ کانپ رہی تھی اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اس نے چیخ کر کہا۔ ''ناگ دیوتا کے لئے اسے چھوڑ دو شیشن۔ شیشن اسے چھوڑ دو۔ یہ بالکل بے گناہ ہے۔ قصور تو میرا ہے شیشن۔ مجھے سزا دو۔ جرم میں نے کیا ہے۔ پاپن میں ہوں۔ شیشن، شیشن، ناگ دیوتا کے لئے اسے آزاد کردو۔''

وہ مجھے اس موذی اژدھے کی گرفت سے رہا کرانے کے لئے منتیں کر رہی تھی لیکن اژدھے کی پھنکار لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ اب اس کے منہ سے چنگاریاں برسنے لگی تھیں۔ یہ شاید شدید غصے اور ناراضگی کا اظہار تھا۔

شوشی گڑگڑاتی رہی لیکن اس موذی ناگ نے اپنی گرفت ڈھیلی نہ کی۔ اس کی وحشت ناک پھنکاروں سے گرنے والے شعلوں سے غار میں انگارے جلتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

اب شوشی غصے میں آگئی۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ''شیشن اسے چھوڑ دو۔ میں کہتی ہوں شیشن میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی لیکن اسے آنچ نہ آنے دوں گی۔''

اس پر پھنکار ہی پھنکار میں مجھے اس ناگ کا ایک قہقہہ سنائی دیا۔ شاید اس نے شوشی کی اس دھمکی پر بھرپور قہقہہ لگایا تھا اور اس قہقہے کے ساتھ ہی میں نے دیکھا شوشی منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی۔ اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ ''ساپارا سمپا۔ ساپارا سمپا۔'' کچھ دیر بعد میں نے دیکھا۔ اب وہ ایک ناگن کی شکل اختیار کر رہی تھی۔ اس کا نچلا نصف حصہ ناگن کا ہوگیا اب وہ اس موذی کے سامنے غصے سے پھنکارنے لگی۔

دونوں کافی دیر تک پھنکارتے رہے نہ جانے ان دونوں کی کیا گفتگو ہوئی مگر سانپ کی گرفت ڈھیلی محسوس کرتے ہی میں نے آزاد نہ ہوسکتا تھا۔ اب ناگ کے منہ سے جھڑنے والے شعلے ختم ہوگئے اور اس کے تاج میں جگمگانے والے نیلم کی نیلی نیلی سی مدھم روشنی میں، میں نے شوشی کو دوبارہ انسانی روپ اختیار کرتے ہوئے دیکھا لیکن اب غصے کی بجائے اس کے چہرے پر تھکن اور مایوسی کے آثار جھلک رہے تھے۔ اس کے عارضوں کے گلاب بجھے بجھے اور کملائے ہوئے تھے۔

موذی ناگ اب مجھے اپنی گرفت میں لئے غار میں آگے کی جانب بڑھنے لگا شوشی بھی ہمارے ساتھ ساتھ قدم بڑھانے لگی اور پھر دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خلاء کی لامحدود وسعتوں میں بھٹک رہا ہوں شوشی کا سایہ لہراتا ہوا ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اب ہم ایک عجیب وغریب تہہ خانے میں تھے، اس کے اندر کا حصہ کوئی صدیوں پرانا مندر معلوم ہوتا تھا جس کے اندر ہزاروں سانپ اپنی لہو چاٹنے والی سرخ زبانیں نکالے میری جانب دیکھ کر غصے سے پھنکار رہے تھے۔ عود، عنبر، لوبان اور اگربتیوں کی تیز خوشبو میں پھیلتی جارہی

راجہ مہاراجے کی لڑکی نہیں ہو۔لیکن میری زبان گنگ ہوگئی جیسے میری قوت گویائی سلب ہوکر رہ گئی ہو وہ میری طرف محبت سے دیکھ رہی تھی میں بھی اس کی محبت میں ایسا گم ہوا کہ سب کچھ بھول گیا ساری باتیں، اوراس سے سارا خوف جاتا رہا۔ ہم کافی دیر تک راز و نیاز میں کھوئے رہے۔ا

اگلی رات خوشبوؤں میں بسی ہوئی تھی، شوشی عروسی جوڑے میں میرے سامنے تھی۔ اس کی آنکھیں غیر فانی محبت سے معمور تھیں، میں اس کا حسن وشباب اور راجکماریاں جیسا لباس دیکھ کر حیران تھا حقیقت تو یہ ہے کہ شاعروں نے جتنے سراپے لکھے ہیں۔ مصوروں نے جتنی تصویریں بنائی ہیں سنگ تراشوں نے جتنے جسمے تراشے ہیں اور دنیا والوں نے جتنی دلفریب مورتیں دیکھی ہیں۔ وہ ان سب سے حسین شاہکار تھی شوشی کا رنگ اس رات مسرت سے گلنار ہو رہا تھا جب ہم دونوں جھونپڑی سے باہر نکلے تو بانس کے درختوں کی جھنڈ پر پونم کا چاند ہولے ہولے ابھر رہا تھا میں نے شوشی کی جانب دیکھا تو مجھ پر مدہوشی چھاگئی اور سارے بدن میں خوشبو کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہ اس سے سرخ لباس پہنے چاند کی دودھیا روشنی میں بہت ہی پیاری، دلکش اور سندر نظر آرہی تھی۔ اس کے لباس سے خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔

آج اس کے گھنیرے بالوں میں چمپا کی آدھ کھلی کلیوں کا تاج سجا ہوا تھا اس کے حسن میں ایک لاہوتی دلنوازی آگئی تھی ہوا کے جھونکوں میں مخمور سے ہوکر ہم دونوں نالے کے اس پار پہاڑیوں کے دامن کی طرف چلے جا رہے تھے جہاں ہم نے سہاگ کی رات کے مزے لوٹنے تھے ہمارا سفر لمبا نہ تھا چنانچہ ہم بہت ہی جلد نالے کو عبور کرکے پہاڑیوں کے دامن میں آپہنچے لیکن وہاں پہنچ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کیونکہ اب وسیع میدان کی جگہ وہاں پر ایک چھوٹا سا خوبصورت محل کھڑا تھا اس محل کے محرابوں اور گنبدوں پر نورانی جگمگاہٹوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آفتاب نصف النہار پر ہے ہم اس محل کے اندر داخل ہوئے تو عجیب سماں تھا ایک خوبصورت کمرے میں بڑے بڑے قیمتی قالین اور غالیچے بچھے تھے۔ فانوس جگمگا رہے تھے۔ یہ کمرہ شاہی سازوسامان سے پوری طرح آراستہ وپیراستہ تھا، یہاں کی چیزیں اتنی عمدہ اور شاندار تھیں کہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی تھیں۔

شوشی میرا ہاتھ تھامے ہولے ہولے اس کمرے میں آگئی۔اس نے مجھے ایک زرنگار کرسی پر بیٹھا دیا میں چشم حیرت یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ آخر یہ سب کیوں اور کیسے ہوگیا.....؟ میری سمجھ میں کوئی بات نہ آرہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے ایک خوبصورت میز پر چاندی اور سونے کی طشتریوں میں انواع اقسام کے کھانے چنے ہوئے دیکھے ان کے ساتھ ہی پھل اور مشروبات بھی تھے نہ جانے یہ اہتمام کس نے کیا تھا.....؟ میں سوچ سوچ کر تھک گیا تھا میری عقل جواب دے چکی تھی۔''خدایا یہ سب کیا ہے۔ کیا شوشی اتنی بڑی شکتیوں کی مالک ہے کہ اس نے ایک ہی دن میں یہ محفل اور سارا ساز وسامان مہیا کرلیا.....؟'' میں ابھی سوچوں میں گھرا ہوا تھا کہ شوشی کی شہد سے میٹھی اور آبشاروں سے کہیں زیادہ مترنم آواز سنائی دی۔

''بہادر پیارے تم نے جانے کن لاحاصل سوچوں میں کھوگئے ہو کھانے کا وقت ہوگیا ہے آؤ۔ پہلے کھانا کھالیں پھر ہم دونوں نے کھانا بڑے مزے سے کھایا اور جب طرح طرح کی نعمتوں سے سیر ہوگئے تو اس کمرے سے باہر نکلے کمرے کے باہر بے شمار لڑکیوں نے ہمارا سواگت کیا لیکن یہ دیکھ کر میرا جسم سن ہوگیا کہ ان لڑکیوں کے نچلے دھڑ ناگنوں جیسے تھے پھر یہ لڑکیاں جو شاید سب کی سب خوبصورت باندیاں اور کنیزیں معلوم ہوتی تھی دائیں بائیں مودب ہمارے ساتھ چلنے لگیں۔

رات اب بھیگتی جارہی تھی چنانچہ شوشی کی ان کنیزوں اور سکھیوں نے اسے حجلۂ عروسی میں پہنچادیا۔ حجلہ عروسی کی غیر معمولی سج دھج دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ یہ

وہ زیادہ دیر کھڑی نہ ہوسکی اور بلند قامت ناگ
دیوتا کے سامنے دوزانوں ہوگئی اس کی آنکھیں بند تھیں
وہ دونوں ہاتھ جوڑے بنتی کررہی تھی۔

ناگ دیوتا کی انجن کی گڑگڑاہٹ جیسی آواز
پھر گونجی۔ ”ابھاگن تو نے پوری ناگ جاتی کے ساتھ
غداری کی ہے تو نے شیش کے سچے اور پوتر پریم کو ٹھکرا
کرایک آدم زاد کی پتنی بننا قبول کرلیا، تو نے یہ بھی نہ سوچا
کہ ناگ اور آدم زاد ایک دوسرے کے جنم جنم کے بیری
ہیں۔ اس طرح تو نے ناگ جاتی کے بیری سے دواہ
کرکے ہماری مہاشکتیوں کا اپمان کیا، ہماری اچھا تو یہی
تھی کہ تجھے اور اس ملیچھ ناگ مار کو ابھی اور اسی سے نشٹ
کردیتے مگر نہیں۔ تم میں سے ایک کو ہی نشٹ کیا جائے گا
اور ایک کو نمونہ عبرت بناکر زندہ رہنے دیا جائے گا اسے
مانگے سے بھی موت نہ آئے گی۔“

”مہاراج۔ دیوتا۔ میرے دیوتا۔ مجھ ابھاگن
کو ہی نشٹ کردیجیے۔ میں ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں میں
اپنا بلیدان دے کر اسے بچانا چاہتی ہوں۔ میں بلیدان
دینے کو تیار ہوں۔“

ناگ دیوتا کی خوف ناک آواز پھر گونجی۔ ”ہم
تمہارا بلیدان لینے کو تیار ہیں لیکن یہ منش زندہ رہے گا۔
اپنی کرنی کا پھل بھگتنے کے لئے کیونکہ اس کے ہاتھ
ہمارے سینکڑوں جوانوں، بچوں اور بوڑھوں کے خون
سے رنگے ہوئے ہیں۔ شیش اسے پونم کی رین ڈستا رہے
گا ہمارا اور ہماری جاتی کا زہر اس کی رگوں میں دوڑے گا
پرورش پائے گا۔ لیکن یہ مر نہ سکے گا۔“

اس کے بعد خوف ناک پھنکار کی آواز سنائی دی
اور ناگ دیوتا کے منہ سے آگ کا شعلہ تیزی سے
آکر شوشی کے گلابی بدن پر آگرا۔ جیسے کسی آتش فشاں
نے لاوا اگلا ہو، شوشی کی بھیانک اور دلخراش چیخیں
مندر میں پھیلتی چلی گئیں اور میں نے دیکھا اس کا سارا
گوشت چڑچڑ کرکے جلنے لگا، وہ موت سے ہم آغوش
ہوچکی تھی۔ اب ناگ مندر میں اس کا استخوانی ڈھانچہ
میرے سامنے پڑا تھا۔ میں اس منظر کی تاب نہ لاسکا
اور بے ہوش ہوگیا جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے گھر میں
پلنگ پر پڑا کراہ رہا تھا۔ نہ جانے ناگ مندر سے مجھے کون
اٹھا کر لایا، یا کس کی شکتی نے مجھے میرے گھر پہنچایا۔

اس واقعہ کو پچاس سال گزر چکے ہیں ہر ماہ جب
پونم کا چاند اپنی شیتل کرنوں سے دھرتی کو منور کرتا ہے
تو مجھے اپنے جسم میں اکڑن محسوس ہوتی ہے۔ میری
ہڈیاں کڑکڑاتی ہیں۔ خون کی گردش تیز ہوجاتی ہے ایسا
معلوم ہوتا ہے جیسے شیش ناگ نے مجھے پوری قوت سے
اپنے وجود میں جکڑ لیا ہے۔ پھر اس موذی کا ڈنگ مجھے
اپنے جسم میں زہر بکھیرتا محسوس ہوتا ہے۔ میری نبضیں
ڈوبنے لگتی ہیں۔ پسینے سے شرابور ہوجاتا ہوں اس وقت
میں حالت نزع میں ہوتا ہوں۔ مگر موت میرے قریب
بھی نہیں پھٹکتی۔ اس موقع پر جب زہر میرے وجود میں
پھیلتا ہے تو شوشی کا خوبصورت اور کنول سا چہرہ میری
آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ میں تصور کی آنکھوں
سے اس کا جسم بھسم ہونے کا منظر دیکھتا ہوں اور شوشی
شوشی پکارتا ہوا پاگلوں کی طرح بستر سے اٹھ کر پہاڑیوں
کی طرف بھاگنے لگتا ہوں۔ خدایا...... اوہ میرے
خدایا...... شوشی کو میں آج تک نہیں بھول سکا۔ اس کی یاد
میرے سینے میں ابدالابد تک محفوظ رہے گی۔ ”شوشی آہ
شوشی......“

رولو کا حکیم وقار سے بولا۔ ”حکیم صاحب یہ
بہادر کی پوری روداد جو کہ پچاس سال سے ہر پونم کی
رات بہادر کرب و اذیت سے دوچار ہوجاتا۔ بہادر کی
حالت واقعی افسوس ناک تھی، پوری روداد سنانے کے بعد
وہ سسکیوں سے رونے لگا۔

اس کی حالت واقعی قابل رحم تھی، میں نے اپنے
دل میں ایک عجیب سا درد محسوس کیا اور میں نے اس سے
وعدہ کرلیا کہ ”بہادر آپ گھبرائیں نہیں، صبر کریں اور
جہاں اتنے سال آپ نے اذیت برداشت کی تو چند دن
اور ہمت سے کام لیں میں اپنے تئیں ہر ممکن کوشش کروں
گا کہ آپ کو اس اذیت سے چھٹکارا دلا سکوں۔

مجھے قوی امید ہے کہ اب آنے والی پونم کی رات

تھیں لیکن اس سمے میرا دل ڈوب رہا تھا نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس ناگ مندر میں مٹی کے دیئے اور موی شمعیں خود بخود جگمگا اٹھیں ،مندر کا ذرہ ذرہ بقعہ نور بن گیا اور اس تیز روشنی میں سنگ مرمر کے خوبصورت چبوترے میں سون کا ایک بہت بڑا ناگ پھن پھیلائے میری جانب غصے سے اور نفرت سے گھورتا ہوا دکھائی دیا۔ ناگ دیوتا کے اس مجسمے کے نیچے لڑکیوں کی ایک قطار ہاتھ باندھے کھڑی تھی پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے دیوتا کے چبوترے کے سامنے اس کے قدموں میں تازہ پھولوں کا ایک انبار لگ گیا اور بھی لڑکیاں تعظیماً ناگ دیوتا کے سامنے جھک گئیں اسی لمحے مندر میں لٹکے ہوئے ناقوس اور مختلف ساز جنہیں کوئی بھی بجانے والا نہ تھا خود بخود بجنے لگے سازوں اور ناقوسوں کی ملی جلی آوازیں اتنی دہشت ناک تھیں کہ میری روح تک لرز اٹھی۔

ناگ دیوتا کے سنگھاسن تلے کافوری شمعیں روشن ہوتے ہی لڑکیوں کے پاؤں حرکت میں آگئے اور وہ ہولے ہولے رقص کرنے لگیں۔ سازوں اور ناقوسوں کی آوازیں تیز ہونے کے ساتھ ساتھ رقص بھی تیز ہوتا گیا مجھے اس رقص سے بڑی وحشت محسوس ہو رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے موت کے عفریت میری نگاہوں کے سامنے رقص کر رہے ہیں ،پھر اسی وقت ناگ دیوتا کے چبوترے سے گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی اور مندر میں لٹکی ہوئی گھنٹیاں خود بخود بجنے لگیں گھنٹیاں بجتے ہی شوشی لہراتی بل کھاتی اور گھنگھروؤں کی تانیں اڑاتی آگے بڑھی اور ناگ دیوتا کے طلائی مجسمہ کے نیچے جھوم جھوم کر ناچنے گانے لگی۔ وہ ناچتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ''دھرتی اور آکاش کے ایشور۔ میں یہ رقص کی بھینٹ اس لئے دے رہی ہوں کہ تو میرے پاپ کو نظرانداز کر دے۔ مجھے شما کر دے بھگوان۔ میں تیرے چرنوں کی داسی ہوں میں نے صدیوں تیرے چرنوں پر اپنے پیار اور عقیدت کی افشاں بکھیری ہے۔ دھرتی اور آکاش کے مالک۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور تھی اس لئے اس منش کو اپنا بنا بیٹھی اب وہ میرا سرتاج ہے۔ میرے جسم و جان کا مالک ہے بھگوان تجھے اپنی شکتیوں کی سوگند میں پناہ لینے آئی ہوں شیش اسے مارنے پر تلا ہوا ہے فیصلہ تیرے ہاتھ ہے دیوتا۔ تیرے چرنوں کی داسی اس منش کو تیرے سامنے لے آئی ہے یہ بالکل بے گناہ ہے بھگون عظیم دیوتا اسے معاف کر دے اور ہم دونوں کو آگیا دے کہ ہم اس دنیاوی زندگی میں اپنا جیون اکٹھے بسر کرسکیں۔ دھرتی اور آکاش کے ایشور......اے ناگ دیوتا۔ اے ناگ دیوتا......''

شوشی ناچتی ہوئی ناگ دیوتا کے سنگھاسن کے قدموں میں گر پڑی اس کی حالت دیکھنے کے قابل تھی وہ زاروقطار رو رہی تھی آنسو اس کے رخساروں کو بھگوتے ہوئے نیچے گر رہے تھے اس کی ہچکیوں کی آواز سے میرا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔

آہ بے چاری میری زندگی بچانے کے لئے کتنی پریشان تھی۔ کاش شیش ناگ مجھے غار میں ہی ڈس لیتا اور میں یہ منظر دیکھنے کے لئے زندہ نہ ہوتا۔ میں نے کئی بار دل ہی دل میں اپنی زندگی پر لعنت بھیجی شوشی ناگ دیوتا کے قدموں میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر فریاد کر رہی تھی۔

اور اچانک گھنٹیاں خاموش ہوگئیں سکوت طاری ہوگیا کامل سکوت، گہرا سناٹا سانس لینے کی آواز یا ہلکی سی پھنکار بھی سنائی نہ دے رہی تھی پھر مندر کے اس بھیانک سناٹے اور پراسرار سکوت میں ہوا کا ایک تیز ابلتا ہوا اور انتہائی گرم جھونکا اندر گھس آیا جیسے کسی انتہائی زہریلے اژدھے نے غصے اور نفرت سے لاوا اگلا ہو اور پھر واقعی ایک گھمبیر اور خوفناک پھنکار سنائی دی طلائی پھن میں جان پڑ گئی اور ناگ دیوتا کی آواز مندر میں گونجی۔ ''شوشی اٹھو......اٹھو شوشی۔'' یہ آواز سنتے ہی شوشی خوف سے لرزتی کانپتی اٹھ بیٹھی لیکن وہ لڑکھڑا رہی تھی اس کا گلابی جسم بری طرح لرز رہا تھا۔

غار میں پچاس سال پہلے ایک معاملہ ہوا تھا اور وہ معاملہ یہ تھا کہ ان ناگ ناگنوں میں سے ایک ناگن ''شوشی'' تھی جو کہ ایک آدم زاد بہادر سے محبت کر بیٹھی تھی۔

اور میں مانتا ہوں کہ شوشی نے سانپ جاتی کے قانون کو توڑا تھا۔

اور پھر سانپ جاتی قانون کے تحت شوشی کو اپنی جان دینی پڑی تھی۔

اور یہی نہیں بلکہ اس کا محبوب جو کہ آدم زاد تھا شوشی کی موت کے بعد اسے ایک ناقابل برداشت اذیت سے دوچار کردیا گیا۔

اور وہ اذیت ہر پونم کی رات میں وہ جھیلتا ہے جو کہ اس کے ناقابل برداشت ہوتا ہے، اور یہ سلسلہ پچاس سال سے ہورہا ہے۔

اور اذیت کا یہ سلسلہ پونم کی رات میں یہ شیش دیتا ہے اور میں اسی سلسلے میں آیا ہوں۔'' یہاں تک بول کر رولوکا خاموش ہوگیا۔

رولوکا کی باتیں سن کر ناگ دیوتا بولا۔''مہاپرش۔آپ کی ساری باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں لیکن شوشی اور آدم زاد بہادر نے سانپ جاتی کا اٹل قانون توڑا تھا۔ اور انہیں سزا ملی۔''

یہ سن کر رولوکا بولا۔''آپ کو حق پہنچتا ہے کہ آپ سزا دیں، مگر ایک حد تک آپ نے شوشی کو موت سے ہمکنار کردیا...... چلئے بہادر کو بھی موت کا مزا چکھا دیتے...... مگر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کسی آدم زاد کو آپ پچاس سال سے مسلسل ایک مخصوص رات میں اذیت دے رہے ہیں۔

خالق کائنات نے اپنی ہر مخلوق کو دل دماغ دیا ہے انسان تو انسان جانور بھی کبھی کبھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوجاتے ہیں شوشی اور بہادر کا معاملہ بھی دل کا تھا، ناگ دیوتا آپ خود ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں۔

کبھی کبھار بلکہ اکثر آپ بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر اپنی خوبصورت اور حسین ترین داسی پر فریفتہ ہوجاتے ہیں۔

وہ داسی آپ کی اپنی ملکیت ہوتی ہے کسی انسان میں یہ ہمت نہیں ہوتی کہ کوئی اس داسی کو غلط نیت سے چھولے اور اگر کبھی ایسا ہوتا ہے تو آپ کا عتاب اس جوان پر نازل ہوجاتا ہے آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ بس دل، دل ہوتا ہے چاہے جس پر آجائے لیکن ایک حد میں رہتے ہوئے۔

ناگ دیوتا جب آپ دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر آدم زاد داسی کو اپنی ملکیت سمجھ بیٹھتے ہیں تو کیا ایک ناگن اپنی اچھا سے کسی آم زاد کو نہیں چاہ سکتی...... ناگ دیوتا میں امید رکھتا ہوں کہ آپ دل پر ہاتھ رکھ کر صحیح جواب دیں گے اور میں جس مقصد کے لئے آیا ہوں اسے حل کردیں گے۔

ناگ دیوتا اگر چاہوں تو ایک اشارے سے اس غار میں موجود تمام ناگ ناگنوں کو پلک جھپکتے میں ختم کرسکتا ہوں مگر میں ایسا نہیں کرسکتا، میں دوسروں کی جان اور دل کی قدر کرتا ہوں۔'' اور رولوکا خاموش ہوکر بغور ناگ دیوتا کو دیکھنے لگا۔ رولوکا کی باتیں تمام ناگ اور ناگنوں پر اثر کرگئی تھیں۔

ناگ دیوتا نے بغور تمام ناگ ناگنوں پر اپنی نظر ڈالی پھر بولا۔''مہاپرش آپ کی تمام باتیں قابل غور اور قابل قدر ہیں اور میں آپ کی قدر کرتا ہوں آپ چاہیں تو ایک اشارے سے پورے غار میں آگ کا سمندر دہکا سکتے ہیں۔''

میں آپ کی بڑائی اور طاقت کو پرنام کرتا ہوں...... اور یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آنے والی پونم کی رات سے بہادر کو کوئی کشٹ نہیں ہوگا...... اس اذیت وتکلیف سے اس کی جان چھوٹ جائے گی......'' اور پھر ناگ دیوتا نے شیش کو حکم دیا کہ ''آئندہ تو بہادر کے متعلق سوچے گا بھی نہیں اور نہ ہی اس راستہ پر جائے گا جہاں بہادر ہوگا۔''

حلیم وقار سے رولوکا بولا۔''حکیم صاحب اور میں غار سے واپس آگیا اور پھر آنے والی پونم کی رات میں بہادر خیر خیریت سے رہا...... پونم کی رات گزرنے کے بعد بہادر میرے پاس آیا اور نمناک آنکھوں سے میرا شکریہ ادا کیا۔'' یہ بول کر رولوکا خاموش ہوگیا۔

(جاری ہے)

میں آپ خیر و عافیت اور خوش و خرم رہیں گے کسی قسم کی اذیت سے آپ کا واسطہ نہیں پڑے گا، آپ بے فکر ہو کر اپنے گھر جائیں اور میرے حق میں دعا کرتے رہیں کہ میں اس معاملے میں کامیاب ہو جاؤں۔ یہ معاملہ ہے تو کٹھن، میں خود بھی اذیت و تکلیف سے دوچار ہو سکتا ہوں...... خیر آپ جس آس و امید سے آئے ہیں تو میری کوشش سے آپ کو ضرور خوشی ملے گی۔"

اور بہادر نے مجھ پر حسرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے مصافحہ کیا اور چلا گیا۔

رولوکا سے حکیم وقار بولے۔ "حکیم صاحب پھر اس کا حل کیا نکلا، کیا آنے والی پونم کی رات میں اذیت سے بہادر کی جان چھوٹ گئی؟"

یہ سن کر رولوکا بولا۔ "ہاں! میری محنت بار آور ثابت ہوئی اور پونم کی رات میں پچاس سال سے بہادر کو جو اذیت ہو رہی تھی اس سے اس کی جان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئی۔

حکیم وقار بولے۔ "آپ کو تو بہت اذیت ناک اور خوف ناک مراحل سے گزرنا پڑا ہوگا جہاں کہ جان جانے کا زیادہ خطرہ ہوگا۔ اور آپ کامیاب ہوئے تو کیسے ہوئے وہ تو سانپوں کی خوف ناک دنیا ہوگی اور بقول سانپ راجہ یا سانپ دیوتا کے بہادر نے سانپ جاتی کے قانون کو توڑا تھا۔"

"ہاں! یہ بات تو تھی...... دو تین روز تک میں منصوبہ بناتا رہا اور اس کے متعلق سوچتا رہا اور اپنے تئیں غائب حالت میں ہو کر پورے ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ اور جب میں مکمل منصوبہ بنا چکا تو سانپوں کی دنیا میں پہنچ گیا جو کہ پہاڑ کے عمیق گہرائی میں واقع ہے۔

میں اپنے منصوبے کے تحت غائب ہو کر اس غار میں پہنچ گیا اور غار کی اندرونی حالت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں ایک سے بڑھ کر ایک زہریلا سانپ دہشت و غضب کی حالت میں موجود تھا، غار میں موجود سب سے اونچا ایک چبوترا تھا اور اس پر ناگ دیوتا کا پتھریلا مجسمہ موجود تھا اس کے قدموں کے پاس ایک بہت ہی زہریلا سانپ اپنا پھن پھیلائے ہوئے غار میں اپنی نگاہیں گھما گھما کر دیگر سانپوں کو دیکھ رہا تھا۔

وہ سارے سانپ ناگ اور ناگن تھے کوئی عام سانپ نہ تھے۔

میں چبوترے پر موجود ناگ دیوتا کے قریب اچانک انسانی روپ میں آ گیا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی جیسے پورے غار میں زلزلہ آ گیا۔ سارے سانپ غیض و غضب کی حالت میں پھنکارتے ہوئے چبوترے پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے اور پھر چبوترے پر جو سانپ موجود تھا اس کے منہ سے شعلے نکل کر میری جانب بڑھے۔

مگر وہ شعلے مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی اپنا دم توڑ دیتے تھے اس سانپ کی غضب ناک حالت دیکھ کر میں رعب دار آواز میں بولا۔ "شیش! اپنی یہ اوچھی حرکت سے باز رہو ورنہ وقت سے پہلے اپنا نقصان کر بیٹھے گا۔"

میری آواز سن کر وہ سانپ جو کہ میری جانب منہ کر کے پھنکار رہا تھا اور پھنکار کے ساتھ اس کے منہ سے شعلے نکل رہے تھے اس کا نام شیش تھا۔ اچانک اس پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا کیونکہ اس کو میری اصلیت اور طاقت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اور وہی نہیں بلکہ غار میں موجود سارے ناگ ناگن ٹکر ٹکر مجھے دیکھنے لگے۔

کہ اتنے میں، میں نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا۔ ناگ دیوتا کا پتھریلا مجسمہ۔ جو کہ ساکت تھا اس میں اچانک حرکت نظر آئی اور چشم زدن میں وہ پتھریلا مجسمہ انسانی روپ میں آ گیا اس پر نظر پڑتے ہی شیش سمیت سارے ناگ ناگن نے اس کی عزت افزائی کے لئے اپنے اپنے سر جھکا دیئے، میری نظر جب ناگ دیوتا پر پڑی تو ناگ دیوتا نے مسکراتے ہوئے ہندوانہ رسم و رواج کے مطابق اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا۔ اور پھر گویا ہوا۔ "مہاپرش آپ نے کیسے کشٹ کیا، اتنا تو میں آپ سے پوچھنے کا حق رکھتا ہوں کہ آپ یہاں کیوں پدھارے ہیں؟"

میں ناگ دیوتا کی باتوں اور عزت افزائی سے متاثر ضرور ہوا۔ پھر میں نے جواب دیا۔ "ناگ دیوتا اس

کی تھی، ایجنٹ نے آج اسے آنے کی دعوت دی تھی، اسے امید تھی کہ یہ حویلی اس کے لئے بہتر ثابت ہوگی، چنانچہ وہ مظفر نگر کے لئے نکل پڑا تھا۔

ہوا میں خنکی گھلی ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی نے موسم کو نہایت خوشگوار بنادیا تھا۔ پانچ ایکڑ کے باغات میں گھری ہوئی وہ حویلی تھی لیکن اس وقت غیر آباد اور خالی تھی، اس حویلی سے جڑی بہت عجیب وغریب روایات تھیں مظفر نگر میں اس حویلی کو نحوست کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ رات ہوتے ہی حویلی سے رونے کی آوازیں بلند ہوتیں جو کہ رات گئے تک جاری رہتیں، کہا جاتا تھا کہ یہ حویلی مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے اپنے ایک مصاحب خاص کو خوش ہوکر انعام میں دی تھی، بہادر شاہ ظفر مغلوں کا آخری بادشاہ تھا، اس کے بعد ہندوستان کی تاریخ نے کبھی مغلوں کو نہیں دیکھا۔

بہادر شاہ ظفر کا مصاحب خاص ایک اچھا مصور بھی تھا۔ اس سے بہتر اس پائے کا مصور بہادر شاہ ظفر کے پاس نہ تھا۔ ایک روز وہ مصاحب حویلی کے اندر جاتا تو دکھائی دیا لیکن اس کے بعد اسے پھر کبھی کسی نے باہر آتے نہیں دیکھا۔

اس واقعے کو کافی عرصہ گزر گیا۔ آہستہ آہستہ چند واقعات کے پیش نظر وہ حویلی پراسرار مشہور ہوگئی اور وقت کے ساتھ ساتھ ویران ہوگئی۔

کامران کی کار جب مظفر نگر میں داخل ہوئی تو دن کا ایک بج رہا تھا، اسے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں ایجنسی بند نہ ہوجائے۔

لیکن ایجنسی کھلی تھی۔

ایجنٹ اپنے آفس میں ایک اجنبی کو آتا دیکھ کر نہایت حیران ہوا۔

''جی فرمایئے.....'' اسٹیٹ ایجنٹ نے شائستہ لہجے میں کامران کو مخاطب کیا۔

''جی..... میرا نام کامران ہے..... آپ سے فون پر بات ہوئی تھی۔

''جی..... ہاں یاد آیا..... حویلی کے سلسلے میں آپ سے بات ہوئی تھی مجھے خالد کہتے ہیں..... کرایہ 10,000 روپے ماہوار ہوگا، اور ہاں میں ایک بات اور بتادوں، حویلی آسیب زدہ ہے۔''

''آسیب زدہ.....!'' کامران نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''جی ہاں..... آسیب زدہ..... میں ہمیشہ اپنے ہر کلائنٹ کو سچ بتاتا ہوں۔'' ایجنٹ بولا۔

''بہت اچھا کرتے ہیں آپ'' کامران نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔''ایک اور بات۔'' کامران نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا۔

''جی..... فرمایئے.....'' ایجنٹ نے کہا۔

''بات یہ ہے کہ میں آسیب بھوت یا جنات وغیرہ کو نہیں مانتا، انسان سیارے تسخیر کررہا ہے اور آپ'' کامران استہزائیہ لہجے میں بولا۔

''پھر ٹھیک ہے.....'' ایجنٹ مسکرایا۔

حویلی کو اندر سے دیکھنے کے بعد کامران نے اندازہ کرلیا تھا کہ وہ برسوں سے ویران پڑی ہے۔ ہر کمرا گرد سے اٹا پڑا تھا۔ دیواروں پر مکڑیوں نے جالے تان دیئے تھے۔

ایجنٹ کو اس بات کا احساس تھا کہ حویلی اچھی حالت میں نہیں چنانچہ اس نے کامران کو ہفتہ بھر کا وقت دیا تاکہ اس کی صفائی ستھرائی کرواسکے۔

کامران کو یہ حویلی پہلی نظر میں بھا گئی تھی، جس مقصد کے لئے اس نے شہر سے اتنا دور اس حویلی کو کرایہ پر لیا تھا وہ اسے پورا ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے دوستوں سے بے حد عاجز تھا جو کہ ہر وقت ہنگاموں کی تلاش میں رہتے تھے۔ تنہائی میں وہ مطالعے کے شوق کو پورا کرے۔ کامران کی نظر جب حویلی کے ایک کمرے میں دیوار پر موجود پینٹنگ پر پڑی، وہ پینٹنگ نہایت ہی خوب صورت تھی ایک 30,35 سالہ نوجوان زنجیروں سے جکڑا ہوا تھا۔ وہ دیکھنے میں انتہائی خوب صورت اور زندہ معلوم ہورہا تھا، نوجوان کے چہرے پر



تصویر کا قیدی

رضوان علی سومرو۔ کراچی

نوجوان نے اپنی نفسانی خواهشات کی تکمیل کے لئے قلبی رشتے کو بھلا بیٹھا اور پھر اس نے ایک خونی منصوبه ترتیب دیا لیکن قدرت کو کچھ اور هی منظور تھا، دیکھتے هی دیکھتے اپنے دام میں خود صیاد آگیا۔

غروراور تکبرانسان کو اکثر زندہ درگور کردیتا ہے۔ ثبوت کہانی میں موجود ہے……

کامران نے کار کی رفتار کو آہستہ کیا اور سڑک کے کنارے کھڑا کردیا، سڑک کے دونوں اطراف درختوں کے گھنے سلسلے نظر آرہے تھے جو نہ جانے کتنی دور تک چلے گئے تھے۔ کامران نے کار کو کھڑا کیا اور دوسری سیٹ پر پڑا ہوا نقشہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اب اس کے اندازے کے مطابق مظفر نگر بیس میل دور تھا۔ اس چھوٹے سے قصبے کو اپنے دامن میں سمیٹتے ہوئے وسیع و عریض جنگلات کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔

کامران کئی ماہ سے کسی دور افتادہ پرفضا مقام پر واقع کسی اچھے سے گھر کی تلاش میں تھا لیکن ابھی تک اس سلسلے میں ناکامی ہوئی تھی۔ پھر چند دنوں پہلے اسے ایک مقامی اخبار میں مظفر نگر سے چند میل کے فاصلے پر ایک خالی حویلی کا اشتہار نظر آیا، حویلی کرائے کے لئے خالی تھی، اس نے متعلقہ اسٹیٹ ایجنٹ سے فون پر بات

لگا......

مگر اس لمحے آتش دان میں بھڑکتی آگ سرد پڑگئی اور کمرے میں نیم وا اندھیرا چھا گیا۔

اسی لمحے درد و کرب میں ڈوبی ہوئی ایک چیخ اس کی قوت سماعت سے ٹکرائی...... چیخ سن کر وہ کانپ گیا، نہ جانے کیوں اسے ایسا لگا کہ اس چیخ میں ''مدد...... مدد......'' کی صدا شامل ہے۔

نہ جانے کیوں کامران کو شدید خوف سا محسوس ہونے لگا اسے ایک ایک کر کے سارے بھوت پریت اور بدروحوں کی کہانیاں یاد آنے لگیں۔

''کیا یہ سب سچ ہے بھوت پریت کا وجود بھی اس دنیا میں موجود ہے......؟''

کامران یہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے اسی لمحے آتش دان کی آگ دوبارہ روشن ہوگئی...... کچھ ہی دیر میں کمرے کا ماحول ویسے ہی گرم ہوگیا، اب نہ تو چیخ تھی نہ ہی غیر فطری آوازیں، بس ایک سناٹا تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے لکڑیاں کے چٹخنے کی آوازیں......

کامران نے دوبارہ مطالعے میں مستغرق ہونے کی کوشش کی مگر اب وہ انہماک ہی بن رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں اس کا دل مطالعے سے اچاٹ ہوگیا، کافی دیر تک وہ ایسے ہی کرسی پر بیٹھا رہا بالآخر نیند کے غلبے نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ سو گیا۔

وہ جس جگہ سو رہا تھا، چھت کے اوپر ایک زرد رنگ کی شے آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی، ساتھ ہی ساتھ وہ جال بھی بناتی جارہی تھی وہ عین کامران کے سر پر پہنچ کر رک گئی...... چند ہی لمحے گزرے کہ مکڑی کے منہ سے باریک باریک سے تار نکلنے لگے۔ وہ تار نکلتے جاتے مکڑی ان پر رینگتی جاتی، تھوڑی ہی دیر میں وہ بالکل کامران کے سر پر پہنچ چکی تھی......اب وہ مکڑی کامران کے بالوں کے اندر تھی

اسی لمحے کامران کی آنکھ کھل گئی، کامران کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کے سر پر کوئی ہے......اس کے سر کے بالوں کے درمیان عجیب قسم کی تیز چبھن محسوس ہو رہی تھی، جیسے کوئی باریک باریک سی سوئیاں اس کے سر میں چبھو رہا ہو......اس نے جھلا کر اپنے سر کے بالوں کو نوچنا شروع کردیا...... یہ کیفیت چند لمحوں تک رہی......پھر وہ چبھن یکدم ختم ہوگئی۔ اس کے چہرے پر درد و کرب کی جگہ سکون تھا اس کی آنکھوں میں عجیب سا خمار تیر رہا تھا۔ جیسے اس نے ایک ساتھ شراب کے کئی جام اپنے اندر انڈیل لئے ہوں، آنکھیں غیر معمولی طور پر سرخ اور جسم اکڑ سا گیا تھا، جیسے وہ کسی کے ٹرانس میں آگیا ہو......

اب اس نے چلنا شروع کردیا تھا وہ یوں چل رہا تھا جیسے کسی کے زیر اثر ہو۔ وہ حویلی کے اس کمرے میں پہنچ گیا۔ جہاں وہ پینٹنگ لگی تھی جس میں ایک نوجوان زنجیروں میں قید جکڑا پڑا تھا۔ اسی لمحے کامران اچانک جیسے ٹرانس سے باہر آگیا......اس نے اپنے آپ کو اس پینٹنگ کے سامنے پایا......وہ سوچ رہا تھا کہ میں یہاں کیسے پہنچا......

دفعتاً اس کو یخ بستہ لہری اپنے اندر دوڑتی محسوس ہوئی۔

اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی برفانی تودے کے سامنے کھڑا ہو، اس سے نکلتی سرد ہوائیں اسے یخ بستہ کئے جارہی ہوں...... اسی لمحے اس کی نظر پینٹنگ پر پڑی اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ حیرت و خوف سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ جو کہ کچھ لمحے قبل پینٹنگ کے اندر نمودار ہوا تھا۔

زنجیروں میں جکڑے ہوئے اس نوجوان کی تصویر کے عقب میں آگ کے شعلے نظر آرہے تھے جو کہ تصویر کا ہی حصہ معلوم ہو رہے تھے۔ آگ کے شعلے نوجوان کے پورے جسم کو چاٹ رہے تھے......کامران دہشت زدہ نظروں سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا اسے لگ رہا تھا کہ جیسے تصویر میں اب آگ کے شعلوں کے ساتھ ساتھ ایک کالا سانپ بھی نوجوان سے لپٹا نظر آرہا تھا......

''مم......میری......مم......مدد......کرو......تم ہی

چھائے کرب واذیت کے تاثرات بھی مصور نے اجاگر کردیئے تھے، واقعی مصور کے فن کا جواب نہ تھا۔

کامران ایجنٹ سے بات پکی کرکے واپس شہر روانہ ہوگیا۔

رات کے تقریباً 12 یا 1 بجے کا وقت تھا۔ حویلی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شدید سردی کے سبب مظفر نگر کے مکین وقت سے پہلے ہی اپنے اپنے گھروں میں جادبکے تھے۔

دفعتاً فضا میں ایک تیز چیخ کی آواز ابھری۔ پھر ہلکی سسکیاں حویلی کے اطراف میں گونجنے لگیں۔

''بب...... بچاؤ...... مم...... میری مدد...... کرو...... اس عذاب سے مجھے نجات دلاؤ'' آواز میں نہایت بے چارگی اور کرب تھا......

''چپ ہو جاؤ...... ورنہ'' اسی لمحے ایک کرخت سی آواز ابھری۔ پھر وہ کرب و درد میں ڈوبی آواز خاموش ہوگئی۔

☆......☆......☆

کامران ایک ہفتہ کے بعد حویلی میں منتقل ہوگیا تھا۔ اسے اس بات کا اندازہ ضرور ہوگیا تھا کہ اسے اس قصبے سے ضرورت کی ہر چیز مل جائے گی۔

اس رات سردی کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا، آتش دان میں شعلے عروج پر تھے۔ کامران نے آتش دان میں رقص کرتے ہوئے شعلوں کی طرف دیکھا۔ موسم سرما کی خنک ہوائیں بند دریچوں پر سر پٹخ رہی تھیں، لیکن آتش دان کی وجہ سے کمرے کی فضا آرام بخش تھی یہ کامران کی اس حویلی میں پہلی رات تھی۔

قریب ہی پڑی میز پر شراب سے لبریز گلاس موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں راہیڈر ہیگرڈ کا ناول ''شی'' تھا۔ پڑھتے پڑھتے ایسا محسوس ہوا کہ کمرے میں اس کے علاوہ بھی کوئی اور ہے...... پھر اچانک محسوس ہوا کہ آتش دان کے شعلوں میں کوئی زندہ وجود جھوم رہا ہے؟'' کیا شی زندہ ہوگئی؟؟''

''کیا واقعی اس آتش دان میں کوئی ہے؟'' وہ ڈرتے ڈرتے اٹھا۔ آتش دان کے قریب جاکر دیکھا، تو وہاں صرف جلنے اور رقص کرتے شعلوں کے سوا کچھ نہ تھا، کامران ازخود ہنس پڑا، ناول میں اتنا گم تھا کہ ایسا لگا کہ ''شی'' اس آتش دان میں گھس پڑی۔ ''شی'' جو کہ شعلوں میں نہا کر بھی زندہ تھی راہیڈر ہیگرڈ کی عظیم تخلیق اس کے حواس پر سوار ہوگئی تھی، شاید یہ ہول اور تنہائی کا اثر تھا۔

کامران گلاس ایک ہی سانس میں خالی کرکے پھر کتاب کی طرف متوجہ ہوگیا...... چند ہی لمحے گزرے ہوں کہ اس کے کانوں میں ایسی آواز گونجی جیسے کوئی میز گھسیٹ رہا ہو۔ اس نے کتاب رکھ کر ادھر ادھر دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا لیکن میز گھسیٹے جانے کی آواز بدستور اس کے کانوں میں گونج رہی تھی......

''کون ہے...... کون ہے......'' وہ اٹھ کر زور سے چلایا۔ اس کے چلاتے ہی جیسے میز گھسیٹے جانے کی آواز بالکل بند ہوگئی؟

کمرے کی فضا میں ویسے سناٹا طاری ہوگیا تھا لیکن آتش دان میں لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

''کیا یہ حویلی واقعی آسیب زدہ ہے؟ یا پھر یہ میرا وہم ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''میز کی آواز ہوسکتا ہے حویلی میں ادھر ادھر بھاگتے چوہوں کی ہو یا پھر ان گلہریوں کی ہو جنہوں نے اس ویران حویلی میں اپنا گھر بنالیا ہو۔'' یہ سوچ کر اس نے دل کو تسلی دی اور دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہوگیا۔

کتاب پڑھتے ہوئے اسے 15 یا 20 منٹ گزرے ہوں گے کہ اچانک خنکی کی ایک شدید لہر کمرے میں تیر گئی......

اس نے ادھر ادھر دیکھا مگر تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے...... ''اسے کسی ان دیکھی چیز سے خوف محسوس ہوا...... اسے اپنے دانت بجتے ہوئے سے محسوس ہوئے...... اس نے اٹھ کر آتش دان میں مزید لکڑیاں ڈالنے کا ارادہ کیا اور اٹھ کر آتش دان کی طرف بڑھنے

جب کامران کافی لئے کمرے میں داخل ہوا تو عین اسی وقت ایک دردناک چیخ ابھری چیخ اتنی تیز اور درد بھری تھی کہ نائلہ جیسے اچھل کر رہ گئی...... کامران کے بدن میں تھرتھری سی دوڑ گئی...... لیکن پروفیسر جاوید پرسکون تھا۔

''مجھے اس جگہ لے چلو، جہاں سے یہ آواز آئی ہے۔'' پروفیسر نے کہا۔ وہ تینوں اٹھ کر اس کمرے میں جا پہنچے جہاں پینٹنگ موجود تھی۔

تینوں نے بغور پینٹنگ کو دیکھا۔ پینٹنگ وہی منظر پیش کر رہی تھی جو کہ پچھلی رات کامران نے دیکھا تھا۔

''بہت خوب......'' پروفیسر جاوید مسکرایا۔

''نائلہ میرا بیگ لے کر آؤ......'' جاوید نے نائلہ سے قدرے توقف کے بعد کہا۔ اور چند منٹ میں ہی نائلہ بیگ لے آئی۔

جاوید نے بیگ کھولا اس بیگ سے ایک پنسل جو کہ سرخ رنگ کی تھی ایک چھوٹی کتاب جو کہ غالباً وظائف کی تھی۔ یہ دونوں چیزیں نکال کر چند لمحے کچھ سوچتا رہا، پھر اس نے کچھ زیر لب پڑھ کر پنسل پر پھونک ماری۔

''اس پنسل سے پینٹنگ کے اردگرد حصار لگادو۔'' نائلہ سے کہا تو نائلہ زیر لب کچھ پڑھتی رہی اور پینٹنگ کے گرد حصار لگاتی رہی۔

''بس اب ہٹ جاؤ۔'' جاوید نے نائلہ سے کہا۔

''کامران میرے وظیفہ مکمل ہوتے ہی تم اس پینٹنگ کو اس جگہ سے ہٹا دینا۔''

اس کے بعد جاوید نے بلند آواز سے وظیفہ پڑھنا شروع کردیا، شروع شروع میں اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے پھر چہرہ پرسکون، کافی دیر تک...... پروفیسر جاوید وظیفہ پڑھتا رہا۔ پھر کامران نے دیکھا کہ جاوید کا چہرہ تمتما رہا ہے...... چند لمحے بعد جاوید خاموش ہوگیا...... جاوید نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو کامران نے آگے بڑھ کر وہ پینٹنگ اتارلی۔

''جیسے ہی کامران نے پینٹنگ اتاری، جس جگہ پنسل سے حصار بنایا گیا تھا وہاں کا سنگ مرمر ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگا، کامران، جاوید اور نائلہ خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

''تڑک...... تڑک...... تڑک......'' آوازیں خاموشی اور سناٹے کو درہم برہم کئے جارہی تھیں۔

رفتہ رفتہ کامران کو یہ احساس ہونے لگا کہ جہاں جہاں سے سنگ مرمر گر رہا تھا وہاں سے کسی مرد کے قد آدم پورٹریٹ کے نقوش ابھر رہے ہیں بلکہ اسے پورٹریٹ کہنا بالکل غلط تھا بلکہ وہ قد آدم تصویر کے نقوش پتھر کی دیوار پر ابھر رہے ہیں، وہ ایک حسین و جمیل نوجوان کی تصویر تھی جسے دیوار پر ابھارا گیا تھا۔

نوجوان نے مغلیہ لباس پہن رکھا تھا۔ آتش دان میں بھڑکتی آگ اس تصویر کے ہر نقش کو واضح کررہی تھی۔ نوجوان کے چہرے پر کرب واذیت کے آثار نمایاں تھے۔

دفعتاً ایک عجیب واقعہ ہوا، کامران نے دیکھا کہ تصویر کے لب ہلے۔ ''م...... میری...... مدد...... کرو...... میں بہت تکلیف میں ہوں...... مجھے اس جہنم سے نکالو۔'' پھر ایک چیخ کمرے میں گونجی، یہ وہی چیخ تھی جس کو کامران اکثر سن چکا تھا۔

چند منٹ بعد تینوں ایک گول میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے نائلہ کا چہرہ تصویر کے مقابل تھا، وہ کامران کا الٹا ہاتھ تھامے ہوئے تھی اور جاوید کا سیدھا......

جاوید نے اپنا سیدھا ہاتھ کامران کے ماتھے پر رکھ دیا...... ہاتھ رکھتے ہی کامران کو شدید خنکی کا احساس ہوا لیکن وہ جانتا تھا کہ نوجوان کی روح کو بلانے کے لئے یہ سب ضروری تھا۔

نائلہ آہستہ آہستہ کسی انجانی زبان میں کچھ بولنے لگی...... اس کے چہرے پر بلا کا سکون تھا...... جاوید اپنے وظائف کی کتاب سے کچھ پڑھ رہا تھا، پھر نائلہ کی آواز آہستہ آہستہ مدھم پڑنے لگی...... کہ نجانے کہاں سے سبز رنگ کی دھند نے نائلہ کے چہرے کو اپنی لپیٹ

کر سکتے ہو......'' ایک تیز سرگوشی کی آواز کامران کی قوت سماعت سے ٹکرائی۔

''تت......تم......کون ہو......؟'' کامران نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ایک بے کس......مجبور......'' پھر دوبارہ سرگوشی اس کے کانوں کو سنائی دی۔

''میں سمجھا نہیں...... میں تمہاری کیسے مدد کروں......'' کامران اب کافی سنبھل چکا تھا۔

پھر چند لمحے بعد پینٹنگ پہلے جیسی ہوگئی، کسی قسم کی کوئی آواز یا سرگوشی نہ تھی۔

اب کامران کو یقین ہوچکا تھا کہ یقیناً وہ حویلی آسیب زدہ ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کا دل نہیں کررہا تھا اس حویلی کو چھوڑنے کا، وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس مظلوم کی مدد کرے جو اس پینٹنگ میں قید ہے؟

''کیا اس پراسرار حویلی سے کوئی بھید وابستہ تھا؟'' اکیسویں صدی میں یہ سوچنا بھی عجیب لگ رہا تھا، مگر حقائق اس کے سامنے تھے، دفعتاً اسے اپنے دوست پروفیسر جاوید اور اس کی بیوی یاد آ گئی، پروفیسر جاوید روحانیت میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔

جاوید کی بیوی نائلہ ایک اچھی معمول تھی، پروفیسر جاوید نہ صرف روحوں کو بلاسکتا تھا بلکہ ان سے باتیں بھی کراسکتا تھا۔

کامران نے اکثر پروفیسر جاوید کے انہونے کارنامے دیکھے تھے۔ اس کے دوسرے دوست محض تفریح طبع کے چکر میں روحوں سے باتیں بھی کرچکے تھے لیکن کامران نہ صرف ان کا مذاق اڑاتا بلکہ اسے شعبدہ بھی کہتا۔ کامران کے مذاق اڑانے کو پروفیسر نے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا بلکہ مسکرانے پر اکتفا کرتا تھا۔

☆......☆......☆

ڈیڑھ گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد کامران کو پروفیسر کی گاڑی آتی دکھائی دی، کامران نے اپنی کار اسٹارٹ کی، ہیڈ لائٹس روشن کرکے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

کامران نے پروفیسر سے موبائل پر گفتگو کرکے ساری بات بتائی تو پروفیسر نے آنے کا وعدہ کیا، کامران نے پروفیسر کو مظفر نگر تک آنے کی دعوت دی تھی۔

اب کامران اور پروفیسر کی گاڑی آگے پیچھے حویلی کی طرف جانے والے راستے پر دوڑ رہی تھی۔

کامران جب جاوید اور اس کی بیوی نائلہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو آتش دان کی آگ سرد پڑ رہی تھی۔ کامران نے آتش دان میں چند موٹی لکڑیاں ڈال دیں۔

''تو تم بھی بھوتوں کے وجود کے قائل ہو ہی گئے......'' نائلہ مسکرا کر بولی۔ اور کامران نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''چائے یا کافی......'' کامران نے نائلہ کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''فی الحال......صرف کافی......مظفر نگر میں سردی بہت ہے۔'' پروفیسر جاوید نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

جواب میں کامران نے سر ہلایا اور کچن کی طرف بڑھ گیا۔

کامران کے جانے کے بعد پروفیسر جاوید سگار نکال کر سلگانے ہی والا تھا کہ اچانک اس کی نظر نائلہ پر پڑی۔

نائلہ کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا! نائلہ کا چہرہ دھواں دھواں ہورہا تھا......اس کی آنکھیں یک ٹک آتش دان کی آگ کو تک رہی تھیں۔

''نائلہ'' جاوید نے نائلہ کو آواز دے کر پکارا۔ تو نائلہ یوں چونکی جیسے خیالات میں نہ جانے کن کن جہانوں کی سیر کررہی تھی۔

''جاوید...... یہ حویلی واقعی آسیب زدہ ہے...... اور تم جانتے ہو کہ میں مافوق الفطرت چیزوں کو فوراً محسوس کرلیتی ہوں۔'' نائلہ نے جیسے سرگوشی کی۔

اور جاوید نے جواباً سر ہلادیا۔

مارِ گنج

طاہرہ آصف۔ساہیوال

سونے کی اینٹوں پر بچے کو بیٹھا کر پنڈت نے ایک عمل پڑھنا شروع کیا اور پھر پنڈت نے بچے پر پھونک ماری تو بچے کے گرد دھواں پھیلا اور چشم زدن میں بچہ اپنی ہیبت تبدیل کرکے ایک خوفناک سانپ بن چکا تھا۔

انسانی ذہن کو حیرت کے سمندر میں ڈالتی اپنی نوعیت کی بے مثال اور پر تحیر ڈراؤنی کہانی

مطالعہ کا شوق مجھے وراثت میں ملا ہے، دادا مطالعہ کے شوقین تھے تو ابو کتابوں کے رسیا، ابو کتاب پڑھتے ہوئے گردو پیش سے غافل ہو جاتے اور ہمہ وقت اچھی کتابوں اور دیگر تحریری مواد کی جستجو میں رہتے، اللہ انہیں غریق رحمت کرے، آج وہ ہم میں نہیں ہیں، ان کے علاوہ یہ جنون مجھے دوسری جماعت میں جب اردو تحریر سے آشنائی ہوئی تو یہ عشق لاحق ہو گیا وہ بھی اس قدر کہ پڑھی جانے والی کتب، رسائل اور میگزینز کی تعداد تو یاد نہیں مگر اندازہ ہے کہ تین سے چار من کے قریب مواد چاٹ لیا ہوگا۔ میں جہاں بھی جاؤں میرے لئے سب سے پر کشش کتاب ہی ہوتی ہے۔ اب سے اٹھارہ یا انیس سال قبل جب میں اسکول کی طالبہ تھی بڑے بھائی کے گھر جانے کا اتفاق ہوا، وہ کچھ دن رکنے کی نیت سے ساتھ لے گئے۔ بھائی کا تعلق بزرگان دین کے ایک سلسلہ سے ہے۔ اسی نسبت سے ان کے گھر پر اسلامی مواد ہی نظر آیا۔

ایک روز میرے ہاتھ اصلاحی رسائل کا ایک مجموعہ لگا جو مجلد تھا اس میں بہت عمدہ اور اصلاحی تحاریر تھیں۔

زیر نظر کہانی میں نے اس مجموعہ میں پڑھی جو کہ خاصا قدیم بھی تھا، میں وضاحت کردوں کہ یہ کہانی میری طبع زاد نہیں بلکہ میں نے پڑھی تھی چونکہ مجھے یہ بہت پسند آئی اور مصنف کے مطابق یہ حقیقی بھی ہے اس لئے میں اسے خود لکھ رہی ہوں، اتنا وقت گزرنے کی وجہ سے کہانی کا عنوان اور مصنف کا نام یاد نہیں اس میں میرا حصہ اتنا ہی ہے کہ جہاں جہاں میری یادداشت کمزور پڑی وہاں میں نے اپنی طبع سے کام لیا یعنی بیشتر کہانی من و عن ہے بس کہیں کہیں میری پیوندکاری ہے۔

میرے محلہ میں چند مہینوں پیشتر ایک شریف صورت شخص وارد ہوا اس نے پہلے کرایہ پر ایک مختصر سا گھر لیا پھر محلہ ہی میں پرچون کی دکان بنالی۔ اس کے دکان بنا لینے کا اہل محلہ کو خاصا فائدہ ہوا ایک تو روزمرہ کی اشیا قریب ہی سے دستیاب ہونے لگیں، دوم اس نے دام اور تول بہت ایماندارانہ مقرر کیے۔ ساتھ ہی وہ نیک اطوار اور کم گو ثابت ہوا نتیجتاً بہت جلد اس کا کام چل نکلا محلے اور علاقے کی خواتین بھی اس کی نیک چلنی کی وجہ سے بکثرت آنے لگیں۔ میرا بھی چند بار اس کی دکان پر جانے کا اتفاق ہوا، میں نے اس کی عمر کا اندازہ پینتیس سے چالیس کا لگایا۔

چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ دکانداری کے دوران وہ ہمہ وقت ہاتھوں پر دستانے پہنے رکھتا مجھے یہ بات متجسس کر گئی۔ پھر میں نماز کے اوقات میں مسجد جاتا تو وہاں بھی مختصر دعا سلام ہو جاتی بلکہ فجر کے بعد وہ امام صاحب سے ناظرہ کی تعلیم لیتے ہوئے بھی دیکھا گیا۔ مجھے اچنبھا ہوا کہ وہ اس عمر میں آکر کلام پاک کی تعلیم

میں لے لیا......

جاوید نے دھیرے سے اپنا سر ہلایا تو کامران سمجھ گیا کہ وہ ٹرانس میں جاچکی ہے اب نائلہ کے ہونٹوں سے ایک چمکدار لکیر نکل کر اس مغل نوجوان کی ابھری ہوئی تصویر میں داخل ہو رہی ہے۔

کچھ ہی لمحوں بعد زرد اور سبز رنگ کے حصار نے نوجوان کی تصویر کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

حصار ہٹا تو وہاں کوئی پینٹ کیا ہوا چہرہ نہ تھا بلکہ گوشت پوست سے بھرپور ایک چہرہ تھا۔

''کون ہو تم......؟'' جاوید نے پوچھا۔

''میرا نام اعتمادالدولہ ہے...... میری مدد کرو...... آپ کو خدا کا واسطہ''

''ہم تمہاری مدد کے لئے جمع ہوئے ہیں اب بتاؤ تم کون ہو......؟'' پروفیسر جاوید نے کہا۔

''میں بہادر شاہ ظفر کا مصاحب خاص تھا میں ایک مصور بھی تھا...... ایک سنگ تراش بھی، میرے جیسے پائے کا مصور پورے ہندوستان میں کوئی نہ تھا لیکن میں نے قدرت کی دی ہوئی صلاحیتوں سے کام نہ لیا جو لینا چاہئے تھا...... میں بہت مغرور تھا خوب صورت تھا کم عمر تھا...... مجھ میں تکبر تھا...... دولت کے لئے کوشاں تھا...... مجھے خود پر بہت ناز تھا...... میں بھول گیا تھا کہ مٹی سے بنے ہوئے انسان کی حقیقت کیا ہے اور اس حقیقت کے پیش نظر انسان کو تکبر و غرور سے دور رہنا چاہئے، ناپاک قطرے سے تخلیق انسان...... جو کہ ایک دن مر کر مٹی میں مل جاتا ہے...... تکبر کس طرح کرسکتا ہے......'' نوجوان کے چہرے پر اداسی تھی، آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

''پھر کیا ہوا......؟'' جاوید نے بے تابی سے پوچھا۔

''ایک دن مجھے خیال آیا کہ میرا اپنا چہرہ اور میرا جسم بہت خوبصورت ہے، پھر میں اپنی تصویر بنانے پر لگ گیا، گھنٹوں میں خود کو آئینے میں دیکھتا، کام کرتا، ایک دن تصویر مکمل ہوگئی تصویر مصوری کا عظیم شاہکار تھی...... اس دن میں نے انتہائی تکبر کیا کہ شاید میرے جیسا کوئی نہیں پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میں اس تصویر کے سامنے سر جھکا کر بیٹھ گیا اور اپنی قابلیت و تصویر کی خوبیوں میں کھو گیا۔

اچانک مجھے ایسا لگا کہ تصویر نظر نہیں آرہی، مجھے کمرہ نظر آرہا تھا۔ میں ہر آہٹ سن سکتا تھا...... دفعتاً مجھے اپنے ہاتھوں میں زنجیریں پڑتی ہوئی محسوس ہوئیں جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ میں اپنے تکبر و غرور کی پاداش میں ''تصویر کا قیدی'' بنادیا گیا ہوں۔

میرا تکبر، میرا غرور، میرے گناہ سانپ اور آگ کی شکل میں مجھ پر مسلط کردیئے گئے، میں عذاب سے دوچار ہوگیا، میری روح عذاب میں ہے، کئی صدیوں سے، میری مدد کرو، میری دیوانگی کی حد تک پہنچی خود پرستی نے میری روح کو قید کردیا تصویر میں۔'' اتنا کہہ کر وہ رونے لگا...... پھر گویا ہوا۔

''لوگ آتے گئے وقت گزرتا گیا، میری گریہ زاری نے اس حویلی کو آسیب زدہ بنادیا۔'' آہستہ آہستہ نوجوان کی آواز ڈوبتی چلی گئی، اب وہ پھر پینٹ کیا ہوا چہرا تھا۔

''ہمیں اس کے لئے کچھ کرنا پڑے گا...... بہت بڑا کاٹ لی اس نے۔'' کامران نے کہا۔

پروفیسر نے اثبات میں سر ہلایا اور تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر بلند آواز میں کلام الٰہی کی تلاوت کرنے لگا......

کامران اور نائلہ نے ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھائے اس نوجوان کے لئے مغفرت طلب کرنے لگے۔

جیسے جیسے جاوید کلام الٰہی پڑھتا جاتا ویسے ویسے دیوار سے اور اس پینٹنگ سے اس نوجوان کے نقوش دھندلے پڑتے جاتے، بالآخر ہر چیز غائب ہوگئی نہ وہاں پینٹنگ تھی نہ ہی نوجوان کا نقش، اس نوجوان کی روح کو قرار آگیا تھا......

اسے اس کے تکبر، غرور، خود پرستی کی قیمت کئی صدی تک چکانی پڑی تھی۔



ہے اس کا تو کوئی اپنا ہے، نہیں اب ہم ہی اس کے اپنے ہیں کیوں نہ کوئی مناسب لڑکی یا عورت دیکھ کر اس کا گھر ہی بسا دیا جائے تاکہ اس کی زندگی آسان بھی ہو جائے اور کسی کی رفاقت بھی میسر آ جائے۔''

میں نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور کہا۔ ''بیگم پہلے میں اس کا عندیہ لے لوں پھر اس کام میں دیر کیسی۔''

ایک روز میں نے موقع دیکھ کر یہ بات کہہ دی تو وہ ایسے گھبرا گیا جیسے اس کا کوئی جرم پکڑا گیا ہو اس نے فوراً منع کر دیا، اس کی گھبراہٹ سے میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے کہا۔ ''میاں تم تو ایسے گھبرا رہے ہو کہ گویا تمہیں زندان میں ڈلوانے کی بات کر دی ہو۔'' پھر اس کے قریب ہو کر کہا۔ ''میں تمہارے بڑے بھائی جیسا اور تمہارا مخلص و بہی خواہ ہوں اگر کوئی ذاتی نوعیت کی خرابی ہے تو ہم سے کہو اس کا بھی علاج کرائے دیتے ہیں ہم کون سا کسی سے کچھ کہیں گے۔''

اس نے کہا۔ ''بھائی جان آپ کا خیال غلط ہے۔ بس ہم شادی کرنا ہی نہیں چاہتے ورنہ آپ کی محبت و خلوص پر شک کرنا بھی گناہ ہے میرے لئے تو رب تعالیٰ کے بعد آپ ہی سے دنیا آباد ہے۔''

نجانے کیوں میرے دل میں چھپی بات لب پر آ ہی گئی اور میں نے کہہ دیا کہ ''میاں ہم یہ محسوس کرتے رہے ہیں کہ کچھ تو ہے جو بتا نہیں رہے آج شادی سے انکار نے ہمارے خیال کو پختہ کر دیا ہے۔ بہت اچھا ہو تاکہ تم دل کی بھڑاس نکال لیتے اور ہم شاید تمہارے کسی کام آ جاتے۔''

میری اس بات سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، پھر رفتہ رفتہ ان آنسوؤں میں شدت آ گئی یہاں تک کہ وہ ہچکیوں سے روتا رہا۔ میں نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیر کر تسلی دی اور رونے دیا تاکہ دل میں جمع غبار دھل جائے بہت دیر رونے کے بعد میں نے اسے بستر پر لٹا دیا اور سونے کی تاکید کر کے چلا آیا اس شب کے بعد میں اس سے معمول کے مطابق ملتا رہا اور مزید نہ کریدا کہ جب دل ہلکا ہو گا تو سب حال کہہ دے گا۔

دن گزرتے رہے ایک شب جب میں ملاقات کے لئے اس کے یہاں گیا تو کچھ ادھر ادھر کی باتوں میں اس نے کہا۔ ''بھائی جان میں جانتا ہوں کہ آپ میرے دل کا احوال جاننا چاہتے ہیں مگر میں اپنی آپ بیتی سنا کر آپ کو کھونا نہیں چاہتا کیونکہ میں پہلے ہی ستم رسیدہ ہوں مگر میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا بلکہ حقیقت بتا دوں گا چاہے میں آپ کی رفاقت سے محروم ہو جاؤں۔''

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ پھر وہ گویا ہوا۔

''متحدہ ہندوستان کا وہ کوئی شہر تھا جس کا نام مجھے اپنی کمسنی کے باعث یاد نہیں، وہاں میں اور میری بیوہ ماں رہتے تھے، نجانے کب میرا باپ فوت ہوا کہ اس کے بعد ہم غریب ماں بیٹا اور بدحال ہو گئے کہ کما کر کھلانے والا تو چلا گیا گھر میں جب فاقے ہونے لگے تو ماں نے خاندانی وقار کو ایک طرف رکھ کر بقا کی جدوجہد اختیار کر لی۔ اس علاقے میں جہاں ہم تھے وہاں ہندو مسلمان کی آبادی مشترک تھی، ہمارے گھر سے کچھ ہی دور ایک ہندو ساہوکار کی حویلی تھی، وہ ہمارے علاقے کا سب سے صاحب ثروت شخص تھا میری ماں اس کے گھر چلی گئی اور کام مانگا وہ حویلی اس قدر بڑی اور افراد اتنے زیادہ تھے کہ کام ملنا یقینی تھا۔

سیٹھ کی بیوی نے میری ماں کے سب احوال سننے کے بعد اسے صفائی ستھرائی کے کام پر ایک روپیہ روزانہ پر رکھ لیا۔ اب ماں مجھے صبح کھلا پلا کر خود کام پر چلی جاتی اور پھر دوپہر کے بعد لوٹتی، میں زیادہ تر آس پڑوس کے بچوں سے کھیلتا رہتا، کبھی ماں کے ساتھ چلا جاتا اور ایک طرف خاموش ہو کر بیٹھ جاتا، ماں جب کام سے فارغ ہوتی تو اجرت لے کر میرا ہاتھ پکڑ کر گھر آ جاتی۔

یونہی دن گزرتے رہے ماں کے کام کرنے سے حالات تو نہ بدلے مگر پیٹ بھرنے کا سامان ہو جاتا۔ ماں بہت خوددار اور نیک انسان تھی، کسی سے سوال کرنا اسے ناپسند تھا۔

میری عمر اس وقت سات یا آٹھ برس ہو گی کہ ایک روز ماں بیمار پڑ گئی اسے بہت تیز بخار تھا اس روز وہ کام پر



لے رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ بالکل تنہا ہے یعنی کہ نہ والدین اور نہ ہی دیگر رشتہ دار حتی کہ بیوی بچے بھی نہیں، باقی لوگوں کا تو معلوم نہیں۔

مگر میں اس کے حالات جاننے کے لئے بے چین ہوگیا۔ مگر کیا کیجئے کہ شناسائی سرسری تھی سو پہلے راہ و رسم پیدا کرنے کا سوچا اور اس کا سبب بھی بن گیا وہ ایسے کہ میں سماع کی محافل میں بصد شوق جاتا ہوں۔

یہ قیام پاکستان کے چند برس بعد کا زمانہ تھا تب لوگوں میں ابھی بزرگان دین سے محبت عقیدت موجود تھی اور سماع کی محافل بھی اکثر ہوا کرتی تھیں سو میں جب بھی کسی ایسی محفل میں جاتا اسے وہاں موجود پاتا وہ بھی ایسے کہ وہ ادھر ادھر سے بے خبر گریہ کناں ہوتا ہر بات اس کی ذات میں چھپے اسرار میں اضافہ کرتی، میں نے خود اس سے بات کرنا شروع کردی اور بے تکلفی کی فضا قائم کرلی۔

شروع میں وہ محدود ہی رہا مگر میری محبت کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ میرے قریب آنے لگا اگرچہ مجھے اس میں خاصا وقت لگا۔ مگر وہ میرا دوست بن ہی گیا۔ پہلے تو اہل خانہ کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ والدین کا انتقال بچپن میں ہوگیا، بہن بھائی تھے نہیں اور تنہا ہونے کی وجہ سے شادی بھی نہ ہوسکی پھر میں نے اس کے دستانے پہن رکھنے والی عادت کا پوچھا تو اس نے کہا۔

''اس کے ہاتھوں کو کوئی بیماری ہے جس کی وجہ سے وہ خود احتیاط کرتا ہے کہ سودا سلف دیتے ہوئے اس کی یہ بیماری دوسروں تک نا پہنچے۔''

بہر حال اس کی باتوں سے میری کچھ تسلی ہوگئی مگر مجھے پھر بھی لگا کہ ابھی کچھ باتیں مخفی ہیں، بہر حال ہماری شناسائی بے تکلفی میں بدلنے لگی۔

میں دکان کے بعد عشاء سے فارغ ہونے پر اس کے مکان پر چلا جاتا اور گپ شپ کرکے آجاتا، کبھی وہ میرے بہت اصرار پر گھر آتا تو بچے بھی اس سے مل کر خوش ہوتے کہ وہ ان سے بہت محبت کرتا میری بیوی کو بھابھی کہہ کر مخاطب کرتا اور بات کرتے ہوئے نگاہ نیچی رکھتا، بیوی بھی اس کی مداح تھی کھانا کھلائے بغیر نہ جانے دیتی وہ ہمارے برتنوں کو براہ راست استعمال کرنے سے گریز کرتا اور گلاس اپنے ہی ساتھ رکھتا، ہمیں اس کی یہ احتیاط کچھ عجیب لگتی مگر وہ اپنے مرض کا کہہ کر مطمئن کردیتا۔

ہمارا تعلق بخیر و خوبی چل رہا تھا کہ ایک روز بیوی نے کہا کہ ''آپ کا دوست تنہا ہے سارے کام خود کرتا

گیا اور سامنے ایک ننھی سی مورتی رکھ لی اور کوئی نامانوس الفاظ دھیمے دھیمے پڑھنے لگ گیا۔

میں اس سارے عمل سے بہت پریشان تھا ماں میرا انتظار کرتی ہوگی۔ اس کی حالت بہت خراب تھی میرا دھیان بار بار ماں کی طرف جاتا رہا مگر اس ظالم پر مطلق کوئی اثر نہ تھا۔

اسے یہ عمل کرتے ہوئے گھنٹہ ڈیڑھ ہورہا تھا میں نے بول کر اپنی ماں کے پاس جانے کا کہنا چاہا مگر نجانے کیسی میری زبان منجمد ہوگئی وہ تھا کہ بغیر رکے یہ عمل کئے ہی جارہا تھا بیٹھے بیٹھے میری کمر اکڑ گئی اور ٹانگیں سن ہوگئیں پھر اس نے میری جانب منہ کرکے پھونک ماری۔

اوہ خدایا! اس کا چہرہ سیاہ پڑ چکا تھا اور آنکھیں انگارہ، اس کی پھونک نے میرے نچلے دھڑ میں آگ بھردی، میں تڑپ کر رہ گیا، میں نے اپنی ٹانگوں کو دیکھنا چاہا تو یہ کیا میری ٹانگیں غائب ہوگئیں اور ان کی جگہ ایک سیاہ دم تھی جو میرے وجود سے جڑی تھی، میں تھرا کر رہ گیا اور ایک چیخ میرے منہ سے خود بخود نکل گئی مگر وہ ہر طرف سے غافل اپنے عمل میں غرق تھا۔

پھر وقت کا حساب نہ رہا کیونکہ میرے لئے وقت رک گیا تھا۔

اگلی بار پھونک ماری تو پیٹ سے سینے تک میرا وجود سیاہ سانپ میں بدل گیا۔

اور پھر وہ اس شیطانی عمل میں جت گیا اس کی اپنی حالت بھی خراب تھی مگر اسے میری بدلتی ہیت وحشی بناتی جارہی تھی اس کا سیاہ چہرہ اس کی اندرونی مسرت کا غماز تھا۔

پھر ایک طویل پڑھائی کے بعد جب اس نے آخری پھونک ماری تو میں مکمل طور پر ایک سیاہ کوبرا سانپ میں بدل چکا تھا۔

پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا خوشی اس کے وجود کے پور پور سے ٹپک رہی تھی اس نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا۔

''اب تو میرا مطیع ہے میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو اس خزانے کی حفاظت کرے گا ہمیشہ، یہ میری تمام عمر کی محنت اور میری جان ہے، میں اس خزانے تک کسی کو آنے نہیں دینا چاہتا اب تو وہ موذی ہے کہ کوئی سانپ تیرے مقابلے پر نہیں آسکتا، میرے سوامی مہاراج کا بتایا عمل سچا ثابت ہوا اب میری مایا کو میرے علاوہ کوئی چھو نہیں سکے گا کیونکہ اب تو اس پر بیٹھا ہے۔'' پھر وہ قہقہے لگانے لگا اور پھر اس تہہ خانے کو بند کرکے چلا گیا۔

اب یہ بات قابل غور ہے، بھیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ ایک سات آٹھ برس کے معصوم بچے کو جس کی کل کائنات اس کی ماں ہو اس سے الگ کرکے ایک قوی الجثہ سانپ میں بدل دیا جائے اور قید تنہائی میں ڈال دیا جائے تو اس کا کیا حال ہوگا، میں روتا رہا روتا رہا مگر تقدیر کے لکھے کو میرے آنسو نہ دھو سکے۔

میرے پاس وہ زبان نہ رہی جس سے میں اپنا حال دل کہہ سکتا وہ ستمگر بنیا اپنی فانی دولت کو وقتی دوام بخشنے کے لئے مجھے قربان کرگیا۔ وہ دن میں ایک بار آتا ایک پیالے میں میرے لئے دودھ ہوتا وہ میرے آگے رکھ کر مجھے پرنام کرتا اور کہتا۔ ''اے ناگ دیو! میں نے اس دولت کو ایک عمر لگا کر اکٹھا کیا ہے میں نہیں چاہتا کہ اسے کوئی چھوئے یہاں تک کہ میری اولاد بھی، تم اس مایا کے ناگ ہو اب میں بےفکر ہوں۔''

جب تک وہ زندہ رہا اس تہہ خانے میں آتا رہا، میں نے اسے کبھی یہاں سے کچھ بھی لے جاتے نہیں دیکھا، بس کبھی کبھی وہ اس میں اضافہ ضرور کرجاتا اور میں حیرت سے یہ بےمعنی زندگی جیتا رہا۔

اپنی ماں کی یادوں کو دل میں بسائے مجھے یہ خیال پاگل کردیتا کہ وہ تپتے بخار میں میرا انتظار کررہی ہوگی میرے نہ جانے سے اس پر کیا بیتی ہوگی۔

پھر وقت گھڑی اور دن رات کا حساب ختم ہوگیا۔ معلوم نہیں کتنا عرصہ میرا ساتھ اس بنیے کا رہا مگر پھر وہ آنا بند ہوگیا پھر میں انتظار کرتا رہا کہ اگر وہ مر کھپ گیا ہے تو اس کی اولاد سے کوئی آئے گا تو میں چپ چاپ اس جگہ کو چھوڑ دوں گا مگر وہ لعین غالباً اپنی اولاد سے بھی یہ راز چھپا گیا۔

پھر وہ وقت آیا کہ وہ مایا چل پڑی۔ جی ہاں زمین میں چھپے خزانے ہمیشہ ایک مقام پر نہیں رہتے بلکہ وقت

بھی نہ جاپائی تھی اور گھر پر کوئی رقم نہ تھی کہ اس کا علاج ہوسکتا جب دوپہر ہوگئی تو اس کے بخار میں شدت آگئی۔

ہم دونوں بھوکے بھی تھے ماں نے مجھ سے کہا کہ میں ساہوکار کے گھر جاؤں اور جا کر کہوں کہ ماں بہت بیمار ہے وہ مہربانی کر کے ایک روپیہ دے دیں، اگلے روز جب اس کا بخار ٹھیک ہوجائے گا تو وہ کام کر کے یہ قرض چکادے گی۔

میں ماں کے کہنے پر گھر سے نکلا شدید ترین گرمی کا موسم تھا، ٹھیک دوپہر کا وقت ہونے کی وجہ سے تمام لوگ اپنے اپنے گھروں اور ٹھکانوں میں قلعہ بند ہوتے، ہو کا عالم تھا حتیٰ کہ چرند پرند بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے میں قمیض کے بغیر نیکر میں پسینے سے شرابور چلتا ہوا حویلی پہنچا، حویلی کا دروازہ کھلا تھا، میں اندر چلا گیا بہت خاموشی تھی کوئی نوکر یا گھر کا فرد نظر نہیں آیا غالباً دوپہر کا کھانا کھا کر وہ اپنے اپنے کمروں میں جاچکے تھے، چلتا چلتا جب میں دالان میں آیا تو دیوار کے ساتھ بچھے تخت پر لالہ دکھائی دیا، وہ قمیض کے بغیر ململ کی دھوتی میں ملبوس نیم دراز تھا، لالہ دراز قد اور دیو پیکر تھا اس کی آنکھیں بہت سرخ تھیں، ایک دم اسے سامنے پا کر میں ڈر گیا۔

مجھے دیکھ کر سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔ ''کہو بالکے کیسے آئے ہو؟''

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''لالہ جی ماں بہت بیمار ہے حکیم سے دوائی لینی ہے انہوں نے کہا ہے کہ مہربانی کر کے ایک روپیہ دے دیں وہ ٹھیک ہو کر کام کر کے چکادے گی۔''

لالہ چند لمحوں تک میری جانب غور سے دیکھتا رہا، نہایت پرسوچ انداز میں پھر اس کی آنکھوں میں چمک آگئی، اس نے کھڑے ہو کر آہستگی سے کہا۔ ''بالکے میرا ایک کام کرے گا، بدلے میں ایک نہیں دو روپے دوں گا وہ بھی واپسی کے بغیر۔''

میں ایک کمسن معصوم بچہ بھلا کیا جانوں کہ اس کی بات مانی جائے یا نہیں صرف اپنے بھوکے پیٹ اور ماں کے بخار کا سوچ کر سر ہلا دیا۔

اس نے پوچھا۔ ''جب تو آرہا تھا تو کسی نے تجھے یہاں آتے دیکھا۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں۔''

وہ مجھے پیچھے آنے کا کہہ کر حویلی کے اندر جانے لگا، میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ وہ بہت سارے کمروں کے اندر سے چلاتا ہوا غالباً حویلی کے آخری حصے تک آگیا یہ ایک خالی کمرہ تھا جس میں کوئی سامان نہیں تھا کمرے میں طاقچہ بنا ہوا تھا اس نے طاقچے میں ہاتھ داخل کر کے نجانے کیا کیا کہ سامنے کی دیوار جو بالکل ہموار تھی بیچ سے ہٹ گئی اور ایک تاریک خلا نظر آنے لگا، لالہ نے دیوار سے لگی ہوئی مشعل سے مشابہ کوئی چیز روشن کی اور مجھے لے کر اندر اترنے لگا یہ تہہ خانہ تھا چند زینوں کے بعد پاؤں زمین سے لگے تو روشنی ایکدم کئی گنا ہوگئی۔

جب میں نے اردگرد دیکھا تو نگاہیں چندھیا گئیں یہ ایک کمرہ تھا جو سونے اور چاندی کی اینٹوں اور جواہرات سے بھرا ہوا تھا انہی سے منعکس ہو کر مشعل کی روشنی میں اضافہ ہوا تھا۔ بہت ساری سونے کی اینٹیں تھیں جنہیں بہت ترتیب سے یوں رکھا ہوا تھا کہ وہ ایک چبوترے کی صورت اختیار کرگئی تھی۔

چند لمحے مجھے گردوپیش کا جائزہ لینے میں لگے اس کے بعد مجھ پر دہشت سوار ہونے لگی اس کمرے میں بے اندازہ دولت تھی کوئی جگہ خالی نہ تھی ہر طرف زروجواہر کے ڈھیر، خوشی کے بجائے خوف پیدا کررہے تھے۔

پھر لالہ جو کہ اب تک مجھ سے نرمی سے پیش آرہا تھا ایک دم درشت ہوگیا، میرے بغل میں ہاتھ دے کر سونے کی اینٹوں کے چبوترے پر بیٹھادیا اور بہت سختی سے بولا۔ ''سن بالک یہاں پر جم کے بیٹھا رہ جب تک میں نہ کہوں ہلنا بھی نہیں ورنہ تیری گردن کاٹ دوں گا۔'' اس لمحے اس کے تیور نہایت خطرناک تھے۔

میں بری طرح سے سہم چکا تھا پھر اس نے اس کمرے میں کہیں سے ایک دیا برآمد کیا اسے جلا کر زمین پر رکھا پھر پیلے سے سفوف سے دائرہ بنا کر اس میں بیٹھ

پھر اس نے مجھ پر اپنے منتروں کا علم آزمایا اور واقعی کچھ دیر کے بعد میں ایک انسان کی شکل میں کھڑا تھا۔

میں بے خود ہو کر خود کو دیکھنے لگا کہ اتنے برسوں کے بعد میں انسان کے قالب میں واپس آیا تو مارے خوشی کے گنگ ہو گیا یہ بھول گیا کہ کس حال میں کھڑا ہوں، سپیرے نے ایک چادر میری طرف اچھالی تو مجھے یاد آیا کہ مجھے پہلے ستر پوشی کرنی چاہئے، چادر میں نے جلدی سے لپیٹ لی اور میں اس بوڑھے کے قدموں میں سر رکھ کر اس کا احسان مند ہوا کہ اس نے مجھے نئی زندگی دے دی۔

اب میں پانچ چھ برس کا نہیں بلکہ چالیس سال کا ایک مرد تھا۔ میری زندگی کے بتیس برس اس جہنمی دولت کی نذر ہو گئے، میں رخصت ہونا چاہتا تھا کہ اس بوڑھے نے کہا۔ ”دیکھو جوان یوں خالی ہاتھ جانا بھی مناسب نہیں بہتر ہے کہ جس دولت کی میں برسوں حفاظت کی ہے اس میں سے کچھ تو لے لو۔“

مگر میرے دل میں دولت سے اتنی نفرت بھری تھی کہ دیکھنا بھی قبول نہ تھا، کجا لے لینا مگر اس نے سمجھایا کہ ”زندگی کی شروعات بغیر پیسے کے ممکن ہی نہیں۔“ سو اس نے خود ہی ایک تھیلے میں کچھ سونے کی اینٹیں اور جواہر ڈال دیئے اور کہا کہ ”جاؤ اب نئے سرے سے زندگی جیو۔“ میں اس کا شکریہ ادا کر کے اور بیوہ عورت کی بھرپور مدد کی تاکید کر کے چل پڑا۔

جب میں اس ساہوکار کے ظلم کا شکار ہوا تھا وہ غالباً متحدہ ہندوستان کے وقت کی بات تھی اب وقت تیس برس آگے آ چکا تھا یہ جگہ مملکت خداداد تھی سو ماں کو تلاش کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ اب تک میں اس کے چہرے کے علاوہ ہر بات بھول چکا تھا مگر پھر بھی ہر بوڑھی عورت کو اس خیال سے دیکھتا کہ وہ میری ماں تو نہیں۔

میں نے ایک شہر میں جا کر زندگی کا آغاز کیا، پیسے کی کمی نہ تھی، سو ایک گھر لے کر رہنے لگا پھر زندگی کی تنہائی اپنا احساس دلانے لگی میں کسی سے کہہ سن کر ایک غریب گھر کی مناسب سی عورت دیکھ کر نکاح کر لیا، میں بیوی کے آجانے سے بہت خوش تھا، میں نے اپنی حقیقت تو نہ بتائی کہ وہ خوفزدہ ہو کر مجھے چھوڑ نہ جائے۔

مگر اگلی صبح وہ مردہ پائی گئی وہ بھی اس عالم میں کہ اس کا تمام بدن نیلا پڑ چکا تھا، تب مجھ پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ میرا پیچھا، ماضی سے مکمل طور پر نہیں چھوٹا، میں سانپ کے قالب سے تو نکل آیا مگر اس کا زہر اب میرے وجود کا حصہ تھا جو میری ایک رات کی بیوی کی لاش کی صورت میں میرے سامنے تھا۔

اب اہل محلہ اور سسرال والوں کے سامنے میں نے بیوی کو سانپ ڈس جانے کی کہانی سنا کر مطمئن کیا اور اس کے سفر آخرت کی تیاری کر کے اسے شہر خموشاں چھوڑ آیا۔ اب اس شہر سے میرا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ میں نے وہ شہر چھوڑا اور یہاں آ کر رہنے لگا، مزید شادی کا خیال دل سے نکال دیا کہ محض ایک رات کی رفاقت کے لئے ناحق کسی کی جان کیوں لوں۔

اپنے اندر زہر کی موجودگی کا علم ہوتے ہی میں نے احتیاط برتنی شروع کر دی، اپنے کھانے پینے کے برتن اپنے لئے محدود کر لئے اور دکان بھی وقت گزارنے کے لئے کھولی ہے کہ فارغ ہو کر کیا کروں گا، لوگوں کو کوئی گزند نہ پہنچے اس لئے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے رکھتا ہوں۔ میں نے تو کسی سے راہ و رسم بھی نہ رکھی کہ کسی کو میری حالت کا علم نہ ہو جائے اور میں اپنے ہی ہم جنسوں سے دور ہو جاؤں مگر آپ کی محبت نے میرا عہد توڑ دیا میں آپ کا دوست تو بن گیا مگر آپ کی محبت کا جواب دینے کے لئے میں شادی نہیں کر سکتا اس لئے یہ ساری بات بیان کر دی ہے اب شاید آپ بھی مجھ سے کوئی تعلق نہ رکھنا چاہیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ سر جھکا کے رونے لگا۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگایا اور کہا۔

”میرے دوست تمہارا ماضی ہماری دوستی اور محبت میں حائل نہیں ہو سکتا کیونکہ حادثے انسانوں کے ساتھ ہی ہوا کرتے ہیں یہ تمہاری خطا نہیں تقدیر کا لکھا ہے جو پورا ہو گیا، اب آنسو پونچھو اور خود کو میرا بھائی ہی تصور کرو۔“



کے ساتھ سفر کرتے رہتے ہیں۔ یہ خزانہ بھی برسوں کے بعد چل نکلا اور زمین کے اندر اندر سفر کرتا رہا، اس سفر میں میری اور ہم جنسوں سے بھی ملاقات ہوتی رہی جو میری طرح خزانوں کے خود ساختہ رکھوالے تھے میں بظاہر ان کے جیسا ہوتے ہوئے بھی ان سے بہت الگ تھا، وہ پیدائشی جانور تھے جبکہ مجھے انسان سے اس حالت میں لایا گیا تھا اور وہ ان خزانوں پر اپنی فطرت کی وجہ سے مسلط ہوئے تھے اور میں زبردستی بیٹھا دیا گیا تھا۔ انہیں غالباً میری اصلیت کا ادراک تھا جبھی ان میں سے کوئی مجھ سے مانوس ہونے کی کوشش نہ کرتا۔

بہرحال یہ ضرور تھا کہ میرے پاس موجود خزانہ ان تمام خزانوں سے بڑا تھا جو گردش کے اس سفر میں میری نظر سے گزرے۔

اتنا کہنے کے بعد وہ کچھ دیر کو خاموش ہوگیا اور میں بھی اس طلسم سے کچھ باہر آیا جو اس کی حیرت انگیز اور دلگیر داستان سے ماحول پر طاری تھا میں نے دیکھا کہ اپنی بپتا سناتے ہوئے اس کی آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ رہے تھے۔

اس لمحاتی توقف کے بعد اس نے سلسلہ وہیں سے جوڑا۔ ”نامعلوم میں کتنے سال سے اس سفر میں رہا مگر ہمہ وقت یہ خواہش دل میں رہی کہ کوئی وسیلہ بنے اور میں اس قالب سے نجات پالوں۔ پھر گردش کرتے کرتے یہ مایا ایسی جگہ آرکی جہاں زمین کے اوپر سپیروں کے ایک قبیلے کا ڈیرہ تھا۔ سانپ کے قالب میں رہتے ہوئے مجھے ان خصوصیات کا بخوبی علم ہو چکا تھا جو مجھ میں آچکی تھیں اور جو تمام اعلیٰ نسل کے سانپوں میں ہوتی ہیں۔

اس قبیلے میں ایک بیوہ عورت بھی تھی جس کا ایک ہی چھوٹا سا بیٹا تھا، وہ بھی بیمار، میں نے جان لیا کہ اس قبیلے میں موجود ایک بوڑھا سپیرا سانپوں پر بے پناہ علم رکھتا ہے، وہ واحد شخص تھا جو اگر آمادہ ہو جاتا تو مجھے اس قالب سے واپس انسان کی جون میں لاسکتا تھا۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا اور اس سے قبل کہ یہ مایا آگے چل پڑتی یا یہ قبیلہ کوچ کر جاتا میں نے اس بیوہ کے خواب میں آکر اس کو دولت وزر کے انبار دکھائے اور کہا کہ ”میں یہ سب اسے دوں گا اگر وہ اپنے قبیلے کے اس بوڑھے کو میری مدد پر آمادہ کرے۔“ میں دو تین روز تک اس کے خواب میں آتا رہا اور اس جگہ کی نشاندہی بھی کر دی جہاں میں زیرزمین اس خزانے پر کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

جب بار بار اس عورت نے ایک ہی خواب دیکھا تو ایک روز اس نے بوڑھے سپیرے کو ساری بات کہہ سنائی اور اس ڈیرے سے چند گز کے فاصلے پر میرے ٹھکانے سے بھی آگاہ کر دیا۔

اس سپیرے نے عورت کو مطمئن کر کے بھیج دیا اور خود اس جگہ پر بیٹھ کر اس نے مجھ سے ذہنی رابطہ کیا تو میں نے اسے اپنا حال بیان کر دیا اور استدعا کی کہ ”میں اس خزانے کی نگرانی سے تنگ آچکا ہوں مہربانی کر کے مجھے اس سے نجات دلائیے اور مجھے میری اصل پر لوٹا دے۔“

اس نے تسلی دی اور چاند مکمل ہونے پر آنے کا وعدہ کیا۔

اب میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، میں پل پل گن رہا تھا کہ کب چاند مکمل ہو اور مجھے آزادی کا پروانہ ملے اس بوڑھے نے اپنے قبیلے والوں سے کیا معاملہ طے کیا یہ تو معلوم نہیں مگر جب چودہویں کی رات آئی تو وہ بوڑھا سپیرا اپنی بین لے کر نصف شب کو آموجود ہوا، بڑھاپے نے اس کے قویٰ تو مضمحل کر دیئے تھے مگر علم کی جولانی بدستور تھی۔

اس نے ایک سرخ سفوف سے پہلے اس جگہ کا حصار کیا جو میرے اوپر آتی تھی پھر اس حصار میں بیٹھ کر کچھ دیر منتروں کا ورد کرتا پھر اس نے بین اٹھا کر بجانا شروع کر دی، اس کی بین کی آواز نے مجھے بے چین کر دیا، میں دیوانہ وار اس کے سامنے آ گیا، وہ کچھ دیر نگاہ جمائے میری آنکھوں میں دیکھتا رہا، سانپ کی آنکھوں کا طلسم مشہور ہے مگر اس لمحے اس کی آنکھوں کا سحر میرے اندر کو جلا رہا تھا۔

حسب وعدہ میں نے پہلے خزانہ اس کے روبرو کر دیا، اتنی مایا دیکھ کر بھی اسے مطلق کوئی اثر نہیں ہوا،

ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ آبادی کا دور، دور تک کوئی نام و نشان نہ تھا بلکہ کچھ فاصلے پر دو تین جھونپڑیاں نظر آئیں۔ ان جھونپڑیوں کو دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ رات اچھی گزر جائے گی۔ دو جھونپڑیاں خالی تھیں جبکہ ایک جھونپڑی میں ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس کو دیکھ کر مسکرائی۔

''مسافر لگتے ہو یقیناً تمہاری گاڑی خراب ہوگئی ہوگی؟'' وہ بولی۔

''ہاں اماں یہ بات درست ہے لیکن آپ کو کیسے علم ہوا؟'' کلیم نے پوچھا۔

''اکثر مسافر گاڑی خراب ہونے پر ہی یہاں کا رخ کرتے ہیں تاکہ انہیں کھانے پینے کو کچھ مل جائے اور آسانی سے پیر پھیلا کر رات گزار سکیں۔''

''اچھا، اچھا اس کا مطلب ہے مسافر یہاں آتے رہتے ہیں لیکن اس ویرانے میں آپ کو ڈر نہیں لگتا؟'' کلیم نے پوچھا۔

''ڈر کیسا میرے پاس ہے ہی کیا جو میں چور ڈاکوؤں سے ڈروں۔'' بوڑھی عورت نے پراسرار لہجے میں کہا۔

''واقعی آپ کے پاس ڈاکوؤں کو لوٹنے کو کچھ بھی نہیں ہے، کیا مجھے یہاں رات گزارنے کے لئے جگہ مل جائے گی۔؟'' کلیم نے پوچھا۔

''ہاں، ہاں دو اضافی جھونپڑیاں میں نے بنائی ہیں، صرف مسافروں کو ٹھہرانے کے لئے۔'' بوڑھی عورت بولی۔

''ٹھیک ہے اماں مجھے سفر کی تھکن بہت ہے اس لئے میں سونا چاہتا ہوں۔ کھانا میں نے راستے میں کھالیا تھا۔ اس لئے کھانے کی زحمت نہیں کرنا۔'' یہ کہتے ہوئے کلیم سونے کے لئے چلا گیا۔ سفر کی تھکن اتنی زیادہ تھی کہ وہ جھونپڑی کے فرش پر ایسا پڑ کر سویا کہ صبح ہونے پر ہی آنکھ کھلی۔ بیدار ہونے پر وہ اپنے اندر بہت زیادہ کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ چٹائی پر لیٹے لیٹے اس نے بے خیالی میں جھونپڑی کی چھت پر نظر دوڑائی۔ وہاں کئی موٹی موٹی چمگادڑیں دیکھ کر وہ خوفزدہ ہو کر اٹھ بیٹھا۔

''اٹھ گئے بیٹا؟'' بوڑھی عورت نے اسے اٹھتا دیکھ کر کہا۔

''ہاں اٹھ گیا، یہ...... یہ...... چمگادڑیں کہاں سے آ گئی ہیں جھونپڑی میں، بڑی خطرناک انداز میں چھت سے لٹکی ہوئی ہیں۔'' کلیم نے پوچھا۔

''یہ میری پالتو چمگادڑیں ہیں تم ان سے نہیں ڈرو، یہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گی۔'' بوڑھی عورت پراسرار انداز میں بولی۔

''بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ کچھ نہیں کہیں گی۔ ان کا کام خون پینا ہے اپنی بھوک مٹانے کو یہ کسی کی بھی پرواہ نہیں کرتیں۔'' کلیم نے کہا۔

''میں نے کہا نا کہ یہ کچھ نہیں کہیں گی یہ صرف رات کی سیاہی میں خون پیتی ہیں، دن کی روشنی میں جھونپڑی سے باہر نہیں جاتیں اور نہ کسی کا خون پیتی ہیں۔''

''اس ویرانے میں انہیں خون کہاں سے ملتا ہوگا؟''

''تم ان کی فکر نہ کرو ان کے خون پینے کا انتظام خود بخود ہو جاتا ہے۔ اس وقت ان کا پیٹ خون سے بھر چکا ہے اس لئے خاموشی سے سو رہی ہیں، آؤ میں تمہارے ناشتے کا بندوبست کرتی ہوں۔''

''ن...... نہیں مجھے بھوک نہیں ہے، میں چلتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے کلیم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی ٹانگوں میں لرزش محسوس ہو رہی تھی کمزوری کی وجہ سے اور ساتھ ہی بھوک بھی لگ رہی تھی۔ وہ اس پراسرار ماحول سے گھبرا گیا تھا اور جلد سے جلد وہاں سے دور بھاگ جانا چاہ رہا تھا۔ بوڑھی عورت ناشتے کو روکتی رہ گئی لیکن وہ بھاگتا ہوا اپنی کار کے پاس پہنچا، کار اس کی جوں کی توں کھڑی تھی۔ کلیم نے جیسے ہی کار کو چابی لگا کر اسٹارٹ کیا وہ فوراً اسٹارٹ ہوگئی، کار کے اسٹارٹ ہو جانے پر وہ کار کو دوڑاتا ہوا چلا گیا۔ راستے میں ایک ہوٹل سے ناشتہ کیا اور آگے بڑھ گیا۔

سفر سے لوٹنے پر کلیم کو زیادہ کمزوری محسوس ہو رہی



خونی واردات

خلیل جبار۔ حیدر آباد

بستر پر لیٹتے ہی نوجوان تھکن کی وجہ سے بے سدھ ہوگیا اسے اپنے ارد گرد کا کوئی ہوش نہ رہا اور پھر جب صبح کے وقت اس کی آنکھ کھلی تو اس کی دنیا ہی بدل چکی تھی وہ اس قدر کمزور ہوچکا تھا کہ اس سے چلنا دوبھر ہوگیا۔

خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش لرزہ براندام کہانی

ویرانے میں گاڑی کے بند ہوجانے پر کلیم نے گاڑی کو غور سے دیکھا اور پھر بار بار کوشش کرنے پر گاڑی اسٹارٹ نہ ہوئی تو اس نے غصے سے نیچے زمین پر اتر کر زور سے گاڑی کو لات ماری۔ اس ویرانے میں گاڑی خراب ہوجانے پر وہ کہیں گاڑی کھڑی کرکے رات میں سونے کا ٹھکانہ تلاش کرتا لیکن سوائے پہاڑی اور پتھریلی علاقے کے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ رات گزارنے کی کوئی جگہ نظر نہیں آرہی تھی۔ تو اس کا دل چاہا کہ وہ صبح تک اپنی کار میں سو کر رات گزارے۔

کلیم ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے کار کو دھکا دے کر ایک ٹیلے کی طرف اس طرح کھڑا کردیا کہ سڑک پر سے گزرنے والا کار کو نہ دیکھ سکے۔

اس کام سے فارغ ہوکر اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں شاید کہیں دور کوئی آبادی نظر آئے۔ لہٰذا وہ ٹہلتا

کردیا کہ کسی انسان کا تازہ خون پیے، تازہ خون کی طلب نے اس کو راتوں میں آوارہ گردی کرکے شکار تلاش کرنے لگا۔

رات کی تاریکی میں کسی کو بھی پکڑ کر اس کا خون پی جاتا۔

تازہ خون نے اس کے جسم میں بے پناہ پھرتی پیدا کردی۔ وہ پلک جھپکتے میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا تھا۔ اس کی یہ کارروائیاں تیز ہونے پر پورے شہر میں اس کے بارے میں باتیں پھیل گئیں لوگوں نے خوفزدہ ہوکر راتوں کو شہر میں گھومنا بند کردیا تھا۔ کلیم کسی نہ کسی طرح اپنا شکار تلاش کرہی لیتا تھا۔ پولیس بھی حرکت میں آ گئی تھی اور وہ خون پینے والے کو تلاش کرتی پھر رہی تھی۔

☆......☆......☆

سرفراز اپنے دوست کی تقریب سے لوٹا تھا۔ اچانک کچھ دوری پر اس کو ایک کار نظر آئی۔ جس نے بریک لگائے اور کار سے کسی کو نیچے پھینک کر آگے کو بڑھ گئی۔ سرفراز کو تجسس ہوا اور اس نے اپنی کار کی رفتار کو تیز کردیا۔ کار کے قریب پہنچنے پر اس نے کار کے نمبر نوٹ کرکے اپنی کار کی رفتار دھیمی کرکے اس کا رخ پیچھے کی جانب کردیا۔ کار سے کسی لڑکی کو پھینکا گیا تھا۔ وہ لڑکی ہلکے ہلکے سانس لے رہی تھی۔ سرفراز نے اس لڑکی کو فوری طور پر اسپتال پہنچایا۔ بروقت طبی امداد ملنے پر وہ بچ گئی۔

''وہ کون تھا جس نے تمہیں کار سے دھکا دے کر گرایا تھا۔'' سرفراز نے لڑکی کے ہوش میں آنے پر اس سے پوچھا۔

''وہ......وہ......ڈریکولا تھا۔ اس نے میرا خون پی کر کار سے دھکا دے دیا تھا۔''

ڈریکولا کا نام سن کر سرفراز کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی جس کی اسے تلاش تھی۔ وہ اتنی آسانی سے مل جائے گا۔ پچھلے دنوں سرفراز کی بہن کو اغوا کرلیا گیا تھا۔ اور چند دن کے بعد اس کی ایک سڑک پر سے لاش ملی تھی، ڈریکولا نے اس کا سارا خون چوس لیا تھا۔ جس کے سبب وہ مرگئی تھی۔

''تم بچ کیسے گئیں یہ ڈریکولا جب تک لڑکی کا سارا خون پی نہ جائے چھوڑتا نہیں ہے۔'' سرفراز نے پوچھا۔

''دراصل میں نے اس سے لفٹ مانگی تھی۔ مجھے جلدی گھر پہنچنا تھا۔ اس نے لفٹ دے کر دھوکے سے میرا خون پی لیا۔ خون پینے پر مجھ پر مدہوشی طاری ہوگئی تھی۔ لیکن یہ مدہوشی زیادہ دیر نہ رہی اور مجھے ہوش آ گیا اور میں نے اس کو کار روکنے کا کہا۔ لیکن جب اس نے کار نہ روکی تو میں نے اس پر حملہ کردیا۔ بوکھلا کر اس نے مجھے خاموش رہنے کی تاکید کی۔ لیکن میں نہ مانی اور مسلسل مزاحمت کرتی رہی، ہاتھا پائی کرتے ہوئے کار کا دروازہ کھل گیا اور میں نیچے سڑک پر گر پڑی، اپنے پیچھے کار کو آتا دیکھ کر وہ کار کی اسپیڈ بڑھا کر بھاگتا چلا گیا۔ اس کار کے نہ آنے پر ڈریکولا مجھے نہیں چھوڑتا اور ضرور اغوا کرکے اپنے گھر لے جاتا اور وہی سلوک کرتا جو وہ اور لڑکیوں کے ساتھ کررہا ہے۔

''میں نے تمہارے گھر اطلاع کردی ہے تمہارے گھر والے آتے ہی ہوں گے، میں اب چلتا ہوں۔'' سرفراز نے اجازت چاہی۔

''لیکن......آپ کو میرے گھر والوں کے بارے میں کیسے پتا چلا؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے تمہارے موبائل پر کال آئی تھی۔ وہ بڑے پریشان تھے میں نے انہیں ساری صورت حال بتا کر یہاں بلالیا ہے۔''

''ابھی میں نے اور میرے گھر والوں نے آپ کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا اور آپ اتنی جلدی جارہے ہیں۔'' لڑکی نے کہا۔

''شکریہ میں ادا کرتا ہوں کہ آج کے اس واقعہ نے مجھے ڈریکولا تک پہنچنے کا موقع فراہم کردیا ہے۔ میں اب آسانی سے ڈریکولا تک پہنچ کر اپنا انتقام لوں گا۔'' سرفراز نے کہا۔

''کس طرح کا انتقام؟'' وہ چونکی۔

تھی، اٹھتے بیٹھتے چکر آنے لگے تھے۔ مجبوراً اسے ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑا۔ ڈاکٹر نعمان ان کا فیملی ڈاکٹر تھا۔ کلیم کا اس سے دو ہفتے سے علاج چل رہا تھا۔ اس کے میڈیکل چیک اپ کے لئے کئی ایکسرے اور ٹیسٹ بھی ہوچکے تھے۔ رپورٹ نارمل تھی، کمزوری محسوس ہونے پر ڈاکٹر نعمان بھی حیران ہوگئے۔

''بڑی حیرت کی بات ہے تم واقعی بہت کمزور ہوگئے ہو، تین دن قبل تمہارے چہرے سے بالکل بھی نہیں محسوس ہو رہا تھا کہ کمزور ہو، تمہارا مجھے فوری طور پر خون ٹیسٹ کرانا پڑے گا۔ رپورٹ آنے پر ہی میں کچھ کہہ سکوں گا۔'' ڈاکٹر نعمان نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے آپ ٹیسٹ لکھ دیں میں ابھی ٹیسٹ کرالیتا ہوں۔'' کلیم نے کہا۔

خون ٹیسٹ کی رپورٹ آنے پر وہ دوسرے دن ڈاکٹر نعمان کے پاس پہنچا۔

''ارے بھئی تمہارا خون بہت کم ہوگیا ہے۔'' ڈاکٹر نعمان نے حیرت سے رپورٹ کو دیکھا۔ ''کمزوری محسوس ہونا لازمی بات ہے۔ سب سے پہلے تم کو خون کی کئی بوتلوں کا انتظام کرنا پڑے گا اور تمہارا علاج بھی چلے گا۔''

''خون کی بوتلیں چڑھانا لازمی ہے؟'' کلیم نے پوچھا۔

''ہاں بھئی فوری طور پر تمہاری طاقت کو بحال رکھنے کو یہ کرنا ضروری ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

کلیم کو خون حاصل کرنے کے لئے اپنے دوستوں کی خدمات حاصل کرنا پڑیں۔ خون کی بوتل لگنے سے اس کو بڑا فرق محسوس ہو رہا تھا اور کمزوری میں بھی کمی واقع ہوئی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب میں اب بہتر محسوس کر رہا ہوں گیا اور خون کی بوتل لگوانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''ایک دو بوتل اور لگ جانا بہتر رہے گا۔'' ڈاکٹر نے خون کی بوتل کی نلکی ہٹاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میں کئی دوستوں کی خدمات حاصل کرتا ہوں۔'' کلیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر کے کمرے سے باہر جانے پر بے خیالی میں اس کی نظر اپنے ہاتھ کی انگلیوں پر پڑی بوتل ہٹائے جانے پر خون کے چند قطرے اس کے ہاتھ کی انگلیوں پر گر گئے تھے۔ ان خون کے قطروں کو دیکھ کر بے اختیار اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ ان خون کے قطروں کو چاٹے، کلیم نے ادھر ادھر نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس وقت کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے ان خون کے قطروں کو انگلیوں سے چاٹ لیا۔ خون چاٹتے ہوئے اس کو ایک عجیب سی لذت کا احساس ہوا۔

کلیم کا دل چاہنے لگا کہ وہ اور خون پیئے۔ فوری طور پر اس کے لئے خون کا انتظام مشکل تھا۔ اس کا رخ ایک بلڈ بینک کی طرف ہوگیا۔ وہاں سے خون حاصل کرکے وہ سیدھا گھر پہنچا اور بوتل سے خون گلاس میں ڈال لیا۔ گلاس منہ سے لگاتے ہوئے گھن سی محسوس ہوئی لیکن وہ آنکھیں بند کرکے پورا گلاس پی گیا۔ خون اس کے جسم میں جاتے ہی وہ خاصی توانائی سی محسوس کرنے لگا ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کے جسم میں کوئی کمی ہوگئی جو خون پینے سے پوری ہوگئی ہے۔

کلیم رات کو جب سونے کو بستر پر لیٹا۔ اسے بوڑھی عورت اور چمگادڑوں کا خیال آ گیا۔ کس قدر وہ پراسرار عورت تھی۔ چمگادڑیں بھی بڑی خطرناک تھیں جنہیں دیکھ کر بدن میں جھرجھری پیدا ہوجائے۔

وہاں رکنے سے مجھے خون کی کمی ہوئی تھی، ضرور ان چمگادڑوں نے میرا خون پیا تھا۔ ورنہ میرے خون میں کوئی کمی نہیں تھی پھر اچانک ایک رات میں اس قدر خون کی کمی کیسے ہوگئی۔

کلیم کا اب یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ مختلف بلڈ بینکوں سے خون لے کر پینے لگا تھا۔ خون پینے کا شوق اس کو بہت مہنگا پڑ رہا تھا اور وہ تازہ خون بھی نہیں ہوتا تھا اس لئے تازہ خون پینے کی خواہش نے اس کو مجبور

زندہ صدیاں

ایم اے راحت

قسط نمبر: 12

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر جھلمل کرتی، قوس قزح کے دھنک رنگ بکھیرتی، حقیقت سے روشناس کراتی، دل و دماغ میں ہلچل مچاتی ناقابل یقین ناقابل فراموش انمٹ اور شاہکار کہانی

سوچ کے نئے دریچے کھولتی اپنی نوعیت کی بے مثال، لاجواب اور دلفریب کہانی

میں جس کیفیت کا شکار تھا میرا دل ہی جانتا تھا۔ پراسرار کہانیوں کا خالق، تاریخ کی تحقیق کا تمیں مار خان اس وقت چوہا بن گیا تھا۔ بالکل ہی بے عقل نہیں ہوگیا تھا۔ کوروتی مجھے پولیس لاک اپ سے نکال لائی تھی۔ لیکن اب میں باقاعدہ مجرم بن گیا تھا۔ ایک اہم شخصیت کے قتل کی تفتیش کے لئے مجھے پکڑا گیا تھا۔ اس قتل کا تعلق ایک انسانی ڈھانچے سے بتایا جارہا تھا جس کا تعلق مجھ سے تھا۔ ممکن ہے پولیس کو کوئی اور پراسرار کہانی سنا کر اپنی پوزیشن صاف کرلیتا لیکن اب تو وہی قاتل ڈھانچہ مجھے لاک اپ سے نکال لایا تھا اور اس سے میرا سو فیصدی تعلق ثابت ہوگیا تھا۔ پولیس اس ڈھانچے کو کم، مجھے زیادہ تلاش کرے گی۔

کوروتی پراسرار علوم کی ماہر تھی، کسی بھی مشکل سے بچ سکتی تھی لیکن میرا کیریئر تباہ ہوگیا تھا۔ میرے پبلشرز بھی بے چارے میری وجہ سے مصیبت میں گرفتار ہوں گے۔

''بہت پریشان ہو عالی؟'' کوروتی نے کہا۔

''ہاں کوروتی۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''مجھے بہت افسوس ہے لیکن، اس کی آواز سسکی میں بدل گئی۔ کافی دیر تک خاموش بیٹھے رہنے کے بعد وہ بولی۔ ''لیکن...... میرا صدیوں کا تجربہ ہے کہ مشکلات کتنی ہی اہم اور بظاہر ناقابل حل محسوس ہوتی ہوں۔ لیکن ان کا کوئی نہ کوئی حل نکل آتا ہے۔ ان مشکلات کا حل بھی آخرکار نکل ہی آئے گا۔ تم پریشان نہ ہو۔

''کیا عمدہ بات کہی ہے کوروتی۔'' میرے لہجے میں طنز پیدا ہوگیا۔

''کیوں......؟'' وہ بولی۔

''تم صدیوں سے جی رہی ہو۔'' اور صدیوں جیو گی۔ لیکن مجھ غریب کو تو تھوڑی سی زندگی ملی ہے۔ وہی کہ عمر دراز مانگ کر لائے تھے چار دن، جو کہ اب پولیس سے آنکھ مچولی میں گزریں گے۔

وہ خاموش ہوگئی۔ جیسے میرے الفاظ سے اسے دکھ پہنچا ہو۔ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ''اب آگے کی زندگی کے لئے ایک لائحہ عمل بنانا ہوگا ہمیں، اور سنو، اب میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میرے ساتھ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ گوتم بھنسالی صدیوں سے میرے عشق میں گرفتار ہے۔ لیکن اسے سکون تھا کہ میں کسی سے پیار نہیں کرتی۔ میں نے کسی کو اپنا قرب نہیں بخشا۔ اب وہ دیوانہ اسی لئے ہوا ہے کہ...... میں نے اپنا سب کچھ تمہیں دے دیا۔ اور اس

''مجھے اپنی بہن فائزہ کا انتقام ڈریکولا سے لینا ہے اس نے میری بہن کا خون پی کر بڑی بے دردی سے اسے ہلاک کردیا تھا اور میں پاگلوں کی طرح راتوں میں اسے تلاش کرتا پھر رہا تھا۔'' سرفراز نے کہا۔

سرفراز اسپتال میں کچھ دیر رک کر سیما کا شکریہ ادا کرکے گھر چلا آیا۔ ڈریکولا کے خلاف اس کے دل میں جو آگ اٹھ رہی تھی اس میں اور تیزی آ گئی تھی۔ دوسرے دن سب سے پہلے اس نے رجسٹریشن آفس سے کار کے مالک اور گھر کا ایڈریس لیا۔ گھر کا پتا معلوم ہوجانے پر اس نے رات میں اپنی کار ڈریکولا کے گھر سے کچھ فاصلے پر پارک کی اور اس کا انتظار کرنے لگا۔

کار کے اندر اس نے مکمل اندھیرا کیا ہوا تھا تاکہ وہ ڈریکولا کو نظر نہ آسکے۔

رات کے دو بجے ڈریکولا کی کار آتی نظر آئی۔ ڈریکولا نے کار کو روک کر باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھا اپنا مکمل اطمینان ہوجانے پر اس نے کسی دوشیزہ کو اپنے کاندھوں پر لاد کر بڑے اطمینان کے ساتھ کار کو لاک کرکے گھر کے اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی پھر واپسی ہوئی۔ گھر کا گیٹ کھول کر ڈریکولا نے کار کو اندر پارک کرکے گیٹ بند کردیا۔

سرفراز نے دو تین گھنٹے انتظار کرکے گھر کی باؤنڈری وال پر چڑھ کر اندر کود گیا اور مین گیٹ کھول دیا تاکہ اس کو بھاگنے میں آسانی ہو۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ گھر کے اندر داخل ہوگیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ ایک کمرے میں ڈریکولا سورہا تھا۔ دوسرے کمرے خالی تھے۔ ایک کمرے میں وہ لڑکی ایک مسہری پر سو رہی تھی اور باہر سے دروازے میں کنڈی لگی تھی۔

سرفراز نے لڑکی کو ہلکے سے جگایا۔ جاگنے پر وہ بری طرح چونکی لیکن سرفراز نے فوری طور پر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''خبردار شور نہ کرنا ورنہ ڈریکولا جاگ جائے گا۔'' سرفراز نے کہا۔

''ت...... تت...... تم کون ہو؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''جو لڑکیاں ڈریکولا کے ہاتھوں شکار ہو کر مرگئی ہیں۔ ان ہی میں سے ایک لڑکی کا بھائی ہوں، میں اس ڈریکولا سے اپنی بہن کا انتقام لینا چاہتا ہوں، کیا تم میری مدد کروگی۔'' سرفراز نے پوچھا۔

''میں کس طرح تمہاری مدد کرسکتی ہوں، مجھے ڈریکولا اٹھا کر لے آیا ہے۔''

''میری بات توجہ سے سنو، میرے پاس کار میں پٹرول کے کئی بڑے بڑے گیلن رکھے ہیں انہیں ہم سارے گھر میں ڈال کر دروازے کو لاک کرکے آگ لگادیتے ہیں۔ اس طرح یہ ڈریکولا اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔'' سرفراز نے اپنا منصوبہ بتایا۔

''ٹھیک ہے چلیں گیلن لے آتے ہیں۔'' لڑکی نے کہا۔

سرفراز اور لڑکی کی محنت سے پورے گھر میں چاروں طرف پٹرول بہہ رہا تھا۔ سرفراز نے دروازے کی کنڈی بند کرکے اس پر ایک موٹا سا تالا لگادیا۔ گھر کے بڑے گیٹ سے نکل کر ماچس کی تیلی اندر اچھال دی۔ پٹرول نے آگ کے شعلے کو فوراً لپکا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے گھر کو چند منٹوں میں گھیرے میں لے لیا۔ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کررہے تھے، سرفراز اور وہ لڑکی دور کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ جب تک فائر بریگیڈ پہنچی، سب کچھ جل کر خاک ہوچکا تھا۔ گھر کے اندر سے پولیس کو ڈریکولا کا ڈھانچہ ملا جو اس قدر جل چکا تھا کہ اس کی ہڈی کو ہاتھ لگانے پر وہ ٹوٹ کر فرش پر گررہی تھی۔ سرفراز کو ڈریکولا کا ڈھانچہ دیکھ کر اطمینان کا احساس ہوا۔ اس کا انتقام پورا ہوچکا تھا۔

ڈریکولا کے مرتے ہی شہر میں ڈریکولا کی خونی وارداتیں بھی ختم ہوگئی تھیں۔ کسی کو بھی پتا نہیں چلا کہ ڈریکولا کہاں چلا گیا لیکن اس شہر میں دو افراد ایسے تھے جنہیں معلوم تھا کہ ڈریکولا مر کر اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔



نے اسی رقابت میں میرے ساتھ یہ سب کیا ہے۔"

"تو پھر......؟" میں نے کہا۔

"تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

اس کے یہ الفاظ میرا دم نکالنے کے لئے کافی تھے۔ آپ خود غور کریں۔ ایک خوفناک انسانی ڈھانچہ جسے دیکھ کر ہی جان نکل آئے۔ آپ کو اس کی پذیرائی کرنی ہے، اسے اپنی خلوتوں میں جگہ دینی ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو۔" اس کی آواز ابھری۔

"تم نے اس ڈاکٹر کو کیوں قتل کیا۔" میں نے کہا۔

"میرا دل تو چاہتا ہے کہ ساری دنیا کو فنا کردوں۔" وہ غرا کر بولی۔

"وہ تو بے قصور تھا۔"

"میرے درد کا درماں کون کرے گا۔"

"کوئی اگر نہ کرسکے تو اس کا کیا قصور ہے۔"

"میں نہیں جانتی۔"

"اگر یہ نہ ہوتا تو مجھے مجرم نہ گردانا جاتا۔ اور ہم دونوں مل کر اس مشکل کا کوئی حل تلاش کرتے۔"

وہ خاموش ہوگئی۔ دیر تک یہ خاموشی طاری رہی پھر اس نے کہا۔ "اسی لئے میں کہہ رہی ہوں کہ ہمیں ایک لائحہ عمل بنانا ہوگا۔ کوئی تدبیر کرنی ہوگی۔ تم اپنی دنیا کے ایک ذہین انسان ہو۔ جو تم سوچ سکتے ہو، میں تمہیں سوچ سکتی۔ مجھے اپنا اصل وجود چاہئے۔ اور یہ بھی ہر قیمت پر حاصل کرنا ہوگا۔ چلو چھوڑو۔ تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ میں تمہارے لئے کچھ کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔"

"تم......؟" میں نے کہا۔

"ہاں، دیکھتی ہوں تم آرام کرو، اور سنو، یہاں سے بھاگنے کی کوشش مت کرنا، تمہیں تلاش کرنا میرے لئے مشکل نہ ہوگا۔"

"اپنے ساتھ پولیس لے کر مت آجانا۔" میں نے کہا اور اس کی ہنسی سنائی دی۔ پھر اس نے وہ موٹا کھیس اوڑھا اور باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد مجھے یوں لگا جیسے میں مہینوں کا بیمار ہوں۔ شدید نقاہت محسوس ہورہی تھی جیسے بدن کی جان نکل گئی ہو۔ یہ کیا ہوگیا کتنی سبک روی سے زندہ صدیاں چل رہی تھیں۔ کوروتی مجھے صدیوں کی تاریخ سے روشناس کرا رہی تھی۔ تاریخ کے وہ پراسرار نام جن کی سحر انگیز داستانوں کی آؤٹ لائنز ہی سنی تھیں ان سے متعلق مستند کتابوں کا فقدان ہے۔ جیسے مصر کی حسین ساحرہ کلوپٹرہ، ٹرائے کی ہیلن، نینوا کی ہم جنس پرست، جرمنی کی ایوا براؤن، یونان کی سائیکی، یولیوا کی جین آرک اور نہ جانے کون کون، بس وقت ساتھ نہ دے سکا۔

اور اب بے چارہ ذیشان عالی اس پراسرار کوٹھی کا قیدی ہے۔ اور باہر پولیس ڈنڈے لئے دندناتی پھر رہی ہے۔

کوروتی جلد ہی واپس آگئی۔ کافی سامان ساتھ لائی تھی جو اس نے کچن میں رکھ دیا۔ پھر بولی۔ "میں تمہارے لئے کھانا بناتی ہوں۔"

"تمہیں آتا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"پھر......؟" میں ہنس پڑا۔

"آؤ، تم میرا ساتھ دو۔" میں واقعی بھوکا تھا۔ جو کچھ الٹا سیدھا بن سکا بنایا اور زہر مار کیا۔ اس نے دکھ بھری آواز میں کہا۔ "مجھے بھوک نہیں لگی۔ میرا معدہ بھی گل کر پانی بن چکا ہے۔"

کھانے کے لئے اتنا لے آئی تھی جو کئی دن تک چل گیا۔ ویسے اس کوٹھی میں استعمال کی ساری چیزیں موجود تھیں۔ ایک بات مسلسل میرے ذہن میں چل رہی تھی۔ میں نے کہہ ڈالی۔

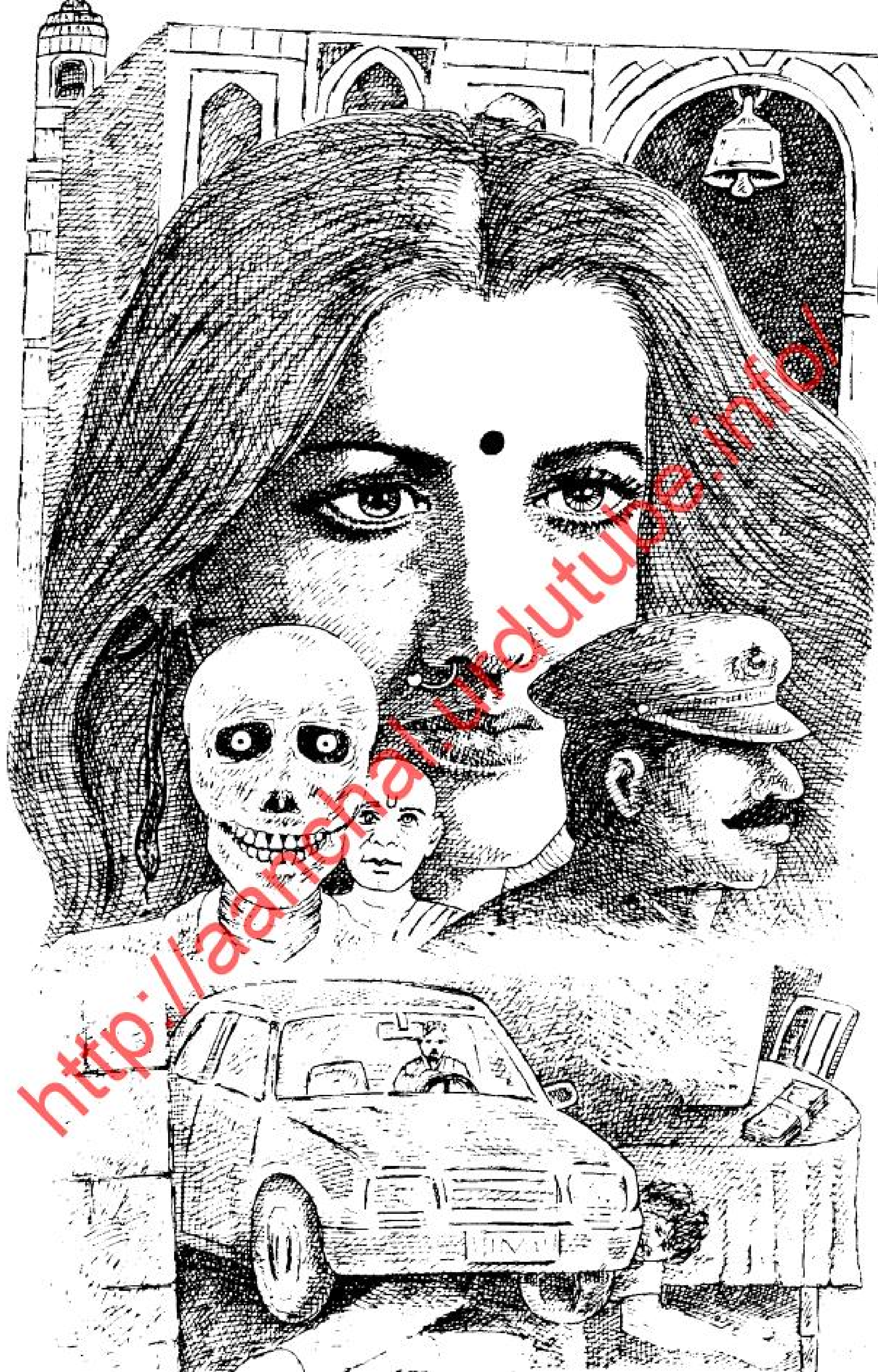
"مجھے ایک بات بتاؤ کوروتی۔"

"پوچھو۔"

"کیا تمہارے ذہن میں تاریخ کا کوئی ایسا دور نہیں ہے جس میں کوئی ایسا سادھو، حکیم، یا کوئی جادوگر ہو جو تمہاری مشکل حل کرسکے، اگر ایسا ہے تو کیوں نہ ہم تاریخ کے اس دور میں چلیں۔"

"میاں میں اپنی کمزوری کا اعتراف کروں گی۔"

"کیا مطلب۔"



دنیا میں لے جاؤں۔ یا اس کے بارے میں کوئی مضمون لکھوں۔ اگر وہ ڈاکٹر قیصر شاہ کو قتل نہ کرتی تو شاید جدوجہد کی جاسکتی تھی۔ مثلاً میں اپنے وسائل سے کام لے کر اخبارات کا سہارا لیتا، یہ مضمون شائع کراتا کہ ایک مظلوم عورت سائنس کی دنیا کے لئے چیلنج بن گئی ہے۔ کسی انوکھے زہر کے ذریعہ اس کے بدن کا گوشت پانی بن کر بہہ گیا ہے۔ اس کا کیا علاج ہوسکتا ہے۔ امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور دوسرے ممالک اسے کسی انوکھے تجربے کے لئے حاصل کرسکتے تھے۔ لیکن اب یہ نہیں ہوسکتا تھا۔

کوروتی باہر آتی جاتی رہتی تھی۔ وہ مجھے اخبارات لاکر دیتی رہتی تھی اور دوسری چیزیں بھی لے کر آتی تھی۔ البتہ میں باہر جانے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ ایک دن اس نے ایک دلچسپ عمل کیا۔ ایک بڑا پیکٹ لے کر بازار سے واپس آئی تھی۔

''اس میں کیا ہے؟'' میں نے پوچھا اور اس نے پیکٹ کھول کر میرے سامنے کردیا۔ یہ بہت ہی خوب صورت برقع تھا۔ ''یہ کیا ہے۔''

''اس کا نام تم ہی جانتے ہوگے۔''

''ہاں۔ یہ برقع کہلاتا ہے۔ لیکن تم یہ کیوں لائی ہو۔''

''تمہارے لئے لائی ہوں۔''

''کیا بکواس ہے۔'' میں جیسے چلایا۔

''اور یہ بھی لائی ہوں۔'' اس نے چوڑیوں کا ایک پیکٹ میرے سامنے رکھ دیا۔

''کوروتی ہمارے ہاں یہ مردوں کے لئے گالی کہلاتی ہیں۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔

''ارے کیوں۔'' اس کی حیران آواز ابھری۔

''مگر تم میرے لئے کیوں لائی ہو؟''

''میں نے باہر ایسے کچھ لوگوں کو دیکھا جنہوں نے ایسے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے جسم اور چہرے نظر نہیں آرہے تھے البتہ کھلے ہاتھوں میں یہ چیز تھی۔ بس میں نے سوچا تم اتنے دن سے گھر میں قید ہو، یہ چیزیں پہن کر ہم باہر گھومنے جاسکتے ہیں۔''

میرا موڈ خراب ہوا تھا لیکن کوروتی کا موقف سن کر میرے حلق سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا میں دیر تک ہنستا رہا اور وہ ساکت بیٹھی رہی۔ پھر بولی۔

''تمہیں اچھا لگا۔''

''بہت اچھا، بس اسی کی کسر رہ گئی تھی۔''

''یہ نہیں کہ ہم ہر جگہ جاسکتے ہیں نا۔''

''ہاں۔''

''تو پھر چلو تیار ہوجاؤ۔''

پڑھ رہے ہیں نا آپ، ذیشان عالی کی بپتا، ایسا مصنف بھی دیکھا ہے آپ نے، غالب فقیروں کا بھیس بنا کر تماشائے اہل کرم دیکھتے تھے۔ اپنے شو کے مطابق۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

عالی، دیکھیں آگے کیا دیکھنے کو ملتا ہے۔ باہر نکل آئے، سب سے پہلے کچھ خریداری کی، جو کھیس کوروتی اوڑھے ہوئے تھی وہ کافی گندا ہوگیا تھا۔ اس دکان سے جہاں سے اس نے میرے لئے برقع خریدا تھا، کوروتی کے لئے بھی ایک برقع خریدا، پھر ایک دکان سے زنانے جوتے خریدے اور میں ذیشان عالی سے شانی بن گیا۔

کافی دن کے بعد گھر سے باہر نکلا تھا۔ شہر اجنبی اجنبی لگ رہا تھا۔ اس لئے جو کچھ کیا جاسکتا تھا کیا۔ اپنے گھر کے سامنے سے بھی گزرا۔ دروازے پر پولیس کی سیل لگی ہوئی تھی اور دو پولیس والے کرسیاں ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔

شام کے سات بجے کا وقت تھا جب ہم گھر واپس لوٹے، آٹو رکشہ میں آئے تھے۔ لیکن دوسرے گھر پر نظر پڑی تو اوسان خطا پڑ گئے۔ کوروتی کی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے چار پانچ پولیس موبائل کھڑی ہوئی تھیں اور پولیس کے جوان خوب بھاگ دوڑ کررہے تھے۔

''رکشہ والے روکو، روکو۔'' میں نے زنانہ آواز بنا کر کہا۔ اور رکشہ رک گیا۔ ہم دونوں نیچے اتر گئے، کوروتی بھی صورتحال سمجھ گئی تھی۔

''یہ کیا ہوا؟ اس نے کہا۔

''ایسے کئی کردار میرے ذہن میں ہیں۔ لیکن وہ مجھے ٹھیک نہیں کرسکیں گے۔''

''کیوں۔''

''تم ابھی تک یہ سب کچھ کیوں نہیں سمجھ سکے۔ ہم جب ماضی میں داخل ہوتے ہیں تو صرف اس دور کے دیدہ ور ہوتے ہیں۔ ہم کسی کردار کو منتخب کرکے اس کا روپ اختیار کرلیتے ہیں۔ لیکن وہ ہوتے نہیں ہیں۔ ہم، ہم ہی ہوتے ہیں۔ اب اگر میں اسی حالت میں وہاں جاتی ہوں تو تاریخ میں داخل تو نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہ تو ماضی ہوتا ہے، جو گزر چکا ہوتا ہے۔''

میں خاموش ہوگیا۔ جب بھی وہ مجھے ایسی باتیں بتاتی تھی میرے دماغ کی چولیں ہل جاتی تھیں۔ وہ اکثر باہر چلی جاتی تھی۔ لیکن اس نے کبھی مجھے باہر جانے کے لئے نہیں کہا تھا۔ وہ میرے لئے خطرہ نہیں مول لینا چاہتی تھی۔

پھر ایک دن وہ بہت سے اخبارات لے آئی۔

''میں نے ان میں سے ایک میں تمہاری تصویر دیکھی تو یہ سب لے آئی۔''

میں نے خوفزدہ نگاہوں سے اخبار کے پہلے صفحے پر اپنی تصویر دیکھی۔ یہ تصویر میرے کسی ناول سے لے لی گئی تھی۔ نیچے میرا بائیوڈیٹا تھا۔ کہاں پیدا ہوا، کیا کیا لکھا، اس خوفناک وجود سے میرا کیا تعلق ہے۔ ڈاکٹر قیصر پولیس کمشنر کا کزن تھا اور اس کے بارے میں کمشنر صاحب کا بیان تھا کہ یہ لڑکی پوری پولیس کی نوکری کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ بہت مختصر وقت میں وہ ڈاکٹر قیصر شاہ کے قاتل کو پکڑ کر عوام کے سامنے پیش کردیں گے۔

دعویٰ کیا گیا تھا کہ اس قتل کے پس منظر میں صرف ذیشان عالی ہے۔ وہ ہاتھ آجائے تو سارے عقدے حل ہوسکتے ہیں۔

میرے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا۔ میں گردن گردن دلدل میں دھنس گیا تھا۔ کوروتی تو ایک پراسرار وجود تھا۔ خود کو کسی بھی طرح دنیا کی نظر میں سے اوجھل کرسکتا تھا۔ لیکن میں اپنے ملک کی پولیس سے اچھی طرح واقف تھا۔ ایک ہی جرم کے دس بیس اقبالی مجرم تلاش کرلینا پولیس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا جبکہ دائیں ہاتھ کی کارکردگی الگ مقام رکھتی تھی۔

''اب کیا ہوگا کوروتی۔''

''کچھ نہیں۔'' وہ سکون سے بولی۔

''یہ اخبارات پڑھے ہیں تم نے۔''

''میں یہ زبان پڑھنا نہیں جانتی۔''

''ان سب میں میری موت کی کہانی لکھی ہے۔''

''وہ کہانی صرف کہانی رہے گی۔''

''تم یہ زبان پڑھ نہیں سکتیں اور مجھے بچانے کا دعویٰ کررہی ہو۔'' میں نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تمہیں تھوڑی ہی دیر میں پولیس کے چنگل سے نکال لائی، یہ بھول گئے۔''

''تمہارے اس عمل نے میرے مجرم ہونے کی تصدیق کردی۔''

''دیکھو ذیشان عالی، مجھے جو نقصان پہنچا ہے تمہاری وجہ سے پہنچا ہے۔ گوتم بھنسالی نے صرف رقابت کا شکار ہو کر میرا یہ حال کیا ہے۔ مجھ سے نفرت یا بیزاری کا اظہار مت کرو۔ مجھے اپنے نقصان کی کوئی فکر نہیں ہے۔ لیکن اگر تم نے مجھ سے کنارہ کشی کی تو...... میں کیا کروں گی۔ یہ سوچ کر ہی تمہارا سانس تبدیل ہوسکتا ہے۔''

مجھ سے زیادہ اس حقیقت سے کون واقف تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے واقعی ایسا ہی کرسکتی ہے۔

''تم جب بھی باہر جاؤ اخبار لے آیا کرو۔ کم ازکم مجھے پتہ تو چلتا رہے کہ میرے خلاف کیا ہورہا ہے؟'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ لیکن تم ذہین ہو، اپنی دنیا سے واقفیت رکھتے ہو۔ اور سوچو میں کس طرح ٹھیک ہوسکتی ہوں۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگیا۔

کیا درگت بنی تھی۔ سوچتا تو خود پر ترس آنے لگتا تھا۔ میرا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ سوچتا بھی رہتا تھا پر کیا کروں۔ میرے کون سے وسائل تھے کہ کوروتی کو باہر کی

''یس میڈم۔'' چھوٹی ڈاکٹر نے کہا، اور میں اسٹریچر دھکیلنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے میری ہوا کھسکی کیونکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ سٹی اسکین سینٹر کہاں ہے۔ لیکن شکر ہے کہ اس وقت پورا قافلہ ساتھ تھا۔ دونوں نرسیں، چھوٹی ڈاکٹر اور پھر لڑکی کے لواحقین۔

چھوٹی ڈاکٹر آگے آگے جارہی تھی۔ کافی آگے جا کر ہم ایک بڑی لفٹ کے پاس رکے اور دیوہیکل لفٹ کا دروازہ کھل گیا۔ اور ہم اسٹریچر سمیت لفٹ میں داخل ہوگئے۔ سٹی اسکین سینٹر تیسری منزل پر تھا دور ہی سے مجھے وہ بورڈ نظر آ گیا جس پر سٹی اسکین لکھا ہوا تھا۔

بڑی ڈاکٹر نہ جانے کون سے راستے سے یہاں پہنچ گئی تھی۔ پھر لڑکی کو اندر اتارا گیا۔ اور ہمیں باہر نکال دیا گیا۔ چھوٹی ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔

''کیا نام ہے تمہارا۔''

''انور'' میں نے ایک لمحہ بھی نہ سوچا اور پھٹ سے بول پڑا۔

''انور تمہیں یہیں رکنا ہے۔''

''جی ڈاکٹر صاحبہ......'' میں نے کہا۔ لڑکی کے لواحقین باہر کھڑے تھے۔ عورتیں مسلسل روئے جارہی تھیں۔ مردوں میں ایک بزرگ تھے جو بری طرح نڈھال نظر آ رہے تھے۔ سب بدحواس تھے۔ ڈاکٹر اندر مصروف تھیں۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں کوروتی کو کافی دور چھوڑ آیا ہوں۔ جس مصیبت میں پھنسا ہوں اس کی وجہ وہی ہے اور پھر اپنے منحوس ڈھانچے کو وہ مجھ پر مسلط کئے ہوئے ہے۔ خاص طور پر وہ اپنی خلوتوں میں میری قربت چاہتی ہے۔ نہ صرف قربت بلکہ پوری توجہ بھی۔ خدا کی پناہ، آپ خود سوچیں کسی کی حس لطافت کا کیا حال ہو۔

اب تک اس سے تعاون کرتا آیا تھا۔ لیکن خوف کی وجہ سے۔ جب تک سب ٹھیک چل رہا تھا۔ مجھے اس سے دلچسپی تھی وہ مجھے صدیوں سے روشناس کرا رہی تھی اور میں اپنی کتاب لکھ رہا تھا۔ لیکن اب تو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ میں باقاعدہ مجرم بن چکا تھا۔ ایک بڑے ڈاکٹر کا قاتل کا معاون، اور لاک اپ کے مفرور، ارے باپ رے۔ پھانسی کا پھندا میری گردن میں بھی فٹ ہوسکتا ہے۔

کوروتی وہاں لابی میں میرا انتظار کررہی ہے اور اب تو کافی وقت گزر چکا ہے۔ نیز یہ کہ میں وارڈ بوائے بنا ہوا ہوں۔ وہ اگر مجھے دیکھ بھی لے گی تو پہچان نہیں سکے گی۔ کیوں نہ گول ہو جاؤں۔ وارڈ بوائے کی حیثیت اس اسپتال میں روپوش رہوں۔ یہیں کہیں اپنا ٹھکانہ بنالوں۔ اور وقت کا انتظار کروں۔ کوروتی اگر کہیں نظر بھی آئے تو اس سے پوشیدہ ہو جاؤں۔

اسی وقت ایک عورت کی چیخ سنائی دی اور میں چونک پڑا۔ اس فیملی کی ایک نوجوان عورت چیخی تھی وہ بزرگ جو نڈھال نظر آ رہے تھے بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑے۔ سب ان کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ اور عورت انہیں کے گرنے پر چیخی تھی۔

میرے اندر بھی ہمدردی کی لہر اٹھی۔ یہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی میں نے جلدی سے انہیں دوسروں کے ساتھ مل کر اسٹریچر پر لٹایا۔ ایک مرد نے کہا۔

''انور بھائی، پانی مل جائے گا۔'' غالباً اس نے میرا نام اس وقت سن لیا تھا جب چھوٹی ڈاکٹر نے میرا نام پوچھا تھا۔

''ابھی لایا۔'' میں نے کہا اور تیزی سے ایک طرف دوڑ گیا۔ کینٹین یہاں سے فاصلے پر نہیں تھا۔ میں نے اس وقت دیکھا تھا جب میں اپنے لئے جگہ تلاش کررہا تھا۔ میں نے منرل واٹر کی بڑی بوتل خریدی اور دوڑتا ہوا ان کے پاس واپس آ گیا۔

ایک عورت نے جلدی سے بوتل میرے ہاتھ سے لے لی اور یخ پانی بزرگ کے چہرے پر چھڑکنے لگی۔ بزرگ کو ہوش آ گیا تو اس نے انہیں پانی پلایا۔ ایک مرد نے کہا۔

''ابا میاں۔ حوصلے سے کام لیں۔ خود کو سنبھالیں۔ آپ ہی ہمت چھوڑ بیٹھیں گے تو ہمارا کیا ہوگا۔''

''اب میں ٹھیک ہوں۔'' بزرگ نے کہا۔ پھر

’’پولیس پہنچ گئی۔‘‘ میں خوفزدہ لہجے میں بولا۔
’’اب کیا کریں۔‘‘
’’پہلے یہاں سے بھاگو پھر سوچیں گے کہ کیا کریں۔‘‘ میں نے کہا۔ رکشہ والا اس دوران پیسے لے کر چلا گیا تھا۔ ہم دونوں کچھ جگہوں کی آڑ لے کر وہاں سے چل پڑے۔ کافی دور تک پیدل چلتے رہے، کوئی بات ذہن میں نہیں آرہی تھی کہ کہاں جائیں۔

نہ جانے کتنی دور پیدل چلے تھے۔ پھر ایک بارونق جگہ رک گئے۔ سامنے ہی اسپتال نظر آرہا تھا۔ بہت بڑا اور مشہور اسپتال تھا، میں اس کے بارے میں جانتا تھا۔

’’آؤ.....!‘‘ میں نے کسی خیال کے تحت کہا اور کورولی میرے ساتھ چل پڑی۔ اس وقت یہ بہترین پناہ گاہ تھی جہاں ہم کچھ دیر قیام کرکے کوئی موثر بات سوچ سکتے تھے۔ چنانچہ ہم دونوں اسپتال میں داخل ہوگئے۔ یہاں ایک نئی ہی زندگی تھی۔ افراتفری کے شکار لوگ اپنی اپنی پریشانیوں میں لپٹے ہوئے، ہم لابی میں جا بیٹھے، ہماری جیسی بہت سی برقع پوش خواتین بھی نظر آرہی تھیں اس لئے کسی نے ہمیں مشکوک نظروں سے نہیں دیکھا۔

تھوڑی دیر ہم لابی میں بیٹھے رہے۔ پھر میں نے اچانک کورولی سے کہا۔
’’میں ابھی آتا ہوں۔‘‘
کہاں۔‘‘
’’تم بیٹھو۔‘‘ میں نے کہا۔ اور پھر میں اسے چھوڑ کر وہاں سے چل پڑا۔ بس ایک خیال دل میں آیا تھا۔ میں اسپتال کا جائزہ لیتا رہا۔ بہت سے دوستوں سے گزر کر آخرکار میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جو غالباً اسپتال کا اسٹور تھا۔ یہاں بہت سی اوپن الماریاں تھیں جن میں بستروں کی چادریں، وارڈ بوائز کی وردیاں وغیرہ چنی ہوئی تھیں میری باچھیں خوشی سے کھل گئیں۔ مجھے ایسی ہی کوئی چیز درکار تھی، اس سے پہلے کہ کوئی اس طرف نکل آتا میں نے پھرتی سے اپنے سائز کا ایک وارڈ بوائے کا لباس نکالا اور برق رفتاری سے آگے بڑھ گیا۔ میں نے وہ جنرل واش روم بھی دیکھ لئے تھے جو مریضوں کے ساتھ آنے والوں کے لئے تھے۔ ایک واش روم میں داخل ہوکر میں نے لباس تبدیل کیا اور مکمل طور پر وارڈ بوائے نظر آنے لگا۔

عظیم الشان اسپتال میں سینکڑوں وارڈ بوائے تھے ان پر کون توجہ دیتا۔ پھر بھی خود کو محفوظ رکھنے کے لئے میں نے ایک اسٹریچر لیا اور چل پڑا۔ ابھی میں کچھ ہی قدم چلا تھا کہ ایک لیڈی ڈاکٹر نے مجھے آواز دی۔

’’ادھر آؤ۔ جلدی آؤ۔‘‘ میں اسٹریچر دھکیلتا ہوا اس کے قریب پہنچا تو وہ مجھے اشارہ کرکے آگے بڑھ گئی۔ ہم کوریڈور عبور کررہے تھے۔ راستے سے لیڈی ڈاکٹر نے دو نرسوں کو ساتھ لے لیا۔ اس طرح وہ مجھے لے کر ایک کمرے کے سامنے رکی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ نرسیں بھی اس کے ساتھ اندر چلی گئی تھیں۔ انہوں نے دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا تھا اس لئے میں اندر کا منظر دیکھ رہا تھا۔

ایئرکنڈیشنڈ کمرے میں کئی افراد موجود تھے جن میں دو عورتیں اور تین مرد تھے۔ عورتیں اور مرد اپنی حیثیت سے بہت شاندار نظر آرہے تھے۔ عورتیں رو رہی تھیں۔ مرد بھی افسردہ نظر آرہے تھے۔ ان کے پاس بستر پر ایک مریضہ لیٹی ہوئی تھی۔ ایک اور لیڈی ڈاکٹر اس کا معائنہ کررہی تھی۔ پھر اس نے آنے والی لیڈی ڈاکٹر کو دیکھ کر کہا۔
’’چلو۔ اسٹریچر لائی ہو۔‘‘
’’یس میڈم۔‘‘ دوسری ڈاکٹر نے جواب دیا۔
’’لے چلو۔‘‘
’’آؤ۔ اندر آؤ، مجھے ساتھ لانے والی ڈاکٹر نے مجھے بلایا اور میں اسٹریچر لے کر اندر داخل ہوگیا۔ بستر پر لیٹی مریضہ ایک بے حد خوب صورت نوجوان لڑکی تھی اس کی عمر تیئس چوبیس سال ہوگی۔ چہرہ بے حد پرکشش تھا۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

’’کیا منہ پھاڑے کھڑے ہو۔ اسے اٹھاؤ۔‘‘ بڑی ڈاکٹر نے مجھے ڈانٹا اور میں جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ حسین لڑکی کو اسٹریچر پر ڈالا گیا۔ تو بڑی ڈاکٹر نے کہا۔ ’’سٹی اسکین سینٹر لے آؤ۔‘‘

''اس پر سایہ ہوگیا تھا۔ ویرانوں میں ماری ماری پھرتی تھی۔ کہیں سے روگ لگا لائی۔ مگر یہ لوگ بڑے ماڈرن ہیں۔ سائے وائے کو نہیں مانتے ہر تیسرے دن ڈاکٹر بدلتے رہے اور اس کو اس حال پر پہنچا دیا۔ ماردیا بے چاری کو۔''

''ویرانوں میں کیوں پھرتی تھیں۔'' میں نے پوچھا۔

''آثار قدیمہ سے بہت دلچسپی تھی اسے، کھنڈرات میں گھومتی پھرتی تھی۔ کسی سہیل سے محبت کرتی تھی جب دورہ پڑتا تھا سہیل کو پکارتی تھی۔''

''سہیل کون ہے۔''

''کوئی بھی نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''ہوش میں ہوتی تو اپنے آپ پر لعنت بھیجتی اور کہتی کہ سہیل کوئی نہیں ہے۔ ضرور اس پر سہیل نامی کسی آسیب کا سایہ تھا۔''

''اور بھی کچھ سنادے بہو، کیسے کم بخت ہوتے ہو تم لوگ، مرنے کے بعد بھی کسی کو نہیں چھوڑتے اور الزامات لگاؤ میری مرحوم بچی پر.....'' بزرگ جو کمرے میں موجود تھے اور یہ باتیں سن رہے تھے۔ روتے ہوئے بولے اور مجھے یہ کہانی سنانے والی عورت نے دانتوں زبان دبالی۔ اسے شاید بزرگ کی موجودگی کا خیال نہیں رہا تھا۔

اسی وقت اچانک مردہ لڑکی کے بدن میں جنبش ہوئی اور اس کی آواز سنائی دی۔ ''سہیل'' یہ آواز سن کر نہ صرف کمرے میں موجود لوگ بلکہ میں بھی اچھل پڑا۔ بزرگ بڑی تیزی سے اٹھے اور لڑکی کے پاس پہنچ گئے۔

''ثنا۔ میری بچی۔ ثنا میری جان۔'' انہوں نے لڑکی کا خوب صورت ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر روتے ہوئے کہا۔

''ابو۔ وہ سہیل۔'' لڑکی نے میری طرف اشارہ کیا اور میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ''سہیل میرے پاس آؤ۔'' لڑکی نے پھر کہا اور اپنا ایک ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

مجھ سے باتیں کرنے والی لڑکی بدحواسی سے اٹھی اور باہر بھاگ گئی۔ وہ شاید مردوں کو اس بارے میں خبر کرنے گئی تھی کہ ثنا زندہ ہے۔ بزرگ نے ہاتھ سے مجھے اشارہ کیا۔ وہ مجھے اپنے پاس بلا رہے تھے۔ میں احمقوں کی طرح چلتا ہوا لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ لڑکی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔

''میں اب کبھی تمہیں نہیں جانے دوں گی سہیل، کبھی نہیں۔''

''مم۔ میرا نام.....'' میں نے ہکلاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن بزرگ جلدی سے بول پڑے۔

''ہاں بیٹی، سہیل اب کبھی کہیں نہیں جائے گا۔ وہ ہمارے پاس رہے گا۔'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے آنکھ سے مجھے اشارہ کیا کہ میں خاموش رہوں۔ ان کے انداز میں عاجزی تھی۔

اتنی دیر میں وہ سارے لوگ فوراً اندر گھس آئے جو ڈیڈ باڈی کو لے جانے کے انتظامات کرنے گئے تھے۔ سب لڑکی کے گرد جمع ہوگئے اور اسے ٹٹولنے لگے۔ بزرگ سرگوشی کے انداز میں ان لوگوں کو ساری تفصیل بتا رہے تھے۔ پھر ایک مرد جا کر چھوٹی ڈاکٹر کو بلا لایا۔ وہ بھی ثنا کو زندہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی اس نے اسٹیتھسکوپ سے لڑکی کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ پھر موبائل فون نکال کر شاید بڑی ڈاکٹر کو صورت حال بتانے لگی۔

کچھ ہی دیر میں بڑی ڈاکٹر آگئی۔ دو تین مرد ڈاکٹر بھی ساتھ تھے۔ سب نے اچھی طرح لڑکی کا جائزہ لیا۔ پھر ایک ڈاکٹر نے کہا۔

''یہ حیرت انگیز طور پر بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ لوگ بتایئے انہیں لے جانا چاہتے ہیں یا دو تین دن انہیں یہاں آبزرویشن میں رکھا جائے۔''

''نہیں ڈاکٹر، ہم اسے لے جائیں گے۔'' بزرگ نے کہا۔

''ٹھیک ہے، جیسی آپ کی مرضی، رابعہ ان کے پیپر بنادو۔''

''سہیل، میرے پاس آجاؤ۔'' ثنا نے پھر کہا، اور میں گھبرائی ہوئی نظروں سے ان لوگوں کو دیکھنے لگا، ایک بزرگ نے کہا۔

''ایک منٹ ثنا بیٹے۔'' بزرگ نے کہا اور پھر میری طرف رخ کر کے بولے۔

بولے۔ ''اندر سے کوئی خبر ملی۔''

''ابھی نہیں۔''

''ہوں۔'' بزرگ بولے۔ مرد نے مجھے آواز دی۔

''انور بھائی۔''

''جی سر جی۔'' میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔

''پانی کی بوتل کتنے کی آئی تھی۔''

''کیوں سر جی۔''

''پیسے لے لو، تم نے ہم پر احسان کیا ہے۔''

''ہم غریبوں کو بھی کبھی کبھی احسان کے مزے لینے دیا کرو سر جی۔ ہم بھی انسانوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ آپ ہماری اس چھوٹی سی خدمت کے پیسے ہمارے منہ پر مار کر ہماری خوشی ضائع کردو گے۔''

''ارے۔'' جوان عورتوں میں سے ایک بولی۔

''پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں انور بھائی۔'' دوسری نے کہا۔ مرد کہنے لگا۔

''معافی چاہتا ہوں انور بھائی، غلطی ہوگئی۔'' بزرگ مجھے دیکھ کر مسکرائے، پھر بولے۔

''کتنا پڑھا ہے۔''

''بس اتنا کہ خود کو انسان سمجھنا آجائے، دوسرا کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔''

''واہ۔'' بزرگ بولے، وہ لوگ مجھ سے کافی متاثر نظر آرہے تھے۔

اس وقت چھوٹی ڈاکٹر باہر نکلی اس کے چہرے سے افسردگی جھلک رہی تھی۔ سب اس کی طرف لپکے۔ تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ''سوری صبر کیجئے۔''

ایک کہرام مچ گیا۔ عورتیں دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ مرد سسکنے لگے۔ اندر سے بڑی ڈاکٹر اور نرسیں بھی باہر نکل آئیں۔ چھوٹی ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔

''انور۔''

''جی ڈاکٹر صاحبہ۔''

''ڈیڈ باڈی کمرے میں پہنچا دو۔''

''جی۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور اسٹریچر کی طرف بڑھ گیا۔ بزرگ کو سہارا دے کر اسٹریچ سے نیچے اتار لیا گیا۔ میں اسٹریچر لے کر اندر چلا گیا اور میں نے نرسوں کی مدد سے نوجوان لڑکی کے مردہ جسم کو اسٹریچر پر لٹایا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے بھی دکھ کا احساس تھا۔ بہت خوب صورت اور چھوٹی سی عمر کی لڑکی تھی۔ پتہ نہیں بے چاری کو کیا ہوا تھا۔

اس کے جسم کو کمرے میں مقفل کردیا گیا اور مرد اس کی ڈیڈ باڈی کو گھر لے جانے کے لئے انتظام کرنے لگے، میرے اب یہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ لیکن اسی وقت اس نوجوان عورت نے مجھ سے بات کی تھی کہا۔

''انور بھائی۔''

''آپ بہت اچھے انسان ہیں۔ میں آپ کی باتوں سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔ ہم پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔ ورنہ ہم آپ سے کہتے کہ ہم سے دوبارہ بھی ملیں۔''

''آپ لوگ خود بھی اچھے ہیں، ورنہ اس دور میں کوئی کسی کو کچھ نہیں مانتا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں نے کیا بھی کیا ہے۔''

''نہیں، مجھے آپ کے الفاظ بہت اچھے لگے تھے۔ ایک بات بتایئے۔''

''جی۔۔۔؟''

''ثنا کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔''

''میں نہیں جانتا۔ اگر آپ کے گھر والے بڑے ڈاکٹر صاحب سے بات کرلیں گے تو شاید نہ ہو۔ ثنا اس بی بی کا نام ہے۔''

''ہاں بہت اچھی لڑکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چٹ پٹ ہوگئی۔''

''آپ کی کون تھی۔''

''نند تھی میری۔ لیکن مجھے بہنوں کی طرح پیاری تھی۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ انکل تو اس پر جان چھڑکتے تھے دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔''

''انکل وہ بزرگ۔''

''ہاں، میرے سسر ہیں۔''

''کیا ہوا تھا۔''

جائے، میں بس اسی خوف کا شکار تھا اور اس وقت تک رہا جب تک میں ثناء کے ساتھ ایک شاندار لینڈ کروزر میں بیٹھ کر نہ چل پڑا، کوروتی مجھے پانے میں ناکام رہی تھی۔

ثناء میرے شانے سے سر ٹکائے بیٹھی کافی مطمئن نظر آ رہی تھی، میں نے مردوں کے چہروں پر ہلکی سی ناگواری بھی محسوس کی، لیکن مجھے کیا پرواہ تھی، مجھے تو لے کر آیا گیا تھا، اگر یہ لوگ میری اس کیفیت کو ناپسند کریں گے تو آرام سے وہاں سے نکل آؤں گا، پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا، اگر ان کے درمیان کچھ عرصے کے لئے جگہ مل جائے تو کم از کم حالات قابو میں آ سکتے ہیں، غرضیکہ جس کوٹھی میں گاڑیاں داخل ہوئیں وہ بھی قابل دید تھی۔

سب لوگ اندر چلے گئے، میں بھی ساتھ ہی تھا اور مجھے ثناء کے ساتھ جس بیڈ روم میں پہنچایا گیا وہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، بہترین ایئر کنڈیشنڈ بیڈ روم جہاں اعلیٰ ترین فرنیچر پڑا ہوا تھا، پھر مردوں میں سے ایک شخص نے مجھے اپنے پاس بلایا اور بولا۔

''انور ہے نا تمہارا نام؟''

''جی سر۔''

''دیکھو انور ہم اپنے والد صاحب کی بہت زیادہ عزت کرتے ہیں، میں ثناء کا باپ ہوں، میرا نام عبدالسعید ہے، میرے والد ثناء سے بہت پیار کرتے ہیں، وہ اس وقت ذہنی عدم توازن کا شکار ہے اور پتہ نہیں تم اس کے ذہن میں سہیل کی حیثیت سے کیوں آ گئے ہو، ممکن ہے وہ تمہیں اپنے ساتھ رکھنے پر اصرار کرے لیکن اگر تم ایک شریف نوجوان ہو تو ہماری عزت آبرو کا خیال رکھنا، میں تمہیں دھمکی نہیں دے رہا کیونکہ تم از راہ انسانیت یہاں آئے ہو، جس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں، لیکن انور اپنی حدود میں رہنا ہماری مجبوری سے ناجائز فائدہ نہ اٹھانا ورنہ تم یہ سمجھ لو کہ میں تمہاری زندگی کا دشمن بن جاؤں گا۔''

میں نے پرادب لہجے میں کہا۔ ''جناب عالی یہ تو آپ پر منحصر ہے، مجھے تو میری نوکری ختم کرا کے یہاں لایا گیا ہے، مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ میں یہاں رہوں، آپ بے شک اپنے معاملات خود دیکھئے گا، اور اگر عزت سے مجھے یہاں رکھنا چاہتے ہیں تو میں قطعی اس بات میں دلچسپی نہیں رکھتا کہ آپ مجھے ثناء کے ساتھ رکھیں، میں غریب آدمی ہوں لیکن آپ سے درخواست کرتا ہوں ہاتھ جوڑ کر کہ میری توہین نہ کریں۔''

''نہیں بیٹے نہیں، میں تمہاری توہین نہیں کر رہا بس خدشے کا اظہار کر رہا ہوں، ظاہر ہے جوان بیٹی کا باپ ہوں تم خیال رکھنا۔''

''جی۔'' میں نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا اور ویسے بھی حقیقت یہ ہے کہ میں تو صرف کوروتی سے جان چھڑانا چاہتا تھا مجھے اس عالیشان کوٹھی میں رہنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، لیکن وہی ہوا، مجھے پہننے کے لئے میرے ہی سائز کے لباس دیئے گئے تھے، یقینی طور پر کسی کے ہوں گے، وہ لباس تبدیل کر کے میں نے ثناء کے پاس سے جانا چاہا لیکن اس نے مجھے پھر پکڑ لیا۔

''کہاں جا رہے ہو سہیل؟''

''رات بہت زیادہ ہو چکی ہے ثناء میں سونے جا رہا ہوں۔''

''کیا مطلب، تم کہیں اور جا کر سوؤ گے؟''

''ہاں ثناء میرا آپ کے کمرے میں سونا مناسب نہیں ہے۔''

''ہرگز نہیں، میں پاگل ہو جاؤں گی سہیل، تمہیں یہیں رہنا ہے۔'' بزرگ نے فوراً میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں بیٹے کوئی بات نہیں ہے، ہم تمہارے لئے بستر لگوائے دیتے ہیں۔''

سارا انتظام کیا گیا میرے لئے یہ سب کچھ بے حد عجیب تھا اور حقیقت یہ ہے کہ میرے ذہن میں واقعی کوئی کھوٹ نہیں تھی، لیکن جب کوٹھی میں سناٹا چھا گیا اور ہر طرف خاموشی ہوگئی تو ثناء اپنی جگہ سے اٹھی اور میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

''سو گئے سہیل؟''

''نن... نہیں۔''

''انور ذرا میری ایک بات سنو۔'' یہ کہہ کر وہ تھوڑے سے پیچھے چلے گئے، میں ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا۔

''انور میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو، لیکن جس قدر شریف انسان ہو بس میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا، بیٹے میرا نام عبدالحکیم ہے، کاروباری آدمی ہوں، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دو تین فیکٹریاں چلتی ہیں میری، یہ میرا خاندان ہے اور یہ بچی اس خاندان کی روح ہے، ہم سب اس پر جان دیتے ہیں اور اس کی بیماری نے ہماری جان لے لی ہے، بیٹے یہ بالکل ٹھیک تھی، لیکن بس قدرت کی مرضی، اچانک ہی بیمار ہوگئی اور اس کا ذہن متاثر ہوگیا، اس پر دورے پڑتے ہیں اور یہ عجیب و غریب کیفیت کا شکار ہوجاتی ہے، خیر میں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا تم سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ جہاں تم نے ہماری اتنی مدد کی ہے تھوڑی سی مدد اور کرو، یہ تمہیں سہیل کہہ کر پکار رہی ہے، اگر تم اس کے قریب نہ رہے تو اس کا ذہنی توازن پھر بری طرح بگڑ جائے گا، کچھ عرصے کے لئے اپنی اس ملازمت سے چھٹی لے لو، ہمارے ساتھ رہو، ہم تمہیں منہ مانگا انعام دیں گے بلکہ اگر تم اس ملازمت کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ ہی رہنا پسند کرو گے تو ہم تمہیں موجودہ تنخواہ سے چار گناہ زیادہ تنخواہ دیں گے، یہ میرا وعدہ ہے تم سے، تمہاری ادھر ڈیوٹی بھی ہے تو جس سے کہو میں اس سے بات کرلوں، تم ہمارے ساتھ چلو یہ ثناء کے ذہنی توازن کی بہتری کے لئے بہت ضروری ہے۔''

میرا تو دل خوشی سے کھل اٹھا تھا، کیا شاندار موقع عطاء کیا تھا قدرت نے، ادھر کوروتی برقعے میں ملبوس میری تلاش میں سرگرداں ہوگی کہ اتنے لمبے وقت کے لئے میں کہاں چلا گیا۔ میں بے شک اس کے ساتھ تھا اور گزارہ کررہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اب یہ ایک عذاب بن کر مجھ پر مسلط رہے گی اور مجھے وہ کچھ کرنا پڑے گا جو خودکشی کے مترادف ہوگا، آخر میں انسان تھا نفاست پسند تھا، میرے اندر کچھ لطافتیں بھی تھیں، لیکن اس وقت جن حالات سے گزر رہا تھا ان میں کوروتی کی قربت مجبوری بن گئی تھی، اگر اس طرح سے میں اس خاندان میں کچھ عرصے پوشیدہ رہ سکوں تو ہوسکتا ہے آگے چل کر کوئی ایسا موقع نکل آئے کہ میری زندگی بچ جائے، میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا، لیکن میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا، اس کے لئے اب تھوڑا سا توقف ضروری تھا، چنانچہ میں نے گردن جھکالی اور سوچنے لگا، پھر میں نے کہا۔

''حیران کن بات یہ ہے محترم بزرگ کہ میں بھی اس کائنات میں تنہا ہوں، کوئی بھی نہیں ہے میرا، یہیں اسی اسپتال کے کسی گوشے میں پڑا رہتا ہوں اور زندگی یہیں تک محدود ہے، میں نے بے لوث اپنا فرض پورا کیا ہے چونکہ ایک وارڈ بوائے کی حیثیت سے یہ میری ڈیوٹی تھی، لیکن اگر تقدیر مجھے آپ کی خدمت میں لے جانا چاہتی ہے تو اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ مجھے ایک خاندان مل جائے، آپ کی خدمت کرکے جو وقت گزرے گا وہ میرے لئے باعث فخر ہوگا۔''

''خدا تمہیں خوش رکھے، میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں تمہیں گلے لگالوں، لیکن میں ذرا مختلف فطرت کا مالک ہوں جبکہ یہ لوگ اپنے آپ کو لئے دیئے رکھتے ہیں، یہ بچی بے شک میری اولاد کی اولاد ہے لیکن مجھے اتنی عزیز ہے کہ یوں سمجھ لو جس طرح کسی جادوگر کی جان طوطے میں ہوتی ہے اسی طرح میری جان ثناء میں ہے، چلو بس ٹھیک ہے، جاؤ ذرا دیکھو وہ کیا کہہ رہی ہے۔''

میں خوشی سے قدم اٹھاتا ہوا ثناء کے پاس پہنچ گیا، وہ پیار بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی، بزرگ ان مردوں کو میرے بارے میں سمجھا رہے تھے، میں ثناء کے قریب پہنچا تو اس نے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور بولی۔

''تم کہیں نہیں جاؤ گے سہیل، میرے پاس رہو گے، سمجھ رہے ہو نا؟''

''ہاں ٹھیک ہے، میں تمہارے پاس ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

پھر باقی کارروائیاں ہوئیں، مجھے صرف یہ خوف تھا کہ کہیں کوروتی مجھے تلاش کرتی ہوئی میرے پاس نہ پہنچ

ہو رہی تھیں کہ وہاں پر کھدائی کی جائے اور دیکھا جائے کہ پولیس کمشنر اور دوسرا افسر اعلیٰ کہاں گم ہوگیا، اس کے لئے حکومتی کارروائیاں جاری تھیں، میں دہشت بھرے انداز میں یہ خبر پڑھ رہا تھا، کوئی نہیں جانتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ پولیس کمشنر اور اس کا ساتھی لازمی طور پر تاریخ کے کسی دور میں پہنچ گیا ہوگا۔

کیا بدبخت زندگی ہے، پتہ نہیں اب اس کی اس دور سے واپسی ہوگی یا نہیں، بظاہر تو اس کے کچھ امکانات نہیں تھے، دوسری بات اس کتاب کی تھی، پتہ نہیں اس کے سلسلے میں کیا کیا کارروائی ہو، ایک بہت ہی قیمتی چیز خطرے میں پڑ گئی تھی، وہ کتاب کے نیچے کوئی تہہ خانہ تلاش کریں گے، لیکن تاریخ کہیں تہہ خانے میں قید تو نہیں ہوگی، پتہ نہیں کتاب کے نیچے سے کیا برآمد ہو کچھ ہو بھی یا نہیں، یہ تو کوروتی کی جادوگری تھی کہ اس نے ایک ایسی کتاب قائم کر رکھی تھی، بڑی افسوسناک کیفیت تھی، انتہائی قیمتیں چیزیں ضائع ہو رہی تھیں اور ان کے تحفظ کے لئے کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، کوروتی یقینی طور پر مجھے تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی، ورنہ اب تک وہ مجھ تک پہنچ گئی ہوتی، لیکن میں ان تمام تفتیشات کے باوجود الجھن میں تھا، مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرا مستقبل کیا ہوگا۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ عبدالحکیم صاحب کے ہاں کچھ مہمان آئے، ان میں عورتیں اور مرد بھی تھے، ایک شخص بہت ہی اسمارٹ اور بڑی اعلیٰ شخصیت کا مالک تھا، اس کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی، چہرے کی بناوٹ بھی ذرا خاص ہی قسم کی تھی، میں کسی کام سے سامنے آیا تو وہ شخص مجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا اور پھر اس نے کہا۔

''سنو سنو مسٹر سنو میری بات سنو۔''

میں جھجکتا ہوا اس کے قریب پہنچا تو وہ مجھے بڑے غور سے دیکھنے لگا، پھر بولا۔ ''کیا نام ہے آپ کا؟''

''سہیل۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس نے عبدالحکیم صاحب کے دوسرے بیٹے سے جو اس وقت میرے قریب ہی موجود تھا پوچھا۔

''سہیل صاحب سے تعارف نہ ہو سکا۔''

اس شخص نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے عزیز ہیں، کچھ دن سے ہمارے ساتھ ہی مقیم ہیں۔'' وہ ساری حقیقت نہیں بتانا چاہتا تھا۔

''اچھا اچھا بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر سہیل صاحب، اصل میں آپ کا چہرہ بڑا شناسا شناسا سا لگا، نجانے کہاں آپ کو دیکھا ہے؟''

میرے پورے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں، اسی وقت عبدالحکیم صاحب کے دوسرے بیٹے نے اس کا تعارف کرایا۔

''یہ سینٹرل انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ کے بہت بڑے افسر ہیں، میرے ماموں زاد بھائی ہیں، اشتیاق احمد ہے ان کا نام؟''

اس آدمی نے مسکرا کر گردن ہلائی تھی، لیکن میرے پاؤں بے جان ہو رہے تھے اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں زمین میں گر پڑوں گا، سی آئی ڈی آفیسر میری نگاہوں کے سامنے تھا اور اس نے مجھے غور سے دیکھا تھا اور کہا تھا کہ اسے میرا چہرہ شناسا سا معلوم ہوتا ہے، میری جان نکل گئی تھی۔ اور لازمی امر تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے، پولیس بلکہ سی آئی ڈی کا افسر اعلیٰ ایسے ہی نہیں بن گیا ہوگا، اب وہ میرے بارے میں چھان بین کرے گا، اب کیا کروں یہاں سے فرار ہو جاؤں یا تقدیر کے فیصلے کا انتظار کروں، ویسے بھی میں جانتا تھا کہ یہ قیام گاہ میرے لئے مستقل نہیں ہے، بیچاری لڑکی ٹھیک ہوگی تو مجھے پہچاننے سے انکار کر دے گی، یہ رات میرے لئے بڑی بھیانک تھی، اب تک ثناء کے ساتھ جو عیش کئے تھے وہ ناقابل فراموش تھے، بڑی دلکش لڑکی تھی، حالانکہ ذہنی مریضہ تھی لیکن اب آپ کو کیا بتاؤں شرم آتی ہے۔

آخر کار فیصلہ کیا کہ یہاں سے نکل جاؤں گا، لیکن رات کے کوئی تین بجے ہوں گے ثناء کے ساتھ آخری دلکش لمحات گزرے تھے اس نے بھی اپنی محبت کا ثبوت حسب معمول دیا تھا۔

"میں تمہارے پاس آجاؤں۔"

"کک..... کیوں؟" میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا اور وہ ہنستی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے پاس پہنچ گئی، حقیقت یہ ہے کہ میرے اوسان خطا ہوگئے تھے، لیکن ثناء کی لگاوٹ مجھے عجیب وغریب راستے دکھا رہی تھی اور پھر یہ لگاوٹ میری مجبوری بن گئی، جو کچھ بھی تھا، مجھے اپنی زندگی عزیز تھی، ایک بیچارے مصنف پر جو بیت رہی تھی اس کا دل ہی جانتا تھا، اب میں آپ کو کیا بتاؤں۔

دوسری صبح میرے لئے بڑی سحرانگیز تھی، دلکش ثناء میرے وجود میں سما چکی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کاش اس کا ذہنی توازن ایسا ہی رہے، میری اچھی خاصی پذیرائی ہورہی تھی، دلچسپ بات یہ تھی کسی نے مجھے مشکوک نگاہوں سے نہیں دیکھا، حالانکہ یہاں کسی کو یہ پتہ چل جاتا کہ مجھ غریب نے نہ چاہنے کے باوجود کیسی رات گزاری ہے، تو میری تو کوئی نہ سنتا اور یہی کہا جاتا کہ آخر میں نیچ تھا، ایک گھٹیا سا وارڈ بوائے جبکہ ایسی بات نہیں تھی، میں وارڈ بوائے تھا ہی نہیں بلکہ ایک نامور مصنف تھا، ایک اور شکر کی بات یہ تھی کہ یہاں شاید ایک بھی شخص ایسا نہیں تھا جو ادب سے دلچسپی رکھتا ہو یا ناول یا کہانیاں اور افسانے پڑھتا ہو ورنہ میرے ناول پر میری تصویر بھی ہوا کرتی تھی، مجھے اس شکل میں باآسانی پہچانا جاسکتا تھا۔

خیر جناب بہترین ناشتہ ملا، بدلے ہوئے لباس میں میری شخصیت پھر نکھر آئی تھی اور میں نے دیکھا کہ کئی نگاہوں نے مجھے غور سے دیکھا ہے، ایسے وقت میں میرا دل لرز جاتا تھا لیکن وہی بات جس پر میں خدا کا شکر ادا کرچکا ہوں کہ ان میں سے کسی کو بھی ناول افسانے اور کہانیاں پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور مجھے نہیں پہچانا گیا تھا۔ دن بھر خاطر مدارت ہوئی اور پھر دوسری رات آگئی مجھے اپنے آپ پر ہنسی آرہی تھی کہ ذیشان عالی وہ جو کہتے ہیں نا کہ شکر خورے کو شکر ہی ملتی ہے، تو باقاعدہ مجھے شکر کا استعمال کرایا جارہا تھا اور یہ شکر ثناء کی شکل میں تھی، لیکن دوسرے دن تھوڑے سے خوف کا احساس ہوا، ایک اخبار میری نگاہوں کے سامنے آگیا تھا جو پچھلے دن کا تھا۔

میں نے اسے پڑھا تو اس میں خدا کے فضل سے میری تصویر تو نہیں چھپی تھی، لیکن میرے بارے میں بڑی گوہرافشانیاں کی گئی تھیں، پولیس نے اس عمارت پر چھاپہ مارا تھا جس کے بارے میں پڑوسیوں نے بتایا تھا کہ یہاں ایک انوکھا وجود آتا ہے جو ایک خاص قسم کا کھیس اوڑھے ہوتا ہے، یہ عمارت بالکل ویران ہے اور یہاں کبھی کبھی بس ایک عورت نظر آتی ہے جو کافی دن سے نظر نہیں آئی، البتہ کوئی اور عورت کھیس اوڑھے اپنا چہرہ پورا ڈھکے ہوئے آتی جاتی نظر آتی ہے، یہ اطلاع پولیس کو دی گئی تھی اور پولیس نے یہاں چھاپہ مارا تھا۔

چوتھے دن کے اخبار میں بڑی ہنگامہ خیزی تھی اور اس دن جو کچھ ہوا تھا وہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ پولیس کمشنر نے عمارت کی بھرپور تلاشی لی تھی اور انہیں ایک پراسرار کمرے میں ایک انوکھی کتاب ملی تھی، وہ پتھر کی کتاب تھی جو بہت بڑی تھی اور کمرے کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی تھی اس کے اوپر تک جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں، پولیس کمشنر اس حیرت انگیز کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے اوپر گئے ان کے ساتھ دو اور اعلیٰ افسران تھے، کتاب میں عجیب قسم کی تختیاں سی ابھری ہوئی تھیں، پولیس کمشنر نے ان میں سے ایک تختی پر پاؤں رکھا تو اچانک ہی کسی صندوق کے ڈھکنے کی طرح کھل گئی اور پولیس کمشنر اس میں غروب ہوگئے، یہی کیفیت ان دو اعلیٰ افسران میں سے ایک کی ہوئی تھی۔ وہ بھی کتاب کے تعویذ جیسے پتھر پر چڑھا اور اس میں گم ہوگیا۔ تیسرا آفیسر بھاگ کر باہر آگیا تھا اور اس نے یہ سنسنی خیز خبر سب کو سنائی تھی، چنانچہ ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔

ماہرین کے پورے گروپ نے سارا دن اس کتاب کی چھان بین کی لیکن اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا کہ اس کے نیچے کیا تھا، یہی سوچا گیا تھا کہ شاید کوئی عظیم الشان تہہ خانہ ہے، چنانچہ اب یہ تیاریاں

ہوئی آواز میں کہا۔

''کوروتی یہاں سے تو نکلو ورنہ میں مرجاؤں گا۔''

''ہاں ہاں نکلو..... پھر موقع ملے تو مجھے چھوڑ کر کہیں چلے جانا۔''

''طنز نہ کرو کوروتی طنز نہ کرو، براہ کرام اس کمرے سے تو باہر نکلو'' کوروتی نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے دروازے کی جانب بڑھ گئی، میں درحقیقت اس وقت غم کا شکار تھا، آخر انسان ہوں کئی دن ثناء کے ساتھ رہا تھا اور وہ میری قربت میں بہت خوش نظر آتی تھی، لیکن ثناء نہیں بلکہ کوروتی اور یہ کوروتی کا عجیب و غریب انداز تھا، وہ کمرے سے باہر نکل آئی اور میرے ساتھ قدم بڑھانے لگی۔

''آؤ آگے آؤ..... یہاں ایک محفوظ جگہ ہے، جہاں ہم عارضی طور پر چھپ سکتے ہیں، آؤ میں تمہیں بتاؤں وہ کون سی جگہ ہے۔''

اس کوٹھی کے گیٹ کے پاس ایک انیکسی بنی ہوئی تھی، انیکسی خالی پڑی ہوئی تھی، اس کا اوپری حصہ کسی خاص ڈیزائن پر بنایا گیا تھا جہاں ایک انتہائی کشادہ برج جیسی جگہ تھی، اس برج تک پہنچا جاسکتا تھا، بڑی محفوظ جگہ تھی۔ ہم اسی باڑھ کے ساتھ ساتھ انیکسی تک آئے تھے، خالی انیکسی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور مجھے لئے ہوئے برج پر پہنچ گئی۔

''کیسی جگہ ہے؟'' اس کی آواز ابھری جس میں مسکراہٹ کا انداز تھا، میں اوپری سانسیں لینے لگا، جگہ کے بارے میں، میں کیا تبصرہ کرتا، مجھے کوروتی کی ہنسی سنائی دی تھی پھر اس نے کہا۔

''پوری زندگی کا تجربہ ہے میرا اور میں جس زندگی کی بات کرتی ہوں وہ ایک قدیم تاریخ ہے، تو میں اپنے تجربے کے بارے میں بتارہی تھی کہ مرد کبھی عورت سے مخلص نہیں ہوتا، اسے صرف اپنی پسند سے دلچسپی ہوتی ہے اور انہی میں تم بھی ہو۔''

خیر وقت گزرا اور پھر ہم نے برج کے روشن دانوں سے دیکھا کہ پوری کوٹھی میں بھگدڑ مچی ہوئی ہے، ملازم اور دوسرے لوگ بھاگ دوڑ کررہے ہیں، مزید یہ ہوا کہ دن دس بجے کے قریب پولیس کی کئی گاڑیاں دندناتی ہوئی کوٹھی میں گھس آئیں اور کوٹھی کی ناکہ بندی ہونے لگی، پھر کچھ اور ہوا کوروتی دلچسپی سے یہ تماشہ دیکھ رہی تھی، لیکن میرے اوسان خطا تھے میں نے کہا۔

''کیا کہتی ہو؟''

''ارے کیسے ادیب ہو تم، صورت حال سے حالات کا جائزہ نہیں لے سکتے اور اندازہ نہیں لگا سکتے کہ کیا ہورہا ہے؟''

''مطلب؟''

''پہلی بھاگ دوڑ جو تھی وہ اس سلسلے میں تھی کہ ثناء کے کمرے سے تعفن پھیلا ہوگا، سڑے ہوئے گوشت کا تعفن کیونکہ بہرحال وہ مکمل طور پر ڈھانچہ نہیں بنی ہے بلکہ اس کا گوشت آہستہ آہستہ گل رہا ہے اور اس سے بدبو پھیل رہی ہے، تو جب یہ بدبو پھیلی ہوگی تو لوگوں نے وہاں پہنچ کر دیکھا ہوگا کہ کیا صورت حال ہے اور اس کے بعد جو بھگدڑ مچی ہے وہ اس کا نتیجہ تھی اور اب جو یہ پولیس کی گاڑیاں آئی ہیں وہ سو فیصدی تمہاری تلاش میں آئی ہیں۔''

''یار ذیشان عالی، تمہارا تجربہ صرف چند سالوں کا ہے، میرا زندگی بھر کا تجربہ ہے اور میری زندگی کتنی ہے تمہیں اس کا علم ہے، ادھر کوئی نہیں آئے گا بے فکر رہو، اور اگر انیکسی میں کوئی آ بھی جائے تو اس برج کے بارے میں تو سوچے گا بھی نہیں اور پھر ذیشان عالی تم فکر مند کیوں ہو، میں ہوں نا اگر سی آئی ڈی والوں نے تم پر قابو پا بھی لیا تو میں تمہیں وہاں سے نکال لاؤں گی۔''

مجھے ایک دم غصہ آیا اور میں نے کہا۔ ''اور اگر انہوں نے تم پر بھی قابو پالیا تو؟''

میرے اس جھلائے ہوئے انداز پر وہ خوب ہنسی پھر بولی۔ ''تو کیا کریں گے مجھے سزائے موت دے دیں گے نا، میری ہڈیوں کو کلہاڑیوں سے کوٹیں گے، جب وہ کوٹ چکیں گے تو میں اٹھ کر کھڑی ہوجاؤں گی اور ان کی ہوا خراب ہوجائے گی۔''

تو میں بتا رہا تھا کہ رات کے تین بجے کا وقت ہوگا، میں ثناء کے گداز بدن پر ہاتھ رکھے نیم غنودگی کے عالم میں تھا کہ اچانک ایک عجیب سے احساس نے مجھے چونکا دیا، مجھے اپنے ہاتھ کے نیچے ثناء کا بدن کچھ عجیب عجیب سا لگا، یوں لگا جیسے ثناء کے گداز بدن کی گدازیوں میں کوئی نمایاں تبدیلی ہوئی ہو، ایسا لگا جیسے اس میں ہڈیاں ابھر رہی ہوں، نہ سمجھ میں آنے والی ہڈیاں، میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا اور میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ثناء کو دیکھا، یہ دیکھ کر میری دہشت کی انتہا نہ رہی کہ ثناء کے پورے بدن سے گوشت غائب ہوتا جا رہا تھا اور سوکھی ہڈیاں ابھرتی جا رہی تھیں، اس کا چہرہ بے حد بھیانک تھا اور بدن کی کیفیت بھی عجیب ہوتی جا رہی تھی۔ بدن چونکہ لباس میں ڈھکا ہوا تھا اس لئے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن چہرہ بالکل نمایاں تھا۔

ایک استخوانی ڈھانچہ میرے حلق سے ہلکی سی آواز نکل گئی تو ثناء نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، کچھ لمحے مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی رہی اور پھر اچانک ہی اچھل پڑی، وہ اچھل کر بیٹھ گئی تھی اور ہڈیوں کی کڑکڑاہٹ مجھے صاف سنائی دی تھی، آپ یہ سمجھ لیجئے کہ میں خوف سے قریب المرگ ہوگیا تھا، ثناء نے اپنے ہاتھوں کی کلائیاں ٹٹولیں پیروں پر سے کپڑا ہٹا کر انہیں دیکھا، پھر اس کی آواز ابھری۔

''ذیشان عالی'' اور یہ آواز میرے خدا میرے خدا، یہ آواز کوروتی کی تھی، میرے ہوش و حواس ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے، میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا، کوروتی نے کہا۔

''ذیشان عالی۔''

''کک..... کک..... کور..... کوروتی۔''

''ہاں میں کوروتی ہی ہوں۔''

''لل..... لیکن لیکن.....''

''تم نے بیوفائی کی ذیشان عالی، تم بے وفا نکلے۔''

''کک..... کیوں؟''

''اسپتال میں اپنی دانست میں تم نے مجھ سے جان چھڑالی تھی، مجھے وہاں چھوڑ کر فرار ہوگئے تھے، میں پاگلوں کی طرح تمہیں تلاش کرتی پھری، بڑے خطرناک حالات سے گزرنا پڑا مجھے، میں تمہیں بتاؤں ذیشان عالی، میں کوئی روح نہیں ہوں ایک زندہ وجود ہوں جسے کوئی بھی نقصان نہیں پہنچ سکتا، مجھ پر گولیاں چلائی جائیں تو میری ہڈیاں ٹوٹ سکتی ہیں، مجھے اگر کہیں بلندی سے نیچے گرنا پڑے تو میرا وجود چور چور ہوسکتا ہے یہ الگ بات ہے کہ میں اس وجود کو سمیٹ کر پھر وہاں سے چل پڑوں کیونکہ موت مجھ سے گریزاں ہے، ذیشان عالی آخر کار میں تمہیں تلاش کرتی ہوئی وہاں پہنچ گئی جہاں تم ایک وارڈ بوائے کی حیثیت سے ان لوگوں کے درمیان اپنی جگہ بنا رہے تھے۔

وہ لڑکی جس کا نام ثناء تھا بیچاری مر چکی تھی اور جب انہوں نے اسے مردہ قرار دے دیا اور اس کی ڈیڈ باڈی کو اس کے عزیز و اقارب کے حوالے کرنے گئے تو میں نے غنیمت سمجھا کہ میں اس کے وجود کو اپنالوں، میں بتا چکی ہوں کہ میرا علم اتنا ہے کہ میں یہ عمل کرسکتی تھی، چنانچہ میں ثناء کے جسم میں داخل ہوگئی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بھی تمہارے علم میں ہے، بس تمہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ لڑکی ثناء نہیں بلکہ میں ہوں، وہ بیچاری تو اسی وقت مر چکی تھی، تم نے چالاکی سے کام لیا اور یہاں تک آ گئے۔

میں دم بخود تھا، میرے ہوش و حواس میرا ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے، اچانک ہی اس نے کروٹ بدلی اور میں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا، کہ ثناء کے اندر سے کوروتی باہر نکل آئی ایک سوکھا سا استخوانی ڈھانچہ جسے میں اچھی طرح پہچانتا تھا وہ کوروتی کا ڈھانچہ تھا، لیکن بستر پر بھی مجھے ایک خوفناک شکل نظر آئی تھی، یہ ثناء تھی جس کا بدن گل چکا تھا اور جگہ جگہ سے اس کی ہڈیاں جھانکنے لگی تھیں، یہ اس کا اصل وجود تھا جو اتنے دنوں کے اندر اندر گلنے لگا تھا، اس سے شدید تعفن اٹھ رہا تھا، اتنا کہ انسانی ذہن پاگل ہوجائے میں نے بھرائی

''مگر میں تو کھڑا نہیں ہوسکوں گا، تمہیں نہیں معلوم پولیس کتنی رحمدل ہوتی ہے اور کیا سلوک کرے گی ایک مفرور مجرم کے ساتھ۔''

''اب یہ تو غلط بات ہے ویسے بھی تم نے اپنی جان بچانے کے لئے مجھے دھوکہ دیا تھا، چلو خیر تم میرے محبوب ہو، میں نے یہ سب کچھ اس حساب میں ڈال دیا ہے۔''

ہم روشن دان سے دیکھتے رہے، ایمبولینس آئی، ڈاکٹر آئے، نرسیں آئیں، پولیس بھاگ دوڑ کرتی رہی، اندر رونے پیٹنے کی آوازیں بلند ہوتی رہیں، عبدالحکیم صاحب پتہ نہیں کیا کیا کرتے رہے، پورا دن یہ ہنگامہ جاری رہا، غالباً ثناء کی تدفین کے لئے کوششیں کی جاتی رہیں اور اس کے بعد شام کو مغرب کے وقت اس کا جنازہ آہوں اور آنسوؤں کے ساتھ لے جایا گیا، پولیس بھی شریک تھی، فوٹو گرافر بھی آئے تھے، پریس بھی موجود تھا، عجیب ہی ہنگامہ رہا تھا، پوری کوٹھی لوگوں سے بھری پڑی تھی اور یہ حیرانی کی بات تھی کہ اٹیک کی جانب کسی نے توجہ نہیں دی تھی غالباً وہ لوگ یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ دو خطرناک مجرم اسی کوٹھی میں چھپے ہوئے ہیں، ان کا تو خیال ہوگا کہ جتنی جلدی ممکن ہوسکا ہوگا وہ یہاں سے بھاگ گئے ہوں گے لیکن انہوں نے کیا سوچا ہوگا، میں نے کوروتی سے کہا۔

''کوروتی مجھے شدید بھوک لگ رہی ہے۔''

''تھوڑا سا انتظار کرلو، تھوڑا سا، ذرا اندھیرا پھیل جائے اور یہ لوگ ذرا پرسکون ہوجائیں میں تمہارے لئے کھانا لے آؤں گی، فکر کیوں کرتے ہو۔''

میں ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگیا، واقعی پورا دن کچھ کھائے پئے بغیر گزر گیا تھا اور یہ بڑی افسوسناک بات تھی، لیکن صبر کے سوا اور چارہ کار کیا تھا۔

بدن تھکن سے چور ہو رہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں دماغ کی جو حالت تھی خدا ہی جانتا ہے۔ کوروتی اس وقت ایک دیوار سے کمر لگائے بیٹھی تھی۔ ابھی مدھم سی روشنی ہو رہی تھی اس لئے کوروتی کا ہیولہ نظر آرہا تھا۔

میرے خدا، میں خود اپنے بارے میں کہتا ہوں کہ اگر مجھے کوروتی کی اصلیت نہ معلوم ہوتی اور میں ایسے کسی ڈھانچے کو اس طرح بیٹھے دیکھ لیتا تو خوف سے میری سانس بند ہوسکتی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ تبھی کوروتی کی آواز ابھری۔

''عالی۔''

''ہوں؟''

''نیند آرہی ہے۔''

''ہاں، دل چاہ رہا ہے دائمی نیند سو جاؤں۔''

''آہ، کیا دلکش بات کہی ہے۔''

''اس سے کیا دلکشی ہے؟ میں نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

''ہوں کو ہے نشاط کار کیسا کیسا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیسا''

''تمہیں شاعری سوجھ رہی ہے۔''

''ہاں، موت کتنی دلکش چیز ہے، زندگی سے تھکے ہوئے کسی انسان سے پوچھو۔ اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''تم مرنا چاہتی ہو۔''

''چھوڑو ایسی باتیں مت کرو، کوئی فائدہ نہیں، وہ خاموش ہوگئی، مجھ پر واقعی غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔'' اچانک اس نے کہا۔

''عالی۔''

میں چونک پڑا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی، کہنے لگی۔

''یار اس مشکل کا کوئی حل نکالنا پڑے گا۔ مجھے ایک بات بتاؤ۔ اس شخص نے ہمیں اس لڑکی کی کہانی سنائی تھی جس کے ہاتھ پاؤں مڑے ہوئے تھے۔ اور ایک درویش نے اس کے باپ کو ایک نسخہ بتایا تھا۔''

''ہاں۔''

''ایسا کوئی درویش ہمیں نہیں مل سکتا۔''

''کہاں ملے گا۔'' میں نے کہا۔

''تلاش کریں گے۔ ہوسکتا ہے کوئی مل جائے۔''

''ہوں۔'' میں نے مختصراً کہا۔ اصل میں پیٹ میں

''میری بھی نہیں۔'' اس کی آواز میں محبوبیت تھی۔ میرا دم نکل گیا۔ اس کے لہجے کا مفہوم ظاہر تھا۔ میں کچھ نہ بول سکا تو اس نے دوبارہ کہا۔

''بولو۔''

''کیوں نہیں۔''

''ایک بات کہوں تم سے۔''

''ہاں کہو۔''

''میں جانتی ہوں میری قربت تمہارے لئے ایک مشکل کام ہے۔ لیکن یہ میری اصل ہے۔ اور اگر میری اصل تمہارے لئے ناقابل قبول ہے تو معاف کرنا۔ میرے لئے اس سے دردناک بات اور کوئی نہیں۔ ہاں ایک وعدہ تم سے کرسکتی ہوں۔'' وہ رکی پھر بولی۔ ''پوچھو گے نہیں کیا۔''

''نہیں پوچھوں گا۔''

''کیوں۔''

''اس لئے کہ میں نے تمہاری اصل قبول کرنے سے انکار کب کیا ہے۔'' میں نے جواب دیا اور وہ وارفتہ ہوگئی۔ سوکھی ہڈیوں کی مالا میرے گلے کی زینت بن گئی۔ اس نے بڑی محبوبیت سے میری گردن میں بانہیں نما چیز ڈال دی تھی۔ میری گردن میں کھجلی ہونے لگی۔

دوسری صبح نہ جانے کب آنکھ کھلی تھی۔ بھیانک رات کی نڈھال صبح ثنا کی حیثیت سے کوروتی بہت پیاری تھی۔ لیکن......

میں نے اس کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔ لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ اس کے بعد نیچے کی سن گن لی۔ لیکن کوئی آہٹ نہیں سنائی دی۔ پھر روشن دان سے باہر کا نظارہ کیا۔ پورا لان کاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ثنا کے قل ہو رہے تھے۔ ایک سے ایک قیمتی کار موجود تھی۔ فائیو اسٹار قل تھے۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

ابھی روشندان سے باہر کی گہما گہمی کا جائزہ لے رہا تھا کہ پیچھے سے آہٹ سنائی دی۔ اور میں اچھل پڑا۔ بدن نے پسینہ چھوڑ دیا تھا۔ لیکن کوروتی کی آواز سنائی دی۔

''میں ہوں عالی۔''

''اوہ۔''

''ناشتہ لائی ہوں تمہارے لئے ہوں۔'' اس نے کہا۔ اور میرے سامنے ایک ٹرے لگادی۔ ٹرے میں حلوہ پوریاں اور سالن وغیرہ تھا۔ ''نیچے کوئی نہیں ہے، جلدی سے واش روم ہو آؤ۔'' اس کے لہجے میں کسی محبت کرنے والی بیوی کا سا پیار تھا۔ جس سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''نیچے آکر میں نے ضروریات سے فراغت کی۔ یہ انیکسی ہمارے لئے ایک پرسکون پناہ گاہ تھی میں واپس پہنچا تو وہ میری منتظر تھی۔

''میں کیسے تمہارا شکریہ ادا کروں کوروتی۔'' میں نے پوریاں چباتے ہوئے کہا۔

''بتاؤں۔'' وہ شوخ لہجے میں بولی۔

''ہاں بتاؤ۔''

''جیسے کرتے ہو۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولی اور کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ وہ ہنس رہی تھی اور میں رو رہا تھا۔ بس آگے کیا کہوں۔

''پوریاں کافی تھیں۔ بچ گئیں اس نے ایک سلیقہ مند بیوی کی طرح انہیں دوپہر کے لئے مخصوص کردیا۔ اس کے بعد اس نے مجھے جو پیش کیا وہ واقعی متاثر کن تھا، یہ آج کے اخبارات تھے۔

''ارے اوہ، کوروتی یہ؟ یہ تم نے کیسے حاصل کئے۔''

''بتاؤ۔''

''جھمگٹ لگا ہوا پوریوں والے کی دکان پر، میں چادر اوڑھ کر گئی تھی۔ وہاں جاکر میں نے چادر اتار دی اور اس کے بعد کوروتی قہقہے لگانے لگی، ہنستے ہوئے اس نے کہا۔ ''اور اس کے بعد گاہک تو بھاگے سو بھاگے ہی تھے، پوریوں والا بھی اٹھ کر ایسا بھاگا کہ سب کچھ ہی بھول گیا، بس میں نے ضرورت کے مطابق پوریاں لیں اور چادر اوڑھ کر وہاں سے واپس چل پڑی، اس دوران میں نے ایک اخبار والے کو بھی دیکھا جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے اور وہ فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا اخبار بیچ رہا تھا۔ میں نے یہاں آنے کے بعد پوریاں وغیرہ رکھیں، مجھے

چوہے دوڑ رہے تھے۔ اس وقت کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کوروتی خاموش ہوگئی۔ میری پلکیں پھر جڑنے لگیں اور پھر میں سوگیا۔ پتہ نہیں یہ نیند تھی یا بھوک پیاس کی غشی، خیر اس وقت ماحول پر گہرا سناٹا مسلط تھا، جب کسی نے میرے بدن کو ہلایا اور میرے کانوں میں آواز ابھری۔

''عالی۔''

''کیا ہے؟'' میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ نتھنوں میں ایک عجیب سی خوشبو آئی تھی۔ عمدہ قسم کے قورمے کی خوشبو۔

''ارے ارے پریشان مت ہو، کھانا لائی ہوں تمہارے لئے، پانی بھی ہے، ویسے انیکسی میں کوئی نہیں ہے۔ تم چاہو تو نیچے جاسکتے ہو، کوئی ضرورت ہو تو۔''

''اس وقت سب سے بڑی ضرورت کھانا ہے، کہاں ہے، کیا کچھ روشنی ہوسکتی ہے۔''

''نہیں، روشنی خطرناک ہوگی، ایک کام کرتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ اور ایک طرف بڑھ گئی۔ انیکسی میں کئی روشندان تھے جن میں سے بعض میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ لیکن گردمٹی سے یہ شیشے دھندلائے گئے تھے۔ اس نے ایک روشن دان کھول دیا اور تیز روشنی اندر گھس آئی۔ آسمان پر چودھویں کا چاند کھلا ہوا تھا۔ کوروتی نے وہ سارے برتن میرے سامنے رکھ دیئے۔

عمدہ قسم کا قورمہ، روغنی نان وغیرہ تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہ کھانا ہے جو رشتے دار کسی کی موت پر دیتے ہیں۔ اس وقت اور کچھ نہیں سوچا جاسکتا تھا۔ میں کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کوروتی کو کھانے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے پیٹ بھر کر کھایا بلکہ ضرورت سے زیادہ کھایا۔ کوروتی کچھ کپڑے وغیرہ بھی لائی تھی۔ میں نے شکر گزاری سے کہا۔

''تم نے مجھے نئی زندگی ہے کوروتی۔''

''کاش میں کہہ سکتی کہ میری جان بھی تمہارے لئے حاضر ہے۔ لیکن میں ایک بات کہوں۔ تم نے مجھے خود سے دور کرنے کی کوشش کی تھی۔'' میرے پاس اس بات کا جواب نہیں تھا۔ کوروتی خاموش رہی پھر تھوڑی دیر کے بعد بولی۔ ''میں نے تم سے کسی درویش یا جادوگر کے بارے میں کہا تھا۔''

''ہاں۔''

''تلاش کرو کوئی سنیاسی یا بزرگ ایسا مل جائے جو میرا علاج کردے۔''

''ہم کوشش کریں گے، ویسے ایک بات بتاؤ۔ اچانک تمہاری ہیبت کیسے بدل گئی، ثناء کا بدن تبدیل کیسے ہوگیا؟''

''یہ میرے لئے بھی ایک نیا تجربہ تھا عالی۔'' وہ بولی۔

''وہ کیا۔''

''یہ کہ اگر میں کسی کے مردہ بدن پر قبضہ کرلوں تو بس ایک مخصوص وقت تک ہی یہ قبضہ قائم رہ سکتا ہے اس کے بعد خود بخود ختم ہوجائے گا۔''

''پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔''

''کبھی نہیں۔'' پہلے میں نے یہ عمل کیا ہی نہیں۔

''پھر تم نے ثناء کے بدن پر یہ عمل کیسے کیا۔''

''اس علم کا مجھے پتہ تھا۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ تمہارے گم ہوجانے کے بعد میں اسپتال میں تمہیں تلاش کرنے لگی اور آخر میں، میں نے تمہیں وارڈ بوائے کے روپ میں دیکھ لیا۔ بس پھر میں تمہارے پیچھے لگ گئی اور میں نے پہلی بار ثناء کے بدن پر قبضہ جمایا۔ میرا خیال تھا کہ میں طویل عرصہ تک ثنا بنی رہوں گی لیکن پھر گزری رات کو اچانک مجھے ایک دم احساس ہوا کہ میں ثنا کے بدن سے نکل رہی ہوں۔ میں خود چونک پڑی تھی۔ رفتہ رفتہ میں اس کے بدن سے نکل گئی۔ اور اس کا سڑا ہوا تعفن زدہ بدن نمایاں ہوگیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ عمل زیادہ طویل نہیں ہوتا۔

''ہوں۔'' میں نے پرخیال انداز میں کہا۔

''اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔ اس وقت تمام لوگ تھک ہار کر سوگئے ہیں۔ میں مہیا کرسکتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں۔ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

کہانیاں عوام میں بے حد مقبول ہیں جیسے محترمہ طاہرہ آصف جو تماشہ فطرت کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ انسان اس کے سحر میں گرفتار ہوکر رہ جائے یا پھر جناب ساحل ابڑو جو اماوس کی رات کی بھیانک کہانی پیش کرتے ہیں اور پھر رضوان علی سومرو جو گل حیات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ حیرت سے منہ کھلے کا کھلا رہ جائے، البتہ یہ گل کبھی کبھی وہ گل کھلاتا ہے کہ انسان گلگلہ بن کر رہ جائے اور پھر جناب ضرغام محمود جو نہلے پہ دہلا ہیں، کمال کے رائٹر ہیں اور ایس امتیاز احمد بس ان کے بارے میں کیا کہا جائے، یوں سمجھ لیجئے کہ وہ بہت سی زندہ روحوں کے خالق ہی نہیں بلکہ خود بھی انتہائی ماہر روحانیات معلوم ہوتے ہیں کہ ان کی ہر تحریر بے مثال اور ہم اے وحید صاحب کا تذکرہ ضرور کریں گے جنہوں نے پتہ نہیں کہاں سے رولو کا دریافت کیا ہے جس نے لوگوں کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے، ہاں ملک فہیم ارشاد بڑی خوب صورتی سے ظالم آتما سے کراتے ہیں اور یہ ظالم آتما کوروتی کی شکل میں آپ کے شہر میں دندناتی پھر رہی ہے، بات احسان سحر صاحب کی بھی کمال کی ہے کہ انہوں نے جو آنکھیں روشن کی ہیں انہوں نے پراسرار تحریروں کی دنیا میں بڑی روشنی پھیلائی ہے، لیکن ملک این اے کاوش جس مورکھ کو پکڑ کر لائے ہیں وہ سچ مچ مورکھ ہی ہے کیونکہ ساجدہ راجہ کی سفید موت خوف و دہشت سے خون کو رگوں میں منجمد کردیتی ہے، ہاں عامر ملک صاحب نے ایک بڑی جدت اختیار کی ہے کہ انہوں نے روحوں کا ملن کرادیا ہے، لیکن نعیم بخاری آکاش کی بے بس روح کی کہانی بھی بڑی دردناک ہوتی ہے اور پھر ہم آجاتے ہیں ایم الیاس پر، جنہوں نے ایک ناگن کو بھی عشق کی لعنت میں گرفتار کردیا ہے، منعم اصغر صاحب نے موت کا بدلہ لے لیا ہے اور وجیہہ سحر نے تو چلئے لٹیا ہی ڈبودی ہے یعنی انہوں نے خناس کو قبضے میں کرلیا ہے، ضروریات شیطان میں خناس کی جو اہمیت ہے اس سے سبھی واقف ہیں لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ بیچارہ ذیشان عالی انہی خوفناک تحریروں کے جال میں پھنس کر کوروتی کا شکار ہوگیا اور یہ اور کوروتی اپنی کھوئی ہوئی حیثیت پانے کے لئے دہشت گردی کرتی پھر رہی ہے۔

تو اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم بتارہے تھے کہ وہ ذیشان عالی کو لاک اپ سے نکال لائی اور اس کے بعد دونوں لاپتہ ہوگئے، لیکن پراسرار روحوں یا پھر جیسا کہ ذیشان عالی بیان کرتا ہے کہ صدیوں پرانی زندہ عورت جو نجانے کیسی کیسی پراسرار قوتوں کی مالک ہے، اپنی دہشت ناکی پھیلاتی پھر رہی ہے اور تازہ ترین واقعہ یہ ہے کہ ایک بہت ہی مقتدر شخصیت عبدالحکیم صاحب کی پوتی ثناء ایک عجیب وغریب بیماری کا شکار ہوگئی اور بدنصیب بچی کا ایک اسپتال میں انتقال ہوگیا، لیکن پھر وہ زندہ حالت میں ملی اور ذیشان عالی ایک وارڈ بوائے کی حیثیت سے ان لوگوں میں شامل ہوگیا اور یہ بیچارے خوشی خوشی ثناء کو گھر لے آئے اور یہاں خوشیاں منائی گئیں، لیکن خاصا وقت گزرنے کے بعد یہ خوشیاں اچانک ہی دردوغم میں تبدیل ہوگئیں کیونکہ ثناء ثناء نہیں تھی بلکہ وہ کوروتی کی روح تھی جو اس کے بدن سے آزاد ہوکر فرار ہوگئی اور ثناء کا بدن ایک مردہ بدن رہ گیا۔“

یہ ہولناک کہانی بذات خود ایک فکشن کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن اس کا ایک ایک لفظ میرے لئے بڑا خوفناک تھا، اخبار نے آخر میں وہی الفاظ لکھے تھے جو اس وقت میرے ذہن میں آئے تھے اس نے لکھا تھا کہ یہ ہولناک کہانی صرف کہانی نہ سمجھی جائے یہ حقیقت ہے کہ اس وقت شہر ایک ایسی روح کے دست ستم کا شکار ہے جو کہیں بھی کچھ بھی کرسکتی ہے اس لئے شہریوں کو سرکاری طور پر ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ایسے کسی انسانی ڈھانچے سے محتاط رہیں جو انہیں کوئی بھی نقصان پہنچا سکتا ہے، حکومت نے یہ اجازت دی ہے کہ اس ڈھانچے کے خلاف کوئی بھی عمل کیا جاسکتا ہے، اسے جرم تصور نہیں کیا جائے گا، البتہ ذیشان عالی اگر ہاتھ آجائے تو اسے گرفتار کرکے پولیس تحویل میں دے دیا جائے اور اسے کوئی جسمانی نقصان نہ پہنچایا جائے کیونکہ پولیس اس

اندازہ تھا کہ تم اخبارات میں اپنے بارے میں پڑھنے کا شوق رکھتے ہو، بس میں نے اخبار بھی اسی طرح حاصل کیے اور وہاں سے آ گئی۔''

''ارے واہ کہاں ہیں اخبار؟'' میں نے دلچسپی سے کہا اور کوروتی نے تین چار اخبار لا کر میرے سامنے رکھ دیئے، میں بے صبری سے ان اخبارات پر جھک گیا، پہلے ہی صفحے پر جلی سرخی کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔

''شہر پر بلاؤں کا حملہ، کچھ خوفناک بلائیں شہر میں گردش کر رہی ہیں۔'' اس کے بعد باقی خبر تھی جسے اس طرح لکھا گیا تھا۔ ''ہم عوام کو ہراساں نہیں کرنا چاہتے ہم خوف و دہشت نہیں پھیلا رہے لیکن ہمارا فرض ہے کہ ہم انہیں اس سنگین صورت حال سے آگاہ کریں جو اس وقت شہر کو درپیش ہے۔ ذیشان عالی نامی ایک فکشن رائٹر جو پراسرار کہانیاں بھی لکھتا تھا اور تاریخی ناول بھی، پتہ نہیں اس کی کہانیوں کا کوئی کردار کیسے زندہ ہو گیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کے علاوہ اور کچھ سوچا نہیں جا سکتا کہ یا تو وہ کردار ذیشان عالی کے قبضے میں ہے، یا پھر ذیشان عالی اس کردار کے قبضے میں، یہ کردار ایک خوفناک وجود ہے جو انسانی ڈھانچے کی شکل میں متعدد کارروائیاں کرتا پھر رہا ہے اور اسے خوفناک جناتی قوتیں حاصل ہیں۔

تفصیل یوں ہے کہ کچھ عرصے پہلے ایک عورت ایک بڑے ڈاکٹر صاحب سے ملی، اس کا انداز بے حد پراسرار تھا، ڈاکٹر نے اس سے اس کی بیماری کے بارے میں پوچھا تو اس نے اپنا ڈھکا ہوا چہرہ کھول دیا، وہ ایک انسانی ڈھانچہ تھا مکمل ڈھانچہ، جو بول رہا تھا باتیں کر رہا تھا اس نے کہا کہ وہ ایک حادثے کا شکار ہو کر یہ شکل اختیار کر گئی ہے، اس کی آواز نسوانی تھی، ایک دلکش اور جوان عورت کی آواز، اس نے ڈاکٹر احسان سے درخواست کی کہ وہ اپنی مہارتوں سے کام لے کر اس کا علاج کریں اور اس جس طرح بھی بن پڑے اس کے بدن کا گوشت واپس لے آیا جائے، اس نے بتایا کہ کسی زہریلے محلول کے ذریعے اس کے ایک دشمن نے اس وقت جب وہ ایک ٹب میں غسل کر رہی تھی وہ محلول پانی میں ملایا اور اس کا یہ حال کر دیا اس کے بدن کا گوشت گل کر بہہ گیا اور وہ ایک ڈھانچے کی شکل اختیار کر گئی۔

ڈاکٹر نے اسے ہمارے ملک کے ایک عظیم الشان ڈاکٹر، ڈاکٹر قیصر پاشا کے پاس بھیج دیا اور اس سے کہا کہ وہی اس کا صحیح علاج دریافت کر سکیں گے، اب اس کے بعد صورت حال کا پتہ نہیں چل سکا کہ ڈاکٹر قیصر پاشا سے اس کے کیا مذاکرات ہوئے، لیکن اس نے ڈاکٹر قیصر پاشا کو قتل کر دیا، لازمی امر ہے کہ وہ اس کے جنون کا نتیجہ تھا، اس سے پہلے کی ایک کہانی اس کہانی سے یوں منسلک ہو جاتی ہے کہ ہوٹل تاج محل میں ذیشان عالی ایک کمرے میں مقیم ہو گیا، اسی کمرے میں اس کے ساتھ کوئی اور وجود بھی تھا جس کا کچھ پتہ نہیں چل سکا، البتہ پولیس نے گہری تفتیش کے بعد یہ ضرور معلوم کر لیا کہ ذیشان عالی ایک انتہائی خوب صورت عورت کے ساتھ ہوٹل کے اس کمرے میں مقیم ہوا تھا، بعد میں ایک دن اس کمرے سے ایک انسانی ڈھانچہ نمودار ہوا اور دوڑتا چلا گیا۔ ہوٹل میں بھگدڑ مچ گئی تھی اور بہت بری کیفیت ہو گئی تھی، تفصیل معلومات پر ذیشان عالی کو گرفتار کر لیا گیا، لیکن پھر لاک اپ کے پاس ایک ڈھانچہ نمودار ہوا اور اس نے لاک اپ کھول کر ذیشان عالی کو رہا کرا لیا، اس دن کے بعد سے ذیشان عالی لاپتہ ہے۔

پھر یوں ہوا کہ اس انسانی ڈھانچے کو مختلف جگہوں پر دیکھا گیا، اس پر ڈاکٹر قیصر پاشا کے قتل کا الزام تھا اور اس کا معاون کار ذیشان عالی تھا، ذیشان عالی کا ماضی برا نہیں تھا وہ بس سیدھا سادہ کہانی کار تھا۔ لیکن کہانیاں اس طرح بھی زندہ ہو جاتی ہیں یہ ہر بار رائٹر کو نوٹ کر لینا چاہئے، کبھی کبھی اس کے کردار زندہ ہو کر اس کی گردن پکڑ لیتے ہیں، اندازہ یہی ہے کہ ذیشان عالی اس پراسرار وجود کے شکنجے میں آ چکا ہے اور اس کے ساتھ جرائم میں ملوث ہونے کے لئے مجبور ہے۔

ہم خاص طور سے پراسرار کہانیوں کے ان لکھنے والوں سے مخاطب ہیں جن کی انتہائی خوب صورت

میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں کوئی مافوق الفطرت وجود نہیں ہوں، میں ایک زندہ عورت ہوں، زندہ کردار ہوں جو بس ایک طریقے سے جس کے بارے میں تمہیں بتا چکی ہوں اور جس میں سچی بات یہ ہے کہ میری جدوجہد شامل نہیں تھی حیات ابدی حاصل کر چکی ہوں، بہت سی ایسی کہانیاں منظر عام پر آتی ہیں جنہیں ہم صرف اختراع سمجھتے ہیں لیکن ذیشان عالی جب اس طرح کے واقعات انسان کی نگاہوں کے سامنے آتے ہیں تب وہ ان اختراعات پر غور کرنے لگتے ہیں، کیا وہ سچ ہے جیسے تم رائیڈر ہیگرڈ کی ''شی'' کو لے لو، وہ شخص بھی تاریخ کا ایک حصہ ہے، اس نے ایسے کردار کو تخلیق کیا جو کہیں دور پہاڑوں میں رہتا ہے یا رہتی ہے اور غسل آتش کر کے نئی زندگی پا جاتی ہے، لوگ اسے فکشن سمجھتے ہیں کہانی سمجھتے ہیں، اس کہانی کو پتہ نہیں کس کس نے کیا کیا نام دیئے ہیں، لیکن جو کچھ بھی ہے، کہیں نہ کہیں سے کوئی خاکہ ملتا ہے اس کا، جو مسئلہ جنم کا یہ ہے کہ وہ کتاب نہیں توڑی جا سکتی اور توڑ کر بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا انہیں کیونکہ یہ بات تو طے ہے کہ کمشنر اور اس کا ساتھی تاریخ کے کسی دور میں چلے گئے ہیں اور شاید واپس نہ آسکیں۔''

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کوروتی کہ اب ہم کیا کریں؟''

''میں نے تم سے کہا تھا ناکہ جس طرح اس لڑکی کے ٹیڑھے ہاتھ پاؤں سیدھے ہوگئے اسی طرح تم بھی ایسا کوئی درویش تلاش کرو جو میرے بدن کے اس ضائع شدہ گوشت کو بحال کردے اور پتہ نہیں کیوں مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اس دور کی سائنس یا اگر سائنس نہ سہی تو وہ عملیت جو بہتر ہوتی ہے، میرا مطلب ہے جو سچی ہوتی ہے اور جس کا تعلق روحانیت سے ہوتا ہے کسی نہ کسی طرح میرے وجود کی واپسی کردے گی۔''

میں خاموشی سے سوچنے لگا پھر میں نے کہا۔''اور مجھے تو صرف یہ خطرہ ہے کہ جو ہنگامہ آرائی ہورہی ہے اور جس طرح وہ پولیس آفیسر جس کا تعلق سی آئی ڈی سے ہے ہماری تلاش کررہا ہے کہیں وہ اس انیکسی کا رخ نہ کرلے کیونکہ بہرحال تم دو تین بار یہاں سے نکلی بھی ہو اور تمہیں نکلنا پڑے گا۔'' میں نے کہا اور شاید وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی کیونکہ دیر تک کچھ نہیں بولی تھی، پھر اس نے کہا۔

''اس کا بھی کوئی حل تلاش کریں گے، ظاہر ہے ہم ایک طویل زندگی تو یہاں نہیں گزار سکتے کوئی مناسب حل تلاش کیا جائے گا اور پھر ایک بات کہوں ذیشان عالی؟''

''جی فرمایئے۔'' میں نے کہا تو وہ کسی قدر تنک کر بولی۔

''دیکھو مجھ سے طنزیہ لہجے میں گفتگو مت کیا کرو، میں خود بھی تو مشکل کا شکار ہوگئی ہوں اور تم سے بار بار یہ بات کہتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگتا کہ اس مشکل کا شکار میں تمہاری وجہ سے ہوئی ہوں۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا، بات تو اس کی سچ ہی تھی ایک طرح سے، لیکن بابا میں نے کب کہا تھا، میں تو اس برے وقت کو کوستا تھا جب میں نے کو تھم بھنسالی اور اس بھیانک عورت کا انٹرویو لینے کے بارے میں سوچا تھا اور اس کے حصول سے یہ سمجھا تھا کہ میں تاریخ کی کائنات میں دل ہلا دینے والے راز افشا کروں گا، لیکن میرا سارا وجود خود ہی ہل کر رہ گیا تھا، اچانک ہی میرے ذہن میں اپنی کتاب کا خیال آیا، میں نے کہا۔

''ایک بات کہوں کوروتی۔''

''جی، جی فرمایئے۔'' اس نے بھی میرے ہی انداز میں کہا اور ہنس پڑی۔

''نہیں سنجیدگی سے سنو۔''

''میں سنجیدہ ہوں۔''

''تم نے زندہ صدیوں کا مسودہ کہاں چھپایا تھا؟''

وہ چند لمحے ساکت رہی پھر بولی۔''ارے ہاں، یہ بات تو میں نے سوچی ہی نہیں۔''

''کیا؟''

''جو خبریں تم نے مجھے سنائی ہیں ان میں تمہارے مسودے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔''

سے اس ہولناک روح کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی ہے۔

پوری خبر پڑھنے کے بعد میں نے پیشانی سے پسینہ صاف کیا تھا، کوروتی شاید میری ہی طرف متوجہ تھی کہنے لگی۔

''عالی!''

''ہوں۔'' میں نے بمشکل کہا۔

''کیا لکھا ہے؟''

''ہمارا کچا چٹھا۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''مجھے بھی بتاؤ۔''

''کیا کروگی؟''

''سناؤ نا۔'' اس نے بڑے لاڈ سے کہا اور میں نے اسے تمام تفصیل پڑھ کر سنائی وہ اسے سن کر خوب ہنسی۔

''تم ہنس رہی ہو؟'' میں نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''بڑی مزے کی باتیں ہیں۔'' اس نے کہا اور میں نے برا سا منہ بنا کر دوسرا اخبار پڑھا۔ اس میں آگے کی کہانی تھی، پہلے اخبار کی طرح مختصر تفصیل بتا کر اس نے انکشاف کیا کہ اس ڈھانچے نما پراسرار وجود کی تفتیش کے لئے ہر عمل کیا گیا تھا، ادھر ایک ہونہار پولیس افسر کی پراسرار گمشدگی نے بھی ماحول بڑا سنسنی خیز بنادیا تھا، اس سے زیادہ سنسنی خیز کیفیت اس وقت ہوئی جب اس کتاب کی گہرائیوں کو ٹٹولا گیا، سرکاری ذرائع نے ہر ممکن کوشش کرلی کہ اس کتاب کو توڑ کر اس کے نیچے کوئی بیسمنٹ تلاش کیا جائے ایسی کوئی جگہ جہاں سے پولیس کمشنر ان کے ایک ساتھی کو بازیاب کیا جاسکے، لیکن ہر ممکن کوشش کرلی گئی کتاب توڑی نہیں جاسکی، پھر دوسرے ذرائع اختیار کئے گئے اور کتاب کے نیچے کافی دور سے ایک سرنگ بنائی گئی جو بڑی شدید محنت کے بعد کتاب تک پہنچی لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ کتاب کے نیچے زمین میں کچھ نہیں ہے، بس وہ کتاب زمین پر ٹکی ہوئی تھی، وہ کس چیز سے بنائی گئی ہے اس کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکا، چنانچہ اب اس کوٹھی کو سیل کردیا گیا ہے اور بڑے بڑے ماہر تعمیرات یہ مشورہ کررہے ہیں کہ کتاب کو زیادہ طاقتور مشینوں کے ذریعے توڑا جائے اس کی اصلیت کا پتہ لگایا جائے۔

میں نے یہ تفصیل بھی کوروتی کو پڑھ کر سنائی اور وہ پھر ہنس پڑی، مجھے اس پر شدید غصہ آرہا تھا۔ مجھ پر جو بیت رہی تھی وہ تو میں ہی جانتا تھا، مجھے یقین تھا کہ ہمارے ہاں کی ذہین پولیس لازمی طور پر کوئی نہ کوئی حل تلاش کرلے گی، کوروتی تو کم بخت غائب ہوجاتی تھی لیکن تیرا کیا ہوگا کالیا، میرے ذہن میں یہی سوچیں تھیں، وہ کہنے لگا۔

''تمہیں ایک بات بتاؤں عالی، وہ لوگ کسی طور وہ کتاب نہیں توڑ سکیں گے کیونکہ وہ تاریخ کا سرمایہ ہے، پراسرار قوتیں اسے ان کی نگاہوں سے اوجھل کردیں گی، لیکن وہ پراسرار قوتیں بھی اسے فنا نہیں کرسکیں اور چونکہ وہ میرے علم کی کتاب ہے، میرا سارا تاریخ کا علم اس میں قید ہے اور میں نے اس طرح محفوظ طریقے سے اسے بنایا ہے کہ تم سوچ نہیں سکتے، چودہ انسانی جانیں ضائع کی ہیں میں نے اس کتاب کی تعمیر کے لئے، کبھی تمہیں، اس کے بارے میں تفصیل بتاؤں گی۔''

''کک... کیا مطلب؟'' میں نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''ہاں ذیشان عالی! چودہ افراد ہلاک ہوئے ہیں اس کتاب کی تعمیر میں؟''

میں نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔ ''کوروتی! کبھی کبھی تو یہی بات ہے میری دماغی قوتیں زائل ہونے لگتی ہیں اور مجھے یوں لگتا ہے کہ میں پاگل ہوجاؤں گا۔''

''کیوں؟'' اس نے کہا۔

''بات اصل میں یہ ہے کہ تم اس قدر پراسرار قوتوں کی مالک ہو، لیکن تم اپنے بدن کے گوشت کے حصول کے لئے خود کچھ نہیں کرپاتیں۔''

''ذیشان عالی! بڑی معصوم سی بات کررہے ہو تم،

''لیکن کیڑے مکوڑے؟''

''میں نے سب ختم کردیئے تھے، آؤ نیچے آکر دیکھو، کتنا صاف شفاف ہے۔'' تقریباً سچ کہہ رہی تھی، اس میں ذرہ برابر بدبو نہیں تھی، میں اس کا سہارا لے کر نیچے اتر گیا، مال کی جگہ تھی۔ گہرائی چند فٹ سے زیادہ نہیں تھی لیکن کشادگی خوب تھی، البتہ گہرا اندھیرا تھا۔

''کاش۔ ہم، ایک ٹارچ ساتھ لے آتے۔'' میں نے اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر کہا۔

''ایک منٹ۔'' اس نے کہا۔ اور نہ جانے کہاں سے گٹرلائن میں روشنی پھیل گئی۔ میں نے حیرت سے دیکھا۔ یہ روشنی اس کے ہاتھوں کی انگلیوں سے نکل رہی تھی۔

''یہ کیا؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''آجاؤ۔ اب نظر آرہا ہے۔'' کوروتی کی چہکتی آواز سنائی دی۔

''ہاں، مگر.....؟''

''بتا چکی ہوں میں نے بہت سے گیان حاصل کئے ہیں۔ میں اتنی بے بس نہیں ہوں عالی، بس میرے ساتھ گوتم بھنسالی نے جو کچھ کیا اس کی مجھے امید نہیں تھی۔ اور پھر اگر وہ یہ سب اپنے روپ میں کرتا تو بھگوان کی سوگند میرے بجائے اس کا یہ حال ہوتا۔ میں اس کا داؤ اسی پر الٹ دیتی۔ میری انگلیوں سے جو روشنی نکل رہی ہے یہ میرا گیان ہے۔''

میں خاموش ہوگیا۔ میں اس کے پراسرار علوم کا قائل تھا۔ کشادہ گٹرلائن میں ہم کچھ دور آگے بڑھے۔ پھر وہ ایک جگہ رک گئی۔ اس نے روشن انگلیوں کا رخ اوپر کیا اور مجھے دوسرا مین ہول نظر آگیا۔ کوروتی نے ہاتھ اوپر کرکے مین ہول کے ڈھکن کو اوپر اٹھایا اور ڈھکن اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ صاف ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے، کچھ لمحے رک کر ہم نے باہر کی آہٹیں اور پھر کوروتی اوپر ہاتھ جما کر اپنے استخوانی بدن کو اٹھانے لگی اور اطمینان سے باہر نکل گئی، میرے لئے بھی یہ عمل مشکل نہیں تھا۔

کھلی ہوا میں کھڑے ہوکر ہم نے گہری گہری سانسیں لیں، کوٹھی بھائیں بھائیں کررہی تھی۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔

''کتاب کا جائزہ لیں۔'' کوروتی نے کہا۔

''چلو.....'' میں نے کہا۔ اور ہم اس پراسرار کمرے میں پہنچ گئے۔ کمرے کی حالت بہت خراب تھی، کتاب اپنی جگہ موجود تھی، اس کے آس پاس جو کچھ کہا گیا تھا وہ بیشک بہت کچھ تھا لیکن کتاب کی آب وتاب میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

''یہ محفوظ ہے، اگر انہوں نے اس عمارت کو بم سے بھی اڑانے کی کوشش کی تو اس کتاب کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ویسے ذیشان عالی میں اسے کہیں اور منتقل کردوں گی۔''

''منتقل کردوگی۔''

''ہاں۔''

''کیسے۔''

''آرام سے، میں نے اسے تیار کیا ہے میں سب کچھ کرسکتی ہوں۔'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

ہم دیر تک اس کے آس پاس کا جائزہ لیتے رہے۔ کوروتی اس دوران خاموش رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ''آؤ......'' میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔'' آہ کاش زندہ صدیوں کا مسودہ مل جائے۔''

''وہ بہت سے راستے طے کرکے ایک بڑے ہال میں داخل ہوگئی، ہال کی ایک الماری کھول کر اس نے کچھ کیا تو الماری میں ایک خلا پیدا ہوگیا۔ اس نے اس خلا میں ہاتھ ڈالا اور چند لمحے کچھ تلاش کرتی رہی، پھر اس کی رندھی ہوئی آواز سنائی دی۔

''نہیں ہے۔''

میرے پورے بدن میں ایک تشنج سا پیدا ہوگیا۔ دل جیسے رکنے لگا۔ اور اسی وقت انتہائی تیز مرکری روشنی سے ہال منور ہوگیا۔ ہم دونوں اس روشنی میں نہا گئے تھے۔

(جاری ہے)

"یہی خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا؟" میں نے کہا وہ بولی۔

"میں نے اسے بہت ہی خفیہ جگہ پر رکھا ہے، جہاں سے وہ آسانی سے کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا۔"

"کاش میرا مسودہ مجھے واپس مل جائے۔"

"وہ پھر خاموش ہوگئی اور چند لمحات کے بعد بولی۔" میں اسے جاکر تلاش کروں گی۔"

"تم تنہا نہیں کوروتی میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا، خبروں میں بتایا گیا ہے کہ وہ عمارت سیل کردی گئی ہے، آگے کی کسی کارروائی کے لئے۔"

"ہاں۔"

"اس کا مقصد ہے کہ ہم اگر کسی طریقے سے اس عمارت میں داخل ہوجائیں تو زندہ صدیوں کا مسودہ ہمیں مل سکتا ہے۔"

"کیوں نہ آج رات کوشش کی جائے۔"

"خدا کرے میرا مسودہ مجھے مل جائے۔"

"ویسے میں تمہیں بتاؤں کہ اس عمارت میں داخل ہونے کا ایک خفیہ راستہ بھی ہے۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے کوروتی، آج ہم ہر طرح کا خطرہ مول لیں گے۔ وہ مسودہ میرے لئے زندگی کی طرح ہے، میں اسے ضرور حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے کہا اور کوروتی نے گردن ہلادی۔

باقی وقت جیسے بھی گزرا میرے لئے بڑا بے صبری کا وقت تھا اور پھر جب رات کے سناٹے گہرے ہوگئے اور کوروتی نے مجھے ہلکا پھلکا سا کھانا کھلادیا جسے وہ باآسانی اس کوٹھی کے کچن سے لے آتی تھی اور کوٹھی چونکہ رنج وغم میں ڈوبی ہوئی تھی اس لئے کوئی خاص تحریک نہیں ہوتی تھی، کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ انیکسی سے باہر نکلے اور باہر جانے والے راستے کی جانب چل پڑے۔

ہمیں باہر نکلنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ البتہ شہر کی سڑکوں پر پولیس پٹرولنگ جاری تھا اس لئے ہم تاریک راستوں کا سفر اختیار کررہے تھے۔ کوروتی کی کوٹھی یہاں سے کافی دور تھی اس لئے وہاں تک پہنچنے میں کافی وقت لگا۔ راستے میں کوروتی نے کہا۔

"ذیشان۔ میری بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ تمہاری کتاب کا مسودہ تمہیں مل جائے۔ اسے لے کر یہیں واپس آؤ گے۔"

"تم بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"میں اس بارے میں سوچ رہی ہوں۔ ویسے اتنا سے ہم نے یہاں بتایا ہے۔ اس سے میں، ہم نے کسی کو اس انیکسی کی طرف آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ ان کے کسی کام کی نہیں۔

"ہاں یہ تو ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن ہمارے کام کی تو ہے۔ ہم نے اتنا سے یہاں کتنے سکون سے گزارا ہے۔ یہاں سے پوری کوٹھی پر نظر بھی رکھی جاسکتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے ہم یہیں واپس آجائیں۔"

"کیا جرم ہے۔"

"نہیں کوئی جرم نہیں ہے۔"

"دور سے ہم نے کوٹھی پر نظر دوڑائی۔ گیٹ کا بلب روشن تھا، مین گیٹ پر پولیس کی سیل لگی ہوئی تھی، کچھ فاصلے پر ایک پولیس کانسٹیبل بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

"یہاں تو سب ٹھیک ہے۔" کوروتی بولی۔

"ہاں۔ پولیس والا موجود ہے۔" میں نے کہا۔

"اس سے فرق نہیں پڑتا میں تمہیں خفیہ راستے سے اندر لے جاؤں گی۔ ہم خاموشی سے مسودہ وہاں سے حاصل کریں گے اور اسی راستے سے واپس نکل آئیں گے۔" وہ بولی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا، کوروتی عمارت کی پشت پر آئی، عمارت کے کچھ فاصلے پر اس نے ایک گٹر کے ڈھکنے کو ہٹایا اور بڑے آرام سے اس سے نیچے اتر گئی۔

"ارے، یہ۔" میں نے کہا۔

"برسوں سے سوکھا پڑا ہے۔ استعمال نہیں ہوتا۔" اس نے کہا۔

پیو نے دیکھ لیا تو غصہ کریں گے۔"
"پر کیوں اماں؟" وہ بھی ضدی تھی آج کتنے دنوں بعد وہ اتنے شوق سے تیار ہوئی تھی مگر یہ اماں بھی نا......
"کنواری کنواری دھی یوں سرخی پاؤڈر لگا کر باہر نہیں نکلتیں، نظر لگ جاتی ہے۔" اماں سمجھانے لگی اور وہ برے برے منہ بناتی واپس کمرے میں پلٹ آئی۔
"آج شہر سے جمال آنے والا تھا، اس لئے نازیہ اس کے لئے تیار ہوئی تھی مگر آگے اماں نے ڈانٹ دیا۔
"یہ اماں تو نانی، دادی، سے بھی دو ہاتھ آگے نکلی ہے، جو ذرا دیر کے لئے خوش ہونے دے یہ نہ کرو، وہ نہ کرو بس جو وہ کہیں وہی کرو۔" اندر کمرے میں آ کر وہ بڑبڑائی۔ اور بڑبڑاہٹ اتنی تیز تھی کہ عالیہ آسانی سے سن سکی اور ایک قہقہہ لگایا تو نازیہ تلملا کر رہ گئی۔
یہ تھی نازیہ بشیر..... اپنے ماں باپ کی لاڈلی بیٹی اور تین بھائیوں کی اکلوتی بہن..... نازیہ تینوں بھائیوں سے چھوٹی تھی، تین بیٹوں کے بعد ابا کی بڑی خواہش تھی کہ ان کی بھی ایک پیاری سی بیٹی ہو، جب وہ تھکے ہوئے گھر میں آئے تو وہ بھاگ کر پانی پیش کرے۔ اس سلسلے میں میاں بیوی نے بہت سی منتیں بھی مانگی اور بہت منت مرادوں کے بعد نازیہ دنیا میں آئی۔
نازیہ کے آتے ہی بشیر اور شریفاں کا خاندان مکمل ہوگیا۔
نازیہ آہستہ آہستہ بڑی ہونے لگی بشیر اپنی بیٹی کی ہر خواہش پوری کرتا۔
"نازیہ نے میٹرک تک ہی تعلیم حاصل کی تھی، آگے اس کا پڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پورے گاؤں میں بس صرف عالیہ ہی اس کی سہیلی تھی۔
عالیہ بھی دو بہن بھائی تھے، جمال اس کا بڑا بھائی تھا جو کہ نازیہ کو پسند کرتا تھا کچھ عرصہ قبل ان دونوں کی منگنی بھی ہو چکی تھی۔ جمال شہر میں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کر رہا تھا، تعلیم مکمل ہوتے ہی وہ نازیہ سے شادی کرنا چاہتا تھا جس پر نازیہ کو بھی اعتراض نہ تھا۔
مگر اس دوران نازیہ سے ایک غلطی ہوگئی اور وہ غلطی یہ تھی کہ نازیہ وہاں چلی گئی تھی جہاں جانے سے اسے روکا گیا تھا اور پھر نازیہ کی زندگی ہی بدل گئی تھی۔
ہوا کچھ یوں کہ..... ایک مرتبہ نازیہ کے گھر گائے کو مردہ بچہ پیدا ہوا جس پر نازیہ بہت دکھی ہوگئی کیونکہ ابا کا کہنا تھا کہ میں نازیہ کو شادی پر یہ گائے اور اس کا ہونے والا بچہ گفٹ کروں گا، جس پر نازیہ جی بھر کر ہنسی تھی مگر اب وہ کتنی دکھی تھی۔
اماں نے گائے کا مردہ بچہ اٹھایا اور اسے جا کے کھیت میں ڈال آئی، وہ واپس آگئی، تو نازیہ ماں کی منتظر تھی۔ "آ گئی اماں۔" وہ تیزی سے اس کی طرف لپکی۔
"ہاں مجھے ساری زندگی وہیں تھوڑا رہنا تھا" اماں نے کہا۔
"مگر میری گائے کا بچہ اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی رخصت ہوگیا۔" نازیہ ٹھہری نرم دل وہیں بیٹھ کر بچوں کی طرح رونے لگی، اماں عالیہ اور ابا اسے دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئے، بھلا یہ بھی کوئی رونے کی بات تھی۔
"ارے نازیہ پتر کوئی بات نہیں گائے کا بچہ پھر ہو جائے گا۔" اماں نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر وہ مطمئن نہیں ہو پائی تھی اس کا ذہن وہیں مردہ گائے کے بچے میں اٹکا پڑا تھا۔ وہ بے چین سی ہوگئی تھی وہ اس مردہ بچے کو دیکھنا چاہتی تھی حالانکہ اماں نے اسے سختی سے منع کیا تھا۔
"تجھے وہاں جانے کی ضرورت ہرگز نہیں، ایسی چیزیں خطرناک ہوتی ہیں، ایسی جگہوں پر جن بھوتوں کا سایہ ہوتا ہے اس لئے وہاں سب سے دور رہے۔"
"مگر وہ نازیہ تھی، بہادر، نڈر اور بنا کسی سے ڈرنے والی، اس نے وہاں جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یہ اس کی پہلی غلطی تھی۔
اور پھر دوسری غلطی نے اس نے یہ کردی تھی کہ کسی کو بتائے بغیر وہ مغرب کے بعد وہاں چلی گئی تھی۔

☆......☆......☆

مغرب کی اذان ہونے کے بعد جب ابا اور بھائی نماز پڑھنے چلے گئے اور اماں بھی نماز پڑھنے لگی تو وہ چپکے



خطرناک سائے

منعم اصغر-ڈیرہ غازی خان

دوشیزہ کمرے میں محو خواب تھی کہ اچانک کمرے میں ایک دل کو ہولاتی، چنگھاڑتی آواز سنائی دی جسے سنتے ہی دوشیزہ بدحواس ہوکر نیند سے بیدار ہوگئی اور پھر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ پھر اچانک......

رات کے اندھیرے میں جنم لینے والی خوفناک اور ڈراؤنی دل ودماغ کو مبہوت کرتی حقیقی کہانی

"**نادیہ** نیا سوٹ زیب تن کئے منہ پر پاؤڈر اور ہونٹوں پر سرخی لگا کر، آئینہ ہاتھ میں لئے اپنا جائزہ لے رہی تھی، تبھی عالیہ اندر داخل ہوئی۔

"ارے واہ کہاں کی تیاری ہورہی ہے؟" عالیہ نے شرارت سے کہنی ماری تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

عالیہ اس کی اکلوتی سہیلی تھی اس پورے گاؤں میں۔ "جانا کہاں بس ایویں ہی۔" نازیہ نے کہا اور باہر نکل آئی پیچھے عالیہ بھی باہر نکل آئی، نازیہ سیدھا ماں کے پاس آئی جو برتن دھو رہی تھی۔ "اماں کیسی لگ رہی ہوں۔" نازیہ کی آواز پر شریفاں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور تیز لہجے میں بولی۔ "کتنی بار کہا ہے کہ یوں تیار مت ہوا کر اچھا نہیں لگتا۔" ماں کی بات پر نازیہ کا منہ بن گیا۔ "اماں تم بھی نا سارا موڈ خراب کردیا۔"

"بڑا آیا تیرا موڈ جا کپڑے اتار اور چہرہ دھو ڈال

قطرے آ پڑے تھے۔ اور یہ دیکھ کر نازیہ کی فلک شگاف چیخ بلند ہوئی۔ اور دوسرے ہی لمحے وہ دھڑام سے نیچے آ گری۔

اس کا پورا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے وہ چھڑی اٹھائی اور گھر آ گئی اور سارا راستہ اسے ایسا لگا جیسے کوئی اس کے جسم میں سوئیاں چبھوتا آ رہا ہو، جب تک وہ گھر پہنچی وہ لہولہان ہو چکی تھی۔

گھر والے اسے اس حال میں دیکھ کر گھبرا گئے اور جلدی سے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔

مگر یہ کیا؟ ڈاکٹر ایک طرف دوائی لگاتا تو دوسری طرف سے خون رسنے لگتا، دوسری جگہ لگاتا تو تیسری جگہ سے......

ڈاکٹر خود گھبرا گیا اور اسے لے جانے کا کہا۔ وہ گھر آ گئے اور پھر اس کے بعد وہ سب ہونے لگا جس سے سب کی روح تک کانپ اٹھی تھی۔

اس واقعہ نے سب کو پریشان کر ڈالا تھا مگر اب نازیہ ہر وقت خوفزدہ رہنے لگی۔ رات کو سوتے وقت وہ بہت سی آوازیں سنتی اور اٹھ بیٹھتی۔

سورج غروب ہوتے ہی وہ اگر کہیں جا رہی ہوتی تو اچانک کہیں سے ایک بلی اس کے قدموں میں آ جاتی اور وہ خوب زور سے چلانے لگتی۔

کبھی کبھی تو وہ آہستہ سے چلنے لگتی، تھوڑی دور جا کر جب ہوش میں آتی تو اسے دھچکا لگتا کہ وہ کہاں آ گئی ہے۔

اس دوران عالیہ کی شادی طے ہو گئی تھی۔

شادی کا دن بھی آ گیا مگر نازیہ کو اس حالت میں دیکھ کر عالیہ سسک اٹھتی۔

وہ نازیہ جو ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتی کہ کسی کی شادی آئے اور وہ خوب دل لگا کر تیار ہو۔ مگر آج ایسا کچھ بھی نہ تھا، نازیہ اپنے گھر کے دھلے ہوئے سوٹ میں ملبوس پانی سے منہ دھوئے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ عالیہ کو دکھ ہوا، کیونکہ نازیہ اس کی چہیتی سہیلی تھی، عالیہ کا دل مسوس کر رہ گیا تھا۔

اور پھر جب ڈھول بجنے لگا تو نازیہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی، کمر میں دوپٹہ باندھ کر ناچنے لگی، اماں غصے سے اسے گھورنے لگی مگر آج اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

وہ اتنا ناچی اتنا ناچی کہ سب تالیاں پیٹتے پیٹتے تھک گئے مگر وہ نہ رکی۔

کافی دیر اور جب وہ تھک گئی تو دھپ سے زمین پر آ گری۔ اور جب وہ سیدھی ہوئی تو بہت سی خواتین کی چیخیں نکل گئیں اور کچھ بہت خوفزدہ ہو گئیں کیونکہ نازیہ کی آنکھیں حد سے زیادہ سرخ اور باہر کو ابلی پڑی تھیں۔

اچانک وہ زور زور سے ہنسنے لگی یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تو ایک عورت نے کہا۔

''لگتا ہے اس لڑکی پر کسی خطرناک سایہ کا اثر ہو گیا ہے۔''

یہ بات اماں کی جان نکال گئی تھی۔

اور پھر بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ اماں نے پیر بابا حسین شاہ کو بلایا۔ جب وہ تشریف لائے تو نازیہ کی پھر وہی حالت ہونے لگی۔ حسین شاہ کچھ دیر زیر لب کچھ پڑھتے رہے، جب نازیہ زمین پر ان کے قدموں میں آ گری تب وہ بولے۔ ''کون ہو تم؟''

''بابا...... میں جو بھی ہوں مگر میں اس لڑکی کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا مار ڈالوں گا ختم کر ڈالوں گا اسے۔''

وہ نازیہ بول رہی تھی مگر نہیں اس کے اندر سے کوئی اور بول رہا تھا جس کی آواز بہت بھاری اور کرخت تھی...... کوئی خطرناک سایہ۔

''اس معصوم بچی کو کیوں عذاب دیتے ہو بہت اذیت میں ہے یہ چھوڑ دو اسے......'' حسین شاہ گرجے۔

''معصوم...... ہا ہا ہا۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ ''یہ معصوم نہیں ہے بلکہ قاتل ہے قتل کیا ہے اس نے میرے بچے کو، کھجور کے درخت پر میرا بچہ کھجور توڑ رہا تھا کہ اس نے کلہاڑی سے وار کیا اور میرے بچے کو ختم کر ڈالا اور اب میں اسے ختم کر دوں گا۔'' کہتے کہتے ایک دم آواز بند ہو گئی، وہ سایہ حسین شاہ کے ہاتھ نہیں آ پایا تھا، وہ پریشان ہو کر چلے گئے۔

☆......☆......☆

کچھ دن سکون سے گزرے، اماں اور ابا حد سے

سے گھر سے نکلی اور کھیت میں اس کھجور کے درخت کے نیچے آ پہنچی جہاں گائے کا مردہ بچہ پڑا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ چونکی۔ مردہ بچے کے جسم سے گوشت نوچا جاچکا تھا۔ ''شاید چیل، کوے وغیرہ نے کیا ہوگا۔'' اس نے خود کو تسلی دی اور دکھ سے اسے دیکھنے لگی۔

''تبھی اسے ایک دلخراش چیخ سنائی دی تو وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''کون ہے؟'' اس نے تھوک نگل کر مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

اور پھر اسے ایک زوردار قہقہہ سنائی دیا۔ قہقہہ اتنا خوفناک اور ڈراؤنا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی مگر اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے پاؤں پکڑ لئے ہوں وہ اپنی جگہ پر جم سی گئی۔

اسے اماں کی بات یاد آئی۔ ''ایسی جگہوں پر خطرناک سائے ہوتے ہیں۔'' یہ بات یاد آنی ہی تھی کہ اس کے ماتھے سے پسینے پھوٹ پڑے۔ اس نے اپنی زبان پر قرآنی آیات کا ورد جاری کیا اور پوری رفتار سے واپس بھاگی۔ مگر وہ شیطانی قہقہہ اسے گھر تک سنائی دیتا رہا تھا۔

گھر آ کر وہ چارپائی پر گر سی گئی۔ دل اچھل کر حلق میں آنے کے لئے تیار تھا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ اس کے ساتھ ایسا کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

عالیہ سے اسے جمال کے آنے کی خبر ملی مگر وہ نہیں گئی۔ کچھ دیر بعد جمال خود وہاں آ گیا۔ مگر وہ بجھے دل کے ساتھ اس سے ملی اور زیادہ دیر وہ خاموش ہی رہی۔

یہ تبدیلی سب نے نوٹ کی تھی۔ مگر سب یہ سمجھے کہ وہ اس سے ناراض ہے مان جائے گی مگر کوئی یہ نہ جان پایا کہ سچ کیا ہے؟

ہمیشہ کی طرح اس بار نازیہ نے جمال کا گرم جوشی سے استقبال نہیں کیا اور یہ بات جمال کے ساتھ ساتھ نازیہ نے خود بھی اچھی طرح نوٹ کی تھی۔

☆......☆......☆

رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ نازیہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ اس نے اردگرد نظریں دوڑائیں، سب ہی نیند میں خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے، وہ تیز تیز سانس لینے لگی، وہ جانتی تھی کہ اس کی نیند رات میں ایک بار بھی نہیں ٹوٹتی تھی اور اب وہ جان گئی تھی کہ سوتے ہوئے اس نے کسی کو قہقہہ لگاتے سنا تھا اور یہ وہی قہقہہ تھا جو اس نے کھجور کے درخت کے پاس سنا تھا وہ پسینے سے شرابور ہوگئی۔ بے چینی اور کرب واذیت میں رات کٹی۔

اگلی صبح وہ جاگی تو رات کو پیش آنے والے واقعے کو بھول چکی تھی وہ سمجھی کہ وہ سب اس کا وہم تھا ایسا کچھ بھی نہیں مگر......

اس کی ماں کھیت میں گھاس کاٹنے گئی ہوئی تھی، نازیہ بھی اپنی ماں کے ساتھ تھی اور وہ گھاس کا گٹھر اٹھائے واپس آرہی تھی کہ سامنے سے آتی چیل پر اس کی نظر پڑی، چیل اڑتی ہوئی اس کی طرف آرہی تھی، قریب آکر اس نے اپنا منہ کھولا اور پھر اس کا منہ کھلتا ہی چلا گیا۔ اس کا منہ اس حد تک کھل چکا تھا جیسے وہ اس کو نگل لے گی۔ نازیہ خوفزدہ ہو کر دوقدم پیچھے ہٹی اور آیت الکرسی پڑھنے لگی۔

چیل غوں غوں کرتی ایک طرف اڑ گئی۔ وہ ماتھے پر سے پسینہ صاف کرتی مرے مرے قدموں سے گھر آ گئی۔

☆......☆......☆

پھر اتفاق سے یوں ہوا کہ نازیہ کو پھر اس کھجور کے درخت کے پاس جانے کی ضرورت پیش آئی۔

اماں کے کہنے پر اس کھجور کی چھڑیاں توڑ کے لے آئے۔ ''مجھے چٹائی بنی ہے۔'' وہ اپنے بھائی کے ساتھ آ گئی۔ اس کے بھائی کو اچانک کوئی کام یاد آیا اور وہ اس جگہ سے چلا گیا۔ بہت دیر بعد بھی وہ واپس نہ آیا تو نازیہ کو خود درخت پر چڑھنا پڑا۔

عالیہ اور وہ کھجور کھانے کے لئے کھجور کے درخت پر اکثر چڑھتی رہتی تھیں اس لئے وہ آرام سے درخت پر چڑھ گئی۔ اس نے چھوٹی کلہاڑی سے ایک چھڑی پر یکے بعد دیگرے وار کئے۔ وہ چھڑی کٹ کر نیچے گری اور ساتھ ہی کسی کی کرب ناک چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ نازیہ کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس کے ہاتھ پر خون کے چند

موت کا نقشہ

مدثر بخاری-شہر سلطان

اچانک نوجوان کا سر چکرانے لگا، وہ اپنے ہوش سے بیگانہ ہوگیا، آنکھوں تلے اندھیرا چھاگیا اور جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنی اصلیت بھول چکا تھا، وہ آگے بڑھا اور غراتے ہوئے اپنے قلبی رشتوں کو قتل کردیا۔

کرب واذیت سے دوچار ایک دل خراش، دل فگار، عبرت ناک اور سبق آموز کہانی

میرے ذہن میں جگنو سا چمکا اور ایک جھٹکا سا لگا۔ دوسرے ہی لمحے میرا خوابیدہ مدہوش دماغ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ دنیا کی حقیقتوں میں واپس لوٹ آیا۔ لیکن منظر خوفناک اور میرے دماغ کو جھنجھلا دینے کے لئے کافی تھا۔ مجھے جونہی ہوش آیا میں نے اپنے آپ کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پایا۔ جہاں گھٹن اور حبس تھی۔ میرا دل آنے والے خطروں کا سوچ کر دہل گیا۔

نجانے میں کتنے دن سے جیل میں تھا۔ کون لایا مجھے اس جگہ؟ اور کس جرم میں یہاں دھکیلا گیا تھا؟ حالانکہ واقعات کے اعتبار سے مجھے اس وقت کسی اسپتال کے بیڈ پر بمع ڈرپ کے ہونا چاہئے تھا میں کسی نرس کو اپنی حالت بتاتا۔ تھوڑی بہت کوشش کے بعد میری چھٹی ہوجاتی، مگر جیل میں قید، قیدی کو چھٹی اتنی آسانی سے ملنے والی تو نہ تھی......

کہ ایک اور حیرت انگیز بات یہ کہ جب میں نے ہوش پکڑا، میں نے جیل کے بند دروازے کی آہنی سلاخوں کو ہاتھوں سے جکڑ رکھا تھا اور مجھے ہلکا سا محسوس ہوا تھا کہ میں نے کچھ فضول بکواس بھی سامنے بیٹھے ہوئے محرر سے کی تھی...... الفاظ کی بازگشت تو سنائی نہ دی البتہ محرر نے مجھے جواب میں موٹی سی گالی ضرور دی تھی۔ یقیناً میں نے غائب الدماغی صورتحال میں محرر کو لغویات سے نوازا ہوگا۔

لیکن اچانک ہی میری دماغی حالت کا ٹھیک ہونا کسی معجزے سے کم نہ تھا...... ہوش میں آتے ہی میں نے اپنی ذات کا احتساب کرنا شروع کردیا......

میں اسپتال کے بجائے جیل کیوں لایا گیا؟ جس انداز میں، میں نے جیل کی سلاخوں کو پکڑ رکھا تھا اس کا مطلب تھا کہ میں دماغی طور پر غائب رہا، البتہ باقی تمام امور کسی نفسیاتی ذہنی مریض کی طرح انجام دیتا رہا......

یہ کیسے ممکن تھا؟...... میں نے ساری باتیں جھٹک کر جیل کی تاریک کوٹھری کا جائزہ لیا۔ وہ عجیب گندی سی جگہ تھی جہاں بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ ایک میلی سی چٹائی اور ایک داغدار تکیہ زمین پر پڑا تھا۔ ساتھ ہی جست کا ایک گلاس موجود تھا...... حالات اتنے گھمبیر ہوجائیں گے مجھے قطعی اندازہ نہ تھا۔ تقدیر کی خرابی کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ تقدیر کی کیفیت جانے کس لمحے بدل جائے اور جیتی بازی الٹی پڑ جائے۔ کون کیا جانے......

میں نے صورتحال جاننے کا فیصلہ کیا اور پھر بہتر انداز میں جیل کے دروازے کے قریب جاکر محرر کو آواز دی۔

''ایکسیوزمی سر......'' میں نے انتہائی شائستہ اور

زیادہ پریشان تھے، حسین شاہ نے کہا تھا کہ ”جب تک وہ ہیں تو وہ سایہ نازیہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

ایک رات نجانے رات کا کون سا پہر تھا کہ اماں کو کچھ محسوس ہوا تو اماں نے اٹھ کر نازیہ کو دیکھا۔ تو مارے ڈر کے اماں کی چیخ نکل گئی۔ نازیہ چارپائی سمیت دروازے کی طرف جارہی تھی۔ چارپائی زمین پر گھسیٹی نہیں جارہی تھی بلکہ ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی چارپائی کو اٹھائے لے جارہا ہے، اماں تیزی سے اس کے قریب آئی تھی اور آیت الکرسی پڑھنے لگی تو دھپ سے چارپائی زمین پر گری اور ٹوٹ گئی اور اس طرح اماں نے نازیہ کو بچالیا تھا۔ اب تو آئے دن کے طرح طرح کے دل دہلاتے اور اچنبھے میں ڈالتے واقعات نے سب کو جیسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ معصوم سی نازیہ پھولوں جیسی مرجھا کر رہ گئی تھی۔ اگر وہ ذرا بھی اکیلی ہوتی تو کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا تھا اور جب حسین شاہ آتے تو پھر کچھ دن سکون سے کٹ جاتے تھے۔

اس دن بھی نازیہ اپنے خیالوں میں گم بیٹھی تھی کہ اچانک آگ بھڑک اٹھی اور اس کے کپڑوں کو لگ گئی۔ وہ چلانے لگی اسی وقت حسین شاہ بھی آگئے، اور پھر انہوں نے قرآنی آیات پڑھ کر پھونک ماری تو آگ بجھ گئی اور زخم بھی غائب ہوگئے مگر کب تک؟

ایک رات وہ کچھ ہوگیا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔

اس دن حسین شاہ کہیں اور تشریف لے گئے تھے اور رات کے دوسرے پہر نازیہ کی حالت بگڑ گئی۔ ”اماں وہ آرہا ہے مجھے بچالو، مجھے مار ڈالے گا۔“ وہ چلانے لگی مگر کوئی کر بھی کیا سکتا تھا۔

وہ سایہ نازیہ کے قریب آیا اور نازیہ کی آنکھیں ابل پڑیں، اس کا دایاں ہاتھ دوسری طرف کو مڑ گیا اور پھر بائیں ہاتھ کا بھی یہی حشر ہوا تھا۔

کڑک، کڑک، کی آواز کے ساتھ نازیہ کے پاؤں اور پھر گردن بھی مڑ کر ایک طرف لڑھک گئی۔

ایک دردناک چیخ کمرے میں بلند ہوئی اور نازیہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ساکت ہوگئی۔

گھر والوں نے سایہ کے آگے بہت ہاتھ پیر جوڑے، روئے گڑگڑائے مگر بے سود، نازیہ پر موجود سائے کا کہنا تھا کہ اس نے بھی میرے بچے کو مار ڈالا، میرا بچہ بھی ہمیں بہت پیارا تھا اور لاڈلا تھا۔ بس خون کا بدلہ خون ہوگا۔“

اماں، ابا کو اپنی بیٹی کی بھری جوانی میں موت نے انہیں ہلا دیا تھا وہ ڈھے سے گئے۔ ان کی لاڈلی نازیہ ان کے سامنے تڑپتے ہوئے ان سے بہت دور جاچکی تھی۔

عالیہ شوہر کے ساتھ آئی تو وہ بھی دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ اس کی ہونے والی بھابھی اس کی چھوٹی بہن نازیہ اسے چھوڑ گئی تھی، جمال بھی جیسے پاگل سا ہوگیا تھا۔

آخر ”خطرناک سائے“ نے اپنا کام کردیا تھا۔

کاش کہ نازیہ اپنی ماں کی باتوں کو گرہ میں باندھ کر اس پر عمل کرتی تو اپنی جان سے نہ جاتی۔



گولی

ایک صاحب سینما گھر میں فلم دیکھ رہے تھے۔ جب کوئی دردناک سین آتا تو وہ دھاڑیں مار کر رونے لگتے۔ ساتھ ہی ایک ڈاکٹر بیٹھے تھے۔ تنگ آکر انہوں نے ان صاحب کو گولی دی اور کہا۔ اسے چوستے رہیں آپ بالکل نہیں روئیں گے۔ فلم کے اختتام تک وہ صاحب چپ چاپ بیٹھے فلم دیکھتے رہے۔ فلم ختم ہونے کے بعد ان صاحب نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

”براہ کرام مجھے اس گولی کا نام بتادیجئے تاکہ آئندہ بھی استعمال کرسکوں۔“

”ڈاکٹر صاحب بولے۔ ”یہ گولی نہیں میرے کوٹ کا بٹن تھا۔“

(سونیا بلال۔نواب شاہ)

وفادار بیوی کے ساتھ گزرا ہر لمحہ یاد آنے لگا تھا۔ میری بیوی آئزہ ایک وفادار اور محبت کرنے والی بیوی تھی۔

میری دو بیٹیاں علیزہ اور سامعہ ذہین اور میری لاڈلیاں، پاپا کے بغیر ایک منٹ بھی نہ رہ سکتی تھیں اور میرا بیٹا عدنان ...... پاپا کی جان...... اس کے پیدا ہونے سے گھر کی رونق بڑھ گئی تھی...... پررونق اور خوشگوار یادوں کا مسکن وہ گھر یوں اجڑ جائے گا...... میرا دل پھٹا جارہا تھا......

میں زمین پر گر گیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا...... پھر مجھے لگا جیسے شدت غم سے میرا دل پھٹنے لگا ہو۔ درد تھا جو بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔ میرا سینہ بند ہورہا تھا اور دماغ کسی اندھی تاریک کھائی میں گرتا چلا جارہا تھا...... اور میں بے ہوش ہونے لگا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا......

جب مجھے ہوش آیا تو خود کو اسپتال کے بیڈ پر پایا...... ڈرپ لگی تھی اور آئی سی یو کا منظر لگا...... میری ہارٹ بیٹ کا کمپیوٹرائزڈ ویو سامنے اسکرین پر چل رہا تھا۔ غالباً ای سی جی لنک تھا جو میری باڈی سے کنکٹ تھا......

مجھے جونہی ہوش آیا تو ایک نرس میری طرف بڑھی اور ہلکی سی مسکراہٹ سے بولی۔

''کیسا Feel کررہے ہیں سر؟......''

''I am ok......''

''کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ مجھے کیا ہوا تھا......؟''

''ہلکا سا ہارٹ اٹیک...... کسی صدمے کے تحت...... آپ کے دل پر اثر پڑا ہے......!'' نرس بولی۔

نرس نے ٹھیک کہا تھا صدمہ تھا ہی اتنا بڑا کہ دل پر اثر پڑنا ہی تھا......

''سر...... آپ کی حفاظت کے لئے دو پولیس مین آئی سی یو سے باہر موجود ہیں۔ کسی بھی چیز کی ضرورت پڑے آپ بزر بجا سکتے ہیں......!'' نرس بولی۔

''ok......''

پولیس والوں نے ہمدردی کا مظاہرہ کیا تھا اور مجھے کارڈیالوجی میں داخل کردیا تھا تاکہ میرا بہتر علاج ہوسکے...... گویا اس وقت میں سرکاری خرچ پر تھا...... چلو کچھ تو حاصل ہوا سرکار سے......! میرے اندر گھٹن اور بے چینی تھی، ضمیر پر بوجھ تھا اور کسی بہت بڑے گناہ کا کفارہ نکلتا یاد آرہا تھا قدرت کی طرف سے ڈھیل ملی تھی مگر پکڑ بھی زوردار ہوئی تھی......

میں نے اچانک کسی آدمی کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ سفید لباس میں ملبوس جانا پہچانا شخص تھا اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی سرخ کتاب......!

''کس حال میں ہو مسٹر؟......!''

''تم یہاں کیسے......؟''

''جیسے تم آئے ہو......!''

''وہ میرا ماسٹر تھا...... میں ایک سول انجینئر ہوں۔ کالونی گھر، پلازے اور مختلف رہائشی اسکیموں کے نقشے اور تعمیراتی کام کرتا ہوں۔''

جو شخص اندر داخل ہوا تھا اس شخص سے میری ملاقات ایک تعمیراتی منصوبے کے آخری مراحل میں ہوئی تھی۔ اس کا نام ناصر تھا۔ گورنمنٹ ملازم تھا اور میری شہرت کے چرچے سن کر میرے پاس آیا تھا۔

''میں نے الحمد ٹاؤن کے نئے زون میں اپنا گھر بنانا ہے۔ نقشے اور تعمیراتی کام سارا آپ خود کریں گے......!'' ناصر بولا۔ ''محترم...... ضرور...... لیکن یہ پروجیکٹ ختم ہوجائے گا۔ تو اگلا پروجیکٹ آپ کا ہوگا......''

''شکریہ...... ہم نے آپ کے کام کی تعریف سنی ہے۔ انٹرنیٹ پر آپ کا سارا تعمیراتی پروجیکٹس دیکھ کر اچھا لگا۔ امید ہے آپ ہمارے گھر کو بھی اعلیٰ معیار کے مطابق تیار کریں گے......''

''تعریف کے لئے شکریہ...... میری کوشش ہوگی کہ آپ کی امیدوں پر پورا اتروں...... نقشہ آپ کے مطابق تیار ہوگا۔ باقی ذمہ داری ہماری ہوگی......!'' میں نے کہا۔

''او کے...... انشاء اللہ اس کنسٹرکشن کے بعد آپ



پڑھے لکھے انداز میں محرر کو مخاطب کیا۔

جواب میں محرر کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔شاید وہ میرے نئے انداز سے متاثر ہوا تھا.....

''دوبارہ کہنا..... کس طرح بولا ہے.....!'' وہ میرا استہزا اڑانے لگا.....

''ایکسیوزی سر..... پلیز مجھے انفارم کریں کہ مجھے یہاں کب اور کس جرم میں لایا گیا ہے؟''

''کیا تم وہی شخص ہو جس نے چند لمحے پہلے مجھے گندی گندی گالیوں سے نوازا تھا، اور S.H.O صاحب کو تھپڑ مار دیا تھا..... یقین نہیں آتا۔'' وہ اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔

''آئی ایم ویری سوری سر..... میں حلفاً کہتا ہوں مجھے قطعی علم نہیں کہ میں نے آپ کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا ہے.....!''

''پھر تو تمہیں یہ بھی علم نہ ہوگا کہ چار معصوم لوگوں کا قتل کس نے کیا.....؟'' وہ عجیب طرح کی باتیں کر رہا تھا.....

''چار قتل..... اور وہ بھی مجھے علم نہیں..... کس کا قتل ہوا ہے مجھے بتائیں.....!''

''تم نے چار قتل کیئے ہیں اور وہ بھی اپنی بیوی بچوں کے.....!''

ایک دم سے زمین میرے قدموں تلے سے کھسکنے لگی، کیونکہ میری دنیا ہی اجڑ گئی تھی، اول تو مجھے علم نہ تھا کہ میرے بیوی بچوں کو کس نے قتل کیا تھا..... یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ ''میں نے نہیں کیئے قتل کوئی اپنی بیوی اور بچوں کو قتل کرتا ہے.....؟ سب بکواس ہے..... جھوٹ اور الزام ہے.....!'' میں روہانسی آواز میں بولا۔

''ایس ایچ او صاحب آ جائیں وہ خود ہی بتائیں گے کہ کس نے قتل کیئے ہیں.....!'' وہ برا سا منہ بنا کے اپنی کرسی پر جا بیٹھا.....

''میں کسی شکست زدہ شخص کی مانند اپنی اجڑی دنیا کے بارے میں سوچتا ہوا گندی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ آئزہ، علیزہ، سامعہ اور عدنان کے چہرے میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئے..... ہنستی بستی میری دنیا تباہ ہو گئی تھی..... میں خود کس طرح قتل کر سکتا تھا۔ اپنے بچوں کو۔

محرر نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا وہ کس حد تک درست تھا یا سچ تھا اس کے بارے میں کچھ حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اس وقت میرا دل شدت غم سے ڈوبتا جا رہا تھا۔ شدت غم سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ بچوں اور پیاری

بعد S.H.O میری بند کوٹھری میں آیا۔ وہ ایک نوجوان پڑھا لکھا کلین شیو افسر تھا۔ آنکھوں سے ذہین دکھائی دیتا تھا۔ وہ میرے قریب آکر سکون واطمینان سے بیٹھ گیا۔

''بیٹھ جاؤ......'' اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''جی......!'' میں نے زمین پر بیٹھنے میں عافیت سمجھی البتہ وہ موڑھے پر بیٹھا تھا۔

''تمہارا نام......؟''

''ارمغان......!''

''کیا کرتے ہو؟''

''سول انجینئر ہوں......!''

''کوئی پروف؟''

''میری ڈگریاں......؟ آپ ہائیر ایجوکیشن سے Verify کرا سکتے ہیں......!''

''افسوس! تم نے تعلیم سے بھی زندگی کو نہ سنوارا، اور اپنے ہی ہاتھوں سے چار زندگیوں کو لقمہ اجل بنا ڈالا......!'' وہ بولا۔

''میں حلفاً کہتا ہوں کہ میں نے کوئی قتل نہیں کیا......!''

فنگر رپورٹس اور جائے وقوعہ پر ملنے والے تمام شواہدات یہی ثابت کرتے ہیں کہ قتل ایک ہی خنجر سے کئے گئے ہیں......اور خنجر کے دستے پر ملنے والے انگلیوں کے نشانات تمہارے ہیں......!

''رائٹ سر......! قسمت اگر مجھے پھنسا رہی ہے تو قدرت کا ہی فیصلہ سمجھوں گا......حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے آج تک چیونٹی تک نہیں ماری......!''

''قتل کی تاریخ 19 جنوری رات 9 بجے......! تم کہاں تھے اس رات......؟''

''مجھے علم نہیں میں اس رات کہاں تھا......؟''

''شراب پیتے ہو؟''

''نہیں......!''

''تو پھر تم سیدھی طرح جواب دو کہ اس رات تم کہاں تھے؟''

''سر......میں 13 جنوری کی رات سے اپنے گھر سے 200 کلومیٹر دور ایک رہائشی کالونی کی کنسٹرکشن کا کام کرا رہا تھا کہ اچانک ہمارے کام کا بیلنس بگڑا اور تیسری منزل پر کام کرنے والے سارے مزدور بمعہ انجینئر زمین پر آ گرے، ان میں، میں بھی شامل تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہوا اور حیرت انگیز طور پر مجھے حوالات میں ہوش آیا......حالانکہ مجھے زخمی ہونا چاہئے تھا اور کسی اسپتال میں ہونا چاہئے تھا......''

''تم نے پولیس والوں کے ساتھ بدتمیزی کی تھی......کیا سب کچھ بھول گئے......؟''

''سر...... مجھے واقعی کچھ یاد نہیں'' میں انکساری سے بولا۔

''تم جتنی بھی ڈرامے بازی کرلو......سزا سے نہیں بچ سکتے۔'' اور ایس ایچ او چلا گیا......مگر مجھے ابھی تک تمام تر واقعات کی قطعی سمجھ نہ آ رہی تھی......

رات ہو چکی تھی اور جیل میں گہرا سکوت طاری تھا۔ میں نے تمام تر واقعات کا جائزہ لیا۔ لیکن عقل کے گھوڑے دوڑنے سے بھی حقائق سے پردہ چاک نہ ہوا......میں چٹائی پر لیٹ گیا اور خالی نظروں سے چھت کی طرف گھورنے لگا کہ اچانک مجھے سرخ کتاب کا خیال آیا...... میں نے ایک مرتبہ پھر سرخ کتاب کو کھولا......کتاب کھلی اور ایک خوب صورت بچے کی تصویر سامنے آ گئی اس تصویر کو میں نے اچانک کسی فلم کی طرح Move کرتے دیکھا۔

اچانک ایک کریہہ صورت شخص ہاتھ میں خنجر لئے اس بچے کی طرف بڑھتا ہے اور اگلے لمحے زوردار وار سے بچے کی گردن دھڑ سے جدا ہو جاتی ہے۔ اور خون کا فوارہ چھوٹ پڑتا ہے اور خون کی آبشار بڑی تیزی سے کتاب کے فرنٹ پیج سے سفر کرتی ہوئی میرے جسم پر پڑنے لگتی ہے۔ میرے کپڑے خون میں لت پت ہو جاتے ہیں۔ یہ سب آناً فاناً ہوا تھا۔

میں نے کتاب بند کر دی تھی۔ مگر کتاب کے صفحے پھڑپھڑائے اور خونی منظر ایک مرتبہ پھر چلنا شروع

سے رابطہ ہوگا......!''

وہ چلا گیا......! میں نے ناصر کے گھر کا نقشہ تیار کیا اور......!

اس وقت وہ میرے سرہانے کھڑا تھا۔ اس نے سرخ کتاب میرے سرہانے رکھی۔ اس کی آنکھوں میں غم تھا۔ سرخ آنکھوں نے مجھے ایک لمحے کو بہت کچھ یاد دلا دیا تھا......

''ناصر بھائی...... کیسے ہیں آپ؟......!''

''یہ کتاب پڑھ لینا...... اتنا بتادوں تم نے ظلم کیا ہے ہم پر......'' وہ کتاب میرے سرہانے رکھنے کے بعد باہر چلا گیا۔

وہ کتاب عجیب سی تھی میں نے اس کا پہلا صفحہ کھولا تو جیسے خون پھوٹ پڑا...... وہاں ایک عورت کی تصویر تھی جس کی گردن کٹ گئی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے کتاب سے خون اصل حالت میں جاری ہوگیا ہو۔ اگلے ہی لمحے کسی خونی آبشار کی طرح خون کی دھار کا رخ میری طرف بڑھنے لگا اور میرے سفید کپڑے خون میں لت پت ہوگئے۔

میں نے جھٹکے سے کتاب بند کردی تو جیسے خون بہنا بند ہوگیا...... بہتا خون رک گیا۔ البتہ فرش پر سرخ خون پانی کی طرح بہتا نظر آیا اور میرا جسم بھی خون سے لت پت نظر آیا...... میں نے بزل بجائی تو ایک نرس اندر داخل ہوئی......

''سسٹر...... ابھی ایک شخص سفید کپڑوں میں ملبوس اندر داخل ہوا تھا...... باہر موجود ڈیوٹی پر پولیس مین کیا کررہے تھے؟'' میں نے کہا۔

''لیکن سر...... ادھر تو کوئی شخص نہیں آیا۔ کیونکہ پچھلے دو گھنٹوں سے میں خود ڈیوٹی پر ہوں......!'' نرس بولی۔

''تو پھر یہ خون اور کتاب کہاں سے آئی......؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔

''سر...... آپ کو وہم ہے...... آپ کے پاس نہ تو کوئی کتاب ہے اور نہ ہی کہیں Blood......!'' وہ حیرت میں ڈال رہی تھی......

''دیکھو...... میں پہلے ہی پریشان ہوں...... مجھے مزید پریشان نہ کرو...... ابھی ایک شخص اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سرخ کتاب تھی......!''

''آپ Rest کریں سر...... ویسے آج شام آپ کو ڈسچارج کردیا جائے گا......!'' وہ بولی۔

نرس چلی گئی...... چند منٹوں بعد ڈاکٹرز بھی آگئے۔ ایک ڈاکٹر میری طرف آیا......

نوجوان...... کوئی صدمہ لیا ہے...... ڈپریشن موت کا دوسرا نام ہے...... جھٹکا لگا ہے مگر ہلکی نوعیت کا تھا...... خوش رہا کرو...... دوا ٹائم پر لینا......!'' وہ اچھا ڈاکٹر تھا۔

اسی شام مجھے ڈسچارج کردیا گیا...... اور مجھے پولیس کی گاڑی میں ڈال کر جیل لے جایا جارہا تھا......

سرخ کتاب میرے پاس تھی...... خون کا مجھ سے کیا تعلق تھا ناصر کسی کو نظر کیوں نہ آیا......؟ عجیب صورت حال تھی......

گاڑی شہر کے مضافات سے گزر رہی تھی...... مجھے ایک خیال آیا...... میں نے گاڑی میں موجود کانسٹیبل سے کہا......!

''کیا آپ احمد ٹاؤن کی طرف سے گزر کر چل سکتے ہیں۔''

جواباً کانسٹیبل نے مجھے گھور کر دیکھا۔

''ہم اپنی ڈیوٹی پوری کریں گے...... تمہارے نوکر نہیں ہیں۔ جو روٹ مقرر ہے ادھر سے ہی جائیں گے...... زیادہ چالاکی مت دکھاؤ......!''

''میرے بھائی کی Death ہوگئی ہے۔ ہمارا گھر اس طرف ہے...... میں صرف اپنے گھر کو دیکھ کر جیل کے لئے روانہ ہوجاؤں گا۔'' اصل میں، میں ناصر کا گھر دیکھنا چاہتا تھا اور وہاں سے کچھ معلومات اکٹھی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پولیس والوں نے میری ایک نہ سنی اور ایک مرتبہ پھر مجھے جیل کی بند کوٹھری میں لا پھینکا گیا......

ایس ایچ او تھانے میں موجود تھا۔ چند ہی لمحوں

"تم سچے ہو...... جو کچھ بھی کہہ رہے ہو۔ حرف بہ حرف سچ ہے مگر ابھی تک بہت سی باتیں تم سے مخفی ہیں......!"

"تو پھر بابا...... مجھے مشورہ دیں...... میں کیا کروں۔" میں نے پوچھا۔

"ایک دن کے لئے تمہیں اس جیل سے رہائی دلاسکتا ہوں، تم باہر جاکر بھیس بدل کر حالات کا جائزہ لو، لیکن تم واپس آؤ گے، اس شرط پر تمہیں رہائی ملے گی......!"

"اگر ایسا ہوجاتا ہے تو مجھے بہت سی معلومات مل سکتی ہیں...... میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں واپس لوٹ آؤں گا......!" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے، آج رات میں تمہیں ایک خفیہ راستے سے باہر تک چھوڑ آؤں گا، مگر خبردار جو کسی کو بتایا...... لیکن اگلی صبح سورج ڈوبنے سے پہلے واپس آجانا......!"

☆......☆......☆

میں اس رات جیل سے فرار ہوگیا تھا۔ وہ بھی صرف ایک دن کے لئے...... یہ میں نے بزرگ سے وعدہ کیا تھا...... سب سے پہلے میں نے قیدیوں والا لباس تبدیل کرکے لباس کو گٹھری بنا کر ایک درخت کے نیچے گڑھا کھود کر دفن کردیا۔ تاکہ وقت آنے تک دوبارہ پہن سکوں۔

رات بہت گہری ہوگئی تھی اور میں جنگل کے راستے مین روڈ پر پہنچا تھا۔ جہاں ایک بس پر سوار ہوکے میں اپنے شہر جا پہنچا...... میں سب سے پہلے اپنے گھر پر گیا...... وہاں ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ یہی وہ گھر تھا جہاں میں نے اپنے بچوں کے ساتھ زندگی کے یادگار دن گزارے تھے...... جہاں بچوں کی خوشیاں ہر دیوار، ہر کونے پر نظر آتی تھی۔ تصویروں کی صورت میں، تو کبھی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے گپ سپ کی صورت میں......

میں وہاں سے باہر نکل آیا...... میرا اگلا مشن ناصر سے ملنے کا تھا۔ مگر وہاں بھی مجھے مایوسی ہوئی اور کہانی کھل کر سامنے آگئی۔ مگر ابھی بھی مبہم حالت میں ناصر کا گھر تعمیر کے دو ماہ کے بعد زلزلے کے ہلکے سے جھٹکے سے زمین بوس ہوگیا تھا اور اس المناک حادثے میں ناصر سمیت اس کی بیوی اور بچے جاں بحق ہوگئے تھے...... یہ بات افسوسناک تھی۔ کہ ناصر بچوں سمیت مارا گیا تھا...... کچھ عرصہ قبل ہی میں نے ناصر کے گھر کا نقشہ تیار کیا تھا۔

وہ جدید نقشہ تھا جو اسے پسند آیا تھا۔ اور پھر میری ٹیم نے اس کا گھر چند ہفتوں میں مکمل کردیا تھا۔ لیکن تعمیر کے عرصہ بعد ہی چھت ہی نہیں بلکہ پورا گھر زمین بوس ہوگیا اور بدقسمتی سے گھر کے تمام لوگ ایک ہی چھت تلے موجود ہونے کے سبب مارے گئے......

میں ناکام ہوکر جیل لوٹ آیا...... اسی خفیہ راستے سے جو بابا نے مجھے دکھایا تھا...... میں سارے حالات بزرگ بابا کو بتائے تو انہوں نے کہا......

"بیٹا......! قدرت کے بہت سے فیصلے انسانی عقل سمجھ نہیں پاتی...... جہاں تک میری نگاہ دیکھتی ہے، تم نے اپنے بچوں کا قتل جان بوجھ کر نہیں کیا، تمہارے دماغ پر سیاہ پردہ تھا اور کسی غیر مرئی طاقت نے یہ کام کرایا لیکن یہ بات تم نے عدالت میں خود ثابت کرنی ہوگی......"

عدالت میں کیس داخل ہوا اور پھر میرے ساتھ انوکھے واقعات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سرخ کتاب نے خون اگلنا بند کردیا تھا البتہ کتاب سے قہقہے سنائی دیتے......

میری پہلی پیشی کے دوران سرخ کتاب سے Heat محسوس ہونے لگی اور اسی ہیٹ نے میرے جسم کو بری طرح جھلسا دیا تھا۔ اتنی تیز آگ جلی کہ میرے کپڑے جل گئے اور میں کمرہ عدالت میں ہی زمین پر لوٹ پوٹ ہوگیا......

میرے وکیل نے صرف اتنا ثابت کرنا تھا کہ قتل کے وقت میرا موکل ہوش میں نہیں تھا اور یہ کہ اسے دماغی

ہوگیا۔ یہ تیسرا خونی منظر تھا جو کسی خوب صورت بچی کا تھا۔ خنجر سے بچی کا سر جدا ہونے کی دیر تھی کہ کتاب سے ایک مرتبہ پھر خون جاری ہونے لگا۔ اب کی بار خون پوری کوٹھری میں پھیل گیا۔ خون بری تیزی سے پورے کمرے میں پھیلتا جارہا تھا...... ''یا اللہ میری مدد فرما......

یہ کیا ماجرہ ہے...... کیا راز ہے......؟'' میں نے سرخ کتاب کو جلدی سے اٹھایا اور جیل کی سلاخوں سے باہر پھینک دیا۔ مگر کتاب جس تیزی سے باہر گئی تھی اسی تیزی سے واپس پلٹی تھی۔ جیسے اسپرنگ لگا ہو...... البتہ کتاب سے خون بہنا بند ہوگیا تھا......!

پورے کمرے میں خون ہی خون تھا۔ عجیب سی سڑانڈ بھی تھی۔ جیسے کسی مردہ لاش سے بدبو اٹھی ہے۔ میں ایک کونے میں دبک کے بیٹھ گیا تھا...... لیکن پھر رات کے کسی لمحے مجھے نیند نے آدبوچا اور میں نیند کی وادیوں میں چلا گیا......

اگلی صبح منظر واضح تھا۔ نہ ہی کمرے میں بدبو تھی اور نہ ہی خون کا نام و نشان تھا۔ البتہ سرخ کتاب غائب تھی......

میں ابھی جاگا ہی تھا کہ دو کانسٹیبل آگئے......

''چل پتر...... ڈسٹرکٹ جیل کی تیاری کر...... وہاں بڑی جیل ہے......!

یوں میں ڈسٹرکٹ جیل منتقل ہوگیا۔ یہ بڑی جیل تھی۔ پندرہ پندرہ قیدی ایک ساتھ رہتے تھے۔ وہاں عجیب سے لوگ تھے۔ چھٹے ہوئے بدمعاش بھی اور زمانے کے لفنگے بھی...... کچھ چوری، کچھ نشے، جوئے کے جرم میں پڑے تھے مجھے بھی ایک بیرک میں ڈالا گیا...... اس بیرک میں کل 21 لوگ تھے...... چودہ نوجوان، 6 ادھیڑ عمر اور ایک سفید باریش بزرگ......!

پہلا ہی دن ہنگامہ خیز ثابت ہوا...... جیل کے کچھ قیدی معمولی نوعیت کی بات پر لڑ پڑے اور خوب خون خرابا ہوا، جیل انتظامیہ نے اس وقت نوٹس لیا جب دو نوجوانوں کا سر پھٹ چکا تھا، دونوں قیدیوں کو ٹریٹمنٹ کرائی گئی...... کچھ ہی دیر بعد معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

اطلاع

ایک شخص ہوٹل میں گیا اور بیرے کو کھانے کا آرڈر دیا۔ جب بیرا تعمیل کے لئے واپس جانے لگا تو اس شخص نے بیرے کو ایک پوسٹ کارڈ دیا۔ بیرا بولا۔

''صاحب! یہ پوسٹ کارڈ کس لئے؟''

وہ شخص بولا۔ ''اس لئے کہ اگر کسی وجہ سے تم کو کھانا لانے میں دیر ہوجائے تو براہ مہربانی اپنی خیریت کی اطلاع دے دینا۔''

(عمران۔ دیپالپور)

بزرگ بابا کا نام اسماعیل تھا اتفاق طور پر میری جگہ ان کے ساتھ تھی......

''قتل کے جرم میں آئے ہو......!'' بابا نے مجھ سے کہا۔

''جی بابا......!''

''تم نے قتل خود سے کئے ہیں...... یا کرائے گئے ہیں......؟''

''بابا...... مجھے علم ہی نہیں کہ میں نے قتل کئے ہیں!''

''تم نے چار نہیں...... آٹھ قتل کئے......؟''

''بابا کی بات مجھے سمجھ نہ آئی......!

''وقت کے ساتھ خود بخود جان جاؤ گے......!''

''لیکن بابا...... آپ کون ہیں؟ اور کیسے جانتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

یہ سوالات کرنے کی ضرورت نہیں بیٹا...... تم اپنی زندگی کو خود اپنے ہاتھوں سے تباہ کر بیٹھے ہو......'' وہ بولے۔

''لیکن بابا...... میرے بندے گواہ ہیں کہ میں کام کے دوران بے ہوش ہوگیا تھا۔

اس کے بعد مجھے قطعی علم نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہوا......'' میں نے بتایا۔

''کیا مطلب......؟''

''اس کی بھاری قیمت ملے گی تمہیں......!'' اس نے اپنا بریف کیس کھولا اور نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ میری طرف کھسکا دیا۔

''اتنا پیسہ پوری زندگی نہیں کما پاؤ گے...... بولو منظور ہے......!''

ایک لمحے کو نفس نے اندر کے لالچ کو انسانی ضمیر پر حاوی کر دیا اور میں نے سودا قبول کر لیا......

پھر میں نے ایسا نقشہ تیار کیا کہ دو ماہ کے اندر ہی ناصر چوہان کا گھر زمین بوس ہو گیا......

''بزرگ بابا نے میری کہانی سنی اور غصے کا اظہار کیا......

''یہ چار قتل تمہارے سر ہیں...... کیا تم جانتے ہو......اس کے بعد تمہارے ساتھ کیا ہوا؟''

''جی نہیں بابا...... مجھے اپنے ساتھ بیتے حالات کا قطعی کوئی علم نہیں......!''

''قدرت نے عجیب کھیل کھیلا ہے......تم ایک تعمیراتی حوالے سے مصروف تھے کہ تکنیکی خرابی کی وجہ سے تیسری منزل کا بیلنس خراب ہوا اور تم لوگ زمین پر آ گرے......اور بے ہوش ہو گئے......اس کے بعد کے حالات تمہیں سرخ کتاب بتائے گی......''

''کیا آپ اس سرخ کتاب کے متعلق جانتے ہیں؟''

''ہاں......!تم کتاب کھولو اور تفصیل جان لو؟......''

میں نے کتاب کھولی اور پھر منظر نظر آتے چلے گئے۔

میں نے خود سے دیکھا ایک عمارت پر کنسٹرکشن کا کام ہو رہا تھا کہ ایک کمزور سا انسان اچانک نمودار ہوا اور تیسری منزل پر جا پہنچا اور ہلکے سے Touch کرنے سے پورے ڈھانچے کو ہلا دیا......لوگ زمین پر گرنے لگے...... میں بھی زمین پر گرنے لگا تھا۔ اگلے لمحے میں زمین سے جا ٹکرایا اور بے ہوش ہو گیا تھا۔

تبھی میں نے دیکھا وہی شخص جس نے عمارت کو ہلا دیا تھا میری طرف بڑھا...... وہ ناصر تھا۔ جو غیض و غضب کی علامت بنا ہوا تھا۔

اس نے مجھے زوردار لات رسید کی...... جبکہ میں بے ہوش پڑا رہا...... ناصر نے مجھے دو تین لاتیں مزید رسید کیں اور دوسرے لمحے وہ غائب ہو گیا......

پھر میں نے غور سے دیکھا کہ وہ میرے جسم میں داخل ہو گیا تھا۔ کسی روح کی طرح...... میں نے پھر دیکھا مجھے ہوش آ رہا تھا۔ میں زمین سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میری حالت قابل رحم تھی۔ کیونکہ میری دماغی حالت بہت بری تھی۔ میری آنکھیں ہر قسم کی پہچان سے عاری تھیں...... میں سب سے پہلے ایک دکان پر گیا جہاں سے میں نے ایک تیز دھار خنجر خریدا اور پھر اپنے گھر آ گیا......

اگلے مناظر ناقابل بیان تھے۔ میں نے اس خنجر سے اپنی بیوی کو قتل کر دیا...... اپنے بیٹے عدنان کو قتل کیا...... جبکہ اپنی دونوں بیٹیوں کو بھی اسی تیز دھار خنجر سے قتل کر دیا......!

''ارمغان...... بات سیدھی سی ہے...... ناصر کی روح تمہارے جسم میں داخل ہو گئی...... اور سب کچھ تمہاری بے ہوشی میں ہو گیا......!'' بزرگ بابا بولے۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا...... ناصر کی روح نے مجھ سے اچھا انتقام لیا تھا......جس طرح میں نے اس کے بچوں کو اپنی چالاکی سے قتل کیا تھا۔ اس طرح اس نے مجھے پھنسایا تھا۔

عدالت نے مجھے پھانسی کی سزا دی۔ میں جیل میں ہوتا ہوں...... لیکن ہر روز پھانسی چڑھتا ہوں......

سرخ کتاب سے کبھی سانپ نکل آتے ہیں، تو کبھی بچھو کبھی آگ نکلتی ہے تو کبھی خون......!

روز جیتا ہوں، روز مرتا ہوں...... لالچ کی وجہ سے کتنی زندگیاں میرے ہاتھوں لقمۂ اجل بن گئیں۔

''کسی کا خوشحال اور ہنستا بستا گھر تباہ کرو گے تو تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔'' ہر روز یہ سرگوشی سنائی دیتی ہے۔



دورے پڑتے رہتے ہیں...... میں کمرہ عدالت میں زمین پر لیٹ گیا اور تین چار دفعہ زمین پر لوٹنیاں ماریں...... لوگ ہنسنے لگے تھے......

ساتھ ہی میں۔ ''بچاؤ...... بچاؤ...... آگ آگ۔'' کی آواز لگا رہا تھا......

''آرڈر...... آرڈر......!

جج نے ہتھوڑا بجایا...... کچھ لوگ میری طرف بڑھے اور سیدھا کرتے ہوئے Witness Box میں لے گئے......

جبکہ میرا وکیل جج سے مخاطب ہو کے بولا......

''مائی لارڈ......! میرے موکل کو اکثر دماغی دورے پڑتے ہیں۔ اس رات کو میرے موکل کو قطعی علم نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے...... 13! جنوری کی رات کو میرا موکل ہوش میں نہیں تھا۔ تبھی اس سے یہ قتل سرزد ہوا ہے......!''

اس دن پیشی کا وقت ختم ہوا...... میں جیل واپس آ گیا...... البتہ سرخ کتاب کو میں نے راستے میں ہی پھینک دیا تھا...... وہ عجیب کتاب تھی۔ جس سے نقصان زیادہ تھا اور فائدہ کم......!

لیکن اس رات جب میں نے تکیہ اٹھایا تو نیچے سرخ کتاب موجود تھی...... یہ آفت کی پڑیا میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔

''آپ کا گھر اعلیٰ معیار کا ہوگا، مسٹر ناصر......!''

میں نے ان کو نقشہ تھماتے ہوئے کہا......

''آپ مجھے نقشہ سمجھا سکتے ہیں......؟''

''ضرور......! دس مرلے کی اس زمین پر ہم شاندار محل تیار کر رہے ہیں۔ نیچے ایک ہال کمرہ، کچن، ایک بیڈ روم، دو سائیڈ روم، درمیان سے نکلتی ہوئی سیڑھیاں اوپر کے حصے میں بھی کچھ اسی طرح کا کام ہوگا......!''

''اوکے...... امید ہے آپ کا تیار کردہ نقشہ ہمیں ضرور پسند آئے گا......'' ناصر نے کہا تھا۔

میں نے نقشہ بنا کے کام شروع کر دیا تھا۔ اسی دوران مجھے ایک اجنبی کال موصول ہوئی......!

''ہیلو......!''

مسٹر ارمغان بات کر رہے ہیں......؟ دوسری طرف سے کہا گیا۔

''جی...... بالکل بات کر رہا ہوں......!''

''میں انوار شاہ بات کر رہا ہوں...... مجھ سے مل سکتے ہیں۔ ایک تعمیراتی سلسلے میں......!''

''آپ میرے آفس آ جائیں...... صبح 9 بجے سے دوپہر 1 بجے......!'' میں نے بتایا۔

''آپ شاید مجھے نہیں جانتے...... اس شہر کا امیر ترین آدمی بات کر رہا ہوں......!'' لہجہ مغرور اور انداز دھمکی نما تھا......

''میرے پاس سارے امیر لوگ چل کے آتے ہیں...... آپ بھی تشریف لے آئیں......!'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے......!Address؟''

میں نے آفس کا پتہ بتا دیا۔

اگلے دن ایک لمبی گاڑی میرے آفس کے سامنے رکی اور ایک ادھیڑ عمر شخص میرے آفس میں داخل ہو گیا۔

''تشریف رکھیں سر......!'' میں مصافحہ کے بعد بولا۔

تم آج کل ایک گھر کا نقشہ تیار کر رہے ہو......!''

وہ شخص بولا۔ اس کے بولنے کا انداز بدمعاشوں جیسا تھا۔

''جی نقشہ تیار ہو گیا ہے۔ تعمیر کا کام جاری ہے......!''

''اس پارٹی کا نام بتاؤ گے؟''

''ناصر چوہان!''

''ایک ڈیل کرنی ہے......!''

''کیسی ڈیل......؟''

''ناصر چوہان کا گھر کچھ اس طرح تیار کرو کہ بہت جلد اس کا گھر زمین بوس ہو جائے......!''

تھی وہ اپنی بیوی رضیہ کے ساتھ ہنسی خوشی اپنی زندگی بسر کررہا تھا۔ شعیب کی بیوی رضیہ بہت ہوشیار اور چالاک قسم کی عورت تھی۔ شعیب اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا تھا وہ بیماری کی وجہ سے کوئی بھاری کام تو نہیں کرسکتا تھا لیکن رضیہ نے شعیب کو پاپڑ بیچنے پر لگادیا تھا رضیہ بیسن کے پاپڑ بنا کر شعیب کو دیتی تھی جو کہ ان پاپڑوں کو بیچ کر اپنا اور اپنی بیوی کا پیٹ بھرتا تھا وہ دونوں اپنی زندگی بہت ہنسی خوشی گزار رہے تھے۔

شعیب کو بچوں سے بہت پیار تھا مگر اس کے گھر کا آنگن بالکل سونا پڑا ہوا تھا۔

شعیب نے وہ تصویر جا کر اپنی بیوی رضیہ کو دکھائی تو رضیہ نے کہا۔ ''یہ تو مجھے پرانے زمانے کی تصویر لگتی ہے اور یہ ہے کتنی پیاری اگر ہم اسے کسی اچھے مصور کو دیں گے تو شاید ہمیں اچھی رقم مل جائے۔''

شعیب نے کہا۔ ''ارے پاگل ہوگیا، کیا پتہ یہ کس کی ہے؟ میں محلے والوں سے پوچھ کر آتا ہوں۔''

شعیب اپنے پڑوسی جمال احمد کے گھر گیا وہ اپنے تین بچوں کے ساتھ رہتے تھے جمال احمد کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ بیوی کا انتقال ہوچکا تھا شعیب نے جمال احمد سے پوچھا۔ ''جمال صاحب کیا یہ تصویر آپ کی ہے؟''

جمال نے کہا۔ ''ذرا دکھاؤ تو یہ کیسی تصویر ہے؟''

شعیب نے اس تصویر کو کھولا اور بولا۔ ''یہ دیکھو۔''

جمال نے تصویر کو بڑے غور سے دیکھا پھر کہا۔ ''یہ تو کسی پرانے زمانے کی تصویر لگتی ہے۔ یہاں تو یہ کسی کی نہیں ہوگی۔ تم اسے اپنے پاس ہی رکھو۔''

شعیب نے کہا۔ ''ٹھیک ہے مگر میں پہلے باقی لوگوں سے پوچھ لوں۔''

شعیب وہ تصویر لے کر گھر آگیا۔

رضیہ نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

شعیب نے کہا۔ ''یہ تصویر کسی کی نہیں ہے میں نے سب سے پوچھ لیا۔''

رضیہ نے وہ تصویر لے کر صحن میں لگادی اور بولی۔ ''کل آپ اسے کسی مصور کے پاس شہر لے جائیں مجھے امید ہے کہ اچھی خاصی رقم مل جائے گی۔

☆......☆......☆

پوری کائنات سیاہ چادر میں لپٹی پڑی تھی چاند بادلوں کی اوٹ سے بار بار جھانک رہا تھا ہر سو پھیلا سناٹا رضیہ کو بار بار کسی آندھی کا خوف دلا رہا تھا۔ رضیہ بغیر آنکھیں جھپکائے چاند کو چھپتا اور نکلتا ہوا دیکھ رہی تھی، نیند کا کہیں نام ونشان نہیں تھا، ادھر دوسری چارپائی پر شعیب دنیا مافیہا سے بے خبر نیند کی وادی میں کھویا پڑا تھا کہ اچانک کچن سے کھٹ کھٹ کی آواز آئی، آواز کو سنتے ہی رضیہ اٹھ کر بیٹھ گئی پھر اس نے ادھر ادھر کا جائزہ لیا مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا رضیہ سوچنے لگی۔ ''شاید بلی ہوگی۔'' اور وہ پھر سے لیٹ گئی اور چاند کو تکنے لگ گئی۔

پھر وہی کھٹ کھٹ کی آواز مگر اس بار آواز بہت تیز تھی رضیہ نے لیٹے لیٹے ادھر ادھر دیکھا اچانک اس کی نظر اسی تصویر پر پڑی جو چھت پر تھی رضیہ نے دیکھا وہ لڑکی تصویر میں حرکت کررہی تھی رضیہ کا دل دل اچھل کر حلق میں آگیا وہ جلدی سے اٹھ کر شعیب کے پاس آئی اور اسے اٹھایا۔

شعیب نے کہا۔ ''کیا ہے اتنی رات کو کیوں اٹھادیا۔''

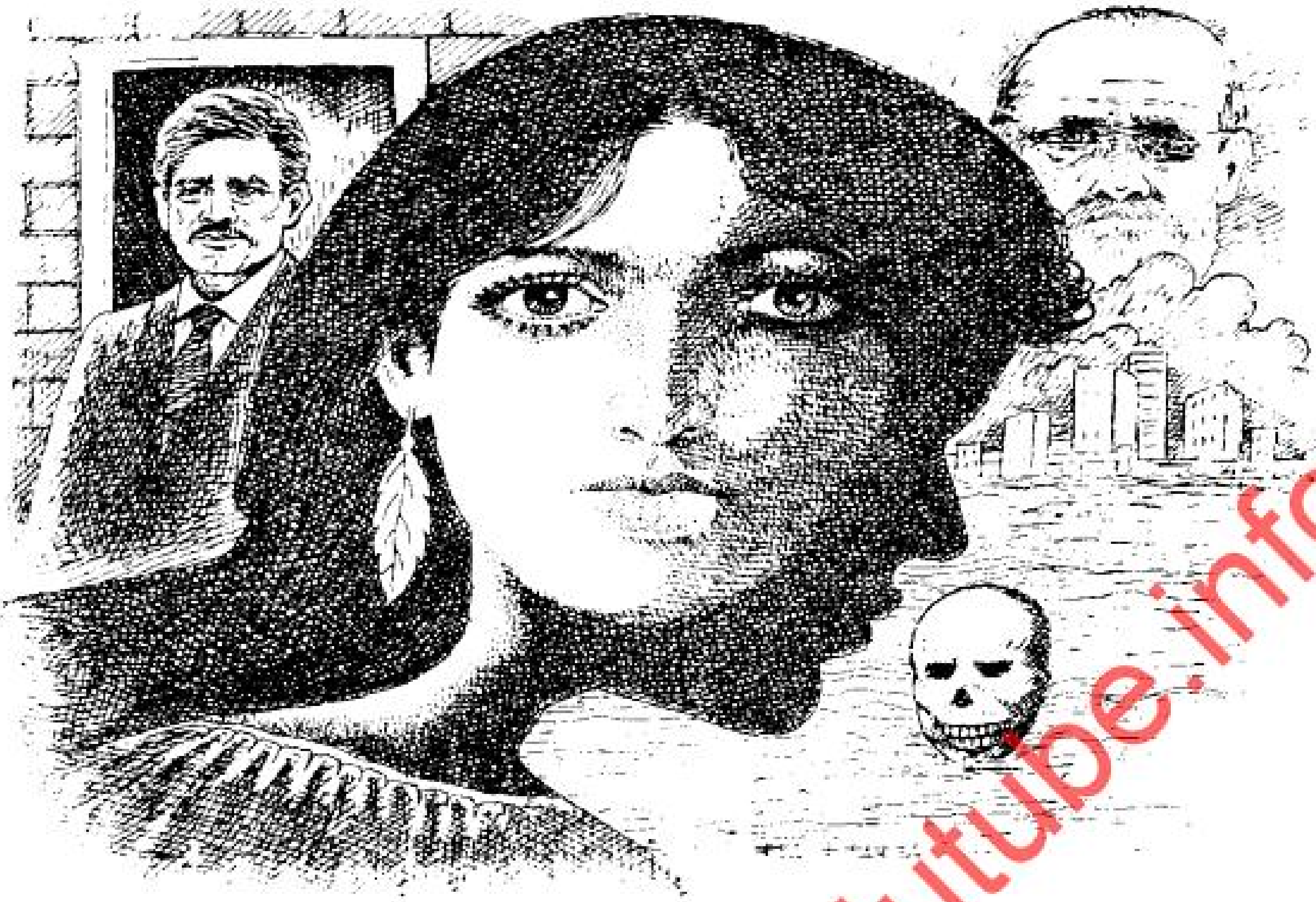
رضیہ بولی۔ ''وہ دیکھیے...... تصویر میں موجود لڑکی حرکت کررہی ہے۔''

شعیب نے اس تصویر کو دیکھا پھر کہا۔ ''ارے پگلی غور سے دیکھو وہ ویسی ہی ہے جیسے پہلے تھی۔''

رضیہ نے دیکھا تو حیران رہ گئی شعیب نے کہا۔ ''تم نے ضرور کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہوگا۔''

رضیہ بولی۔ ''نہیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ ایسے حرکت کررہی تھی جیسے وہ کوئی تصویر نہ ہو بلکہ حقیقت ہو۔

شعیب نے کہا۔ ''بھئی سو جاؤ۔''



قاتل تصویر

کنول فیاض۔ کراچی

کینوس پر موجود خوبرو حسینہ کی تصویر میں اچانک حرکت پیدا ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے حسینہ تصویر میں سے مجسم نکل کر باہر آگئی اور اس کی آنکھوں سے سرخ شعلے نکلنے لگے کہ اچانک......

صدیوں پرانی ایک روح کی لرزہ خیر روداد جو کہ پڑھنے والوں کو دہشت میں مبتلا کردے گی

''اجی ذرا دیکھو تو چھت پر کہیں پرندے پاپڑ نہ خراب کردیں۔'' شعیب جو کہ اپنی بیوی کی ساری عادتوں سے واقف تھا جھٹ سے اٹھ کر چھت پر چلا گیا۔

چھت پر پہنچ کر شعیب نے پرندوں کو اڑایا جو کہ پاپڑوں کو خراب کرنے کے چکر میں لگے پڑے تھے۔ شعیب جانے کے لئے پلٹا ہی تھا کہ اس کی نظر ایک چادر پر پڑی تو اس نے آگے بڑھ کر چادر اٹھائی مگر وہ چادر نہیں تھی وہ تو ایک جائے نماز کے برابر کینوس پر بنی ہوئی ایک خوبصورت سی دلہن کی تصویر تھی جو کہ بڑی خوبصورتی سے کسی مصور نے بنائی تھی۔

شعیب نے کہا۔ ''ایسی تصویر تو محلے میں کسی کے گھر میں نہیں ہوگی پھر یہ یہاں کیسے آئی؟''

شعیب چالیس سالہ شخص تھا اس کی کوئی اولاد نہ

شبنم نے بولی۔ ''مجھے خود نہیں پتا یہ سب کیا ہو رہا ہے مگر تم ڈرو نہیں ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔'' تبسم نے دیکھا تو وہاں وہی تصویر والی لڑکی کھڑی تھی۔

صبح بڑی روشن روشن تھی اور جمال احمد بڑے خوش تھے کیونکہ شبنم کا نکاح تھا اور بارات آنے والی تھی جمال احمد بڑی تیزی سے کام کو نمٹانے میں لگے ہوئے تھے اور کبیر بھی اپنے باپ کے ساتھ پیش پیش تھا۔

جمال احمد نے کبیر سے کہا۔ ''بیٹا جاؤ جا کر شبنم آپی اور تبسم کو بلا لاؤ۔''

کبیر نے تبسم کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر اندر سے کوئی آواز نہ آئی کبیر نے دوبارہ دستک دی مگر اس بار بھی کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ پھر کبیر نے دھکا دیا تو دروازہ کھل گیا، وہ اندر گیا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کبیر چیختا چلاتا جمال احمد کے پاس گیا اور کہا۔

''پا...... پپ...... پاپا، وہ...... وہ...... وہ، وہ...... شب...... شبنم...... آپی''

جمال احمد بولے۔ ''بیٹا کیا ہوا؟''

کبیر بولا۔ ''پاپا آپ خود جا کر دیکھ لو۔''

جمال احمد تھرتھراتے قدموں سے تیز تیز چلتے ہوئے تبسم کے کمرے میں داخل ہوئے تھے کہ ان کے قدموں کے نیچے سے زمین نکل گئی انہوں نے دیکھا کہ شبنم اور تبسم کے سر الگ اور جسم کے باقی حصے الگ پڑے ہوئے تھے۔

☆......☆......☆

آج نئے سال کا پہلا دن تھا کبیر کے دوست علی نے اس سے تحفہ مانگا کیونکہ آج علی کی سالگرہ بھی تھی۔

کبیر نے سوچا کیوں نا میں لڑکی کی پینٹنگ والی تصویر علی کو دے دوں جس سے علی بھی خوش ہو جائے گا اور ویسے بھی علی کو ایسی تجی رچی اور پرانی چیزیں پسند ہیں۔

اگلے روز کبیر نے علی کو اس لڑکی کی تصویر پردے دی جسے دیکھ کر علی بہت خوش ہوا۔ علی نے وہ تصویر اپنے روم میں لگا دی۔

علی اپنے گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور لاڈلا بھی بہت تھا۔ اس کی تین بہنیں تھیں جو کہ اس سے بڑی تھیں علی کے والد بزنس مین تھے اور والدہ نے شوقیاں طور پر بیوٹی پارلر کھول رکھا تھا جس میں وہ محلے کی بچیوں کا پارلر کا کورس کرواتی تھیں۔

رات کافی گہری ہو چکی تھی چاند اپنی چاندنی میں ڈوبا ہوا تھا پورے شہر پر تنہائی راج کر رہی تھی کہ پھر تنہائی کو چیرتی ہوئی پائل کی آواز آنے لگی۔ علی ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ علی نے دیکھا اس لڑکی کی تصویر میں سے مدھم مدھم سی روشنی نکل رہی ہے۔

علی نے خود سے کہا۔ ''مجھے ان چیزوں سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ میں ابھی دیکھتا ہوں کہ یہ روشنی کیوں نکل رہی ہے۔''

علی نے تصویر کے پاس پہنچ کر اس روشنی کی طرف دھیرے دھیرے اور ڈرتے دل کے ساتھ ہاتھ بڑھانا شروع کیا۔ پھر اچانک سے اس تصویر والی لڑکی میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے اپنے ہاتھ کو علی کے دل کے اوپر رکھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے علی بے ہوش ہو گیا، اس لڑکی نے علی کا سینہ چاک کر کے علی کا دل نکال لیا۔

صبح کا سورج اپنے پورے آب و تاب چمک رہا تھا شائستہ بیگم (علی کی امی) علی کے لئے ناشتہ بنانے میں مصروف تھیں۔

کریم صاحب علی کے والد نے شائستہ سے کہا۔ ''ارے شائستہ آج خاص ناشتہ کس کے لئے بنا رہی ہو۔''

شائستہ بیگم نے کہا۔ ''اپنے بیٹے علی کے لئے۔''

کریم صاحب نے کہا۔ ''کیوں؟ آج کچھ خاص بات ہے کیا؟''

شائستہ بیگم نے کہا۔ ''آج میں علی سے رشتے کی بات کروں گی۔ اسلم صاحب کی بیٹی عالیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔''

کریم صاحب نے کہا۔ ''ابھی تو ہمارا علی

رضیہ بولی۔ ''اگر میں مرگئی تو پھر آپ کیا کریں گے؟''

شعیب نے رضیہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا پاگلوں جیسی باتیں کررہی ہو جو ہوگا سو صبح دیکھا جائے گا۔ اب سو جاؤ۔''

رضیہ اپنی چارپائی پر جا کر سوگئی۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ رضیہ کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا وہی تصویر والی لڑکی اس کی چارپائی کے پاس کھڑی تھی اور وہ بہت غصے میں تھی۔

صبح کا سورج کرنیں بکھیرے کھڑا تھا۔ شعیب کی آنکھ کھلی تو اس نے رضیہ سے کہا۔ ''رضیہ چل اٹھ جلدی کرناشتہ بنا مجھے بھوک لگی ہے۔''

مگر رضیہ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلی۔

شعیب نے پھر کہا مگر اس بار بھی رضیہ جوں کی توں رہی جب بار بار اٹھانے پر بھی رضیہ نہ اٹھی تو شعیب خود اٹھ کر رضیہ کی چارپائی کے پاس آگیا اور اس نے رضیہ کے اوپر سے کمبل اتارا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اس نے دیکھا رضیہ خون میں لت پت پڑی ہے۔

شعیب نے چیخنا چلانا شروع کردیا۔

شعیب کی آواز سن کر سارے پاس پڑوس اور محلے والے جمع ہوگئے پڑوسی جمال احمد نے جب رضیہ کی خون میں لت پت لاش دیکھی تو حیران رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد سارے محلے والے شعیب کے گھر میں تھے۔ جمال احمد نے شعیب سے پوچھا۔ ''یہ سب کیسے ہوا؟''

شعیب نے روتے ہوئے بتایا۔ ''آدھی رات کو رضیہ نے مجھے بتایا کہ وہ تصویر والی لڑکی اسے ماردے گی کیونکہ اسے ایسا لگا کہ وہ تصویر والی لڑکی حرکت کررہی ہے۔''

''مگر ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' ایک نے کہا۔

شعیب نے کہا۔ ''مگر ایسا ہوا ہے، تم اس تصویر کو یہاں سے لے جاؤ۔''

جمال احمد نے اپنے بیٹے کبیر سے کہا۔ ''اس تصویر کو یہاں سے لے جاؤ اور محلے کی کچھ عورتوں سے کہو وہ آکر رضیہ آپا کو غسل دیں اور کفن پہنائیں۔''

☆......☆......☆

نئے سال میں دو ہفتے رہ گئے تھے اور کبیر سب کے لئے نیو ائر کارڈ بنا رہا تھا اور ہر سال اپنے دوستوں اور اپنی بہنوں کو تحفے دیا کرتا تھا اور ساتھ میں اپنے بنائے ہوئے کارڈ بھی دیا کرتا تھا۔

تبسم اپنے کمرے میں لگی اس لڑکی کی تصویر کو دیکھے جارہی تھی تبسم کو اس کا لباس بہت پسند آیا تھا اتنے میں شبنم نے تبسم سے کہا۔ ''ہیلو میڈم کہاں کھوئی ہو؟''

تبسم بولی۔ ''آپی دیکھو ناں اس لڑکی کا لباس کتنا پیارا ہے۔''

شبنم نے کہا۔ ''ارے اب اتنا بھی خوبصورت نہیں ہے صرف موتیوں والا گھاگھرا چولی ہی تو ہے۔ چل بس، اب بہت ہوچکا، سوجا رات آدھی ہوگئی ہے۔''

تبسم نے کہا۔ ''آپی آج رات آپ میرے پاس ہی سوجائیں، ویسے بھی چند دنوں بعد تو آپ کی شادی ہوجائے گی۔''

شبنم نے کہا۔ ''چل ٹھیک ہے۔''

شبنم اور تبسم دونوں بیڈ پر سوگئیں رات کے دو یا تین بجے کے قریب تبسم کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا لائٹ کبھی جل رہی ہے تو کبھی بند ہوجاتی ہے۔ تبسم نے شبنم کو جگایا اور بولی۔ ''آپی بلب کو دیکھو۔''

شبنم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تبسم نے کہا۔ ''آپی ایسا کیوں ہورہا ہے؟''

شبنم بولی۔ ''مجھے لگتا ہے بٹن شارٹ ہوگیا ہے تم سوجاؤ۔''

تبسم لیٹی ہی تھی کہ اچانک بیڈ ہلنا شروع ہوگیا۔

تبسم نے کہا۔

''آپی یہ کیا ہورہا ہے۔''

بیٹیوں کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائیں گے۔''
سلیم نے کہا۔''ہاں کیوں نہیں۔''
رابعہ نے کہا۔''کاش !ہمارا کوئی بیٹا بھی ہوتا۔''
سلیم نے کہا۔
چھوڑو ان باتوں کو، چلو کام پر دھیان دو پتہ ہے آج رات 12 بجے ہمیں بچیوں کو وش بھی کرنا ہے۔''
رات گیارہ بجے کے قریب روبینہ کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا تصویر والی لڑکی اس تصویر میں نہیں ہے وہ تصویر بالکل سفید کپڑے کی طرح لگ رہی تھی۔
روبینہ نے فوزیہ کو اٹھایا اور اسے یہ منظر دکھایا۔
روبینہ جو کہ فوزیہ سے بہادر اور ہوشیار تھی اس نے کہا۔''چلو ہم اس تصویر کے پاس جا کر دیکھتے ہیں۔''
اور اٹھ کر وہ تصویر کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی اس کے ساتھ فوزیہ بھی کھڑی ہوگئی اور بغور اس تصویر کا جائزہ لینے لگی۔
ادھر رابعہ نے سلیم سے کہا۔''چلو جی غبارے اٹھالو بارہ بج چکے ہیں۔
سلیم نے کہا۔''ہاں چلو۔''
رابعہ نے کمرے کا دروازے کھولا تو اندر کوئی بھی نہیں تھا۔
رابعہ نے کہا۔''یہ دونوں بچیاں کہاں گئیں۔''
سلیم نے کہا۔''ہمیں پریشان کرنے کے لئے یہیں کہیں چھپ گئی ہوں گی چلو ڈھونڈتے ہیں۔''
رابعہ نے کہا۔''سلیم بچیاں کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی ہیں۔''
سلیم نے کہا۔''تم پریشان نہ ہو، میں دیکھتا ہوں۔''
تھوڑی دیر بعد ایک نوکر نے جواب دیا، جناب ہم نے پورے گھر میں دیکھ لیا مگر بچیوں کا نام و نشان نہیں ہے۔''
رابعہ نے روتے ہوئے کہاں۔''سلیم کچھ کیجیے مجھے میری بچیاں واپس چاہئے کسی بھی صورت میں، کہیں سے بھی مجھے میری بچیاں لاکر دیجیے۔''
سلیم نے کہا۔''ارے تم پریشان مت ہو۔ میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔''
تھوڑی دیر میں پولیس سلیم کے گھر میں آگئی۔
سلیم نے انہیں ساری حقیقت سے آگاہ کردیا پولیس انسپکٹر نے کہا۔''آپ پریشان نہ ہوں، کل صبح تک آپ کی بیٹیاں مل جائیں گی ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کریں گے۔''
اگلی صبح پولیس دو الگ الگ بند کالے شاپر میں کوئی چیز لائی۔
سلیم نے کہا۔''انسپکٹر صاحب یہ کیا ہے؟''
پولیس انسپکٹر نے کہا۔''جی! یہ آپ کی دونوں بیٹیوں کے دھڑ سے الگ کئے ہوئے سر ہیں۔''
سلیم نے کہا۔''انسپکٹر صاحب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے۔''
پولیس انسپکٹر نے کہا۔''دیکھیے ہم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ دھڑ بھی مل جائے مگر......''
سلیم نے کہا۔''مگر کیا اس مگر کا آخر کیا مطلب ہے؟''
بہرحال پولیس انسپکٹر نے تفصیل بتائی اور بولا۔''اب ہم چلتے ہیں۔''
تھوڑی دیر بعد محلے کی مسجد کے پیش امام صاحب آگئے۔
اور پیش امام صاحب نے پورے گھر کا جائزہ لینے کے بعد پریشانی کے عالم میں سلیم سے کہا۔''وہ تمہیں بھی مار ڈالے گی اور تمہاری بیوی کو بھی مار ڈالے گی۔ جس طرح اس نے تمہاری دونوں بیٹیوں کو مارا ہے۔ تم اس تصویر کو جھیل یا دریا میں پھینک کر آجاؤ۔''
سلیم نے کہا۔''مگر کیسے؟''
پیش امام صاحب نے کہا۔''وہ جو تصویر تمہاری بیٹیوں کے کمرے میں لگی ہے اس لڑکی کی، اسے پھینک آؤ، جاؤ جلدی سورج ڈوبنے سے پہلے۔''
ابھی شام کے چار بجے تھے اور سلیم اس تصویر کو دور کسی جھیل میں پھینک آیا تھا۔

☆......☆......☆

صرف 18 سال کا ہے۔"

شائستہ بیگم نے کہا۔ "اب آصف کی شادی ہوچکی ہے اور اس کے دو بیٹے بھی ہیں۔ آمنہ اور صدف کا نکاح ہوچکا ہے اگلے مہینے ان کی بارات ہے۔ ان کی طرف سے تو کوئی بھی پریشانی نہیں ہے۔ رہی بات علی کی تو میں آج کسی طرح علی کو منالوں گی۔ آپ بیٹھیں، میں علی کو جگا کر آتی ہوں۔"

شائستہ بیگم علی کے کمرے میں جیسے ہی داخل ہوئیں تو ان کی چیخ نکل گئی۔

شائستہ بیگم کی چیخ سن کر کریم اور ان کی دونوں بیٹیاں بھاگ کر علی کے کمرے میں گئیں تو وہاں انہوں نے جو منظر دیکھا تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور دل مسوس کر رہ گیا۔

علی زمین پر پڑا ہوا تھا اور اس کا سینہ چاک تھا۔ زمین پر پڑا خون پوری طرح سے جم چکا تھا۔

شائستہ بیگم علی کی حالت دیکھ کر بے ہوش ہوچکی تھیں۔

تھوڑی دیر میں سب محلے والے اور رشتہ دار شائستہ بیگم کے شاندار بنگلے میں موجود تھے آمنہ اور صدف کا رو رو کر برا حال تھا کریم صاحب کو بھی ان کے رشتہ دار حوصلہ دے رہے تھے شائستہ بیگم کو ڈاکٹر چیک کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر کریم صاحب کے پاس گئی اور بولی۔ "آئی ایم سوسوری! آپ نے مجھے بلانے میں بہت دیر کردی۔"

یہ سننا تھا کہ کریم صاحب کے گھر میں کہرام مچ گیا۔ کریم صاحب کا پورا گھر ماتم کدہ بن چکا تھا۔

☆......☆......☆

سلیم کی جڑواں دو بیٹیاں تھیں۔ سلیم کی بیوی بھی سلیم کی طرح بہت چالاک تھی۔

سلیم کی دو جڑواں بیٹیاں روبینہ اور فوزیہ کی سالگرہ تھی۔ سارے نوکر چاکر تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ سلیم بھی پیسوں کے حساب کتاب میں لگا ہوا تھا۔

سلیم کی بیوی (رابعہ) نے کہا۔ "اس بار ہم اپنی

کالا نمک......!

☆ اس ملک میں تنقید کرنے والے ریڈی میڈ ملتے ہیں۔

☆ دفاتر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جہاں ڈیوٹی اہم ہے۔ دوسرے وہ جہاں بیوٹی اہم ہے۔

☆ کیا شوہر اپنی بیوی کی ڈاک کھول سکتا ہے؟ امریکہ کی ایک عدالت نے اسے حق دے دیا مگر ہمت نہیں دی۔

☆ جسے کام نہیں ہوتا، اسے زکام ہوتا ہے۔

☆ بیوی میرے لئے زیورات کا ایک سیٹ قسطوں پر خرید دو، اس سے دو فائدے ہوں گے۔ میں زیادہ دل کش ہوجاؤں گی اور تم فکر کے باعث دبلے ہوجاؤ گے۔

☆ اب میری بیوی کے پاس دس بچے ہیں اور ایک بیکار شوہر۔

☆ ایک گدھے پر سونا لادو۔ شہر کے چورا ہے پر لوگ اس کے لئے آنکھیں بچھائیں گے۔

☆ زن دو حرفی لفظ ہے، مرد سہ حرفی، شادی چار حرفی، اولاد پانچ حرفی، فطرت تمہیں ترقی کے راستے پر دیکھنا چاہتی ہے۔

☆ میں برتھ کنٹرول کے حق میں نہیں ہوں کیوں کہ پیدا ہونا ہر بچے کا پیدائشی حق ہے۔

(ایس امتیاز احمد۔کراچی)

ہوکر لیٹ گئی۔

پھر صنوبر کی نظر اس لڑکی کی تصویر پر پڑی تو انہوں نے دھڑکتے دل کے ساتھ شوہر سے بولیں۔

''ذرا ادھر تو دیکھئے۔'' اور جب شوہر نے دیکھا تو خوف سے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کیونکہ تصویر سے خون ٹپک رہا تھا۔

☆......☆......☆

صبح کا سورج بڑی آب و تاب سے آسمان پر چمک رہا تھا مہران گل کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا نیہا اسے اٹھا رہی تھی اور رو بھی رہی تھی مہران گل ہڑبڑا کر اٹھ گیا اور نیہا سے پوچھا۔ ''آپ کیوں رو رہی ہو؟''

''نیہا نے کہا۔ ''و......و......وہ، وہ اندر۔''

مہران گل اٹھ کر اندر گیا تو ایک دم ٹھٹک کر رہ گیا سامنے اس کے ماں باپ کی لاشیں خون میں لت پت پڑی تھیں۔

کئی گھنٹے بعد مہران گل اپنے ماں باپ کو منوں مٹی تلے دفنا کر اپنی روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ گھر لوٹ آیا اب وہ تنہا اپنے گھر کا سربراہ تھا اپنی دونوں بہنوں کو ان کے اصلی گھر پہنچانا اب مہران گل کی ذمہ داری تھی۔

حنا روتی ہوئی آئی اور مہران گل سے لپٹ گئی۔ مہران نے کہا۔ تم رو نہیں میں جلدی قاتل کا پتا لگاؤں گا۔''

حنا نے روتے ہوئے کہا۔ ''محلے کی عورتوں نے کہا ہے کہ امی ابو پر کسی نے جادو کیا ہے اس لئے انہوں نے ایک عامل کو بلایا ہے وہ امی ابو کے کمرے میں ہیں۔''

مہران کمرے میں گیا تو وہاں ایک عامل بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا مہران کی موجودگی پر اس نے آنکھیں کھولیں اور کہنا شروع کیا۔ ''بیٹا یہ تصویر تم کہاں سے لائے تھے؟''

مہران گل نے کہا۔ ''پریاں جھیل سے۔''

عامل نے کہا۔ ''تمہارے ماں باپ کی ہلاکت اس تصویر میں بنی اس لڑکی نے کی ہے، یہ ایک جادوئی تصویر ہے۔ تم اس کو دوبارہ اسی جھیل میں پھینک آؤ تو اچھا ہوگا۔'' اور پھر وہ عامل چلا گیا۔

عامل کے جانے کے بعد مہران گل نے سوچا اگر میں اس تصویر کو جھیل میں پھینک آؤں گا تو وہ کسی اور کی جان بھی لے سکتی ہے۔'' مہران گل نے سامنے پڑا بڑا چاقو اٹھایا اور اس تصویر کو ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا۔

تصویر کے پھٹتے ہی پورے کمرے میں جیسے زلزلہ آ گیا اور ہر چیز ادھر سے ادھر گرنے اور ٹوٹنے لگی۔ ہر طرف دھواں سا چھانے لگا۔

جب سب کچھ سنبھلا تو سامنے تصویر والی لڑکی کھڑی تھی۔ اس لڑکی نے کہا۔ ''واہ، کیا بات ہے تمہاری بہادری کی، میں ایک روح ہوں صدیوں پہلے ایک ظالم نے مجھے اس تصویر میں قید کر دیا تھا۔ مگر کسی نے مجھے نہیں نکالا پھر تم نے مجھے اس تصویر سے آزاد کرایا، اب میں اپنی دنیا میں جاؤں گی لیکن اکیلے نہیں تمہیں ساتھ لے کر۔''

مہران گل جو کہ اس کی باتیں سن رہا تھا بولا۔

''میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔''

روح نے کہا۔ ''اگر تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گے تو میں تمہاری بہنوں کو بھی مار ڈالوں گی اور پھر تمہیں ہر صورت اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی کوئی تمہیں مجھ سے نہیں بچا سکتا۔''

تو مہران گل نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کہا۔ ''جو تکلیف دینا چاہتی ہو مجھے دے دو۔ میری بہنوں کو چھونا بھی نہیں۔'' اس کے بعد کمرے میں دھواں بھر گیا اور جب دھواں چھٹا تو کمرے میں کوئی بھی موجود نہ تھا۔

جب حنا اور نیہا کمرے میں آئیں تو کوئی نہیں تھا۔ وہ روح مہران کو اپنی دنیا میں لے کر جا چکی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔



مہران گل روزانہ پریاں جھیل پر مچھلیاں پکڑنے آتا تھا وہ نہایت محنت کش اور بہادر نوجوان تھا۔ مہران گل کی داستان کچھ عجیب تھی۔

جس ماں باپ نے اسے جنم دیا تھا وہ عیسائی تھے شروع میں مہران گل کا نام مائیکل تھا آٹھ سال کی عمر میں وہ مائیکل کو چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے تھے پھر مائیکل کو ایک غریب مسلمان گھرانہ مل گیا اور انہوں نے اس کا نام مہران گل رکھ دیا۔ اسے اپنا بیٹا بنا کر اپنے گھر میں رکھ لیا۔ مہران کے نئے والدین بہت غریب اور بوڑھے تھے۔ دو سال تک مہران کے والد نے گھر کو سنبھالے رکھا مگر پھر اچانک سے ان کی طبیعت خراب ہوگئی اور پھر چھوٹی عمر سے ہی مہران گل نے مچھیروں کا کام کرنا شروع کر دیا۔

مہران کی دو بہنیں تھیں حنا اور نیا وہ دونوں بھی اب شادی کے لائق ہوچکی تھیں، حنا اور نیا مہران کی سگی بہنیں نہیں تھیں مگر پھر بھی مہران ان کی شادی کے لئے جہیز اکٹھا کر رہا تھا۔ وہ صبح اٹھ کر پہلے نماز پڑھتا، اتنی کم آمدنی کی وجہ سے مہران کے گھر والوں کو آسانی سے دو وقت کی روٹی پیٹ بھر کر مل جاتی تھی۔

اس دن بھی مہران پریاں جھیل پر مچھلیاں پکڑنے گیا تھا کافی دیر جال پھینکنے پر بھی ابھی تک کوئی مچھلی جال میں نہیں پھنسی تھی۔

پھر اچانک سے جال میں ہل چل ہوئی مہران خوش ہوگیا کہ مچھلیاں جال میں پھنس گئی ہیں۔ جب مہران نے جال اوپر کھینچا تو اس میں رول کی ہوئی ایک چیز تھی مہران نے جب اسے جال میں سے نکال کر کھولا تو وہ کسی لڑکی کی کینوس پر تصویر تھی جو کہ بہت خوبصورت تھی، مہران نے کہا۔

”واہ کتنی خوبصورت ہے اور اس کا گھاگھرا چولی تو بہت خوبصورت ہے میں گھر جا کر اسے والدہ کو دوں گا۔“

مہران نے دوبارہ جال جھیل میں پھینک دیا۔

مہران شام تک جھیل کے کنارے بیٹھا رہا مگر کوئی مچھلی نہ آئی۔

آخر تھک ہار کر جب مہران واپسی کے لئے پلٹا تو اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ جھیل میں جا گرا جھیل بہت گہری تھی اور پانی بھی بہت تھا مگر مہران نے پانی میں ایک درخت کی شاخ کو مضبوطی سے پکڑ لیا کیونکہ جھیل کے پاس بہت سے بڑے بڑے درخت موجود تھے۔

کافی دیر کے بعد آخر کار مہران جھیل سے باہر آ گیا۔ مہران نے جال اور تصویر اٹھائی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

گھر پہنچ کر مہران نے اپنی والدہ سے کہا۔ ”امی آج کوئی مچھلی ہاتھ نہیں آئی مگر میں تمہارے لئے ایک چیز لایا ہوں۔“

والدہ نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں، بتاؤ کیا لائے ہو میرے لئے۔“

مہران نے اپنی والدہ کو وہ تصویر دکھائی۔

والدہ نے کہا۔ ”بہت پیاری ہے جا کر کمرے میں لگا دو۔“

رات میں مہران گل کی والدہ صنوبر سامنے لگی اس تصویر کو گھورے جا رہی تھیں، مہران گل کے والد چارپائی سے اٹھ کر صنوبر کے پاس گئے اور کہا۔ ”صنوبر اس تصویر میں ایسا کیا رکھا ہے جو تم اس کو گھورے جا رہی ہو۔“

صنوبر نے کہا۔ ”کچھ نہیں، نیا کے ابو آپ جا کر سو جائیں۔“

رات کافی گہری ہو چکی تھی چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپ چھپ کر مسکرا رہا تھا مہران کی والدہ صنوبر ادھر ادھر کروٹیں بدل رہی تھیں کہ اچانک کسی کے زور سے ہنسنے کی آواز سنائی دی تو صنوبر نے ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا صنوبر نے اپنے شوہر کو جگایا اور ساری بات سے آگاہ کیا۔

شوہر نے کہا۔ ”سو جاؤ کچھ نہیں ہے لگتا ہے تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ جا کر سو جاؤ۔“ اور پھر صنوبر اپنے بستر پر خاموش

نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا تھا اور بات بھی کچھ ایسی ہی تھی جو بھی سنتا حیرت کے مارے گنگ ہو جاتا۔

مگر پروفیسر ہنری کا کہنا تھا کہ۔ ''یہی بات یہی ہے۔''

پولیس ہر ممکن کوشش کے باوجود لیبارٹری اسسٹنٹ کی لاش یا لاش کا کوئی بھی حصہ برآمد کرلینے میں ناکام رہی تھی اس نے جھنجھلا کر ملک کے ممتاز سائنس دان پروفیسر ہنری کے خلاف قتل کا پرچہ کاٹا اور اسے گرفتار کرلینے کے بعد کیس عدالت میں پہنچا دیا۔ کچھ ذمہ دار افراد کا خیال تھا۔ ''یہ ایک سیدھا سادہ قتل کا کیس تھا جسے پروفیسر ہنری نے اپنی ذہانت سے کام لیتے ہوئے الجھا دیا تھا۔''

آج مقدمے کی سماعت کا آخری دن تھا جس میں پروفیسر ہنری کو اپنی عدالت میں صفائی کا بیان دینا تھا۔ عدالتی کارروائی شروع ہونے میں خاصی دیر تھی لیکن اس سے قبل ہی عدالتی احاطے میں لوگوں کا ایک ہجوم جمع تھا۔ وہ سب پروفیسر ہنری کا بیان سننے آئے تھے۔

رسمی کارروائی ختم ہوتے ہی پروفیسر ہنری کو مجرموں کے کٹہرے میں لاکر کھڑا کردیا گیا اس کا شیو بڑھا ہوا تھا اور لباس کی شکنیں بتا رہی تھیں کہ اسے کئی روز سے لباس بدلنے نہیں دیا گیا اور اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ مہذب معاشرے میں ایک قاتل سے کسی کو ہمدردی نہیں ہوتی۔ وہ سب کے نزدیک قابل ملامت اور قابل نفرت کے لائق ہوتا ہے۔

پروفیسر ہنری اپنی صفائی میں عدالتی کٹہرے میں بیان دینے آیا تو بے حد پرسکون تھا۔ اس پر قتل کا الزام تھا اور وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ پولیس کا ہر آدمی اور عدالت میں موجود ہر شخص اسے پھانسی کے پھندے پر لٹکتے دیکھنے کا خواہش مند تھا لیکن اس کے باوجود اس کی آنکھوں سے اطمینان جھلک رہا تھا اور چہرے پر خوف کی کوئی علامت نہیں تھی۔

اس نے سرسری انداز میں کمرہ عدالت میں موجود ہر چہرے کا جائزہ لیا اور ہلکے سے کھنکارہ۔ سرگوشیوں کی آوازیں یک لخت دم توڑ گئیں۔ ہر شخص اس کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔

اور پلکیں جھپکائے بغیر ٹکٹکی لگا کر اسے گھورنے لگا۔

''عالی جناب! مجھ پر اپنے لیبارٹری اسسٹنٹ کو قتل کرنے کا الزام ہے۔'' پروفیسر نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔

''لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں قاتل نہیں ہوں۔ میں حلف اٹھا کر یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ میں نے اپنے لیبارٹری اسسٹنٹ کو قتل نہیں کیا ہے جہاں تک مجھے یقین ہے یہ ایک خودکشی کا کیس ہے۔ میرے لیبارٹری اسسٹنٹ نے ناراضگی میں خودکشی کرلی تھی اور میں کسی حالت میں اس کا قاتل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ ابھی تک یہی ثابت نہیں کیا جاسکا کہ وہ مرچکا ہے اس کی موت کا کوئی عینی گواہ نہیں اور دوسری بات یہ کہ اس کی لاش بھی دریافت نہیں ہوسکی ہے پولیس ہر ممکن کوشش کے باوجود اس کی لاش برآمد کرلینے میں ناکام ہوچکی ہے اور میں عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کی لاش کبھی دریافت نہیں کی جاسکے گی۔''

کمرہ عدالت میں یکایک سرگوشیاں گونج اٹھیں۔ اونچی نشست گاہ پر بیٹھے جج نے چوبی ہتھوڑے سے میز کو بجایا اور لوگوں کو خاموش رہنے کا حکم دیا۔ جج کے حکم پر کمرہ عدالت میں ایک دفعہ پھر سکوت طاری ہوگیا پروفیسر ہنری نے کسمسا کر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور ہلکے سے کھنکارا اس نے جج اور جیوری کے ارکان کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی بے اعتباری اور بے یقینی کو دیکھ لیا تھا جیوری میں شامل ہر فرد اسے تیز و تند نظروں سے گھور رہا تھا اور اس پر شک کے نوکیلے بھالے پھینک رہا تھا یہ بھالے اسے اندرونی طور پر زخمی کر گئے۔

وہ کٹہرے میں تنہا شرمسار کھڑا تھا اور اٹھتی ہوئی نگاہوں کی چبھن اپنے وجود پر محسوس کررہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ معزز عدالت کے سامنے ساری صورتحال کی وضاحت ابتدا سے کرنا ضروری ہے۔'' پروفیسر ہنری نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''یہ ایک ماہ قبل کی بات ہے میں نے اخبار میں لیبارٹری



سائنسی حادثہ

احسان سحر۔میانوالی

حیرت میں ڈالتی ناقابل یقین اور ناقابل فرامش حیرتناک، خوفناک، دھشت ناک، حیرت انگیز اور تحیر انگیز حقیقت جسے پڑھ کر لوگ برسوں فراموش نہ کرسکیں گے کہ کیا کسی کی بات نہ مان کر انسان زندہ درگور بھی ہوجاتا ہے۔

مفاد پرستی اور مطلب پرستی اکثر انسان کو زندہ درگور کردیتی ہے، حقیقت کہانی میں موجود ہے

اتنا پیچیدہ اور دلچسپ مقدمہ آج تک ملک کی کسی عدالت میں زیر بحث نہیں آیا، ابلاغ عامہ کے تمام موثر ترین ذرائع نے اس مقدمہ کو خوب اچھالا تھا ریڈیو، ٹی وی، اخبارات اور ہفت روزہ اس مقدمے کی ایک ایک لفظ کو بڑی تفصیل سے شائع کررہے تھے اور بڑے اہتمام سے اجاگر کرنے میں ہرلمحہ پیش پیش تھے اور مقدمہ کی سچائی اور صداقت کو تلاش کرنے کے بہانے اس پر ہر پہلو سے تنقید کررہے تھے بعض مبصرین نے اسے ایک انوکھا حادثہ قرار دیا۔ بلکہ بعض کا خیال تھا کہ ملک کے مشہور ومعروف سائنس دان ہنری نے کسی نامعلوم جذبے کے تحت مشتعل ہوکر اپنی جدید ترین لیبارٹری کے اسسٹنٹ کو قتل کردیا تھا اور پھانسی سے بچنے کے لئے یہ دلچسپ اور سسپنس فل کہانی گھڑی تھی جو اس سائنسی دور میں بھی انتہائی حد تک ناقابل یقین تھی۔ کسی

کے سر میں دماغ کی جگہ بھس بھرا ہوا تھا۔ تاہم میں نے اسے تجربے کے لئے ملازم رکھ ہی لیا۔ میں جس قسم کا تجربہ اس پر کرنا چاہتا تھا اس میں مجھے اس کے دماغ کی نہیں جسم کی ضرورت تھی۔ مزید گفتگو کے بعد مجھے پتہ چلا کہ اس کا نام رچرڈ ہے۔''

''دیکھو! میں تمہیں اپنے ساتھ ایک جگہ لے جانا چاہتا ہوں؟'' میں نے اسے بتایا۔ ''یہ سفر ممکن ہے تمہیں غیر مانوس سا لگے لیکن گھبرانا مت میں تمہارے ساتھ رہوں گا اور تم اس تمام سفر کے دوران وہی کرنا جو ہی چیز دیکھنا جس کے بارے میں، میں تمہیں بتاؤں۔

لیکن خبردار کسی بھی چیز کو ہاتھ مت لگانا ورنہ نتیجہ کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوگی۔''

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔

''اچھی بات ہے پروفیسر، جب تم میرے ساتھ ہی رہو گے تو پھر خطرہ کیسا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ظاہر ہے کوئی مصیبت آئی بھی تو اکیلی مجھ پر نہیں آئے گی تم پر بھی آئے گی اور جب تم پر افتادہ پڑے گی تو تم یقیناً خاموش نہیں بیٹھو گے اور اس مصیبت سے بچ نکلنے کی کوئی تدبیر ضرور نکالو گے لیکن یہ تو بتاؤ کہ جانا کہاں ہے؟''

یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھی وہ ٹرے اٹھائی جس میں میرا دوپہر کا کھانا رکھا ہوا تھا۔ یہ کھانا کباب اور سلائس پر مشتمل تھا کیونکہ میں دوپہر میں ہلکی غذا کھانے کا عادی ہوں۔ اس نے مجھ سے رسمی طور پر اجازت لینے کی بھی زحمت گوارہ نہیں کی اور فوراً ہی سلائس اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔ شاید اس کی بھوک چمک اٹھی تھی کھانے کو دیکھ کر یہ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس نے گزشتہ چوبیس گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

''ہمارا یہ سفر کائنات کی چوتھی جہت میں ہوگا۔'' میں نے اسے بتایا۔ اس سفر کے دوران ہم جو چیز کو بیک وقت چار سمتوں سے دیکھ سکیں گے۔

رچرڈ نے پہلا سلائس اپنے معدے میں اتار لیا تھا۔ اس نے دوسرا سلائس اٹھایا اور اسے اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارا مطلب ہے تم کوئی شعبدہ دکھانا چاہتے ہو۔'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں پھر زور سے ہنس پڑا۔

''کیا تم کوئی جادوگر قسم کی چیز ہو۔'' اس کی آنکھوں میں تمسخر تھا یا طنز مجھے نظر نہ آیا تھا۔

میں جھنجھلا کر رہ گیا۔ میں نے نہایت آسان لفظوں میں اسے اپنا مقصد بتادیا تھا۔ لیکن وہ پھر بھی کچھ نہ سمجھا تھا اور مجھے جادوگر تصور کر بیٹھا۔ ہت تیرے کی ملک کا ایک ممتاز سائنس دان جادوگر بنادیا گیا تھا اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ واہ رے! قدرنا شناس زمانے تیرے قربان، ہنر مند بھوکے مریں اور بے ہنر عیش کریں۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اسے اپنی بات سمجھانی چاہی لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا اور کبابوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس کا اندازہ ایسا تھا کہ اگر اس نے ذرہ بھر بھی تاخیر سے کام لیا تو کباب اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں پرواز کر جائیں گے۔

''میرے تجربے کا تعلق جادو سے نہیں ہے یہ خالصتاً ایک سائنسی تجربہ ہے ایسا تجربہ جو مجھ سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ میں ایک بار یہ تجربہ خود پر بھی آزما چکا ہوں۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''اس جدید سائنسی دور میں جبکہ انسان چاند کی زمین کو روند رہا ہے دنیا کے تمام سائنسدان کائنات میں موجود اشیاء کو صرف تین رخ سے دیکھنے میں کامیابی حاصل کرنے سے زیادہ آگے نہیں بڑھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جہتیں اور سمتیں ختم ہوگئی ہیں......'' میں نے اپنے لہجے میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''جہتیں اور بھی ہیں لاتعداد ہی اور لامحدود اور یہی وہ نظریہ تھا جس نے مجھے تجربہ کرنے پر مجبور کردیا۔

میں اپنی تمام تر کوششوں کے بعد کائنات کی چوتھی جہت ڈھونڈ لینے میں کامیاب ہوگیا ہوں ہوسکتا ہے آگے چل کر میں مزید کائناتی جہتیں تلاش کراوں۔''

اسسٹنٹ کا اشتہار دیا تھا کیونکہ ان دنوں میرا پرانا لیبارٹری اسسٹنٹ بیمار ہوگیا تھا اور کئی دنوں سے کام پر نہیں آیا تھا وہ اخبار میں دیئے جانے والے اشتہار کو پڑھ کر میرے پاس آیا اور مجھ سے درخواست کی کہ میں اسے ملازم رکھ لوں۔

وہ طویل عرصے سے بیروزگار تھا اور اپنی بیروزگاری سے گھبرا چکا تھا اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے اسے ملازمت فراہم نہ کی تو وہ باہر نکلتے ہی خودکشی کرلے گا۔ اس کی تعلیمی اسناد مکمل نہیں تھیں اور اسے لیبارٹری میں کام کرنے کا کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔

میں ان دنوں ایک نئے سائنسی تجربے میں مصروف تھا اور اس تجربے کی تکمیل میں مجھے ایک شخص کی شدت سے ضرورت تھی۔ لیکن یہ تجربہ اتنا مہلک اور خطرناک تھا کہ میں نے اسے التوا میں ڈال دیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے نیا سائنسی تجربہ کرنے کے لئے ایک شخص کی ضرورت ہے لیکن یہ تجربہ بہت خطرناک ہے کیونکہ میں فی الحال تجربے کی کامیابی کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ ''میں نے اسے تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔'' اس نے یہ سب سن کر آمادگی کا اظہار کیا۔ ''مجھے یقین ہے کہ آپ کا یہ تجربہ بیروزگاری کے تجربے سے زیادہ خطرناک نہیں ہوگا اس میں آدمی لحظہ لحظہ مرتا ہے اور پھر مرنے کے لئے زندہ رہتا ہے۔''

''نہیں! اب وہ تجربہ اتنا بھی خطرناک نہیں ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''میں خود پر ایک مرتبہ تجربہ کرچکا ہوں اور اس میں مجھے خراش تک نہیں آئی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں گہرائی تک جھانکتے ہوئے اسے بتایا۔

''تو آپ مجھے ملازم رکھ لیں۔'' اس نے کہا۔

''میں ہر تجربے سے گزرنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ وہ تجربے بھوکے رہنے کا نہ ہو۔'' پروفیسر ہنری ذرہ سانس لینے کے لئے رکا۔ اچٹتی سی نگاہ سے لوگوں کی طرف دیکھا جہاں ہر چہرے پر سنسنی اور تجسس ہی تجسس تھا جیسے وہ آگے سننے کے لئے بے چین ہوں۔

پھر وہ بولا۔ ''ضروری ہے کہ اب میں تھوڑی سی تفصیل اس تجربے کی بھی بتادوں، جو میں کرنا چاہتا تھا یہ ایک سیدھا سادہ تجربہ تھا جس کے ذریعے چہار جہتی شعور انسان میں پیدا کردیا جاتا تھا۔ میں نے اپنی تھیوری اسے سمجھائی تو وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا اس کی سمجھ میں میری کوئی بھی بات نہ آئی تھی۔'' اتنا کہہ کر پروفیسر خاموش ہوگیا۔

لیکن وہ اب بھی ماضی میں تھا، چہار جہتی شعور کیا ہوتا ہے پروفیسر......؟'' اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔ ''اور اس کا ادراک آدمی کو کیسے ہوتا ہے؟''

میں بے بسی اور جھنجھلاہٹ میں سر پیٹ کر رہ گیا اس کی ذہنی سطح میرے اندازے سے بھی بے حد کم تھی اسے سمتوں اور جہتوں کا بھی پتہ نہیں تھا۔

حالانکہ سائنس کا معمولی سا طالب علم بھی یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں وہ شش جہتی ہے لیکن جب ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کسی بھی چیز کو تو اس چیز کا صرف ایک ہی رخ ہمارے سامنے آتا ہے جبکہ اس کے بقایا پانچ رخ ہماری نظروں سے اوجھل رہتے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم ہر چیز کو صرف ایک ہی سمت سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ اور ہمیں اس چیز کے باقی پہلو اوجھل اور پوشیدہ رہنے کا احساس بھی نہیں ہوپاتا۔ میرے تجربے کا بنیادی مقصد یہی تھا۔ میں انسان میں وہ شعور پیدا کرنا چاہتا تھا جس کے ذریعے وہ کائنات میں موجود اشیاء کے پہلو دیکھ سکے جو عام طور پر انسانی نگاہ سے اوجھل رہتے ہیں۔

میں نے اسے تفصیل سے ساری بات سمجھائی ،تب بھی وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ شاید اس سے قبل اس نے اس بارے میں کچھ پڑھا ہی نہیں تھا۔ وہ بلند قامت اور خاصا موٹا آدمی تھا اور میرے تجربے کے لئے موزوں اور نہایت مناسب اور میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اس

عدالت میں سناٹا طاری تھا۔ ہر شخص آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے حیرت سے پروفیسر کی الف لیلیٰ سننے میں محو تھا۔ خود اونچی نشست پر بیٹھے جج کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی تمام تر متانت ''سنجیدگی اور وقار کو بھلا کر ایک عام آدمی کی طرح پلکیں جھپکائے بغیر پروفیسر ہنری کے چہرے کو تک رہا تھا۔ پروفیسر ہنری مسلسل بولنے کے باعث کچھ تھک سا گیا تھا اور اس کا تنفس تیز ہوگیا تھا۔

اس نے اضطراری کیفیت میں کٹہرے کا جنگلا اتنی مضبوطی سے پکڑے رکھا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھوں کی پشت پر نیلی رنگوں کا جال سا ابھر آیا۔ جہاں رگیں نمایاں تھیں۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔

''میرا خیال ہے کہ یہاں تھوڑی سی وضاحت کردوں تو بہتر ہوگا۔ کیونکہ بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔ ہم دونوں بظاہر خود کو چار جہتی مقام پر محسوس کررہے تھے لیکن یہ ہمارا دماغ اور صرف شعوری احساس تھا جو ہمیں بتا رہا تھا کہ ہم چار جہتی مقام پر پہنچ گئے ہیں اور ہر شے کو بیک وقت چار طرف سے دیکھ سکتے ہیں جبکہ ہم دونوں کے اجسام تین جہتی دنیا میں ہی رہ گئے تھے گویا ہم ذہنی اور شعوری طور پر چوتھی جہت کی دنیا میں تھے لیکن ہمارے جسم تیسری دنیا کے جہت میں ہی رہ گئے تھے۔

جس جگہ ہم کھڑے تھے وہاں سے ہر چیز ہمیں الٹ پلٹ نظر آرہی تھی۔ کیونکہ وہ چیز ہمیں بیک وقت چار سمتوں میں نظر آرہی تھی میں نے اپنی لیبارٹری کی طرف دیکھا اور اس میں موجود کسی ایک بھی چیز کو پہچاننے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ حالانکہ یہ لیبارٹری میں نے اپنے ہاتھوں سے ترتیب دی تھی اور اس میں رکھی کوئی بھی چیز میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ تاہم اس وقت میں اپنی لیبارٹری کی کوئی شے بھی کوشش کے باوجود پہچان لینے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ شیشے کی باریک نلکیاں مجھے موٹی سلاخوں کی شکل میں نظر آرہی تھیں اور چھوٹی مقناطیسی کیلیں بڑے بڑے کارک اسکریو بن گئے تھے لیبارٹری میں جلنے والے برقی قمقمے بڑی بڑی دھاتی دیگوں میں تبدیل ہوگئے تھے اور شیشے کے مرتبان جن میں کوئی بھی اپنی اصلی حالت میں چھ انچ سے بڑا نہیں تھا کسی توپ کے دہانے کی شکل اختیار کر گئے تھے مجھے ان چیزوں کی ہیئت تبدیل ہوتے دیکھ کر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی ظاہر ہے کوئی بھی شے اگر بیک وقت چاروں جانب سے آپ کے سامنے آجائے تو یہ ہوگا کہ آپ اسے پہچان ہی نہ پائیں گے کہ یہ انگور کا دانہ ہے یا توپ کا گولہ، پنسل ہے یا خلاء میں پرواز کرنے والا راکٹ اور...... یہ کیا ہے، چائے کا ایک کپ یا کیمیکل سے بھرا ہوا ڈرام...... چوتھی جہت میں پہنچنے کے بعد یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ جو چیز دکھائی دے رہی ہے وہ اصل میں ہے کیا بلا۔ آدمی ہے یا درخت کھمبا ہے یا لمبی سرنگ اور کاغذ ہے یا بستر کی چادر۔

رچرڈ اس وقت آخری بسکٹ کھا رہا تھا۔ جب ہم چوتھی جہت میں داخل ہوئے تھے اس نے آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا اور خوف زدہ انداز میں مجھ سے چمٹ گیا اشیا کی نامانوس ہیئت نے اسے خوف زدہ کردیا تھا اس کی آنکھیں حیرت سے باہر کو ابل پڑی تھیں۔ میں نے اسے خوف زدہ پایا تو بے اختیار میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر میں نے اسے دلاسہ دیا اور سمجھایا کہ خطرے والی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اس کے ساتھ ہوں۔ لیکن اس کے باوجود اس کا خوف کم نہیں ہوا۔ اس کا جسم بری طرح کپکپا رہا تھا اور اسے تھرتھری چھوٹ گئی تھی اسے لرزتے اور کپکپاتے ہوئے دیکھ کر مجھے انسان کی بے وقعتی کا احساس ہوا۔ آدمی بھی کیا شے ہے۔ خود سے ڈرنے کی بجائے بے وقعت اشیا سے خوف کھاتا ہے اور ساری عمر نادیدہ خوف میں مبتلا رہتے ہوئے زندگی گزار دیتا ہے، ہت تیرے کی۔'' پروفیسر نے کہا اور خاموش ہوگیا یہ شاید اس کا تکیہ کلام تھا۔

اس نے ایک نگاہ طائرانہ انداز میں عدالت میں موجود لوگوں پر ڈالی وہ بت بنے اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے اور پروفیسر کی طرف گھور رہے تھے جیسے یکا یک ہی اس کے سینگ نکل آئے ہوں۔ یا پھر وہ غیر ارضی مخلوق تھا جو خلا کے مدار میں راستہ بھٹک کر آگیا تھا اور یکا یک ان کے سامنے آگیا ہو۔

اس نے میری باتیں بظاہر توجہ سے سنی تھیں لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس کی اصل توجہ میری طرف نہیں بلکہ کھانے پر مرکوز تھیں کباب اور سلائس ختم ہوگئے تھے اور اس نے چاکلیٹ سے بنی مٹھائی کی طرف ہاتھ بڑھادیا جو مجھے بے حد پسند تھی۔ ''پروفیسر ممکن ہے جو کچھ کہہ رہے ہو درست ہی ہو مگر...... مجھے یہ تو ساری باتیں جادوگروں جیسی ہی لگ رہی ہیں۔'' اس نے چاکلیٹ دانتوں تلے چباتے ہوئے کہا۔ تین سمتیں چار جہتیں اور لا محدود کائناتی جہتیں میری سمجھ میں تو نہیں آتیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جو چیز میں دیکھ رہا ہوں وہ ویسی ہی ہے جیسی کہ مجھے نظر آرہی ہے اگر وہ مختلف ہوتی تو یقیناً مجھے بھی مختلف ہی نظر آتی۔''

میں ایک مرتبہ پھر سر پیٹ کر رہ گیا اسے سمجھانا بے کار تھا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ اشیا ویسی نہیں ہوتیں جیسی درحقیقت ہمیں نظر آتی ہیں بلکہ دراصل ویسی ہوتی ہیں جیسی ہمیں نظر نہیں آتیں۔ تاہم میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ چار جہت والے تجرباتی سفر میں اسے اپنے ساتھ ضرور لے جاؤں گا۔ ممکن ہے اشیا کو چار جہتوں میں دیکھ کر ہی وہ میری بات سمجھنے میں کامیاب ہوجاتا۔ اس کا بھولپن میرے لئے ایک چیلنج بن گیا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ وہ مجھے کوئی پاگل تصور کررہا تھا پڑھا لکھا پاگل، میں نے اس کی یہ غلط فہمی دور کرنے کے لئے اسے فوراً ہی چار جہتی سفر کے تجربے سے گزارنے کی تیاری شروع کردی۔

میں اسے اپنے ہمراہ لیبارٹری میں لے گیا، اور ضروری اقدامات کرنے میں مصروف ہوگیا اتنی دیر میں رچرڈ نے بسکٹوں کا وہ ڈبہ تلاش کرلیا جسے میں اسے اپنے ہمراہ لیبارٹری میں لے گیا تھا اور ضروری اقدامات کرنے میں مصروف ہوگیا۔ بسکٹوں کا وہ ڈبہ میں نے لیبارٹری میں محض اس خیال سے رکھ چھوڑا تھا کہ اگر مصروفیات کے باعث لیبارٹری سے باہر نہیں جاسکوں تو ان بسکٹوں سے ہی پیٹ بھرلوں۔ تجربے کی تیاری مکمل ہونے سے پیشتر ہی وہ ڈبے میں رکھے سارے بسکٹ چٹ کرگیا۔ میں نے سرخ رنگ کی شیشی

چغل خوری

اندلس کے مشہور فلسفی ابن رشد نے کسی چغل خور سے کہا۔

''خدا نے تمہیں ایک اتنی بڑی خوبی دے رکھی ہے کہ تم اس پر جتنا ناز کرو کم ہے۔''

چغل خور نے حیران ہوکر پوچھا۔ ''کونسی خوبی؟''

ابن رشد نے سنجیدگی سے کہا۔ ''چغل خوری، کیونکہ یہی وہ خوبی ہے جس تم سے ایک سال کا فتنہ ایک لمحے میں اٹھاسکتے ہو۔''

چغل خور نے شرم سے گردن جھکالی۔

(عمران-کراچی)

میں رکھا محلول نکالا اور انجکشن کے ذریعے پہلے اپنے اور پھر رچرڈ کے جسم میں اتارا۔

محلول انسانی طاقت کو دوچند کرنے کا کام کرتا تھا اور اسے میں نے خود ہی تیار کیا تھا۔ چار جہتی سفر میں لاغر جسم افراد نہیں جاسکتے تھے اور اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ اس سفر میں بے پناہ قدرتی دباؤ برداشت کرنا پڑتا ہے جو کہ ایک عام انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے اس محلول کی تیاری میں بے اندازہ دولت اور بیش قیمت وقت صرف کیا تھا تب کہیں جاکر اسے تیار کرپایا تھا۔

انجکشن لگنے کے چند سیکنڈ بعد ہی ہم نے خود کو ایک اجنبی اور غیر مانوس جگہ پر پایا۔

اس محلول کی خصوصیت یہی تھی کہ فوراً ہی انسان کو چوتھی جہت میں لے جاتا تھا اور آدمی کو پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ وہ اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے ایک اجنبی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ میں رچرڈ کا ہاتھ پکڑے کائنات کی ایک ایسی نامعلوم جگہ پر کھڑا تھا جہاں ہر چیز چار رنگی نظر آرہی تھی۔ پروفیسر اتنا کہتے ہی خاموش ہوگیا۔

کرنے پر مجبور ہوں۔ میں نے اسے چار جہتی سفر پر جانے سے قبل ہی تنبیہ کر دی تھی کہ وہ وہاں پہنچ کر کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے ورنہ نتائج کی تمام تر ذمہ داری اس پر ہوگی۔ لیکن اس نے میری تمام تر ہدایت فراموش کر دی۔

اور عین اسی وقت جب ہم اپنی لیبارٹری سے واپسی کا سفر تلاش کرنے والے تھے وہ واقعہ پیش آ گیا جس کے وقوع پذیر ہونے کا مجھے سان و گمان بھی نہیں تھا میں فضا میں موجود مقناطیسی لہر تلاش کر رہا تھا جس میں داخل ہو کر ہم خود کار طریقے سے تیسری جہت میں داخل ہو سکتے تھے مقناطیسی لہر کی تلاش میں منہمک ہو کر میں رچرڈ کو فراموش کر بیٹھا اور اس کی طرف سے غافل ہو گیا۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ رچرڈ کیا کرنے لگا تھا۔ یہ بات تو میں پہلے بھی وضع کر چکا ہوں کہ ہم اگرچہ لیبارٹری میں ہی کھڑے تھے لیکن محلول پیتے ہی ایک ایسی جہت میں پہنچ گئے تھے جہاں اشیا اپنی حقیقی وجود کھو بیٹھی تھیں اور ہر چیز جیسی وہ تھی اس سے قطعاً مختلف طور پر ہمیں نظر آ رہی تھیں۔

رچرڈ نے مسرت بھری ایک قلقاری ماری اور بھنے ہوئے گوشت کے اس ڈھیر پر ٹوٹ پڑا جو پارچوں کی شکل میں لیبارٹری کی دیوار کے پاس پڑا ہوا تھا۔ گوشت کے ان پارچوں سے اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھیں وہ جلد ہی ان پارچوں کی طرف لپکا اور جلدی جلدی انہیں اپنے معدے میں اتارنے لگا وہ گزشتہ چوبیس گھنٹوں سے بھوکا تھا اور گوشت کے ان پارچوں نے اسے بے حد حریص اور خود غرض بنا دیا اس سے بہتر کہ میں اس کی طرف ہوتا وہ ذرا سی دیر میں گوشت کے نرم اور ڈھیر کو اپنے معدے میں اتار چکا تھا پیٹ بھرنے کے بعد اس کے چہرے پر آسودگی ابھر آئی اور اچانک ہی میری نظر رچرڈ پر پڑی۔

اور میں چیخ اٹھا۔ ''ارے یہ تم نے کیا کیا۔'' میں نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس نے کیا چیز کھائی ہے وہ بظاہر تو گوشت کے بھنے ہوئے پارچے تھے جو بھوک مٹانے کے لئے اس نے اپنے معدے میں اتار لئے تھے۔ ''لیکن درحقیقت وہ اس کا اپنے جسم کا گوشت تھا جسے وہ ڈکار چکا تھا۔'' چوتھی جہت میں کھڑے رہ کر دیکھتے ہوئے وہ اپنے جسم کو پہچان نہ سکا تھا اور میں جو ذہنی طور پر اس سے برتر تھا اور پہلے بھی ایک مرتبہ چوتھی جہت میں جا کر اشیا کو بدلتی ہوئی شکلوں میں دیکھ چکا تھا میں نے اسے پہچان لیا تھا رچرڈ خود اپنے آپ کو ہی کھا گیا تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک ہچکی لی اور پلک جھپکتے ہی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔''

پروفیسر ہنری نے ایک طویل سانس لی اور عدالت میں موجود جج کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ ہے جناب ساری حقیقت، جو میں نے آپ کے گوش گزار کر دی ہے، اس واقعہ کا کوئی عینی شاہد نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ رچرڈ کے قتل کا الزام کسی طور پر بھی مجھ پر عائد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنا قاتل خود ہی تھا۔'' اور یہ کہتے ہی ہنری خاموش ہو گیا۔

عدالت کا وقت ختم ہو چکا تھا ہر شخص سحر زدہ سا بیٹھا تھا۔ کسی کو بھی اس حیرت انگیز اور دلچسپ روداد پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ ساعت لہٰذا ملتوی کر دی گئی۔ دوسرے روز اخبارات میں پروفیسر کے اس بیان پر بڑی لے دے کی گئی۔ بعض مبصرین نے تو اسے ایک بے سروپا کہانی قرار دیا۔ جو قطعی طور پر ناقابل یقین تھی۔ ''بھلا کیسے یہ ممکن ہے کہ ایک شخص خود ہی اپنے آپ کو کھا جائے اور اسے پتہ بھی نہ چلے۔''

اگلے روز عدالت نے اس دلچسپ اور پیچیدہ مقدمے کا فیصلہ سنا دیا۔ اس نے رچرڈ کی موت کو ایک سائنسی حادثہ قرار دے دیا تھا اور پروفیسر ہنری کو باعزت طور پر رہا کرنے کا حکم دے دیا تھا۔

عدالت کا فیصلہ اپنی جگہ برحق، اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔ لیکن میں یہی سوال آپ سے کرتا ہوں، بتایئے! ''کیا واقعی یہ ایک سائنسی حادثہ تھا؟''



''ڈرومت!'' پروفیسر نے بات پھر وہی سے شروع کی جہاں سے ختم کی تھی۔ ''ڈرومت رچرڈ اور مجھے بتاؤ کہ تم اس وقت کس چیز کو دیکھ رہے ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ ''جس سے تم اتنے خوف زدہ ہوگئے ہو۔'' لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا اور چیخ مارتے ہوئے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ لڑکھڑایا تو میں بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اور اس کے ساتھ ہی پیچھے کی طرف ہٹ گیا بظاہر یہ صرف ایک قدم ہی اٹھایا گیا تھا مگر ایک قدم کے اٹھاتے ہی ہم کسی اور دنیا میں پہنچ گئے تھے۔

لیبارٹری کا منظر میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تھا اور اب جو چیزیں مجھے نظر آرہی تھیں میں ان کی اصلیت ہیت اور شکل وصورت کے بارے میں کوئی بھی بات یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

مختلف قسم کے حشرات الارض تھے جو زمین پر رینگتے ہوئے اور فضا میں تیرتے ہوئے ادھر سے ادھر آجارہے تھے یکایک میری نگاہ ایک موٹے تازے اژدھا پر پڑی جو پھنکاریں ماررہا تھا۔

اور باربار شدت قرب سے اپنا سر زمین پر پٹخ رہا تھا۔ میں اس اژدھا کو اپنے سامنے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ٹھٹک گیا اور خوف ودہشت کی ایک تیز لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی لیکن جب میں نے غور سے اس اژدھا کی طرف دیکھا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ میری لیبارٹری میں لگی شیشے کی ایک باریک نلکی تھی جو اژدھا کی صورت میں حرکت کررہی تھی شیشے کی نلکی کو پہچانتے ہی میرے ہونٹوں سے ایک طمانیت بھری سانس خارج ہوئی یہ امر میرے لئے تسلی بخش تھا کہ اب بھی میں اپنی لیبارٹری میں کھڑا ہوں۔

میں نے دوسری جانب دیکھا تو حیران رہ گیا یہ لیبارٹری کے عقب میں گزرنے والی بڑی سی سڑک تھی جس پر ٹریفک جاری تھا لیکن کیا واقعی وہ ٹریفک ہی تھا...... اس بارے میں حتمی طور پر کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا، میرا خیال ہے کہ یہ ففتھ ویونیو کا علاقہ ہے۔

میں نے رچرڈ سے کہا۔ ''چھوٹے چھوٹے جھینگر جو تمہیں ایک موٹی سی رسی پر چلتے نظر آرہے ہیں غالباً آدمی ہیں جو فٹ پاتھ پر چل رہے ہیں اور یہ ہیبت اور بے ڈھنگی شے جو مسلسل حرکت پذیر ہے غالباً ڈبل ڈیکر بس ہے جو اس روٹ پر صرف چلتی ہے۔''

میں بہت دیر تک رچرڈ سے اسی طرح کی باتیں کرتا رہا اور اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کرتا رہا بالآخر اس پر طاری لرزہ ختم ہوگیا اس کا ڈر دور ہوگیا تھا وہ خوف زدہ ہونے کی بجائے ایک ایک چیز کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور اس کے بارے میں مجھ سے طرح طرح کے سوالات بھی کررہا تھا۔ بعض دفعہ تو کسی عجیب سی ٹیڑھی میڑھی بدوضع چیز کو دیکھ کر ہنس بھی پڑتا تھا۔ اسے میری باتوں پر یقین آگیا تھا اور اس نے سمجھ لیا تھا کہ یہ سب وہی چیزیں ہیں جنہیں اس سے پیشتر وہ صرف ایک رخ سے دیکھتا تھا۔ میں نے رچرڈ کے اس تبصرے پر ناگواری سے منہ بنایا اور تجربے سے متعلق ضروری کوائف جمع کرنے لگا۔

رچرڈ بھی بڑی سنجیدگی اور فرمانبرداری سے میری معاونت کرنے لگا وہ مجھے بتارہا تھا کہ اسے کون سی چیز نظر آرہی ہیں میں نے ان سب کی تفصیل ترتیب وار اپنی ڈائری میں لکھ لی جیسی چوتھی جہت میں رہتے اور اشیا کو بیک وقت چاروں جانب سے دیکھتے ہوئے خاصی دیر گزر گئی غالباً دو گھنٹے یا اس سے بھی زائد، ذرا دیر بعد ہی میں نے اپنی دنیا میں لوٹنے کی تیاری شروع کردی کیونکہ اس وقت رچرڈ نے شکایت کرنی شروع کردی کہ اسے شدید بھوک لگ رہی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ گزشتہ چوبیں گھنٹوں سے بھوکا تھا۔ میں نے ترحم بھری نظروں سے اسے دیکھا اور واپس چلنے کو کہا۔

میں سب سے پہلے اسے کھانا کھلانا چاہتا تھا لیکن وہ بہت ہی جلد باز اور خود غرض ثابت ہوا۔''

پروفیسر ذرا سا ٹھٹکا اور بیان جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''عدالت کے معزز ارکان سے معذرت کے ساتھ کہ میں ایک مردہ شخص کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال

کے ذہن میں تھا، وہ مجسم ہوکر سامنے آ گیا تھا اور شام کے دھندلکے میں کوئی اسے دیکھ کر دھوکا کھا سکتا تھا۔

سحر اگرچہ پیشہ ور سنگتراش تھی۔ مگر اس نے یہ مجسمہ صرف اور صرف۔ اپنی ذہنی تسکین کے لئے بنایا تھا۔

جس چہرے اور قالب کو اس نے مجسمے کا روپ دیا تھا۔ وہ شروع سے اس کے حواسوں پر چھایا ہوا تھا۔ اس کے ہر فن پارے میں اس کی شباہت نظر آتی تھی۔

مگر وہ اس چہرے کو اس سے پہلے بھی مجسمے کے قالب میں نہیں ڈھال سکی تھی، مگر اب یہ تصوراتی چہرہ اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا، زندہ انسانوں میں بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی، لیکن اسے اس میں ناکامی ہوئی۔

البتہ اسے اپنے تصور کی ہلکی سی جھلک شیراز میں دکھائی دی اور لاشعوری طور پر وہ اس کی جانب راغب ہوتی چلی گئی۔ شیراز کا التفات حاصل کرنے کے باوجود اس کا ذہن انہی تصورات کی پرچھائیوں میں الجھا رہا، اور ہزار کوششوں کے باوجود وہ اس تصوراتی چہرے سے نجات حاصل نہ کرسکی۔

اس بار اس نے یہ عزم کرکے مجسمہ تراشنا شروع کیا تھا کہ اس بار وہ اس تصور کو مجسم کرکے ہی اٹھے گی، اور بالفرض اگر ایسا نہ ہوسکا، تو وہ مجسمہ سازی سے ہمیشہ کے لئے الگ ہوجائے گی۔ اس مجسمے کو تراشنے کے دوران اس نے بیرونی دنیا سے خود کو منقطع کرلیا تھا، اسے نہ کھانے کا ہوش تھا، نہ پینے کا، وہ دن رات کام کرنے میں مگن رہتی۔

اب اسے شیراز کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اس سے پہلے اس کا یہ حال بھی نہ ہوا تھا کیونکہ اگر کسی روز اس کی ملاقات شیراز سے نہ ہو پاتی تو وہ بے چین رہتی، مگر اس مجسمے کی تیاری میں اس کی لگن جنون کی حد تک پہنچ گئی تھی، اور آخر کار آج مجسمہ پایہ تکمیل تک پہنچ گیا تھا۔

اس نے مجسمے پر تنقیدی نظر ڈالی، تو اسے کوئی کمی یا خامی محسوس نہیں ہوئی۔ جب وہ اپنی اس تخلیق سے مطمئن ہوگئی تو اس نے پیکٹ کھولا اور مجسمے کو لباس پہنانے لگی، یہ لباس اس نے خصوصی طور پر اپنے تصورات کو مدنظر رکھ کر تیار کروایا تھا، ڈیزائن کے اعتبار سے یہ لباس یونانی شہزادوں کے لباس سے مماثلت رکھتا تھا۔ گیروے رنگ کے لباس نے مجسمے کی خوب صورتی میں اضافہ کردیا تھا۔ لگتا تھا کوئی قدیم یونانی شہزادہ اس جدید دور میں آ گیا ہے۔ اگر کمی تھی، تو صرف ان زیورات کی، جو قدیم دور میں شہزادے پہنا کرتے تھے۔

لیکن سحر نے اس کا بھی خاص خیال رکھا تھا، اور اس نے نہ صرف خود نوادرات فروخت کرنے والوں سے قدیم طرز کے زیورات حاصل کئے تھے بلکہ اس نے کئی زیورات خود ڈیزائن کرکے سناروں سے بنوائے تھے، زیورات سے آراستہ ہونے کے بعد مجسمے کے حسن میں مزید اضافہ ہوگیا، مجسمے کے چہرے سے وہ تمام احساسات ظاہر ہورہے تھے، جو ایک پرتمکنت شہزادے کے دل میں اس کے محبوب کے بارے میں ہوتے تھے، انداز دلبری بھی تھا، شاہانہ وقار بھی تھا، اور اپنے حسن پر غرور کا احساس بھی غرض مجسمہ کیا تھا ایک ایسی ستم کش شخصیت تھی جو اپنے چاہنے والوں سے اپنے حسن کا خراج طلب کررہا تھا۔

سحر اپنی ہی تخلیق پر فریفتہ ہوگئی تھی، وہ سوچتی۔ ''کاش! ایسا ممکن ہوسکتا کہ یہ مجسمہ ایک حقیقی انسان کا روپ دھار لیتا۔'' وہ اس پر سو جان سے فدا ہوگئی تھی۔

ابھی وہ اپنی تخلیق کے حسن میں کھوئی ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی وہ خود خیالوں سے حقیقت میں لوٹ آئی، اس نے انتہائی پھرتی سے مجسمے پر چادر ڈال کر اسے ڈھانپ دیا اور دروازہ کھولا۔

دروازے پر شیراز کھڑا تھا۔ وہ شیراز کو دیکھ کر چونک گئی۔ شیراز بے تکلفی سے کمرے میں داخل ہوگیا۔

''ہیلو! خیریت! اتنی رات گئے؟'' سحر نے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

''کیا میرا آنا تمہیں ناگوار گزرا؟'' شیراز نے تلخ

لہجے میں کہا۔ ''اگر ایسا ہے تو میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر شیراز واپس جانے کو مڑا۔

''میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔''

سحر نے شیراز کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

''تو تمہارا کیا مطلب تھا؟''

شیراز کا لہجہ بدستور خفگی آمیز تھا۔

''مجھے تمہارے بے وقت آنے پر تشویش تھی۔ ویسے میں تم سے ملنے کے لئے بے چین تھی۔''

''خوب...... بہت خوب! بے چینی اسی کو کہتے ہیں۔'' شیراز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تم ہی بتاؤ کہ ہماری ملاقات کو کتنے دن گزر گئے ہیں؟''

''شرمندہ نہ کرو ڈیئر! اصل میں کام میں بہت مصروف تھی۔'' سحر نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

''مصروفیت! اچھا بہانہ ہے تم ایک فون بھی نہ کرسکی!'' یہ کہتے ہوئے شیراز کی نظر سیل فون پر پڑی، جو لاپرواہی سے ایک طرف پڑا ہوا تھا اسے دیکھ کر شیراز کے تن بدن میں ایک آگ سی لگ گئی۔ ''اچھا میں بھی کہوں کہ مجھے تمہارے فون سے کوئی جواب کیوں نہیں مل رہا ہے۔''

''جواب اس لئے نہ ملا کہ میں جلد از جلد اپنا کام ختم کرنا چاہتی تھی۔'' سحر نے وضاحت کی۔

''بہانہ بازی نہیں چلے گی۔ صاف صاف کہہ دو، کہ تمہارا دل مجھ سے بھر گیا ہے۔'' شیراز نے غصے میں کہا۔

''میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہ تھی، اس لئے بات بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' سحر، شیراز کے رویہ پر جھنجھلا گئی۔

''میں اتنا پاگل بھی نہیں ہوں کہ بغیر کسی سبب کے بات بڑھاؤں، تم ہی اس چیز کا موقع دیتی ہو۔'' شیراز کا موڈ بدستور بگڑا ہوا تھا۔

''دیکھو ڈیئر! اتنی بھی بدگمانی ٹھیک نہیں۔ دراصل کام میں اتنی انہماک تھی کہ تمہیں کیا خود کو بھی فراموش کر بیٹھی تھی۔''

''اتنی خود فراموشی نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے۔ ذرا تم ہی انصاف کرو، کہ وہ ہستی جس نے خود کو تمہارے لئے وقف کردیا ہو، کیا اسے تمہاری بے اعتنائی مار نہ ڈالے گی۔''

شیراز نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ اپنی چاہت پر اعتماد ہے۔ اس اعتماد کے سہارے ہی تو میں جی رہی ہوں۔ اگر کچھ دیر کے لئے کسی وجہ سے رابطہ قائم نہ کرسکی، تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تمہاری یاد میرے ذہن سے اتر گئی ہے!'' سحر نے نرم لہجے میں کہا۔

''عرصہ گو مختصر ہی سہی مگر میرے لئے قیامت سے کم نہیں!'' شیراز افسردگی سے بولا۔

''شیراز یقین کرو، کہ اگر مجھے تمہارا قرب، تمہارے وجود کی مہک، تمہاری چاہت، تمہاری محبت میسر نہ ہوتی تو میں آج فن کی دنیا میں اس مقام پر کھڑی نہ ہوتی، تمہاری ذات کی قربت، تمہارے خلوص، تمہاری رفاقت کے سہارے ہی میں نے یہ مقام حاصل کیا ہے، کیا تم یہ نہ چاہو گے کہ میں فن کی ان بلندیوں کو بھی چھولوں جو ابھی میری پہنچ سے باہر ہیں۔ بولو...... بولو!'' سحر نے جذباتی آواز میں کہا۔

''شاعری بھی اچھی کرلیتی ہو، میری تو دلی خواہش ہے، کہ تم آسمان فن پر سورج بن کر چمکو۔'' شیراز بولا۔

سحر کی زبان سے اپنی تعریف سن کر وہ دل ہی دل میں خوش ہورہا تھا۔

''تو پھر وعدہ کرو کہ آئندہ تم اتنی چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر ناراض نہیں ہوا کرو گے؟'' سحر نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ شیراز کی طرف بڑھایا، شیراز نے بے ساختہ طور پر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

''اچھا تو ڈیئر، تم ذرا یہاں آرام کرو، میں تمہارے لئے کافی تیار کرکے لاتی ہوں۔''

''نہیں...... اس کی کوئی ضرورت نہیں!''

''کیوں نہیں...... رسم دنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے!'' سحر نے خوش دلی سے کہا۔ اور کافی بنانے کے لئے چل دی۔

اسٹوڈیو میں اب شیراز تنہا رہ گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ لگے ہاتھوں اسٹوڈیو کا جائزہ ہی لے لیا جائے، اس طرح وقت بھی گزر جائے گا اور بوریت بھی نہ ہوگی۔ یہ سوچ کر وہ اٹھا اور اسٹوڈیو کا چکر لگانے لگا، اسٹوڈیو میں بڑی تعداد میں مجسمے تھے۔ لیکن جب وہ تازہ بنائے ہوئے مجسمے کے قریب پہنچا تو اسے حیرت ہوئی کہ خلاف معمول حرکت تھی۔

مجسمہ چادر سے چھپا ہوا تھا۔ سحر نے کبھی بھی کسی سے اپنی کسی تخلیق کو نہیں چھپایا تھا۔ آخر ایسی کیا بات ہے؟ کہ سحر نے اس مجسمے کو دوسروں کی نظر سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ شیراز نے سوچا پہلے تو اس نے سوچا کہ وہ سحر کے آنے کا انتظار کرے اور اس سے اس بارے میں استفسار کرے۔ لیکن پھر اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر اس نے مجسمے کے اوپر پڑی ہوئی چادر یکبارگی اتار پھینکی۔

جونہی مجسمہ بے نقاب ہوا، شیراز کے اوپر سکتہ طاری ہوگیا، وہ مجسمے کو دیکھ کر مبہوت ہوگیا کیونکہ اس نے اس قدر مکمل مردانہ وجاہت آج تک اپنی زندگی میں نہ دیکھی تھی۔

وہ مجسمہ کیا تھا؟ ایک جیتی جاگتی صورت تھی، جس کی خوب صورتی نے شیراز کی آنکھوں کو خیرہ کرکے رکھ دیا تھا۔

مجسمے کو دیکھ کر اس نے دل ہی دل میں سحر کی فنکارانہ چابکدستی کی داد دی، لیکن اس کے ساتھ وہ مجسمے کے حسن کامل کو دیکھ کر احساس کمتری کا شکار ہوگیا کیونکہ مجسمے کے سامنے اس کا حسن ماند پڑ گیا تھا۔

اس کے دل میں مجسمے کے بارے میں حسد کے جذبات نے جنم لینا شروع کردیا۔ اس نے سوچا کہ اس مجسمے کی تیاری میں سحر نے اپنا خون جگر صرف کیا ہوگا، اسے شک گزرا کہ اس کے علاوہ کوئی اور ہستی ہے جس سے سحر جنون کی حد تک عشق کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس قدر مکمل اور بے عیب حسین مجسمہ وجود میں نہ آتا اور پھر مجسمے کو چادر سے چھپانے کا کیا جواز تھا۔

شاید اس لئے کہ وہ اپنے حقیقی محبوب کو اس کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ نکلا کہ وہ اب تک مجھ سے فریب کررہی تھی۔

ابھی وہ خیالات کے بھنور میں گھرا ہوا مجسمے کے سامنے بے خود سا کھڑا تھا، کہ سحر کافی لے کر آ گئی۔

''کہو مجسمہ پسند آیا؟''

سحر نے شیراز سے پوچھا۔

سحر کی آواز شیراز کو دوبارہ ہوش کی دنیا میں لے آئی۔ ''ہر لحاظ سے مکمل اور بے عیب، آج تک ایسا شاہکار میری نگاہوں سے نہیں گزرا۔'' شیراز نے کہا۔

''عزت افزائی کا شکریہ!'' سحر بولی۔

''مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' شیراز گویا ہوا۔

''وہ کیا؟'' سحر نے پوچھا۔

''کہ تم نے اپنے معمولات کے برعکس اس پر چادر کیوں ڈال رکھی تھی؟'' شیراز نے دریافت کیا۔

''میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتی تھی۔'' سحر مسکراتے ہوئے بولی۔

''یا یوں کہو کہ اپنے اصل محبوب کو مجھ سے چھپانا چاہتی تھی۔'' شیراز بولا۔

سحر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''یہی کہ تم کسی کے عشق میں جنون کی حد تک گرفتار ہو۔''

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟'' سحر بولی۔

''ظاہری بات ہے۔ جب تک تم کسی سے متاثر نہ ہوگی۔ اس کے عکس کو کس طرح مجسم کروگی؟''

''دلیل تو لاجواب ہے!'' سحر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تو پھر تسلیم کرلو کہ تمہیں کسی اور سے عشق ہے!''

شیراز نے کرب آلود انداز میں کہا۔ ''تمہارا رویہ اس مجسمے کی تیاری میں تمہاری لگن اور تمہارا انہماک اس بات کی غمازی کرتا ہے اس سے پہلے بھی تم مجسمے تراشتی چلی آئی ہو۔ مگر اتنا انہماک پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔'' شیراز بولا۔

''ایک لحاظ سے تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔'' سحر نے

ہار مانتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس صورت سے عشق ہے، مگر یہ صورت کسی جیتی جاگتی ہستی کی نہیں ہے، بلکہ میرے تصورات کا عکس ہے، ابتداء ہی سے یہ چہرہ میرے تصورات پر چھایا ہوا تھا۔ اس چہرے کی تلاش میں ہی میں سرگرداں رہی!'' سحر شیراز کو بتارہی تھی۔

اور شیراز بڑے انہماک سے اس کی باتیں سن رہا تھا، لیکن دل و دماغ عجیب و غریب خیالات کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ اس کے دل میں جذبات کا طوفان موجیں لے رہا تھا۔ سحر کے اعتراف کو اپنی توہین سمجھ رہا تھا۔ کیونکہ مجسمے کی تعریف سے اسے اپنی سبکی محسوس ہورہی تھی۔

''اس چہرے نے مجھے یہ فن اپنانے پر مجبور کیا۔ ناراض نہ ہونا، مگر مجھے یہ کہنے میں بالکل عار نہیں کہ میں تمہاری طرف بھی صرف اور صرف اس لئے راغب ہوئی تھی کہ تم میں اس چہرے کی ہلکی سی شباہت مجھے محسوس ہوئی تھی، آج میں بہت خوش ہوں کہ میری یہ خواہش مجسم ہوگئی ہے، کاش میں اس بات پر قادر ہوتی کہ اس کے اندر روح پھونک دیتی، مجھے اس سے عشق ہے، اور رہے گا!'' سحر اپنی رو میں بولتی جارہی تھی۔

سحر کی یہ باتیں شیراز کے احساس پر کوڑے برسا رہی تھیں ان باتوں کی وجہ سے شیراز نے جو تصورات کے محل تعمیر کئے تھے۔ وہ مسمار ہوگئے تھے وہ خود کو خلا میں معلق محسوس کررہا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ سحر اس قدر سنگدل بھی ہوسکتی ہے جس نے بے دردی سے اس بات کا اعتراف کیا کہ اس مجسمے کے مقابلے میں وہ ایک بے حقیقت شے ہے۔ اس کے اعصاب منتشر ہوگئے تھے۔ اس کے ذہن میں صرف یہ خیال گردش کررہا تھا کہ سحر نے اسے وقتی طور پر اپنے ذہنی سکون کے لئے استعمال کیا ہے۔ وہ اب تک سحر کے ہاتھوں کھلونا بنارہا تھا۔

''تو...... تم پتھروں کے ساتھ رہتے رہتے پتھر ہوگئی ہو، تم ایک بے حس لڑکی ہو۔ کیا میں ایک کھلونا تھا۔ تم نے میری توہین کی ہے اور میں اپنی توہین برداشت نہیں کرسکتی، میں نے تمہیں بے لوث ہوکر، ٹوٹ کر چاہا، میری چاہت کا اچھا صلہ دیا تم نے......!''

نیک بیوی

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن بندہ نے تقویٰ کی نصیحت کے بعد کوئی ایسی بھلائی حاصل نہیں کی جو اس کے حق میں نیک بیوی سے بڑھ کر ہو۔ پھر نیک بیوی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔ اگر شوہر اسے حکم کرے تو اس کا کہا مانے اور شوہر اس کی طرف دیکھے تو شوہر کو خوش کرے اور اگر شوہر کسی کام کے بارے میں قسم کھا بیٹھے کہ ضرور تم ایسا کروگی تو وہ کام شرعاً جائز ہو تو اس کی قسم پوری کردے اور اگر وہ کہیں چلا جائے اور یہ اس کے پیچھے گھر میں رہ جائے تو اپنی جان اور اس کے مال کے بارے میں اس کی خیر خواہی کرے۔

(حافظ علی۔ کراچی)

سحر کے سامنے وہ چلایا۔

''شیراز...... شیراز ہوش میں آؤ۔ خدا کے لئے خاموش ہوجاؤ۔'' سحر طیش میں بولی۔

''خاموش کیوں ہوجاؤں، سچی بات نہیں سن سکتی۔ تم نے آخر مجھے کیا سمجھ رکھا تھا۔ میں کوئی گری ہوئی چیز تھا۔ میں اپنی توہین کا انتقام لوں گا۔'' شیراز بدستور چلا رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک بار پھر مجسمے پر پڑی۔

''اگر میں تمہیں حاصل نہیں کرسکا تو تم بھی اپنی پسندیدہ چیز کو حاصل نہیں کرسکو گی، تم نے مجھے میں احساس محرومی پیدا کیا ہے، تو میں تمہیں بھی محرومی کے احساس کا شکار کردوں گا۔'' یہ کہہ کر شیراز نے میز سے ایش ٹرے اٹھایا، اور مجسمے کی جانب زور سے پھینکا، مگر خوش قسمتی سے اس کا نشانہ خطا ہوگیا اور ایش ٹرے مجسمے کے اوپر سے گزر گیا۔

''شیراز پاگل ہوگیا۔'' سحر نے اسے پکڑنے کی کوشش کی، مگر وہ اس کے قابو میں نہ آیا۔

شیراز کو اسٹوڈیو میں لوہے کی ایک سلاخ مل گئی۔

وہ سلاخ لے کر مجسمے کو توڑنے کے لئے دیوانہ وار آگے بڑھا، سحر نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا، سحر کے اس عمل سے مجسمہ تو محفوظ رہا، مگر سلاخ کا اچٹتا ہوا وار اس کے کندھے پر پڑا، اس نے پوری طرح کوشش کی کہ شیراز کا غصہ ختم ہوجائے، مگر صورت حال کو قابو سے باہر نکلتا دیکھ کر اسے بھی غصہ آ گیا۔ وہ بولی۔

''میں تمہیں اتنا سنگ دل اور کم نظر نہیں سمجھتی تھی۔ خیر اگر ... ٹھنڈا ہوجائے تو آ جانا۔''

''ہونہہ ... ! بھول جاؤ کہ میں اب واپس آؤں گا ... تم اپنا دل ان ہی پتھروں سے بہلاؤ، لیکن یاد رکھنا ہر صورت اپنی توہین کا بدلہ لوں گا۔'' اس وقت شیراز کی آنکھوں میں چمک تھی۔

☆......☆......☆

رات کے تقریباً دو بجے ہوں گے کہ اچانک سحر کی آنکھ کھل گئی، اسے محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی موجود ہے، اور اسے آواز دے رہا ہے، وہ گھبرا کر بستر سے اٹھی، اتر کر بجلی کا بٹن دبایا، کمرے میں کسی وجود کا نام و نشان نہ تھا، اس نے یہ سوچ کر کہ یہ اس کا وہم تھا، اپنے آپ کو تسلی دی، اور بتی بند کر کے دوبارہ بستر پر لیٹ گئی۔

کچھ دیر کے بعد اسے پھر کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا، اس بار کسی نے واضح آواز میں اسے آواز لے کر پکارا تھا، آواز نسوانی تھی اور شناسا معلوم ہو رہی تھی، اس بار بھی اس نے اسے وہم سمجھ کر ذہن سے جھٹک دینا چاہا، مگر آواز کے تسلسل نے اسے ایک بار پھر بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

لائٹ جلائی، مگر کمرے میں اس کے علاوہ کوئی اور ذی روح نہیں تھا۔ اس وقت اس کا ذہن عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا تھی، عجیب وغریب قسم کے خیالات اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے، وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ کون سی ماورائی ہستی ہے۔ جو اسے آواز دے رہی ہے۔ بھوت ... پریت، آسیب وغیرہ کا وہ قائل نہیں تھی۔

ابھی وہ اس اسرار کی گتھی کو سلجھانے سے قاصر تھی کہ اسٹوڈیو کی چابی اٹھائی اور اسٹوڈیو کی جانب قدم بڑھانے لگی، اس کا یہ عمل قطعی طور پر غیر ارادی اور بے ساختہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی نادیدہ قوت اسے اسٹوڈیو کی جانب جانے پر مجبور کر رہی تھی۔

سحر نے میکانکی انداز میں اسٹوڈیو کا تالا کھولا اور اس میں داخل ہوگئی۔

جونہی اس کی نظر اس جگہ پر پڑی، جہاں وہ حسین مجسمہ رکھا ہوا تھا، اس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔

مجسمہ اپنی جگہ سے غائب تھا۔ وہ حیران ہوگئی اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجسمہ کس طرح وہاں سے غائب ہوگیا کیونکہ اسٹوڈیو کا دروازہ مقفل تھا۔ اور کھڑکی بھی بدستور بند تھی۔

سحر نے گھبرا کر اسٹوڈیو کا چکر لگایا لیکن جب وہ دوبارہ اس جگہ پہنچی تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ مجسمہ اپنی جگہ پر موجود تھا۔

ابھی وہ اسی کشمکش میں تھی کہ اس نے محسوس کیا کہ مجسمے کی آنکھیں روشن تھیں اور اسے دعوت دے رہی تھیں پھر اس نے مجسمے کی آنکھوں میں اور بازوؤں میں حرکت محسوس کی، مجسمہ نے بانہیں کھول کر اسے اپنی طرف بلایا تو وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھی۔

پھر جب اسے ہوش آیا تو وہ کافی تکلیف و درد کی حالت میں بستر پر پڑی تھی۔

اس کا خیال رکھنے کے لئے اس کی بوڑھی ملازمہ تھی جو طویل مدت سے اس کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ اس نے سحر کو سمجھانے کی کوشش کی، کہ جب سے یہ مجسمہ بنا ہے تب سے ہی کچھ انہونیاں شروع ہوگئی ہیں، مگر سحر نے ہنستے ہوئے اس کی باتوں کو ٹال دیا تھا۔

پھر ایک رات جب سحر اپنی ہی دھن میں ایک دعوت سے واپس گھر آ رہی تھی۔ اس نے گاڑی کی ہیڈ لائٹ کی روشنی میں ایک انسان کو ہاتھ ہلاتے ہوئے دیکھا۔ باہر شدید بارش ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ جان گئی تھی کہ کوئی آدمی مدد مانگ رہا ہے۔ اس نے

اپنی گاڑی اس آدمی کے پاس روک دی، تو وہ آدمی فوراً ہی گاڑی میں شکریہ کہتے ہوئے آبیٹھا۔
سحر حیران رہ گئی کہ وہ ہو بہو اس کے دل و دماغ میں رچا ہوا چہرہ تھا۔ سحر کی حیرانی بھانپ کر وہ بولا۔
''کیا ہوا؟ شاید تم مجھے مجسم دیکھ کر حیران ہوگئی ہو۔''
''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' سحر بولی۔
''محبت کچھ بھی کرسکتی ہے۔ بس تمہاری محبت نے مجھے بھی زندہ کردیا ہے، آؤ، اور میری بانہوں میں سما جاؤ۔'' اس نے اپنی بانہوں کو کھولتے ہوئے کہا۔ تو سحر کسی معمول کی طرح اس کی بانہوں میں سما گئی۔
مدتوں سے پیاسی روح سیراب ہو رہی تھی۔
جب باہر کی بارش اور اندر کا طوفان تھما، تو سحر نے شرماتے ہوئے اپنی پلکیں اٹھا کر اس کو دیکھا اور حیران رہ گئی۔ وہاں اس کا محبوب چہرہ نہیں تھا بلکہ شیراز تھا۔
''تم......!'' سحر کے منہ سے نکلا۔
''ہاں......میں......ہاہاہا......!''
سحر کی حیرانی پر شیراز نے کہا۔ اور قہقہہ لگایا۔
''لیکن......یہاں......تو......وہ......پھر تم کیسے......؟''
''سحر میں نے کہا تھا ناں کہ میں اپنی بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔''
''لیکن میں نے تمہاری بے عزتی نہیں کی تھی۔'' سحر غصہ سے بولی۔
''اگر ایسا تھا تو تم نے میری خبر گیری کیوں نہ کی۔ میں ناراض ہو کر تمہاری طرف سے چلا گیا تھا۔ پھر کئی روز تک میں نے تمہارا انتظار کیا۔ جب تم نہ آئی تو میں نے ایک رات جنون کے عالم میں خودکشی کرلی۔
میری روح کو مرنے کے بعد بھی چین نہ ملا پھر میں نے عہد کیا کہ تمہیں اس مجسمے کے روپ میں آکر لوٹ لوں گا۔ اور پھر تمہیں بھی پتھر بنادوں گا، بالکل اسی طرح......جیسے تمہارا محبوب ہے، پھر تم دونوں کسی آرٹ روم میں اکٹھے رہنا......!'' یہ کہتے ہوئے شیراز کی بدروح نے سحر کی گردن تھام لی۔
سحر تڑپتی رہی......اور پھر آہستہ آہستہ اس کا سارا وجود پتھر کی مورت میں تبدیل ہوگیا۔

☆......☆......☆

''ارے یار یہ گاڑی درمیان میں کھڑی کیوں ہے؟ جب تک یہ درمیان سے ہٹے گی نہیں......ہم آگے نہیں جاپائیں گے۔''
''وہ دو دوست تھے جو کہیں جارہے تھے۔ لیکن اب سڑک کے درمیان میں کھڑی گاڑی نے ان کا راستہ روک لیا تھا۔ ان میں سے ایک جب ہارن دے دے کر تھک گیا تو کچھ سوچتے ہوئے گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ سڑک کے درمیان میں کھڑی گاڑی کے قریب آکر وہ جھکتے ہوئے بولا۔
''ارے......!''
اس کا جملہ پورا نہ ہوپایا، کیونکہ شدت حیرت اس کی زبان گنگ ہوکر رہ گئی۔ اسے یوں حیران کھڑا دیکھ کر اس کا دوسرا دوست بھی نیچے اتر آیا اور جب اس نے گاڑی میں اندر جھانک کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک لڑکی کا حسین و جمیل مجسمہ رکھا ہوا تھا۔
دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ان میں سے ایک نے پولیس کو فون کردیا، پولیس نے آتے ہی گاڑی میں سے مجسمہ نکالا اور گاڑی میں رکھے کاغذات چیک کیے۔ ''یہ گاڑی کسی سحر نامی لڑکی کے نام پر تھی۔'' پولیس نے کاغذات پر درج پتے پر رابطہ کیا۔
تو سوائے بوڑھی ملازمہ کے کوئی نہ ملا، بوڑھی ملازمہ کو جب مجسمہ دکھایا گیا تو اس نے عجیب و غریب باتیں کیں، پولیس نے ان باتوں کو اہم نہ سمجھتے ہوئے گاڑی سے برآمد ہونے والا مجسمہ اسی گھر کے آرٹ روم میں رکھوا دیا جہاں کی مالکن لاپتہ تھی، اور جس کے ہاتھ کے تراشے ہوئے بے تحاشا مجسمے وہاں پہلے سے موجود تھے۔
ہاں ایک خوب صورت مجسمے کے پہلو میں اس مجسمے کو رکھ کر مالکن کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرلی گئی۔



عشق ناگن

ایم الیاس

آخری قسط

چاہت خلوص اور محبت سے سرشار دلوں کی انمٹ داستان جوکہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی کہ دل کے ہاتھوں مجبور اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے بے شمار جان لیوا اور ناقابل فراموش مراحل سے گزرتے ہوئے بھی خوشی محسوس کرتے ہیں اور اپنے وجود کے مٹ جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ یہ حقیقت کہانی میں پوشیدہ ہے۔

یہ دنیا رہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔ انہی الفاظ کو احاطہ کرتی دلگداز کہانی

دو دن اور دو طویل راتیں اس نے زندگی اور موت کے درمیان گزاریں......

وہ خون شام حشرات الارض اس کی شریانوں سے جوہرحیات چوس کر دراہی دیر میں غائب ہوگئے تھے۔

وہ اس کے بعد زمین پر رینگ رینگ کر اپنی تکلیف کو بھلانے کی کوشش کرتا رہا لیکن بے سود..... بھوک اور پیاس سے نقاہت کا احساس اور گہرا ہوتا جارہا تھا۔ رات کی شدید سردی میں پیاس کے باعث اس کی زبان حلق سے باہر نکل پڑی۔ آنکھوں میں درد کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ سر میں شدید دھمک اس طرح ہو رہی تھی جیسے کوئی ہتھوڑی سے ضربیں لگا رہا ہو...... اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے دنیا کی تمام صعوبتیں شیوناگ کے اشارے پر یک جا ہو کر اس پر ٹوٹ پڑی ہوں......

تیسری شام ایک سیاہ رنگ کا نہایت جسیم پرندہ آسمان پر پرواز کرتا اس احاطے میں آیا۔

پروں کی خوفناک پھڑپھڑاہٹ پر اس نے چونک کر پھٹی پھٹی دہشت زدہ آنکھوں سے اس بدنما اور مکروہ قسم کے پرندے کو دیکھا...... اسے ایک موہوم سا خیال آیا کہ شاید وہ مر چکا ہے اور کوئی مردہ خور گدھ اس کی بو پا کر اپنی چونچ سے اس کی لاش کو ادھیڑنے کے لئے آپہنچا ہے۔ اب وہ اس کی بوٹیاں نوچ نوچ کر شکم سیر ہو کر چلا جائے گا۔

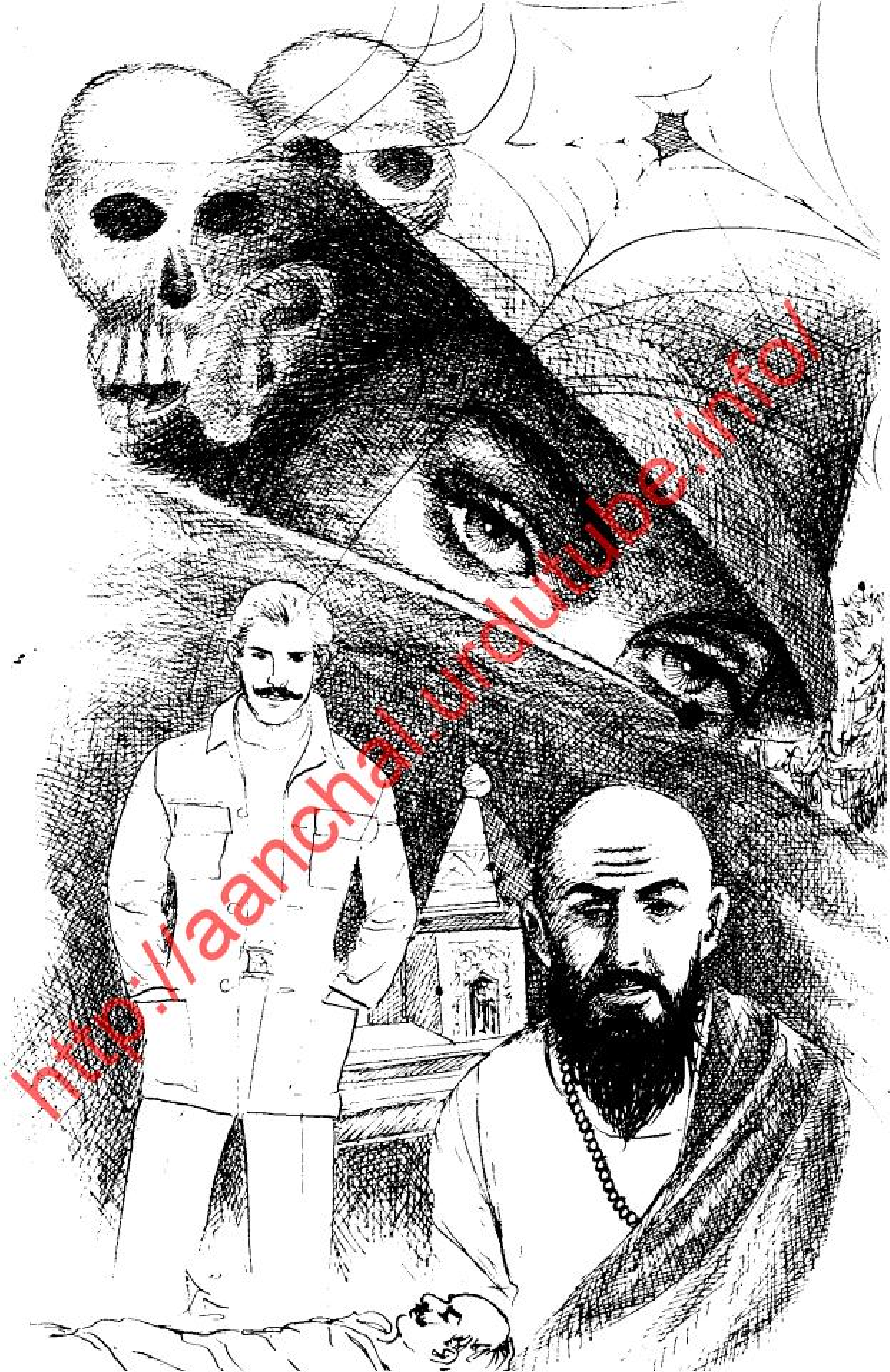
مگر اس کا یہ خیال جلد ہی باطل ثابت ہوگیا اور اس کی سوچ اور اندازہ غلط ہوتا دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ اس سیاہ پرندہ نے زمین پر قدم رکھتے ہی ایک کریہہ چیخ ماری اور پھڑپھڑایا۔ یہ دیکھ کر دوسرے لمحے وہ ساکت اور بے جان سا ہو کر رہ گیا تھا۔ کیوں کہ اس کا ازلی اور بدترین دشمن شیوناگ وہاں موجود تھا۔

شیوناگ نے استہزائیہ انداز سے ایک مکروہ قہقہہ لگایا اور مسکراتا ہوا اس کے پاس آیا اور لٹکی ہوئی زبان کو زور سے اندر کھینچ کر بولا۔

''کیا تو یہ سمجھ رہا ہے کہ موت تجھے پل بھر میں موت کی آغوش میں لے لے گی...... اگر میں اب بھی تجھے مرنے کہاں دے رہا ہوں......؟''

آکاش کی نگاہوں میں فریاد اور التجا سمٹ آئی مگر اس شقی القلب کے چہرے پر رحم کے آثار نظر نہ آئے۔ مگر وہ پہلی بار اس وقت اندھا محسوس ہو رہا تھا۔ جوش انتقام کا ایسا جنون اس پر سوار تھا کہ ہر لطیف جذبے کو خیر باد جیسے کہہ چکا تھا۔

شیوناگ کے ایک اشارے پر پراسرار طور پر کہیں



سے ایک دبلا پتلا مخنی سا شخص ایک صراحی اور پیانہ لئے نمودار ہوا۔ اس کے پتلے پتلے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر سفاکانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اس نے قریب آ کر صراحی سے زردی مائل سیال شیشے کے پیانے میں انڈیلا اور پیانہ اس کی طرف اس طرح بڑھا دیا جیسے بہت بڑی دیا کر رہا ہو۔

اس نے دل میں پل بھر کے لئے سوچا کہ اپنی تمام شقی القلبی، بہیمت اور درندگی کے باوجود بھی دل کے کسی کونے میں رحم کی رمق موجود ہے۔ اس نے نقاہت سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بے صبری کے ساتھ وہ پیانہ لیا...... انگوری شراب کی لطیف بو اس کی نتھنوں سے ٹکرائی۔ اس نے بے تابی کے ساتھ پیانہ اپنے پیاسے ہونٹوں کی طرف بڑھایا۔ ہاتھوں میں ایسی کمزوری تھی کہ وہ بے جان سے لگ رہے تھے۔ اس نے پیانہ تھاما ہی تھا کہ ہاتھوں کی کپکپاہٹ کے باعث پیانے میں سے آدھی شراب زمین پر گر گئی۔

جوں ہی شراب کا وہ ساغر اس کے ہونٹوں کے قریب پہنچا اور اس کی باہر لٹکی ہوئی پیاسی زبان پیانے کو چھونے کے لئے آگے کی طرف سرعت سے لپکی...... شیوناگ کی داہنی ٹانگ حرکت میں آئی اور شیشے کا پیانہ اپنے پیاسے ہونٹوں کی طرف بڑھایا۔ ہاتھوں سے اڑ کے خاک پر گر کر بے شمار ننھے ننھے ریزوں میں تبدیل ہو گیا۔

اس کی آنکھوں میں یک بیک نفرت کے الاؤ دہک اٹھے اور پیاس ایک دم ناقابل برداشت ہو گئی۔ حلق میں کانٹوں کی چبھن اور آنتوں میں شدید اینٹھن ہونے لگی۔

اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے دانتوں سے شیوناگ کا نرخرہ چیر ڈالے اور اس کے ناپاک خون سے اپنا گلا تر کرلے لیکن وہ بے بسی سے فرش پر بڑا نفرت اور غصے کی کیفیت میں کانپتا رہا اس کے لئے اپنی جگہ سے جنبش کرنا بھی دشوار تھا پھر شیوناگ کے اشارے پر وہ مخنی سا شخص اس کی پیاسی زبان سے ذرا دور...... صراحی سے شراب کے قطرے خشک زمین پر ٹپکانے لگا۔ اس نے سخت اذیت کے باوجود اپنے بدن کو قدرے آگے گھسیٹا تاکہ شراب کی ایک ایک آدھ بوند ہی سے اپنا حلق تر کرسکے...... لیکن وہ سفاک شخص صراحی کو اور پیچھے ہٹاتا گیا۔ اس ذلیل اور کمینے شخص کی آنکھیں انجانی سی مسرت سے چمک رہی تھیں۔

وہ کافی دیر تک یوں ہی ترستا اور ماہی بے آب کی طرح تڑپتا اور پھڑپھڑاتا رہا تھا۔ اس کی حالت مرغ بسمل سے بھی بدتر اور ناگفتہ سی ہو رہی تھی...... دشمن اس کے ساتھ ایسی بربریت کرے گا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

اس ذلیل اور کمینے اور شقی القلب شخص نے صراحی کا آخری قطرہ تک خشک زمین پر انڈیل دیا...... لیکن اس کی اینٹھی ہوئی زبان کو اس حیات آفرین تک پہنچنے نہیں دیا۔ ایک قطرہ تک حلق میں ٹپکانے کا سوچا تک نہ تھا۔

سورج ڈھلنے تک شیوناگ اسے ترسا ترسا کر...... اس کی احساس بے بسی کو بیدار کرکے خوش ہوتا رہا اور جب ہر سو ظلمات کی چادر پھیل گئی تو اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا...... فضا میں گرد و غبار کا ایک مہیب بگولا بلند ہوا...... اس کے حلق اور نتھنوں میں مٹی کے ذرات کے باعث خارش ہونے لگی۔ اور پھر آنکھوں میں آنسوؤں کا جو بند تھا وہ اک دم سے ٹوٹ پڑا۔

جب غبار کا وہ طوفان تھما تو اس نے دیکھا کہ چھت کے سائے سے محروم مٹی کی دیواروں والا وہ احاطہ سیاہ پتھر سے بنے ہوئے ایک مندر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ در و دیوار پر ہر طرف دیوی دیوتاؤں کے نامناسب اور شرمناک مجسمے بہت ابھرے ہوئے اور نمایاں تھے۔ دیوار گیر مشعلوں کی روشنی میں پتھر کا ہر بت انسان میں چھپے ہوئے حیوانی جذبوں کی علامت بنا ہوا تھا۔

اس مندر کے ایک سرے پر لکڑی کی اونچی سی مسند تھی جس کے قریب ہی دیوار میں ایک قد آدم طاق نظر آیا تھا۔ شیوناگ نے نیچے جھک کر بے رحمی کے ساتھ اس کا ہاتھ تھاما اور اس کے زخمی بدن کو پختہ فرش پر بری

طرح گھسیٹا اور اس طاق کی طرف لے چلا۔ وہاں پہنچ کر اس نے آکاش کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے طاق پر بٹھا دیا۔ اس وقت نقاہت اور پیاس کے باعث اس کے لئے سیدھا ہونا مشکل تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے اپنی جگہ سے سکڑتے محسوس ہورہے تھے۔ لیکن شیوناگ کی پراسرار قوتوں کے زیر اثر وہ طاق میں سیدھا بیٹھا رہا۔ ورنہ اس کے بغیر ناممکن سا تھا۔

پھر شیوناگ اس کے سامنے کھڑا ہو کر بلند آواز میں نامانوس بول پڑھنے لگا۔ اس کے بدن سے آہستہ آہستہ رہی سہی توانائیاں بھی تحلیل ہونے لگیں اور جب وہ خاموش ہوا تو دیکھنے سننے اور سمجھنے کے علاوہ ہر قوت سے محروم ہو چکا تھا۔

خوف اور آنے والے لمحوں کی دہشت سے اس کا دل ڈوبا جارہا تھا۔ وہ عمل کی قوتوں سے محروم ہو چکا تھا اور آثار سے صاف ظاہر تھا کہ شیوناگ اب وہ سب کچھ کرنے والا ہے جس کے تذکرے ہی سے اس کے وجود میں تھرتھری پیدا ہوگئی تھی۔ اس نے اندازہ کیا کہ چکر پوجا شروع ہونے والی تھی۔

اس پر ہیبت مندر میں سکوت کے کچھ لمحے اور گزرے۔

پھر فضا کسی نادیدہ سنکھ کے شور سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ اس مندر کی فضا میں عجیب سی بے چینی ابھرتی محسوس ہوئی، جیسے کچھ نامعلوم اور پراسرار سائے مندر کی فضا میں ادھر ادھر سرسرائے پھر رہے ہوں۔

آخر کار سنکھ کی وہ آواز دم توڑ گئی۔ شیوناگ فضا میں اچھلا اور چھت کی گولائی میں ابھرے ہوئے کالی کے مجسمے کو چھوتا گزرتا ہوا مندر کے دروازے کے قریب فرش پر جا ٹکا۔ دروازے کے باہر قدموں کی غیر نامانوس آہٹیں گونج رہی تھیں ان کا آہنگ بتا رہا تھا کہ آنے والوں کا رخ اسی جانب ہے۔

پھر یک بیک اس کا دل دھڑک کر حلق میں آ گیا۔ اس نے چیخنا چاہا لیکن آواز ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اس کی آنکھیں دہشت، مسرت، خوف اور بے بسی کے ملے جلے امتزاج سے کشادہ ہوگئیں۔

اس دروازے سے اس کی محبوب بیوی نیلم مندر میں داخل ہورہی تھی۔

تقریباً ایک برس کی طویل، کرب ناک، اذیت اور انتظار کی جان لیوا مدت کے بعد اس کی پیاسی اور بے قرار نگاہوں نے اسے دیکھا تھا...... وہ اجنبی دنیا کی قیدی تھی اور آج پہلی بار آزاد فضاؤں میں نظر آئی تھی۔ اس کی وسیع و عریض دنیا کی غزالی آنکھوں میں بلا کی تازگی اور معصومیت رچی ہوئی تھی۔ چہرے پر حیا کی سرخ شفق کے دل فریب لہریے بکھیر رہی تھی۔ اس کا سبک اور پر شباب گداز بدن آج بھی یوں ہی رعنائی کا شکار نظر آیا تھا۔ جیسے اس کے بدن پر کسی کی نظریں تک نہ پڑی ہوں۔ اس کے انداز خرام میں بلا کی بے نیازی اور عزم نمایاں تھا۔ ایک پروقار تمکنت سی تھی۔ چہرے پر گھمبیر سنجیدگی طاری تھی...... ہونٹ تھے کہ قدرے بھنچے ہوئے تھے۔ اس کا سیاہ لباس اس کے حسن کو سوز اور جلا بخش رہا تھا۔

اس کے پہلو میں ہی ایک طویل قامت اور خوبرو مرد چلا آرہا تھا۔

اس کے شانے چوڑے اور بدن کسرتی تھا۔ رنگ سرخ و سفید اور نقوش دل فریب تھے۔ سرخ بالوں کے خم دار لہریوں کے نیچے کشادہ پیشانی پر سیاہ رنگ کا ایک ننھا سا داغ تھا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں جوش اور جوانی کی چمک نمایاں تھی۔ اونچی سی عقابی ناک کے نیچے پتلے پتلے ہونٹوں پر زندہ مسکراہٹ رقصاں تھی اور اس کا داہنا ہاتھ اس کی پیاری بیوی نیلم کی کمر کے گرد حمائل تھا۔

جوں ہی وہ دونوں اندر گھسے شیوناگ نے بے اختیار مرد کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

اس مرد نے تکبر اور نخوت کے ساتھ شیوناگ کے سر کے بالوں کی جگہ اگے ہوئے ننھے ننھے بے شمار سانپوں کو چھوا اور مسند کی طرف بڑھنے لگا۔ نیلم کی آنکھیں بے قراری کے ساتھ اس مندر میں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے کئی بار آکاش کی طرف دیکھا

لیکن اس کی نگاہیں سرسری طور پر اس پر سے پھسلتی چلی گئیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ اسے پہچان ہی نہ سکی ہے یا شیوناگ کی پراسرار قوتوں کے زیر اثر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوں۔

نیلم اور اس ہمراہی کے پیچھے...... حسن و شباب کا نگاہوں کو خیرہ کردینے والا ایک ہجوم تھا جس میں بہت سی نوجوان اور طرح دار لڑکیاں سروں کو مودبانہ انداز سے جھکائے چلی آرہی تھیں۔ اس کے بعد مردوں کا ایک گروہ اندر آیا۔ وہ سب بھی وجاہت اور مردانگی کے اعتبار سے ہزاروں میں یکتا تھے۔

جب یہ جلوس اندر داخل ہوگیا تو نیلم کا ہمراہی مرد، حاکمانہ انداز میں چوبی مسند پر بیٹھ گیا۔ شیوناگ اس کے قدموں میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ نیلم کھوئے کھوئے انداز میں اپنی جگہ کھڑی بے چینی سے کسی کو تلاش کرتی رہی اور جب اسے کوئی شناسا نظر نہ آیا تو اس کی آنکھوں میں محرومی کے سائے لرزنے لگے اور چہرہ تاریک ہوتا چلا گیا۔

''کہاں ہے وہ مجھے نظر نہیں آیا......'' نیلم مسند کی طرف مڑ کے بھرائی ہوئی آواز میں بولی تو اس کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ شاید اس بدنصیب کو اس سے ملاقات کا فریب دے کر چکر پوجا کے لئے لایا گیا تھا۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اس کا جی چاہا کہ لپک کر نیلم کو سینے سے لگالوں۔ چیخ کر اسے بتاؤں کہ وہ اس کی نگاہوں کے سامنے عذاب اور محرومی میں مبتلا کر کے طاق میں سجادیا گیا ہے...... لیکن وہ کچھ بھی نہ کرسکا۔ شیوناگ کی ہر پیشین گوئی درست تھی۔ اس کے وجود پر موت کا سا جمود مسلط کردیا گیا تھا۔

''اسے بھول جاؤ نیلم......!'' مسند پر بیٹھے ہوئے شخص نے بارعب آواز میں اس سے کہا۔ ''تم کیوں اور کس لئے اس قدر پریشان اور متفکر ہورہی ہو اور اپنی زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے۔ تمہیں کیا اب بھی اس بات کا احساس نہیں ہوا ہے کہ وہ ہرجائی تھا...... وہ تمہیں بھول کر اپنی راتیں دوشیزاؤں اور ہر حسین جواں سال عورتوں سے رنگین کر کے گزارتا رہا ہے اور آج بھی وہ کسی کلی کو پھول بنارہا ہوگا۔ میں تمہیں ایک بات بتادوں کہ اب اس کی آوارگی رنگ لارہی ہے۔ وہ کسی خارش زدہ کتے کی طرح موت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے اور موت اس کے سائے تک سے خوف زدہ ہے اور اس سے دور بھاگ رہی ہے۔''

''نہیں...... نہیں...... تم جھوٹے ہو فریبی...... دغا باز اور مکار...... کیا میں اسے نہیں جانتی جو تم مجھے اس کے خلاف زہر اگل کر میرے دل میں نفرت پیدا کررہے ہو...... بدظن کررہے ہو......'' وہ اپنا چہرہ اپنے دونوں خوب صورت ہاتھوں کے پیالے میں چھپا کر رو پڑی۔ ''میرا محبوب میرا پتی ایک دیوتا کی طرح ہے۔ وہ ایسا نہیں ہوسکتا...... وہ مر کر بھی بے وفائی نہیں کرسکتا؟ بتاؤ وہ کہاں ہے؟'' نیلم نے بے خوفی سے ایسی ایسی کھری باتیں سنائی تھیں کہ کوئی اور اس کے منہ پر کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن نیلم نے کہہ دیا تھا۔ بڑی بے خوفی سے، اس کا بس چلتا تو وہ اس کے منہ پر تھوک دیتی۔ یہ جسارت محبت نے اس میں پیدا کی تھی۔

''سنکھ شروع کرو......'' مسند والے کا چہرہ لحظہ کے لئے متغیر سا ہوا تھا۔ پھر اس بے غیرت نے نیلم کو نظر انداز کرتے ہوئے بے رحمانہ آواز میں کسی کو حکم دیا اور مندر کی فضا سنکھ اور ناقوس کی منحوس اور بے ہنگم آوازوں سے لرز اٹھی۔

نیلم روتی ہوئی زمین پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں کے درمیان جاگری۔ اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے اندر اس کا دل کٹ رہا ہو۔ وہ تیز چھریوں کی دھار اپنی ہر سانس کے ساتھ محسوس کررہا تھا۔ وہ لوگ بلا کے سنگ دل اور سفاک تھے۔ ان کے نزدیک نہ جذبے قابل احترام تھے اور نہ ہی آبرو کی کوئی قدر تھی۔ وہ خوب سمجھ رہا تھا کہ مسند پر بیٹھا ہوا شخص ہی ناگ راجہ ہے۔ وہی اس کا رقیب اور نیلم کی آبرو کا دشمن ہے۔ اس نے نیلم کو زیر کرنے کے لئے یہ بھیانک ناٹک رچایا ہے۔

ناگ راجہ کی مسند کے عقب میں شیو دیو کا ایک

بے ہنگم اور کراہیت آمیز سنگی مجسمہ نصب تھا۔
اس کے دائیں بائیں اس کی عورتوں کے حیا سوز مجسمے سر اٹھائے کھڑے تھے پاربتی کا بدن لباس سے یکسر محروم اور پوری طرح نمایاں تھا درگا مائی، کالی دیوی اور اوما دیوی کے مجسمے بھی اس سے کچھ کم نہ تھے۔ ان سنگی دیوی، دیوتاؤں کے ہوس میں ڈوبے ہوئے وہ پیکر مندر میں موجود مردوں اور عورتوں کی آنکھوں میں میل ہی میل بھرا ہوا تھا۔ جوان کے عزائم کو ظاہر کررہے تھے۔ خاموشی سے...... ان کے لب بند تھے۔

سنکھ کی بھیانک آواز زیر و بم کے ساتھ ابھر رہی تھی۔ مندر کے فرش پر بیٹھی ہوئی حسین ترین لڑکیوں کے چہرے آتش شوق میں انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ خمار کی سرخی میں ڈوبی ہوئی آنکھیں حریصانہ انداز میں شیو دیو کے کراہت آمیز مجسمے کی جانب نگراں تھیں۔ مردوں میں دبا دبا ہیجان پھیلا ہوا تھا۔ ان کے کانپتے ہوئے ہونٹ...... پھڑکتے ہوئے بازو اور بے چین بدن اسے آنے والے لمحوں کی کہانی سنا رہے تھے۔

اس کی محبوب اور جان آفرین نیلم اس ہجوم کے درمیان میں دیوانوں کی طرح ہکا بکا ایک ایک کا منہ تک رہی تھی۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ اس احتجاج کا مقصد ابھی تک سمجھ نہیں سکی ہے۔

پھر یک بیک سنکھ کی آواز تیز ہوئی اور اس کے ساتھ ہی شیوناگ پوری قوت سے ایک چیخ مار کر اٹھ گیا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے جان اور سست ہونے لگیں اس نے اپنی آنکھیں بھینچ لینی چاہیں لیکن یہ ممکن نہ ہوسکا۔ اس کے پپوٹے کسی نادیدہ قوت کے زیر اثر مستقل کھلے ہوئے تھے۔

شیوناگ کے یوں اٹھتے ہی مندر میں ایک گھناؤنا کھیل شروع ہوگیا۔

شیوناگ کے یوں چیخ مار کر اٹھتے ہی مندر کے فرش پر بیٹھے ہوئے ہجوم پر ہیجان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ جب سنکھ پھونکنے والے نے سانس توڑ کر دھن تبدیل کی تو سارے مرد اور عورتیں یک بارگی اٹھ کھڑی ہوئیں اور شیوناگ کے ہمراہ وحشیانہ تیزی کے ساتھ مندر کے وسط میں ناچنے لگیں۔ نیلم ابھی تک حیران و پریشان فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ مسند پر اکڑ کے غرور اور تکبر سے بیٹھے ہوئے ناگ راجہ کی بھوکی نگاہیں اس پر ایک ہوس کار کی طرح جمی ہوئی تھیں۔ وہ اس طرح گھورے جارہا تھا جیسے بھوکا بھیڑیا کچے گوشت کو للچائی نظروں سے گھورتا ہے۔ جب نیلم نہ اٹھی تو وہ مسند سے اتر کے اس کی طرف کوندا بن کر لپکا۔ قریب آتے ہی اس کا ہاتھ تھام کر ناچنے والوں کی بھیڑ میں شامل ہوگیا۔ پہلے تو نیلم کی کئی تیز ہیجان چیخیں سنکھ کے شق میں سنائی دیں۔ جیسے وہ رقص کرنے سے مزاحمت کررہی ہو اور ساتھ دینے کو تیار نہیں۔ پھر وہ کسی نادیدہ قوت کے زیر اثر خود بخود دوسروں کی طرح ناچنے لگی۔

اس وقت مندر میں وحشت اور درندگی کی عجیب فضا قائم ہوچکی تھی۔ سنکھ کی آوازوں پر تھرکتے، لچکتے، اور بل کھاتے اور لہراتے لباس کے بندھنوں سے آزاد ہونے کے لئے بے تاب ہورہے تھے اور ان میں سانسوں کی دیوانگی سما چکی تھی۔ مردوں اور عورت کی تمیز اس طرح مٹ چکی تھی جیسے وہ حیوان ہوں۔ انسان نہ ہوں۔ لڑکیاں انسانیت کی حد سے نکل کر مردوں کو ذو معنی قسم کے اشارے کررہی تھیں۔ آ کاش کو اس وحشیانہ ناچ کے رنگ پہلو سے غلاظت سے بھرپور ایک نئی کہانی جنم لیتی نظر آئی تھی۔

اس کا اندازہ غلط نہ تھا۔ اچانک شیوناگ ناچتے ناچتے لوگوں کے ہجوم میں سے نکلا اور تیزی کے ساتھ دیوار گیر مشعلیں بجھانے لگا اور جب وہاں صرف اور دو روشن مشعلوں کی ناکافی روشنی باقی رہ گئی تو پھر وہ اس ہجوم میں گم ہوکر رہ گیا۔

مشعلوں کی دھیمی دھیمی ...... سرخ روشنی میں وہ سب لوگ طاغوتی سایوں کی طرح ناچتے اور اچھلتے رہے۔ پھر شیوناگ نے تیزی کے ساتھ حلق سے ایک نعرہ مارا جو اس کی سمجھ میں نہ سکا۔ ناچتے ہوئے مردوں

اور عورتوں کے ہاتھ ان جانی سی حرکت میں آئے، فضا قدموں کے شور اور سانسوں کی تیز تیز آندھیوں میں لباسوں کی سرسراہٹیں گونجیں اور جسموں پر برائے نام ستر پوشی رہ گئی۔ وہ صرف اپنی آنکھیں ہی بند کرسکتا اور نہ ہی گردن کو حرکت دینے کی سکت رکھتا تھا۔

وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ ساری حیا سوز داستان اسے جبر سے ہی دیکھنا پڑے گی اور اس کے سوا چارہ کار بھی نہیں رہا تھا۔

اس کا اندازہ کرنے کے بعد اس کی بے چین نگاہیں نیلم کی تلاش میں طواف کرنے لگیں۔ آنکھوں کی پتلیاں بار بار ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک مرتکز ہوتی رہیں۔ چوں کہ نیلم کے کونے میں ایسی پھنسی چھپی ہوئی تھی کہ اسے معلوم نہ ہوسکا تھا کہ وہ کس حال میں ہے۔ البتہ ناگ راجہ اسے کئی بار نظر آیا۔ اس کا چہرہ وفور جذبات سے بھرا ہوا تھا۔

پھر اس نے چوبی مسند کے عقب سے شیو دیو کے کراہت آمیز مجسمے کو حرکت کرتے دیکھا۔ منجمد پتھر کا وہ بے جان مجسمہ غیر محسوس طریقے پر فرش پر سرکتا ہوا ناچنے والوں کے درمیان آرہا تھا۔

ناچنے والے سرک سرک کر اس مجسمے کو جگہ دیتے رہے۔ آخر وہ مندر کے وسط میں آکر ٹھہر گیا۔ اب وہ چھت کی اوندھی پیالی جیسی گولائی میں ابھرے ہوئے کالی کے مجسمے کے بالکل نیچے تھا۔ اچانک کالی دیوی کے بائیں عریاں بازو سے دودھ کی ایک بوند نکل کر شیو دیو کے مجسمے پر ٹپکی۔ وہ پتھر کے ایک مجسمے سے کسی سیال کے یوں اخراج پر حیران ہی تھا کہ شیو دیو کے گرد حصار کی صورت میں ناچتے ہوئے مرد تیزی سے دیواروں تک سرکتے چلے گئے اور ساری لڑکیاں دیوانگی کی سی کیفیت سے شیو دیو کے مجسمے پر اپنے سرخ گداز ہونٹ ثبت کرنے لگیں۔ اس کراہیت آمیز مجسمے سے انہیں بالکل بھی کراہیت نہیں ہوئی تھی۔

اس دوران میں شیو ناگ بندروں کی طرح جست لگا کر شیو دیو کے مجسمے پر سوار ہوگیا۔ وہاں سنبھلنے کے بعد اس نے اپنی پگھلی ہوئی آنکھوں سے ایک بار تمام لڑکیوں کا جائزہ لیا اور داہنا ہاتھ فضا میں لہرا کے ان سے کوئی چیز طلب کرنے لگا۔

اگلے ہی لمحے اس اشارے کا مقصد آکاش کی سمجھ میں آگیا۔

جن لڑکیوں نے شیو دیو کے مجسمے کو دیوانہ وار چوما تھا وہ اپنے تن کو لباس سے بے نیاز کرکے شیو ناگ کی طرف اچھال رہی تھیں۔ وہ انہیں فضا میں تھام کر اپنی گود میں جمع کرتا جارہا تھا۔

جب تمام لڑکیاں لباس سے بے نیاز ہوگئیں تو شیو ناگ نے انہیں پیچھے ہٹ جانے کا حکم دیا اور اسی کے ساتھ سنکھ اچانک خاموش ہوگیا۔ مندر کی فضا پر بوجھل اور سنسنی خیز سکوت چھا گیا۔ جس میں تیز تیز سانسوں کی گونج سنائی دیتی تھی۔ وہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے مردوں کے باعث اس بار بھی نہ دیکھ سکا کہ اس کی محبوب اور جان تمنا کہاں اور کس حال میں موجود ہے۔

پھر سب سے پہلے ناگ راجہ...... شیو ناگ کے قریب گیا اور اس نے اپنی گود میں سے ایک نسوانی لباس نکال کر فضا میں لہرایا۔ پھر اس نے ناگ راجہ کے سر پر ڈال دیا۔ وہ پیچھے ہٹا تو سارے مرد شیو ناگ کے گرد جمع ہوگئے۔ وہ اپنی گود میں سے ایک ایک لباس نکال کر ہر مرد کو دیتا رہا اور جب اس کی گود خالی ہوگئی تو وہ شیو دیو کے مجسمے سے نیچے اتر آیا اور سرعت سے باقی ماندہ وہ مشعلیں جو روشن تھیں ایک ایک کرکے گل کردیں۔

''ان کپڑوں اور ان میں بسی ہوئی خوشبوؤں سے آج کی رات کے لئے اپنی اپنی عورت کو پہچان لو......؟'' مندر میں پھیلے ہوئے گھپ اندھیرے میں شیو ناگ کی تحکمانہ آواز میں گونجی۔ ''یہ تمہاری رات ہے اور اس کا پل پل حسین اور رنگین ہے...... پرلطف اور شراب کا سا نشہ لے کر اور اس رات کو ایسا یادگار بناؤ کہ ساری زندگی کے لئے ناقابل فراموش بن جائے۔''

پھر سیاہ پتھر سے بنے ہوئے اس غار کی تاریک

فضا میں سرگوشیوں اور آویزشوں کا دھیما دھیما پن اور ہیجان خیز شور ابھرنے لگا۔ شیوناگ نے نسوانی جامے تقسیم کرتے سے فضا میں لہرا لہرا کے ان کی نشانیاں ہر ایک پر واضح کردی تھیں۔ اور اب اندھیرا ہوجانے پر بھی کسی کو بھی اپنی ساتھی کی تلاش میں وقت نہیں ہورہی تھی۔ ان سب پر جیسے جنون سا طاری ہوگیا تھا۔

اسے شیوناگ کے کہے ہوئے الفاظ کے مطابق پورا ہوا اس تھا کہ مندر میں پاپوں کے منجدھار میں پھنسے ہوئے لوگ صرف انسانی بہروپیے ہیں۔ ان مردوں اور عورتوں میں بیشتر وہ ناگ اور ناگنیں تھیں جنہیں اپنا روپ بدلنے کی صلاحیت سے نوازا ہوا تھا۔ ان میں اصل انسانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی اور وہ اس سے پراسرار قوتوں کے تابع ہوکر اچھائی اور پاپ کا امتیاز اس تاریکی میں کھو چکے تھے اور غلاظت کے دلدل میں دھنسے ہوئے تھے۔

وہاں بھیانک کھیل شروع ہوچکا تھا۔ وہ ہر قوت اور صلاحیت سے محروم سنگی طاق میں بیٹھا ہوا تھا۔ بدن پر شدید نقاہت کے ساتھ ہی کرب ناک جمود طاری تھا۔ اب اس کی آنکھیں گہری سیاہی میں الجھے ہوئے سایوں کو دیکھ رہی تھیں...... گو ان کے خدوخال دیکھنا یا انہیں پہچان لینا ممکن نہیں تھا۔ لیکن ان کے ہیولے ہیجان میں مبتلا نظر آئے تھے۔ اس کا دماغ ناقابل بیان اذیت میں مبتلا تھا۔ اس پر ایک قیامت سی بیت رہی تھی۔ اس کی پیاری بیوی نیلم ہوس اور گناہ کے اس ہجوم میں نہ جانے گم تھی...... نہ جانے اس پر کیا گزر رہی تھی...... ناگ راجہ کے مکروہ اور گھناؤنے عزائم کی مضبوطی کا اسے خوب علم تھا اور نیلم کی بے بسی کا بھی پورا پورا اندازہ تھا۔ لیکن اسے قرار نہیں آیا تھا۔ یہ زہر آلود احساس اسے کھائے جارہا تھا کہ اس کی نگاہوں کے سامنے نیلم کی روغن پیشانی پر بے آبروئی کی شکنیں ڈالی جانے والی ہیں۔

وہ اس اذیت اور بے بسی کے احساس میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس طاق میں ساکت و جامد بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک مندر کی چھت کی گولائی میں بنے ہوئے کالی کے دیوہیکل مجسمے کی پتلیوں میں سے دھیمی دھیمی کرنیں پھوٹنے لگیں۔ پتھر کے کسی بت کا یہ اخراج بڑا ہی ڈراؤنا تھا، آہستہ آہستہ وہ روشنی مندر کے فرش پر ایک دوسرے کے جسم میں کھوئے لوگوں پر پڑنے لگی۔ وہ سر سے پیر تک غلاظت کے دلدل میں دھنسے ہوئے تھے۔ ان کے مکروہ چہروں پر گھناؤنے عزائم کی گہری لکیریں اور گہری ہوتی جارہی تھیں۔ اس کا جی بے اختیار چاہا کہ وہ اپنی آنکھیں بند کرلے لیکن چاہتے ہوئے بھی یہ بات اس کے بس میں نہیں تھی۔ اس کے اعصاب پر شیوناگ ابھی تک کسی آسیب کی طرح مسلط تھا۔

پھر کالی کے ابھرے ہوئے سنگی مجسمے کی آنکھوں سے خارج ہونے والی روشنی کی وہ لکیریں آہستہ آہستہ فرش پر رینگنے لگیں اور یہ جان کر اس کا دل کنپٹیوں پر اچھلنے لگا کہ اس پتھریلے بت کی پتلیاں حرکت کررہی ہیں۔

اس کی نگاہ اس کی مرضی کے برعکس روشنی کی ان ہیبت ناک لکیروں کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی رہیں۔ پھر ایک ثانیے کے لئے اس نے نیلم کے بارے میں سوچا اس وقت مندر کی فضا نیلم کی دل دوز چیخ سے لرز اٹھی۔ وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کسی مرد سے دور رہنے کی التجا کررہی تھی۔ اس کی شریانوں میں رہے سہے خون کا دوران تیز ہوگیا۔ آنکھوں میں چنگاریاں سلگنے لگیں۔ یقیناً ناگ راجہ نیلم کے سر پر سوار ہوچکا تھا۔ اور بس ذرا سی دیر میں نیلم کی عزت خاک میں ملنے والی تھی۔ وہ بے چاری کب تک اس عفریت کا مقابلہ کرتی؟

ادھر نیلم کی چیخیں تھیں کہ در و بام کو ہلائے دے رہی تھیں۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی نسوانی دل خراش چیخیں نہیں سنی تھیں۔ اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا...... دوسری طرف اس کی نگاہیں کالی کے مجسمے سے خارج ہونے والی روشنی کے ساتھ مندر کے فرش پر رینگ رہی تھیں...... وہ سب نیلم کی چیخ و پکار اور آہ و بکا اور فریاد سے بے نیاز اپنے نفس کی آوارگیوں میں بہکے ہوئے تھے۔

پھر اچانک اس کے جسم کا رواں رواں کھڑا
ہوگیا۔ وہ پراسرار روشنی مندر کے فرش پر آبرو اور ذلت
کی شدید کشمکش میں مبتلا نیلم کے بدن پر جم کر رہ گئی۔
شاید کالی کے سنگی مجسمے کی آنکھیں بھی ادھر ہی جم کر رہ گئی
تھیں۔ اس وقت اس نے جو کچھ دیکھا وہ بیان کرنے کی
قوت قلم میں ہوسکتی تھی اور نہ زبان میں اور نہ ہی الفاظ
ساتھ دے سکتے تھے۔ نیلم کے چہرے پر فریاد اور دہشت
کی بیلاہٹ تھی۔ اس کا چاند جیسا مرمریں اور گداز بدن
شرم اور حیا کے پسینوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے ریشمی
بال بڑی بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے اور وہ چیخ چیخ
کر خود کو ناگ راجہ کے روح فرسا عزائم سے بچنے کی
جدوجہد اور کشمکش کررہی تھی۔ مزاحمت کی سر توڑ
کوشش......

ناگ راجہ اسے ہر طرح سے سہا سہا کر خوش ہو رہا
تھا۔ اور ایک عجیب کی طرح سرشاری کی سی کیفیت محسوس
کررہا تھا۔ لطف لے رہا تھا۔ وہ جس قدر سہم جاتی اتنا
ہی خوش ہوتا...... اس کی جلتی ہوئی بھوکی نگاہیں نیلم کے
بدن کو کسی نیزے کی انی کی طرح چھید رہی تھیں اور وہ تھی
کہ بے بسی کے عالم میں فریاد کناں تھی۔

جب ناگ راجہ نے دیکھا کہ وہ کسی طرح اس
کے قابو میں نہیں آرہی ہے۔ اس سے نہ تو ڈر رہی ہے
اور خوف محسوس کررہی ہے۔ بلکہ دفاع کیے جارہی تھی تو
اس نے اچانک جھپٹ کر نیلم کا چہرہ اپنی ہتھیلیوں کے
درمیان لے لیا۔

پھر وہ بڑے کرب کے ساتھ ہذیانی لہجے میں چیخ
پڑی۔ ''میرے ایشور......! تو مجھے اٹھالے۔''

اس کی آواز میں دہشت، اذیت ناک، کرب اور
التجا کا وہ سمندر انگڑائیاں لے رہا تھا کہ شاید آکاش میں
بھی ہل چل مچ گئی اور ناگ راجہ کی جسارت بڑھنے سے
قبل ہی وہ پورا مندر بھیانک آوازوں سے لرز اٹھا۔
یوں لگ رہا تھا کہ جیسے بڑے بڑے عفریت اس مندر
کے درو بام کو اکھاڑ پھینکنے پر تل گئے ہوں۔

کالی کی سنگی پتلیاں یک لخت بے نور اور ویران
ہوگئیں۔ مندر کے فرش پر پڑے ہوئے سائے وحشت
زدہ آوازوں میں چیخنے لگے جیسے کوئی نادیدہ قوت ان کے
جسموں میں زہریلے نیزوں کی انیاں اتار رہی ہوں۔

وہ شور اور اکھاڑ پچھاڑ اتنی زبردست تھی کہ اس
کے طاق والی دیوار کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح
لرزنے لگی اور وہ اس میں سے اچھل کر فرش پر جا گرا۔
وہاں گرتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس کے اعضا اور
طلسماتی جمود سے نجات پاچکے ہیں۔ اس کے جسم کے
دیئے ہوئے کئی مرمریں جسم تڑپ کر اچھلے اور اس کے
بعد اسے کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔

جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے خود کو
ایک ویرانے میں پڑا ہوا پایا۔ اس کے آس پاس زمین
پر تین عورتیں اور سات مرد بے حس و حرکت پڑے
ہوئے تھے۔ ان کے چہرے اس کے شناسا تھے۔ وہ
انہیں کچھ دیر قبل ہونے والی چکر پوجا میں دیکھ چکا تھا۔
ہر طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اندھیری رات میں
آسمان پر چمکتی ہوئی تاروں کی چادر بہت بھلی لگ رہی
تھی۔ اس نے چند گہرے گہرے سانس لے کر ارد گرد
نگاہیں دوڑائیں۔ لیکن اب وہاں نہ ہولناک مندر تھا اور
نہ ہی سانپوں اور اژدہوں سے بھرا ہوا مصنوعی مندر تھا
جس کے فریب کا شکار ہوکر وہ ایک بار شیوناگ کے
چنگل میں جا پھنسا تھا۔

سب سے آخر میں اس کی نگاہیں سادھو مہاراج
کے چہرے پر پڑیں، وہ اسے قہر بار نگاہوں سے گھور
رہے تھے۔ اسے اپنے کمزور اور زخمی بدن میں بے شمار
چیونٹیاں سنسنانے کا احساس ہوا۔ اس نے بدحواس ہو
کر زمین سے اٹھنا چاہا لیکن نقاہت کے باعث وہ
کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کی حالت مردے سے بھی بدتر
ہورہی تھی۔

''پاپ کے بہروپ بڑے حسین اور دل فریب
دکھائی دیتے ہیں آکاش!'' سادھو مہاراج کی دھیمی مگر
تادیبی آواز نے ماحول کا سکوت توڑا۔ ''میں نے کتنی
مرتبہ ٹوکا اور تجھے رہنمائی کر کے برائیوں سے باز رکھا مگر

تو پھر بھی بھٹکتا اور بہکتا ہی رہا۔''

''مجھے شاگرد بنا لیجئے سادھو مہاراج.....!'' اس نے جذبات سے مغلوب رندھی ہوئی آواز میں شرمساری سے جواب دیا۔ ''اب میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔ میں اپنی رنگین مزاجی کی بڑی عبرتناک سزا بھگت چکا ہوں۔''

''ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔'' وہ اس کے قریب آ کر زمین پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ''تو اب تک دیوانوں کی طرح اندھیرے میں بھٹکتا اور مارا مارا پھرتا رہا..... لیکن اب وہ گھڑی آ پہنچی ہے جب تیرا کالی راج دھانی کا سفر شروع ہو جائے گا۔''

یک لخت اس کے سارے بدن میں سنسنی کی لہر بن کر دوڑ گئی۔ کالی راج دھانی کا نام اس کے ذہن سے پھسلا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے اس اجنبی دنیا کا نام سنتے ہی اسے یوں محسوس ہوا اس کے ذہن میں زہریلے بچھوؤں نے اپنے ڈنک گاڑنے شروع کر دیئے ہوں۔ اس کے وجود میں ناقابل بیان اضطراب پھیلنے لگا اور وہ بے اختیار ہذیانی لہجے میں چیخ مار کر زمین سے اٹھ گیا۔

''کالی راج دھانی صرف ایک سراب ہے..... دھوکا ہے..... فریب ہے..... بے وقوف بنانے کے لئے یہ نام گھڑا ہوا ہے..... تم مجھے بہکا نہیں سکتے.....'' اس نے سادھو مہاراج کے شانے سختی سے تھام لئے۔ اس نے کہا تو اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

اس کے لاشعور میں یہ احساس باقی تھا کہ وہ ذہنی توازن غیر محسوس انداز سے کھو رہا ہے..... اسے ابھی تک رام بھروسے کا حشر بھی یاد تھا..... اس بیل گاڑی بان نے اوٹی نگر اور موہن ہاٹ مندر کا سفر کرتے ہوئے اس کے منہ سے کالی راج دھانی کا نام سن کر پاگلوں کی طرح ندی میں کود کر جان دے دی تھی۔ منکہ قبضے سے نکل جانے کے بعد وہ بھی اجنبی ہو گیا تھا۔ شیو ناگ اپنی پراسرار دنیا کا نام اس کے ذہن سے محو کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس لئے سادھو مہاراج کی زبان سے کالی راج دھانی کا نام سنتے ہی اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ امرتا رانی اسے بتا چکی تھی کہ راج دھانی کے رکھوالوں کا نظام بہت سخت اور بے رحمانہ ہے۔ اس لئے کوئی بھی کالی راج دھانی کا نام سن کر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

سادھو مہاراج نے اندازہ کر کے معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے اور انہوں نے اپنی چمکیلی نگاہیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

چند ثانیوں تک کے لئے اس پر خالی الذہنی کی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ کورے کاغذ کی طرح ہو گیا تھا۔ پھر سادھو مہاراج کی آنکھوں سے مقناطیسی لہروں کے نادیدہ جال نکلتے نظر آئے۔ ان کے ہونٹ کوئی آواز پیدا کئے بغیر تیزی کے ساتھ حرکت کر رہے تھے۔ اور اس پر غنودگی کی کیفیت چھانے لگی تھی۔

اس پر کافی دیر تک یہی کیفیت طاری رہی اور سادھو مہاراج خاموشی کے ساتھ کوئی اشلوک پڑھتے رہے۔ پھر انہوں نے چند قدم آگے بڑھ کر اس کے اوپر سے نیچے تک اور سینے پر تین مرتبہ دم کیا تو اس نے خود کو معمول پر آتا ہوا محسوس کیا۔

''آکاش..... اب تمہیں بہت سنبھل کے محتاط ہو کر چلنے کی اشد ضرورت ہے۔'' سادھو مہاراج نے قدرے توقف کے بعد زبان کھولی۔ ''پنڈت رام دیال کی سادھی جس مندر میں ہے وہ یہاں سے دو کوس کی مسافت پر ہے۔ وہاں پہنچ کر ان کی آتما تمہاری کوئی غائبانہ مدد کرے گی۔''

''کیا آپ اس مندر تک میری رہنمائی نہیں کریں گے؟'' اس نے نگاہیں نیچی کر کے پوچھا۔

''یہ سب میرے اور تمہارے جیسے انسان ہیں یہ ناگ ناگنوں کی ہوس کے دام میں الجھ کر اس حال کو پہنچے ہیں لہٰذا اب ان کی رہبری کرنا میرا کام ہے۔ انہیں ان کے گھرانوں تک پہنچانے کے سوا میں کوئی دوسرا کام نہیں کر سکتا..... تم دل مضبوط کر کے ایشور کا نام لو اور اس مندر کی طرف چل پڑو۔ تمہارا ایک ایک

مہ بہت قیمتی ہے۔"

اس وقت اس کی نقاہت اور کمزوری کافی حد تک دور ہوچکی تھی۔ سادھو مہاراج نے اپنی گٹھری سے ایک سیب نما پھل نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ پھر اس سے بولے۔

"یہ رس بھرا پھل جتنا میٹھا ہے اتنا ہی طاقت بخش ہے۔ تمہاری کھوئی ہوئی ساری توانائی لوٹ آئے گی۔ تم اپنے آپ کو ایک نیا اور طاقت ور انسان تصور کرو گے۔ اور اس کا رس تمہارے جسموں کے زخموں کو مندمل کردے گا اور تکلیف بھی دور کردے گا۔"

اس نے ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے اپنی محسن کی جانب دیکھا اور پھر ان کی بتائی ہوئی سمت چل پڑا۔

سادھو مہاراج نے اسے جو پھل دیا تھا وہ واقعی تاثیر میں لاجواب تھا۔ جتنا تیز رس تھا اتنا ہی طاقت ور بھی۔

چاند کی وہ آخری شب اپنے آخری سانسوں پر تھی۔ وہ ویران علاقے میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ جنگلی درختوں سے پرندوں کی چہکار ابھرنے لگی۔ مشرقی افق پر چھائی ہوئی ظلمات کی چادر میں بھی ہلکی ہلکی سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ فضا میں نیم سحری کی مخصوص اور مانوس بو پھیلنے لگی جس میں ایک عجیب سا سوندھا پن تھا۔

وہ ایک نئے عزم اور جذبے کے ساتھ اپنے راستے پر مستقل مزاجی سے بڑھتا رہا۔ اسے امید تھی کہ سورج طلوع ہونے سے قبل ہی اپنی منزل پر جا پہنچے گا۔

اس وقت اسے بے اختیار سنگیت کی یاد آئی کہ اگر وہ زندہ ہوتی تو تنہائی اور بے بسی کے ان لمحات میں اس کی معاون ثابت ہوتی۔ لیکن وہ بے چاری تو اپنی ذات کو بچاتے ہی شاید فرط مسرت کے باعث موت کی دبی آغوش میں جا سوئی تھی۔ اس کی زندگی میں ایک خلا پیدا کرگئی تھی۔ کتنی مخلص، بے غرض اور جاں نثار اور محبت کرنے والی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کا سفر اپنے اختتام کو پہنچنے والا تھا کہ اسے سامنے ایک بستی کے آثار نظر آنے لگے سادھو مہاراج کی بتائی ہوئی علامات کے سہارے اسے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ اب وہ شاکرپور پہنچ چکا ہے۔

بستی کے نواح میں پھیلے ہوئے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے اس کی نگاہ اپنے کاموں میں مصروف مقامی باشندوں پر پڑی۔ وہ نہایت خوشی اور لاپرواہی کے ساتھ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

وہ اس بستی میں داخل ہوا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہاں مسلمانوں کی آبادی اگر اچھوت اور برہمنوں سے کم نہیں تو زیادہ بھی نہیں ہے۔ خاصی بارونق اور بھری پری آبادی تھی اس لئے کوئی اس اجنبی مسافر کی طرف متوجہ نہ ہوا۔

وہ بستی سے گزر کر جنوبی سرے کی سمت بڑھتا رہا۔ وہاں چھوٹے سے شمشان گھاٹ سے گزرتے ہی اس نے چند کچے مکانات کے عقب میں مٹی کا بنا ہوا ایک گنبد دیکھا جس پر بنے ہوئے رنگین نقش و نگار موسمی سختیوں کے سامنے پھیکے پڑ چکے تھے اس کے دل کی کیفیت عجیب سی ہوچلی تھی۔ رقت اور مظلومیت کا احساس بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ وہ جلد سے جلد اس مندر میں پہنچنا چاہتا تھا تاکہ سمادھی پر پرارتھنا کرسکے۔

گو وہ مندر چھوٹا سا تھا۔ جس میں پنڈت رام دیال کی سمادھی موجود تھی لیکن مندر کا رقبہ خاصے وسیع و عریض احاطے میں موجود تھا۔ اس کے کچے احاطے میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ جس کا یہ مطلب تھا کہ وہاں ہر ضرورت مند بلا روک ٹوک داخل ہوسکتا تھا۔ بعض ایسے چھوٹے مندروں پر برہمن پنڈتوں اور پجاریوں کی اجارہ داری ہوتی تھی جو اچھوتوں کو گھسنے نہیں دیتے تھے اور دروازہ یا گیٹ لگا کر اپنی غیر موجودگی میں تالا لگا دیتے تھے...... اس نے ایسا محسوس کیا تھا کہ یہاں کے پنڈت اور پجاری کوئی مکروہ اور قبیح کھیل نہیں کھیلتے ہیں ہر پنڈت اور پجاری ہوس کار نہیں ہوتے۔

اس نے دیکھا کہ برگد کے بوڑھے اور گھنے

درختوں کے سائے میں رکھے ہوئے مٹکوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔

سادھو مہاراج کی ہدایت کے مطابق اس نے ایشور سے پرارتھنا کی اور ایک بتایا ہوا اشلوک پڑھ کر مٹی کا ڈونگا باہر نکال کر اس میں پانی بھر کے آنکھیں بند کر کے منہ سے لگالیا۔ پانی کے آخری گھونٹ حلق سے اترتے ہی مٹی کے آبخورے میں ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور اسے ہونٹوں پر کسی سخت سی چیز کا لمس محسوس کر کے اک دم سے چونک پڑا۔

آنکھیں کھولیں تو اس آبخورے میں دودھ جیسی سفید رنگت کا سنگ مرمر کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا نظر آیا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ آس پاس نگاہیں دوڑائیں وہاں کوئی بھی اس کی جانب متوجہ نہیں تھا۔ چھوٹے بچوں کی ایک ٹولی مٹی سے کھیل رہی تھی۔ اس نے پھرتی کے ساتھ آبخورے میں سے سنگ مرمر کا وہ ٹکڑا نکالا اور اسے مٹھی میں دبا کر وہاں سے چل پڑا۔ اس وقت اپنی اس کامیابی پر اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ سرشاری سے اس کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔

وہ اپنی خوشی کی دھن میں مگن سر جھکائے چلا جا رہا تھا کہ کوئی اس سے آ ٹکرایا۔

اس نے چونک کر ایک دم سے ٹھٹک کے نظریں اوپر اٹھائیں تو پھٹے ہوئے کپڑوں میں ملبوس، جواں سال لڑکی نظر آئی۔ اس کے گورے اور خوب صورت چہرے پر سیاہ نرگسی آنکھیں سخت انداز میں حرکت کر رہی تھیں۔

''تمہاری یہ درگت کس نے بنادی لڑکی......؟''

وہ حیرت سے بولا۔

''دو تین مردوں نے مل کر میری یہ حالت بنادی اور میرے لباس کی دھجیاں بنادیں۔'' اس لڑکی نے جواب دیا۔

لیکن میں نے انہیں اپنے ارادوں میں کامیاب ہونے نہیں دیا۔ ان کے چنگل سے نکل آئی ہوں۔''

''چلو...... میں تمہیں گھر پہنچا کر آتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن تمہارے ماں باپ مجھ پر شک نہ کریں؟''

اس بستی میں میرا اپنا گھر ہے جس میں، میں اکیلی رہتی ہوں۔'' سرگوشیانہ آواز میں بولی۔ ''تم پردیسی لگتے ہو۔ میرے ساتھ چلو...... میں تمہارا ایسا دل بہلاؤں گی کہ کیا یاد کرو گے؟''

''سنو......'' آکاش نے اس سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ ''مجھے تم نے غلط سمجھا ہے۔ میں ایک مسافر ہوں مجھے لڑکی عورت سے کوئی سروکار اور دلچسپی نہیں ہے......''

''میں نے تم سا خوب صورت مرد آج تک اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ میں تمہاری ہر طرح سے سیوا کروں گی۔''

آکاش نے اسے سرد نگاہوں سے گھورا۔ وہ جوان اور بے حجاب تھی۔ کوئی مرد اسے اس حالت میں دیکھ کر خود کو قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسے اک دم سے یاد آیا کہ یہ شیوناگ کا کوئی نیا حربہ ہے۔ اس نے حقارت سے لڑکی کو دھتکار دیا۔

''تو مجھے ذلیل کر رہا ہے......؟ مجھ ایسی حسین لڑکی تجھے سپنے میں بھی نہیں ملے گی۔ چل میرے سنگ۔'' اس نے خود سپردگی سے دیکھا۔

''تو اپنے ذلیل، کمینے اور نابکار گرو کے پاس جا کر کہہ کہ اب آوارہ لڑکیوں کا حربہ گھسا پٹا ہو چکا ہے......''

''کون گرو'' وہ انجان بن کر بولی۔ ''تو کس کی بات کر رہا ہے؟''

''اس کتے اور ذلیل کی جس نے تجھے میرے پاس ورغلانے کے لئے بھیجا ہے۔'' آکاش نے اسے پوری قوت سے دھکا دے کر زمین پر گرادیا۔

وہ زمین پر گرتے ہی فوراً ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کپڑے پھاڑنے لگی تو آکاش نے غصے سے کہا۔

''تو...... یہ کیا کر رہی ہے......؟ ہوش میں

ہے..... تو بے لباس ہو رہی ہے لیکن میں پھر بھی تیرے ساتھ نہیں چلوں گا۔‘‘

’’تو میرے ساتھ میرے گھر چل کر مجھے خوش کردے، ورنہ.....‘‘ وہ ہذیانی لہجے میں بولی جو دھمکی آمیز تھا۔

’’ورنہ کیا.....؟‘‘ آکاش نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے پوچھا۔

’’میں ابھی شور مچادوں گی کہ تم نے میری عزت لوٹنے کے لئے میرے کپڑے پھاڑ دیئے۔‘‘ وہ چراغ پا ہوکر بولی۔

اس وقت وہ جہاں موجود تھا وہاں کافی سناٹا تھا۔ چوں کہ یہ شمشان گھاٹ کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ اس لئے کسی کی آمدورفت کا دور دور تک کوئی امکان دکھائی نہ دیتا۔ جیسا کہ لڑکی اسے دھمکیاں دے رہی تھی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کا بال تک بیکا نہیں ہوسکا تھا۔ لڑکی کے شور مچانے سے کوئی مدد کو آ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس نے لڑکی کو دیکھا جو بے حجابانہ حالت میں کھڑی انجانی دعوت دے رہی تھی۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ بڑے سے بڑا پارسا بھی..... سادھو اور سنیاسی بھی بہک سکتا تھا۔

’’اف تم کتنی سندر ہو.....؟‘‘ آکاش نے تعریفی نظروں سے دیکھا۔

’’سچ.....؟‘‘ لڑکی شرما گئی۔ اس کا چہرہ حیا آلود ہوگیا۔ ’’میں بہت خوب صورت ہوں نا.....‘‘

’’میں نے اپنی زندگی میں تم جیسی حسین اور پیاری لڑکی کہیں نہیں دیکھی۔‘‘

’’پھر تم میرے ساتھ میرے گھر چل رہے ہو نا؟‘‘ لڑکی اس کے قریب آ گئی۔

’’کیوں نہیں.....‘‘ آکاش نے کہا۔ ’’پہلے میں یہ مٹھاس تو اپنے ہونٹوں میں جذب کرلوں۔‘‘ آکاش نے اس کے ہونٹوں پر انگلی پھیری۔

’’یہ دھجیاں تو نکال پھینکو..... تاکہ میں تمہیں گود میں اٹھا کے لے چلوں۔‘‘

لڑکی نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ آکاش نے ہاتھ بڑھا کے اسے دبوچ لیا۔

لڑکی نے اس کے چہرے پر جھکنا چاہا۔ لیکن آکاش نے فوراً ہی اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔ لڑکی چیخی۔ لیکن اس کی چیخ گلے میں گھٹ گئی۔ وہ اس کے ہاتھوں میں بے بس ہوکر کسی زخمی پرندے کی طرح تڑپنے اور پھڑ پھڑانے لگی تو وہ لحظہ بہ لحظہ اس کے گلے پر اپنی گرفت مضبوط کرتا جارہا تھا۔ سادھو مہاراج نے اس پر جو اشلوک دم کیا اور اس کی جیب میں جو سنگ مرمر کا ٹکڑا تھا اس کی طاقت اور توانائی میں بے پناہ اضافہ کررہا تھا۔ اب وہ ایک نیا آدمی تھا۔ پھر بھی محتاط تھا اور آس پاس کا جائزہ بھی لیتا جارہا تھا۔

آکاش نے اپنا سارا زور صرف کردیا تو چند ہی پل میں لڑکی کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل پڑیں۔

اس لڑکی کا سانس اکھڑنے لگا جس سے اس کے سینے میں سانسوں کا زیر و بم بے ترتیب ہونے لگا۔ جوں ہی اس کے بدن نے آخری جھٹکا لیا آکاش نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ اس نے جنون کی کیفیت میں شقی القلبی، بربریت اور تشدد کیا تھا۔ لڑکی نے فرش پر گرتے ہی اپنا سینہ دونوں ہاتھوں میں بھینچ کر کرب کے ساتھ تڑپی اور پھر اس کا سراپا ایک جھٹکے سے سیاہ سانپ میں تبدیل ہوکر ساکت ہوگیا۔

وہ چند ثانیوں تک خوف اور حیرت کے ساتھ اس سیاہ موذی سانپ کو دیکھتا رہا۔ اس کا اندازہ درست نکلا تھا۔ یہ شیوناگ کا وار تھا جو اس نے ناکام کردیا تھا۔ اگر وہ لڑکی کے فریب میں آجاتا تو اپنی منزل کو پانے میں ناکام ہوجاتا۔ نامراد ہوجاتا۔ پہلے تو اس نے ایڑی سے اس بلا کا سر کچل ڈالا۔ پھر قریب پڑا پتھر اٹھایا جو بیس سیر وزنی ہوگا۔ سانپ کے جسم پر دے مارا۔

’’شیوناگ.....! تو کہاں چھپا ہوا ہے کمینے اور نابکار!‘‘ آکاش نے شمال کی سمت منہ کرکے کہا۔ ’’دیکھ میں نے تیرا حربہ بری طرح ناکام کردیا..... کاش! میں

یہ تیرا حشر کرسکتا.....؟ بھگوان نے چاہا تو اس سے بھی برا تیرا حشر کروں گا۔" اس افتاد سے نمٹ کر وہ دوبارہ آبادی کی طرف چل دیا۔

سادھومہاراج کی ہدایت کے مطابق اسے سورج غروب ہونے سے قبل آبادی میں پہنچنا تھا اور پھر سورج غروب ہونے کے بعد سنگ مرمر کے اس پتھر سمیت مندر میں داخل ہونا تھا۔ اس کے اعصاب میں عجیب سی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ اسے پورا پورا احساس تھا کہ مندر میں اس کی کھوئی ہوئی قوت سدا کے لئے واپس مل جائے گی اور شاید شیوناگ بھی اس بات سے واقف تھا کہ وہ بامراد ہو جائے گا۔ اس لئے اس نے شاکر پور پہنچتے ہی روڑے اٹکانے شروع کردیئے تھے تاکہ وہ ایک بار پھر ایسا پاپ کر بیٹھے کہ مندر میں بھی اس کے مصائب کا کوئی حل نہ پا سکے۔ اس نے شاکر پور میں اپنا بیشتر وقت آباد اور بارونق علاقوں میں گھومتے ہوئے گزارا کہ کسی ویرانے میں وہ شیوناگ کا نشانہ نہ بن جائے۔

دوپہر کے وقت وہ ایک بھٹیارے کے تنور پر پہنچا تاکہ معدے میں ایندھن بھر سکے۔

بھٹیارے کی دکان اس وقت بھری ہوئی تھی اس لئے اس نے اپنے تنور کے قریب ہی اس کے لئے جگہ بنادی۔ وہ ہاتھ دھوکر جوں ہی تنور کے قریب کسی نامعلوم شخص نے عقب سے اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر تنور میں اچھال دیا۔ اس کی چیخ بلند ہوتے ہی ہل چل مچ گئی اور لوگ کھانا پھینک کر وہاں سے بھاگ نکلے۔ لیکن بھٹیارا بہت ہشیار تھا اس نے صورت حال کی نزاکت کو بھانپتے ہی خود کو اس کی زد سے بچاتے ہوئے تنور کے دہکتے ہوئے دہانے پر ٹین کا ڈھکنا اچھال دیا۔

اس کی اس تدبیر سے وہ جلتے ہوئے تنور میں گر کر جھلسنے سے تو بچ گیا لیکن پھر اس کے بدن پر آبلے پڑ گئے۔

بھٹیارے نے اسے سہارا دے کر پانی پلایا اور اس نے حیرت سے پوچھا۔

"حیرت کی بات ہے کہ یہ سب کیسے ہوا.....؟ مجھے یقین نہیں آیا ہے۔"

آکاش نے اسے اپنے اعتماد میں لے کر پوری بات من وعن بتادی۔

وہ آکاش کی بات سن کر ششدر سا ہوگیا اور قدرے تذبذب سے بولا۔

"مجھے تمہارے عقب میں کوئی نظر نہ آیا۔ خیر تم فکر مند اور پریشان نہ ہو۔ ایسا لگ رہا ہے کہ تمہارا کوئی دشمن تمہاری گھات میں ہے اور اس نے موقع پاکر اور سب کی نظریں بچاکر یہ حرکت کی ہے۔"

آکاش نے اسے اس ناگن لڑکی کے بارے میں دانستہ نہیں بتایا تھا کہ اس ناگن نے حسین لڑکی کا روپ بھر کے اسے داغ دار کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس کے فریب حسن میں آجاتا تو جانے اس کا کیا حشر ہوتا۔

میں تو اس بستی میں آج ہی بلکہ تھوڑی دیر پہلے ہی تو آیا ہوں۔" آکاش نے بات بناتے ہوئے کہا۔ وہ اسے شیوناگ کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ "مجھ سے کسی کو یہاں دشمنی کیوں ہونے لگی۔"

"تم میرے پاس ہی رکو..... تم یہاں کس لئے آئے ہو؟" اس نے دلاسا دیتے ہوئے سوال کیا۔

"مندر میں پنڈت رام دیال کی سمادھی کے درشن کرنے آیا تھا۔ میں نے ان کی بڑی تعریف سنی تھی؟"

وہ ضعیف الاعتقاد شخص تھا۔ کٹر قسم کا تھا۔ اس کا مقصد جان کر بڑا ہی مرعوب اور متاثر نظر آیا۔ اس کے بھاگے گاہک اس کے گرد جمع ہوکر اس حادثے کے بارے میں تفصیلات جاننے کے لئے بے چین اور پریشان تھے۔ بھٹیارا نے انہیں گول مول جواب دے کر اس کا ہاتھ تھاما اور اپنی جھونپڑی میں لے آیا جو عقب میں تھی۔

وہ تمہارا دماغ چاٹ جائیں گے۔" آکاس کو اندر لے جاکر اس نے کہا۔ "تم یہاں آرام کرو میں تمہارے لئے کھانا لے آتا ہوں۔"

وہ بھٹیارا ایک اچھے، مخلص اور ہم درد دوست کی

طرح ثابت ہوا۔ وہ جلد ہی اپنے کاموں سے نپٹ کے آیا۔ اسے آکاش کے بارے میں جاننے کا تجسس اور اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔ آکاش نے اسے ایک من گھڑت کہانی سنادی۔

سہ پہر کے بعد باہر سے شور کی آوازیں سنائی دیں تو اس کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ وہ اسے بستر پر دراز رہنے کی تاکید کر کے بھٹیارا باہر نکل گیا۔ چند ثانیوں کے بعد ہی لوٹ آیا۔ اس کا چہرہ متغیر سا ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر آکاش سے رہا نہ گیا۔ وہ ہڑبڑا کے بستر سے نکل آیا۔ ''دوست! خیریت تو ہے؟''

''خیریت نہیں ہے میرے دوست مسافر!'' اس نے سراسیمگی سے جواب دیا۔ ''بڑی عجیب وغریب اور سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ ہر شخص خوف زدہ اور پریشان سا ہو رہا ہے۔''

''کیا بات ہوئی ہے؟'' آکاش نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔ ''مجھے بتاؤ تو سہی۔''

''میری دکان پر لمبی لمبی، موٹی موٹی، چمکدار لکیریں چمگادڑوں کی طرح لہرا رہی ہیں اس لئے لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل پڑے ہیں اور ہر کسی کی زبان پر تمہارا ہی نام ہے...... کیوں کہ شاکر پور میں کبھی بھی ایسی عجیب اور خوف ناک قسم کی چیزیں دیکھنے میں نہیں آئیں...... لوگ سخت برہم ہیں۔ طیش میں آئے ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں باہر لانے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ پنڈت ہری پرشاد ان لوگوں کا لیڈر بنا ہوا ہے اور لوگوں کو تمہارے خلاف بھڑکا رہا ہے۔ نفرت پیدا کر رہا ہے۔''

اس انکشاف پر آکاش کی عقل چکرا کے رہ گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ساری بدمعاشی اور حرکت شیوناگ کی ہے۔ اس نے ان لوگوں کو اس لئے تدبیر کی ہے کہ وہ کسی بھی قیمت پر مندر نہ پہنچے اور وہ نامراد ہو جائے۔

''میرا مخلصانہ اور ہمدردانہ مشورہ ہے کہ تم پچھلے راستے سے چپ چاپ نکل جاؤ۔ پنڈت ہری پرشاد اس علاقے کا سب سے خطرناک بدمعاش ہے...... معلوم نہیں کس کی ایماء پر تمہارے خلاف دشمنی کرنے پر اکسا رہا ہے...... اس کمینے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کوئی پاپی اور بدمعاش ہو۔ نا گہانی بلائیں تمہارا پیچھا کر رہی ہیں۔ انہیں اس بات کا خوف اور اندیشہ ہے کہ تمہاری وجہ سے شاکر پور پر کوئی مصیبت نازل نہ ہو جائے۔

وہ ان پے در پے واقعات سے سخت پریشان اور اس قدر ہراساں ہو چکا تھا کہ بلا سوچے سمجھے اس کا مشورہ مان لیا۔ اس کے کوئی اور صورت اور چارہ کار بھی نہیں تھا۔ بھٹیارا نے ایک چٹائی توڑ کر اس کے مفرور ہونے کے لئے راستہ بنایا۔

باہر نکل کر کھلی فضا میں آتے ہی معاً اس کی نگاہ آسمان کی طرف اٹھی اور اس نے بے شمار لہراتی ہوئی روشن لکیریں نیچے آتی ہوئی دیکھیں، ان لکیروں میں سے نکلنے والی دھیمی دھیمی پھنکاروں نے چند لمحوں کے لئے اسے خوف زدہ کر دیا وہ سمجھ چکا تھا کہ روشن سانپوں کے ذریعے شیوناگ نے پھر ایک بار اس کا تعاقب شروع کر دیا ہے اور اسے مندر سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ اب اس کے لئے مندر بہت اہم ہو چکا تھا۔

دو روشن سانپ ہوا کے دوش پر لہراتے ہوئے تیزی سے اس کی جانب آئے تو وہ بڑی مشکل سے اپنی چیخ روک سکا۔ کیوں کہ اس صورت میں پنڈت ہری پرشاد بھی اپنے مشتعل سانپوں کے ہمراہ اسے گھیر لیتا اور وہ دہری مصیبت میں گرفتار ہو جاتا...... پھر اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

کئی ثانیے گزر گئے لیکن ان میں سے کسی بھی روشن سانپ نے اس پر حملہ نہیں کیا۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے اوپر کی طرف دیکھا۔ وہ پھنکارتے ہوئے روشن سانپ اس کے سر پر اڑ رہے تھے۔ ان کے اس رویے سے اسے کچھ تقویت ملی تو وہ ایستادہ ہو گیا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ اس پر حملہ آور نہیں ہوں گے بلکہ اسے دہشت زدہ کر کے مندر جانے سے روکیں گے۔

اس بات کا اندازہ کرتے ہی وہ سرعت کے ساتھ

شمشان گھاٹ کی طرف لپکا۔ ان روشن اڑن سانپوں کی پھنکاریں یک بیک تیز ہوگئیں...... اور وہ یک بیک اس کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگے۔

وہ جوں ہی شمشان گھاٹ کے قریب پہنچا اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

اس کے سامنے پانچ خون خوار بھیڑیے منہ پھاڑے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی لٹکتی ہوئی سرخ زبانوں کی دونوں جانب نوکیلے دانت چمک رہے تھے۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہ دونوں روشن سانپ غائب ہوچکے تھے۔

اس وقت دن بھر کا تھکا ماندہ سورج اپنی نرم اور بے جان کرنوں سمیت مغرب کی وادی میں آہستہ آہستہ روپوش ہو رہا تھا۔ افق پر سلگتے ہوئے آنچل کی سرخی بکھری ہوئی تھی اور فضا میں شام کا سرمئی دھندلکا ہر سو پھیلنے لگا تھا۔

اس نے رک کر چند ثانیوں تک صورت حال کا بغور جائزہ لیا۔ پھر اس نے جوں ہی قدم آگے بڑھایا وہ بھیڑیے دبی دبی آوازوں میں غرا کے اسے خوف زدہ کرنے کی کوشش کرنے لگے تو اس کے بڑھتے ہوئے قدم تھم سے گئے۔

اس صورت میں کئی لمحات گزر گئے۔ اسے اس بات پر سخت حیرت ہوئی تھی کہ وہ بھیڑیے اپنی فطرت کے خلاف اس پر حملہ کرنے سے گریز کیوں کررہے ہیں جب کہ اسے ایسا لگا تھا کہ یہ کئی دنوں سے بھوکے ہیں۔

اسے فوراً ہی اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ یہ بھی شیوناگ کی ایک چال ہے اسے خوف زدہ اور ہراساں کرنے کی۔ یہ خیال آتے ہی وہ بڑ احتاط ہو کر اور سنبھل سنبھل کے بے خوفی سے آگے بڑھا۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا کہ بھیڑیے اپنی اپنی جگہ پر اس طرح ساکت و جامد نظر آئے جیسے یہ پتھر کے مجسمے ہیں۔ بس وہ بے حس و حرکت اپنی خوف ناک غراہٹوں سے اس طرح ڈرانے کی کوشش کرتے رہے جیسے ابھی جھپٹ پڑیں گے اور اس کی تکابوٹی کرڈالیں گے، وہ درندے تھے کوئی عام قسم کے حیوان نہ تھے جو اسے زک نہ پہنچاتے..... لیکن پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ اس نے کئی کاٹ کر نکلنا چاہا تو وہ دوبارہ اس کی راہ میں مزاحم ہوگئے۔ پھر اس نے ان کی گرم گرم سانسیں اپنے بدن کے اوپر محسوس کیا تو اس کے دل کی دھڑکنیں اس قدر تیز ہوگئیں کہ اسے اپنے دماغ میں گونجتی محسوس ہوئیں۔ پھر وہ اپنا دل مضبوط کرکے آگے بڑھا اور اپنے منتشر حواس کو یکجا کرکے اس افتاد اور ان کے حملے سے خود کو بچانے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ اس کے سوا اسے کوئی اور صورت نظر نہیں آئی۔

زندگی اور موت کے اس دوراہے پر تذبذب اس کے لئے ہلاکت کا بہانہ بن سکتا تھا۔ اس نے اس لئے کوئی پروا نہیں کی اور بے خوفی سے آگے بڑھنے لگا۔ اس نے یہ فیصلہ سوچ بچار کے بعد کیا تھا۔

جیسے ہی اس کا اگلا قدم اٹھا وہ بھیڑیے اس طرح گھبرا کے ہٹے جیسے کوئی عفریت انہیں نگلنا چاہتی ہو۔ انہیں پکڑنا چاہتی ہو۔ جب وہ پھرتی سے ان کے درمیان سے بڑھا تو وہ سب ایک طرف سمٹ گئے۔ پھر وہ اس کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھے۔

اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور کوندا بن کر مخالف سمت لپکا۔ وہ بھیڑیے اس کے تعاقب میں غراتے ہوئے تعاقب کرنے لگے لیکن ان میں سے کسی نے اس پر عقب سے حملہ نہیں کیا۔ آخر کار اسے اس مندر کی عمارت نظر آنے لگی اور اسی کے ساتھ بھیڑیوں کی آوازیں یک لخت سنائی دینا بند ہوگئیں تو اس نے فوراً ہی پلٹ کر دیکھا۔ ان پانچوں میں ایک کا بھی دور دور تک نام و نشان نظر نہیں آیا۔ سناٹے کا راج تھا۔ وہ پراسرار گدھے کے سر کے سینگ کی طرح غائب ہوچکے تھے۔

مندر کے پاس والے مکانوں کے نزدیک کچھ لوگ الاؤ روشن کئے حقے کا دم لگا رہے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی اس کے قدموں کی رفتار سست پڑگئی۔ وہ یہ تاثر دینا نہیں چاہتا تھا کہ وہ خوف کی سی حالت میں دوڑتا

ہوا آ رہا تھا۔ وہ چہل قدمی کے انداز میں ان کے قریب سے گزر گیا اور ان میں سے کسی نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

مندر کے احاطے کے قریب ایک چوبی کھمبے پر مٹی کا ایک دیا ٹمٹما رہا تھا..... فضا پر چھائے ملگجے پن میں دیئے کی لو یوں بھڑک رہی تھی کہ ہر آن ایسا لگتا تھا کہ کسی بھی پل بجھ سکتا ہو۔

دھڑکتے دل کے ساتھ مندر کے احاطے میں پنڈت رام دیال کی سمادھی کے قریب داخل ہوا۔ اس احاطے کے اندر گھستے ہی ہوا میں ایک عجیب سی تازگی اور فرحت کا احساس ہوا اور اسے یوں لگا کہ اس احاطے میں قدم رکھتے ہی وہ شیوناگ اور اس کی بلاؤں اور نادیدہ قوتوں سے محفوظ ہوگیا۔ وہ اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔

سرسبز احاطے کو عبور کر کے اس نے ٹوٹی اور بے حد گھسی ہوئی چپلیں اتاریں۔ پھر عقیدت سے سرشار سمادھی کے وسیع احاطے میں داخل ہوگیا۔ وہاں میں ہر طرف تاریکی پھیل چکی تھی..... اور وہاں ہر سو آتما کو شانتی بخشنے والا سناٹے کا راج تھا۔ بھٹیارے کی زبانی اس نے سمادھی کے بارے میں سینہ بہ سینہ چلی آنے والی ایک عجیب روایت سنی تھی جس کے مطابق کوئی عقیدت مند اس کے احاطے میں نہیں رہتا تھا کیوں کہ اس روایت کے مطابق سورج غروب ہونے کے بعد سمادھی پر حاضری دیا کرتے تھے۔

وہ محتاط انداز میں پنجوں کے بل چلتا سمادھی پر پہنچا۔ سمادھی کے چبوترے پر لوبان اور اگربتی کے دھوئیں چھائے ہوئے تھے۔ وہاں سرسوں کے تیل کے دیوں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ پھولوں سے لدی سمادھی صاف دکھائی دیتی تھی۔

اس نے چبوترے کے پاس کھڑے ہوکر سادھو مہاراج کا بتایا ہوا اشلوک پڑھا۔ پھر سمادھی کے اور قریب ہوتے سے دوپہر کو پانی سے ملنے والا سنگ مرمر کا سفید ٹکڑا اس وقت بھی اس کی جیب میں موجود تھا جسے اس نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

اس سے اس کے روئیں روئیں پر عقیدت آمیز رقت چھائی ہوئی تھی اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی آنکھیں غیرارادی طور پر نم ناک ہونے لگی ہیں..... دل و دماغ پر ناقابل بیان سرور سا چھایا ہوا تھا۔ گردش دوراں کی ہر فکر محو ہوچکی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے ابھی ابھی جنم لیا ہو..... نہ نیلم یاد تھی اور نہ گزرا ہوا صعوبت زمانہ یاد تھا۔

وہ کافی دیر تک خالی الذہن کے عالم میں سمادھی کے قریب سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر اس کے کانوں میں سرگوشی گونجی تو وہ چونک پڑا۔ اس نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈال کر سنگ مرمر کا سفید ٹکڑا نکالا اور بڑے ادب کے ساتھ سمادھی کے سرہانے رکھ دیا۔

وہ پھر اس کے قبضے سے نکلتے ہی اسے اپنی پیاری بیوی نیلم یاد آ گئی جو شیوناگ کی قید میں تھی۔ وہ پراسرار، ہولناک اور ڈراؤنی سرزمین یاد آگئی جہاں ناگ راجہ حکمران تھا اور جس کا نام ابھی ذہن پر جما ہوا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں گڑگڑا کے ایشور سے مدد مانگی اور فرط جذبات سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور دماغ پر ہلکا سا سرور طاری ہونے لگا۔

نہ جانے وہ پچھلے گناہوں کی ندامت کے آنسو تھے یا موجودہ بے بسی کے آنسو..... ان کی جھڑی ایسی لگی کہ وہ رکنے میں نہیں آ رہے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنا لباس نوچ نوچ کر چیخ چیخ کر روئے اور سمادھی پر اس وقت تک روتا رہے جب تک دل کا غبار نہ چھٹ جائے، وہ چاہتے ہوئے اور اپنا پورا زور صرف کرنے کے باوجود بھی چیخ نہ سکا۔ اس کی دبی دبی ہچکیاں اس سمادھی سے ٹکرا کے کہتی رہیں اور اس کا بدن یخ بستہ سردی کی طرح کانپنے لگا اور اس کی شدت اسے بے حال کئے دے رہی تھی۔

''آ کاش! تو خوش ہوجا کہ تو اپنی دلی مراد میں کامیاب ہوگیا.....'' اسے سمادھی میں سے ایک آواز سنائی دی۔ ''تیری جیون ساتھی ملے یا نہ

ملے..... لیکن تیرا کالی راج دھانی کی سرزمین پر پہنچنا مقدر بن چکا ہے۔''

اس نے چونک کر ہر طرف نظریں دوڑائیں۔ اپنی آنکھیں مل مل کر دیکھا لیکن وہاں اس کے سوا کوئی دوسرا ذی روح موجود نہ تھا۔ ''وہ گلابی ناگن تیرے لئے مسخر کی گئی ہے اور اس کے منکے پر تیرا حق جو ہے وہ جائز ہے۔'' وہ دبی دبی نادیدہ آواز بدستور گونج رہی تھی۔ ''وہ منکہ باہر تیری جوتیوں کے پاس موجود ہے۔''

یہ نوید سنتے ہی اس پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہوئی اور وہ فرش پر سے اٹھ کر اندھوں کی طرح باہر بھاگا۔ مندر سے نکل کر اس نے ننگے پاؤں وسیع اور تاریک دالان عبور کیا اور جب اس نے اپنی ٹوٹی چپلیں اٹھائیں تو فرطِ مسرت سے اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ امرتا رانی کا منکہ زنجیر سمیت وہاں پڑا ہوا تھا۔

اس نے پاگلوں کی طرح وہ منکہ اپنی مٹھی کی گرفت میں لے لیا اور دوبارہ سادھی کی طرف دوڑا۔ ایک روشن دیے کے پاس جا کر خوب الٹ پلٹ کر اس منکہ کو دیکھا اور پھر اپنے گلے میں پہن لیا۔ وہ منکہ اس کا جانا پہچانا امرتا رانی کا منکہ ہی تھا۔ پھر وہ سادھی کی عمارت یک بیک تیز روشنی سے بھر گئی وہ سراسیمگی سے کئی قدم پیچھے تیزی سے ہٹ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آسکا۔ وہ روشنی کہاں سے پھوٹ رہی ہے۔ وہ لمحوں تک اندھوں کی طرح پلکیں جھپکاتا رہا اور پھر فرش پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔

اس بے ہوشی کے دوران اس نے ایک سفید باریش سنیاسی کو مخاطب پایا۔ انہوں نے اسے ٹھہرے ہوئے لہجے میں تفصیل اور وضاحت سے سمجھایا کہ وہ کس طرح کالی راج دھانی کے راستے میں نقب لگا کر اس ہولناک دھرتی پر پہنچ سکتا ہے۔

جب اسے دوبارہ ہوش آیا تو مندر میں وہی سرسوں کے دیوں کی ہموار روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اسے کالی راج دھانی کا بھولا ہوا نام دوبارہ یاد آچکا تھا۔ اس کے لئے حیرت اور خوشی کی بات تھی۔ اب اس کا ذہن کورا کاغذ نہیں تھا۔

آکاش نے اسی جگہ سے دالان پر ایک سرسری سی نظر دوڑائی۔ وہاں بدستور رات کی سیاہی مسلط تھی۔ وہ چند لمحوں تک تذبذب کا شکار رہا اور آخر کار منکہ کی قوت آزمانے کے لئے اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کیوں نہ مندر میں شب بسری کرلی جائے۔ یہ جذبہ اس پر حاوی ہوا تو وہ سادھی سے باہر الٹے قدموں سے باہر دالان میں نکل آیا۔ دالان عبور کر کے اس نے احاطے میں اپنی چپلیں پہنیں اور پھر دل ہی دل میں امرتا رانی کو فوراً واپس آنے کا حکم دیا۔ وہ مندر کے احاطے میں کھڑا ہر سمت نگاہیں دوڑاتا رہا۔ انتظار کے اذیت لمحات گزرتے رہے لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ امرتا رانی کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اسے پریشانی اور تشویش ہوئی۔ امرتا رانی کا حکم نہ بجا لانا حیران کن تھا۔

اس پر مایوسی کی لہر چھانے لگی تو دوسرے لمحے اسے یہ گمان گزرا کہ شاید امرتا رانی اب منکے سے آزاد ہو کر شیوناگ کی قیدی اور غلام بن کر رہ گئی ہے۔ پھر اس کے دل میں ایک نئے اندیشے نے سر ابھارا تو وہ کانپ کر رہ گیا۔ امرتا رانی کئی دنوں سے چوں کہ شیوناگ کی قید میں ظلم وستم کا نشانہ بن رہی تھی اور نہ جانے اس پر وہ کیسی اذیتیں دے رہا ہوگا۔ شاید وہ اس کی ایذا رسانی برداشت نہ کرسکی جس سے موت کی بھینٹ چڑھ گئی ہوگی۔

وہ اداسی کے عالم میں کھڑا رہا۔ وسوسوں اور اندیشوں کے زہریلے ناگ اسے ڈستے رہے تو وہ مندر کے احاطے سے باہر آیا۔ اس کا ذہن کٹ رہا تھا۔ چند ثانیوں کے بعد وہ چونک پڑا۔

وہ احاطے سے باہر آیا تھا کہ کسی نے عقب سے اس کی آنکھوں پر اپنے نرم و نازک اور گداز ہاتھ رکھ دیئے۔

ان ہاتھوں کا لمس اس کے لئے نامانوس نہیں تھا۔ وہ مہینوں سے اس لمس سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ وہ امرتا کہہ کر بے اختیار پلٹا۔ وہ اس اچھوتے اور لطیف لمس کو

صدیوں تک بھی فراموش نہیں کرسکتا تھا۔
وہ مرمریں اور گداز ہاتھ والہانہ انداز میں اس کے گلے میں حمائل ہوگئے۔ اس نے فرطِ مسرت سے بے قابو ہوکر امرتا رانی کو بازوؤں کے حصار میں لے کر سینے میں جذب کرلیا۔
پھر وہ اس کے چہرے پر جھک گیا۔ دونوں جذباتی ہوگئے۔ دیر تک انہیں اپنا ہوش نہیں رہا تھا۔
امرتا رانی اس کے بازوؤں میں سمائی ہوئی تھی۔
آکاش نے محسوس کیا کہ چند ہی دنوں میں وہ بے حد کمزور ہوگئی تھی۔ اس کا بدن نقاہت سے کانپ رہا تھا اور وہ سسک بھی رہی تھی۔
''میں نے تمہیں طلب کیا تھا تو تم فوراً کیوں نہیں آئیں؟'' اس نے امرتا رانی کو سینے سے الگ کرکے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
''اس مندر کے احاطے میں سادھی کے باعث کوئی پر بھی نہیں مار سکتا...... میں تمہارا حکم پاتے ہی یہاں آگئی تھی۔ اندر آنے سے مجبور تھی۔ اس لئے باہر انتظار کرتی رہی...... اندر قدم رکھتے ہی میرا سارا بدن جل کر کوئلہ بن جاتا اور تم ہمیشہ کے لئے کالی راج دھانی کے لئے بھٹکتے رہ جاتے۔'' وہ بے جان لہجے میں بتانے لگی۔ ''اور تم...... تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔'' آکاش نے درمیان میں اور اندھیرے میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
منکے کے بغیر نہ تم میرے مالک تھے اور نہ مجھ میں مقابلے کی ہمت تھی۔ شیوناگ نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا...... تو میں اس دنیا میں نہ رہتی۔ وہ راکشش بھیڑیوں کی طرح میرا بدن نوچتا رہا۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔
آکاش نے اس کے بدن کی جگہ جگہ دیکھا جو زخموں سے چور تھا اور ان پر خون جما ہوا تھا۔
''تمہاری یہ ابتر حالت مجھ سے دیکھی نہیں جارہی ہے۔'' آکاش نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ تمہاری حالت کیسے اور کیوں کر ٹھیک ہوگی؟''
''تم ان کی چنتا نہ کرو اب......'' وہ بے جان مسکراہٹ سے بولی۔ ''میں جیسے اپنا منکہ منہ میں رکھوں گی ٹھیک ہوجاؤں گی...... اس کے علاوہ ٹھیک ہونے کی کوئی اور صورت نہیں ہے اور نہ ہی ان زخموں کے مندمل ہونے کی کوئی دوا ہے۔''
آکاش چند ثانیوں کے لئے تذبذب میں پڑ گیا۔ اتنی صعوبتوں کے بعد ہاتھ آیا ہوا اس کے حوالے کرتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ کہیں امرتا رانی پھر سے اسے اپنی ملکیت بنالے...... لیکن پھر اس کا عہد یاد آیا۔ وہ ناگ دیوتا کی سوگند کھا کر ایک موقع پر اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر منکے پر قبضہ نہیں کرے گی۔
آکاش نے شک کو مٹا کر دھڑکتے دل سے منکہ اپنے گلے سے اتار کر امرتا رانی کو دے دیا۔
امرتا رانی نے بڑے احترام کے ساتھ منکے کو بوسہ دے کر آنکھوں سے لگایا اور پھر وہ سیاہ پتھر اپنے منہ میں ڈال کر اسے چوسا۔
آکاش پر ایک ایک پل کسی صدی کی طرح بھاری ہو رہا تھا۔
گوکہ امرتا رانی اس سے عہد کرچکی تھی لیکن اسے اس نسل سے کسی عہد کے ایفا کی ذرہ بھر امید نہیں تھی۔ وہ اندر سے غاروں میں مہا پجاری شنکر ناتھ کا حشر دیکھ چکا تھا۔ امرتا رانی نے وعدہ کرنے کے باوجود اسے پہاڑی ڈھلانوں پر سسکا سسکا کر مار ڈالا تھا اور پھر ناگ دیوتا کی خوشنودی کے لئے آسان سا کنارہ ادا کردیا تھا۔
''یہ لو...... اب میں پہلے کی طرح بالکل ٹھیک، تندرست اور توانا ہوں، میرے زخم اب نہیں رہے۔''
امرتا رانی نے منکہ اس کی طرف منہ سے نکال کر بڑھادیا تو اس کی آواز میں دکھ اور مایوسی کے بجائے سدا بہار شوخی رچی بسی ہوئی تھی۔
آکاش نے اس کے ہاتھ سے منکہ لے کر دوبارہ اپنے گلے میں پہن لیا۔ سکون اور طمانیت کا گہرا سانس لیا۔
اس صحت یابی کی خوشی میں ان دونوں نے جذباتی

انداز سے ایک دوسرے کو مبارکباد دے کر تھوڑی دیر دل خوش کیا۔

''ابھی رات باقی ہے۔ ہمیں سب سے پہلے رات بسر کرنے کی فکر کرنی چاہئے؟'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر ایک طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''نہیں...... ہمیں اسی وقت سون مندر کے عقبی جنگلات میں پہنچنا اشد ضروری ہے۔'' آکاش پرجوش لہجے میں کہنے لگا۔ ''میں جلد از جلد ناگ بھون میں گھس کر ناگ راجہ کو زیر کرنا چاہتا ہوں۔ میں خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔''

''وہاں جنگلوں میں کیا رکھا ہے؟'' اس نے تحیر زدہ نظروں سے آکاش کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''سون مندر میں تو شاید سنگیت بھی بیکار ہو کر رہ جائے گا۔ بس یہی فائدہ ہوگا کہ شیو ناگ ہمارے جسموں کو ذرہ برابر بھی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ وہاں ہم چوہوں کی طرح اس کی قید میں پھنس جائیں گے۔''

''تم یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔'' اس نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ ''جو تمہاری مرضی...... سنگیت کہاں ہے......!'' امرتا رانی نے ایک دم چونک کر پوچھا۔

''وہ اس دنیا سے روٹھ چکی ہے۔'' آکاش نے یہ بتاتے ہوئے دل میں ہلکی سی کسک محسوس کی۔

امرتا رانی کے استفسار پر اس نے تفصیل سے سنگیت کی پوری کہانی سنادی۔

''یہ تو بہت برا ہوا۔'' اس کے خاموش ہونے پر افسردگی سے بولی۔ ''اس وقت ہمارے لئے سنگیت بہت کارآمد ثابت ہوتی۔ وہ بڑی وفادار اور پرخلوص لڑکی تھی۔ اس کی بڑی کمی محسوس ہوگی۔''

فضا بوجھل محسوس ہونے لگی۔ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ خاموش ہوجانا ہی مناسب سمجھا۔

ذرا سی دیر میں وہ شمشان گھاٹ کے نزدیک والے ویرانے میں جا پہنچے۔ امرتا رانی نے سانس روک کر آنکھیں بند کر لینے کی ہدایت کی۔ جس پر اس نے بلا چون وچرا عمل کیا۔ اور جب اس نے آنکھیں کھولنے کے لئے کہا تو اس نے خود کو سون ہاٹ کے جنگلات میں موجود پایا۔

جنگل حیوانات اور ہر طرح کے پرندوں سے بھرے ہوئے اس جنگل پر غیر فطری اور بھیانک سکوت نے اپنا راج مسلط کیا ہوا تھا۔ وہ سب آنے والے ہولناک واقعات کی بو پا کر اپنی کمین گاہوں میں دبک گئے ہوں۔

''سون ہاٹ میں ایسی اجاڑ رات تو میں نے کبھی دیکھی نہیں تھی اور نہ ہی اس کا تصور کرسکتی تھی۔'' امرتا رانی اس گھور اندھیرے میں اس کے قریب آکر اس کا ہاتھ تھام کر سرگوشیانہ آواز میں بولی۔

''یہ ناگ حویلی جسے ناگ بھون بھی اور نہ جانے کیا کچھ کہا جاتا ہے اس پر حملہ کرنے کی پہلی رات ہے۔'' ''میری جان امرتا رانی! اس پرجوش آواز میں کہا تو اس کی آواز دھیمی سی تھی۔ ''جانوروں کو قدرت نے خطرات کی بو سونگھ لینے کی قوت عطا کی ہے...... وہ جان چکے ہیں اور محسوس بھی کرلیا ہے کہ آج کی رات سون مندر والوں پر بھاری ہے۔ کیا تم محسوس کررہی ہو راتوں کو چیخنے والے الو بھی خوف سے سہم کر خاموش ہیں۔ یہ بات تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتی اور سمجھتی بھی ہو۔''

''تو بتاؤ کہ اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟'' امرتا رانی کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش نمایاں تھا۔

''سون مندر سے آنے والی ایک سوکھی بدرو یہاں سے گزر کر سون ندی سے جا ملتی ہے...... اور یہاں قرب وجوار میں اس کا ایک دہانہ ہے۔ اب ہمیں وہی تلاش کرنا ہے۔'' آکاش نے اس کے اور قریب ہوکر سرگوشی کی۔

''اوہ......'' وہ بے اختیار بول پڑی۔ ''گویا تم اس چور راستے سے مندر میں گھسوگے......؟''

''ہاں......'' آکاش نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''بڑے پھاٹک سے سون مندر والے شیو ناگ کے سامنے بے بس اور مجبور ہوجاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ دروازہ اس کے سحر میں ہے۔ بدرو کا راستہ اختیار کرکے

ہم سون مندر میں بھی بے بس اور مجبور نہیں ہوں گے۔''
''اچھا......؟'' امرتا رانی کی زبان سے ایک تحیر انگیز آواز نکلی۔ وہ اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ ''یہ راز تمہیں کیوں کر معلوم ہوا؟''

''یہ بتاؤ کہ یہ بات تم نے مجھ سے کس لئے پوشیدہ رکھی تھی؟'' اس نے سرد سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔ اس کی ذہنی رو یک لخت بہک چلی تھی۔ ہر جگہ کے کچھ ایسے راز ہوتے ہیں میرے آکاش جی......! تمہیں باغی ہو کر بھی ناش نہیں کیا...... ایسے راز عام کرنے والے کو میرے تمام ہم نسل بے رحمی سے ہلاک کردیتے ہیں...... مجھے پورا یقین ہے کہ یہ بات تمہیں اپنی ہی نسل کے کسی پہنچے ہوئے آدمی سے معلوم ہوئی ہے...... لیکن اسے یہ راز کیوں کر معلوم ہوا۔ کیوں کہ ناگ حویلی کا طلسم بہت ہی بھیانک ہے۔ اس کے راز جاننے والا تو پاگل ہو کر خودکشی کرلیتا ہے...... بھلا تم تک یہ بات کیسے پہنچی؟ عقل حیران ہے؟''

اس نے امرتا رانی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر قریب کرلیا اور فاتحانہ انداز سے ہنس پڑا۔

''بہتر ہے کہ اس بات کو بھول جاؤ اور بدرو کے دہانے تک میری رہنمائی کرو...... میں شیوناگ سے انتقام لینا چاہتا ہوں...... اس نے مجھے مجبور اور ہراساں کرکے بہت بری طرح ذلیل اور رسوا کیا ہے......؟'' اس کا لہجہ یک بیک زہریلا ہوگیا۔ ''میں نے اپنی آنکھوں سے چکر پوجا کا گھناؤنا جشن دیکھا ہے۔ میری نظروں کے سامنے ناگ راجہ نے نیلم کے بدن پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی...... اگر نیلم کی فریاد پر قدرت جوش میں نہ آتی تو شاید میری آنکھوں کے سامنے نیلم کی آبرو داغ دار ہوجاتی تو میں وہ سب دیکھنے پر مجبور ہوتا جیسے دیکھنے سے پہلے مجھے موت آجانی چاہئے تھی۔''

وہ کچھ نہ بولی اور اس کا ہاتھ تھام کر گھنے درختوں اور خود رو جھاڑیوں کے درمیان سے گزر کر ایک طرف بڑھنے لگی۔

جنگل پر چھایا ہوا پر ہیبت سکوت کچھ اور گہرا ہوچکا تھا۔ چھائیں چھائیں کرتے اکا دکا جھینگر بھی اب خاموش ہوچکے تھے اور درختوں کے درمیان سرسراتی ہوئی ہوائیں بھی تھم چکی تھیں۔ اس کے اعصاب پر ناقابل بیان سنسنی چھائی تھی۔ ایک طرف کالی راج دھانی میں پہنچنے کا اٹل جذبہ تھا اور دوسری طرف انجانے اور مہیب خطرات کا خوف پریشان کئے دے رہا تھا۔ کالی چادر میں لپٹی ہوئی وہ رات کافی خنک تھی۔ امرتا رانی اس گھپ اندھیرے کے باوجود اس کا ہاتھ تھامے یوں آگے بڑھ رہی تھی جیسے وہ ہر چیز یوں دیکھ رہی تھی جیسے روشنی میں نظر آرہی ہو۔ اس نے جوں ہی ایک خار دار جھاڑی کو عبور کیا کچھ دور ہلکی ہلکی سراہٹیں سنائی دیں جیسے خشک پتوں پر کوئی دبے دبے قدموں چل رہا ہو۔

اس کا سانس جہاں تھا وہیں رک گیا۔ امرتا رانی نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے رک جانے کے لئے کہا...... وہ پراسرار سرسراہٹ اس وقت تک معدوم ہوچکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ پراسرار سرسراہٹ کس کی تھی؟ کیوں تھی؟

''اس رخ پر بھی سون مندر کے رکھوالے موجود ہیں۔ اس لئے پنجوں کے بل بے آواز قدموں سے چلو۔'' امرتا رانی نے چند لمحوں کے بعد بوجھل سکوت کا دم توڑنے کے بعد کہا۔ ''اس لئے کہ وہ ہر آہٹ پر چونک پڑیں گے۔''

آکاش کو اس کے رویے پر خاصی الجھن ہوئی۔ کیوں کہ ایک طرف وہ ایسے پنجوں کے بل چلنے کی ہدایت دے رہی تھی اور دوسری طرف خود اونچی آواز میں باتیں کئے جارہی تھی۔ یہ حرکت اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔

''اپنے اصل روپ میں سانپ بالکل بہرے ہوتے ہیں۔'' وہ اس کی الجھن بھانپ کر بولی۔ ''انہیں اونچی اونچی آواز بھی سنائی نہیں دیتی ہے لیکن ان کا بدن زمین کی دھمک کو دور ہی سے محسوس کرلیتا ہے۔ اب ہمیں کوئی آہٹ پیدا کئے بغیر بہت ہی محتاط انداز سے سنبھل سنبھل کر چلنا ہے...... اس لئے میں نے تمہیں

تاکید کی تھی۔''

آکاش کا سانس تیز ہوتا جارہا تھا۔ دوران خون اس کی کنپٹیوں پر جیسے ہتھوڑی کی سی ضربیں لگا رہا تھا اور اس کی دھمک کھوپڑی میں بھی محسوس ہونے لگی تھی اور امرتا رانی اس کا ہاتھ تھامے چوروں کی طرح دبے قدموں گھنے جنگل میں گھستی چلی جارہی تھی...... جیسے اطراف کا چپہ چپہ اس کا دیکھا بھالا ہو۔

وہ امرتا رانی کے ہمراہ کافی دیر تک گھنے درختوں اور بے ترتیب خودرو جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتا آگے بڑھتا رہا۔ لیکن امرتا رانی کی رفتار سست ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ویرانی بدرو کی تلاش میں پوری رات یوں ہی گزارنے پڑے گی۔ سے اندازہ نہ تھا کہ وہ جگہ اتنی دوری پر واقع ہوگا۔

''اب وہ جگہ کتنی دور ہے جان من!'' آخر وہ پوچھ ہی بیٹھا۔

''میری جان......! میں خود بھی پریشان ہوں۔'' وہ متفکر آواز میں بولی۔ ''اب سے کافی دیر پہلے ہمیں خشک بدرو پہنچ جانا چاہئے تھا لیکن اس کا دور دور تک پتا نہیں ہے۔ شاید میں تمہیں پہلے بتا چکی ہوں کہ سون مندر کے اطراف کی زمین ہر طرف سرکتی رہتی ہے۔ اس لئے ہمیں خفیہ راستے تک پہنچنے میں دشواری پیش آرہی ہے۔''

''کہیں شیوناگ کو ہماری آمد کی خبر تو نہیں مل گئی ہوتی؟'' آکاش نے جنگل پر چھائے ہوئے مہیب سناٹے پر کان دھرتے ہوئے پوچھا۔

وہ خوف زدہ آواز میں ہنس پڑی۔ ''اگر اسے بھنک بھی مل گئی ہوتی تو ان جنگلوں میں قیامت ٹوٹ پڑتی۔ وہ ابھی بے خبر لگتا ہے۔''

اس کے بعد پھر سکوت چھا گیا۔ وہ چند لمحوں تک اس سکوت کی آغوش میں جذباتی ہوتے رہے تھے۔ امرتا رانی نے اس کا حوصلہ بڑھانے کے لئے فیاضی کا ثبوت دیا تھا۔ کیوں کہ اس نے محسوس کیا کہ آکاش نا امید اور شکستہ دل سا ہو رہا ہے۔ اس کے من مانی کرنے پر آکاش کی ہمت بڑھی تھی۔ پھر وہ دونوں احتیاط کے ساتھ پنجوں کے بل آگے بڑھنے لگے......

جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا اور اس کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ پھر اس نے چلتے چلتے امرتا رانی کو گود میں اس لئے اٹھا لیا تھا کہ یقین اور بے یقینی کی ایسی متضاد کیفیات اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی جس سے وہ تیزی کے ساتھ فیصلہ کرنے کی قوت سے محروم ہوتا جارہا تھا...... امرتا رانی کو سینے میں جذب کرنے اور وقفہ سے اس کے چہرے پر جھکتے رہنے سے اس کے دل کو ایک تقویت اور حوصلہ ملنے لگا تھا۔

''ہوشیار......!'' اچانک امرتا رانی اس کی گود سے اتر پڑی تو اس کی پرتجسس آواز ابھری۔ ''ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔''

آکاش کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ امرتا رانی نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ پھر اسے ہمراہ لے کر ایک پرانے درخت کی اوٹ میں سرک گئی۔ یہ درخت بڑا پرانا تھا اور اتنا ہی گھنا تھا اور اس کی شاخیں ہر سمت پھیلی ہوئی تھیں۔

اس نے رات کی گھور سیاہی میں اس کی طرف دیکھا۔ امرتا رانی کی پتلیاں کچھ دور ایک خاص نکتے پر مرکوز تھیں۔ اس کی نگاہوں کے تعاقب میں آکاش نے بھی اس جانب دیکھا اور بے اختیار چونک پڑا۔

گھنے جنگلات کے درمیان ایک چھوٹے قطعے پر بے شمار سانپ چوکنے کے انداز میں اپنے پھن اٹھائے کھڑے ہوئے تھے۔ اس حصے میں بہت ہی محدود اور سفیدی مائل دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جس کے باہر کوئی منبع نظر نہیں آیا تھا۔ ان چوکنے سانپوں کے درمیان میں زمین کا ایک چھوٹا سا قطعہ دھنسا ہوا تھا جس کی حالت سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہی سون مندر سے آنے والی بدرو کا دہانہ ہے جو استعداد زمانہ کے باعث بند ہو چکا ہے۔

''میری جان......! اب بہت پھونک پھونک کر قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ذرا سی بھی غفلت موت

کی آغوش میں پہنچا سکتی ہے۔'' امرتا رانی نے نیچے جھک کر لکڑی کا ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے کہا۔

''تم چنتا نہ کرو جان!'' آکاش نے ہیجان کے باعث کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔''اب ہم آسانی سے شیوناگ کے مقابلے میں آسانی سے زیر نہ ہوسکیں گے۔اب ہم مجبور اور بے بس اور کمزور نہیں رہے ہیں۔''

پھر امرتا رانی نے زمین پر سے اٹھایا ہوا لکڑی کا وہ مضبوط ٹکڑا پوری قوت سے جنگل کی فضا میں اچھال دیا۔

چند ثانیوں کے وقفے کے بعد جوں ہی فضا میں اس ٹکڑے کے گرنے کی پرشور آواز گونجی...... سفیدی مائل دھندلی روشنی میں لہراتے ہوئے سانپ ہم آواز ہو کر غضب ناک آواز میں پھنکارے اور چھلاوں کی طرح اس آواز کی سمت میں پھیلے ہوئے جنگل میں روپوش ہوگئے۔

''نکل پڑو میری جان!'' امرتا رانی نے اس کا بازو تھام کر کہا اور وہ اس کے ہمراہ درخت کی اوٹ سے نکل کر پرانی بدرو کے دھنسے ہوئے دہانے کی طرف دوڑ پڑے جہاں اب گھپ اندھیرے کا راج تھا۔

امرتا رانی نے اس سطح قطع پر پہنچتے ہی اس کا ہاتھ چھوڑا اور پھر آکاش نے فضا میں اس کی ہولناک پھنکاروں کی گونج محسوس کی۔اس کے ساتھ ہی آکاش کو محسوس ہوا کہ وہ تاریک اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والی دنیا میں جارہا ہے۔اس کی دونوں آنکھیں بند تھیں اور حواس اتھل پتھل ہورہے تھے۔

اسے اتھاہ گہرائی میں گرتے ہوئے کوئی دو گھنٹے ہوگئے تھے کہ اچانک اس کے پاؤں کسی سخت فرش پر ٹک گئے،تو اس نے ایک بہت ہی لمبا سانس کھینچا، پھر اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں، وہ حیرت کے سمندر میں غرق ہوگیا، کیونکہ آنکھیں کھولتے ہی اسے جو منظر نظر آیا تھا، وہ ایک بہت ہی وسیع و عریض مرصع ہال میں کھڑا تھا اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر کوئی ایک درجن کے لگ بھگ اپنی خوب صورتی میں بے مثال دیدہ زیب آنکھ کو خیرہ کرتی لڑکیاں کھڑی تھیں اور ان سب کی نظریں اس پر یک ٹک ٹکی ہوئی تھیں۔ ان لڑکیوں کا لباس عریاں تھا اور ان کے جسم کا نشیب و فراز کے شیشے کی طرح جھلک رہا تھا۔

وہ لڑکیاں خوب صورتی میں ایسی تھیں کہ اس وقت آکاش کو الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ وہ ان لڑکیوں کی تعریف کرسکے۔ ابھی تک اس نے ان جیسی حسین لڑکیاں نہ دیکھیں تھیں، ان لڑکیوں کے حسن کے آگے سنگیت اور امرتا رانی کا حسن بھی ماند پڑ رہا تھا۔

کہ اتنے میں ایک حسن سراپا آکاش کے قریب آئی اور اپنے خوب صورت سر کو ہلکا سا جھکا کر زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔''تم لوگ یہاں کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہی ہو۔ یہ بہت مہان پوتر مہمان ''وشنو بھگوان'' کے ہیں، چلو ان کو لے کر جاؤ اور ان کی سیوا کرو، بھوجن وغیرہ کراؤ، یہ بہت دور سے بے شمار اذیت برداشت کرکے یہاں تک وشنو بھگوان کے مہمان بن کر آئے ہیں۔''

اور یہ بول کر اس حسن مجسم نے آکاش کا ہاتھ پکڑا اور مسکراتے ہوئے بولی۔''مہاراج چلئے۔''

اس کی بات سن کر آکاش اس کے ساتھ آگے کو چلنے لگا، پیچھے پیچھے وہ لڑکیاں بھی تھیں جو کہ وہاں کھڑی آکاش کو دیکھ رہی تھیں۔

وہ سب آکاش کو لئے ہوئے ایک سجے سجائے کمرے میں پہنچیں۔ وہ کمرہ آنکھوں کو خیرہ کرتا ہوا تھا، کمرے میں چاروں طرف بے مول ہیرے جواہرات قرینے سے سجائے ہوئے تھے، کمرے کے درمیان ایک بہت ہی خوب صورت مسہری تھی جو کہ مرصع نگاری میں اپنی مثال آپ تھی۔

انہوں نے آکاش کو مسہری پر ادب سے بیٹھایا کہ اتنے میں ایک لڑکی اشارہ پاتے ہی دوڑتی گئی اور فوراً ہی ایک گلاس سونے کی تھالی میں رکھ کر لے آئی، گلاس بھی سونے کا ہی تھا۔ اس لڑکی نے تھالی آگے کی اور گلاس آکاش کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

جو سب سے خوب صورت لڑکی تھی وہ مترنم آواز

میں بولی۔ ''مہاراج یہ شانتی دینے والا شربت ہے، اسے آپ پی لیں، آپ کی ساری تھکن دور ہو جائے گی۔''

شربت سرخ رنگ کا تھا، آکاش نے گلاس اپنے ہونٹوں سے لگایا اور غٹا غٹ سارا شربت پی گیا۔ شربت کا حلق سے نیچے اترنا تھا کہ آکاش نے اپنے پورے وجود میں توانائی کی ایک نئی لہر محسوس کی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا پورا وجود پھولوں کی طرح ہلکا ہو گیا اور وہ اپنے اندر ناقابل بیان فرحت محسوس کرنے لگا۔

پھر اس لڑکی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی جو کہ سب سے زیادہ خوب صورت تھی۔ ''مہاراج آپ چل کر اشنان کرلیں ویسے بھی آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔'' پھر اس نے ایک لڑکی سے کہا۔ ''سپنا جلدی سے مہاراج کا لباس تیار کردے۔'' پھر وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''مہاراج! میں شما چاہتی ہوں کیونکہ میں نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔ میرا نام شانتی ہے۔''

خیر جب آکاش اشنان کرکے نکلا تو اس کے لئے شاہی لباس تیار تھا وہ لباس کیا تھا بلکہ ایسا لگتا تھا کہ کسی شہزادے کا لباس ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کے سامنے انواع واقسام کے کھانے تھے، جن کی خوشبو سے جیسے وہ بے قابو ہوئے جا رہا تھا۔

پھر شانتی کی آواز سنائی دی۔ ''مہاراج آپ بھوجن کریں۔''

شانتی کی آواز سنتے ہی آکاش جیسے کھانوں پر ٹوٹ پڑا کیونکہ آج اسے ایک طویل عرصہ بعد اتنا لذیذ کھانا کھانے کو ملا تھا، اس نے بہت سیر ہو کر کھانا کھایا۔

کھانا کھاتے ہی اس پر غنودگی چھانے لگی، جسے دیکھ کر شانتی بولی۔ ''مہاراج آپ آرام کریں اور اگر میری ضرورت ہے تو حکم کریں میں آپ کی سیوا کے لئے رک جاتی ہوں۔''

یہ سن کر آکاش بولا۔ ''شانتی تم جاؤ اور آرام کرو..... اگر تمہاری ضرورت ہوئی تو میں تمہیں آواز دے لوں گا۔'' اور یہ سنتے ہی شانتی مسکراتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

آکاش نرم و گداز بستر پر لیٹا تو لیٹتے ہی نیند کی وادیوں میں محو خواب ہو گیا۔

صبح ہوتے ہی آکاش کے کانوں میں مترنم آواز آئی۔ ''مہاراج اٹھیے صبح ہو گئی ہے..... اشنان کرکے ناشتہ کرلیں۔''

اور جب آکاش نے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ شانتی تھی اور اس کی دلکش مسکراہٹ ہونٹوں پر موجود تھی۔

آکاش انگڑائی لے کر اٹھا اور اشنان کے بعد واپس آیا تو ناشتہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔

جب وہ ناشتے سے فارغ ہوا تو..... شانتی بولی۔ ''مہاراج آپ کو وشنو بھگوان نے یاد کیا ہے، آپ میرے ساتھ چلیں۔''

اور پھر آکاش شانتی کے ساتھ چل پڑا..... چند راہداریوں سے گزرنے کے بعد شانتی ایک کمرے کے پاس جاکر رک گئی اور بولی۔ ''مہاراج آپ اندر جائیں..... وشنو بھگوان آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

آکاش سہمے سہمے قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔

وہ بہت ہی مرصع وسیع ہال تھا، اور وہاں پر بے شمار لوگ بیٹھے تھے اور بڑے تخت پر ایک بہت ہی شفیق اور رحم دل شخص بیٹھا تھا، اس کے آزو بازو اور بھی لوگ موجود تھے۔

سامنے تخت پر بیٹھے شخص کی نظر جب آکاش پر پڑی تو وہ مسکرایا اور بولا۔ ''بالک میرے قریب آؤ۔''

کمرے میں بیٹھے لوگوں اور کمرے کی سجاوٹ کو دیکھ کر آکاش بہت مرعوب ہو چکا تھا۔ اس کی ٹانگوں میں لغزش تھی۔

اتنے میں اس کی سماعت سے ایک شفیق آواز ٹکرائی۔ ''بالک اس وقت تم ''وشنو بھگوان'' کے دربار میں ہو۔''

پھر وشنو بھگوان کی آواز سنائی دی۔ ''بالک گھبراؤ نہیں۔ میرے قریب آکر بیٹھو۔''

اور آکاش خراماں خراماں چلتا ہوا..... وشنو بھگوان کے قریب جا پہنچا تو وشنو بھگوان نے اسے ایک مرصع کرسی پر بیٹھایا۔

پھر وشنو بھگوان کی آواز پورے ہال میں گونجی۔ ''سجنو! اس بالک کا نام آکاش ہے۔ میں دو روز پہلے ایک اجاڑ جگہ سے گزر رہا تھا تو اس کی درد و کرب میں ڈوبی آواز سنی..... یہ بہت ہی کربناک اور درد بھرے انداز میں ایشور کے آگے گڑگڑا کر فریاد کر رہا تھا۔ اس کی آواز میں اتنا درد تھا کہ میرے آگے کو بڑھتے قدم رک گئے۔ میں وہاں ٹھہر گیا۔ اور پھر میں اپنے تئیں اس کے حال جاننے لگا تو پتہ چلا کہ ناگ بھون میں موجود ناگ راجہ نے اس پر ظلم کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں اس کی خوب صورت پتنی کو اغوا کر رکھا ہے۔ اس کی پتنی حاملہ تھی، پھر بھی ناگ راجہ کو اس پر ترس نہ آیا۔

ناگ راجہ کی مرضی ہے کہ اس کی پتنی نیلم اپنی مرضی سے ناگ راجہ کی آغوش میں بیٹھ جائے اور ناگ راجہ اپنی نفسانی خواہشات پوری کرے۔

ناگ راجہ نے اپنے ایک سیوک شیوناگ کو اس بالک کے پیچھے لگا رکھا ہے اور شیوناگ طرح طرح کے ناقابل برداشت اذیت سے اس بالک کو دوچار کر رہا ہے۔

لیکن ایک بات بہت افسوس کی ہے کہ یہ ناگ دیوتا بھولے ناتھ جو کہ میرے بازو میں بیٹھے ہیں انہیں آج کل فرصت نہیں، یہ ناگ بھون سے بے خبر ہیں اور اس لئے ناگ بھون کا راجہ ظالم بن بیٹھا ہے۔ اگر ناگ دیوتا خبر گیری رکھتے تو آج نیلم اور اس کے اس پتی آکاش پر ظلم کا پہاڑ نہ ٹوٹتا۔

یہ سن کر ناگ دیوتا جیسے طیش میں آ گیا اور شرمسار لہجے میں بولا۔ ''وشنو جی۔ میں شرمندہ ہوں کہ یہ سب کچھ ناگ بھون میں ہوا۔ میں نے ناگ راجہ پر بھروسہ کیا اور اس نے میرے بھروسے کو ٹھیس پہنچائی۔ میں اسے اور شیوناگ کو عبرت ناک سزا دے کر ان دونوں کے وجود کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں گا۔

اس درمیان آکاش کی آنکھوں سے آنسو بڑی تیزی سے بہہ رہے تھے۔ خیر ناگ دیوتا اور وشنو بھگوان اس کے ساتھ بڑی ہمدردی سے پیش آئے۔

اس کے بعد ناگ دیوتا نے آکاش کو اپنے ساتھ لیا اور پلک جھپکتے ہی ناگ بھون میں پہنچا۔ ناگ دیوتا کو دیکھ کر ناگ بھون میں جیسے کھلبلی مچ گئی۔

ناگ بھون میں موجود ناگ راجہ پر نظر پڑتے ہی ناگ دیوتا نے ایک زوردار تھپڑ ناگ راجہ کو رسید کیا اور نیلم کے اغوا کی ساری رام کتھا اور ساتھ ہی آکاش پر ظلم توڑنے کے واقعات ناگ راجہ کے گوش گزار کر دی۔

ناگ راجہ کے تیور بڑے خطرناک تھے۔ ناگ دیوتا کے پہلو میں آکاش کھڑا تھا۔

ناگ دیوتا کے منہ سے زبردست شعلہ لپکا اور دیکھتے ہی دیکھتے ناگ راجہ جل کر راکھ میں تبدیل ہو گیا۔

اس کے بعد ناگ دیوتا نے آکاش کے کندھے پر تھپکی دی اور انکساری سے بولا۔ ''میں تم سے بہت شرمندہ ہوں اور میں نے پاپی کا انت کر دیا، پھر ناگ دیوتا نے ہیرے جواہرات سے بھرا ایک تھیلا آکاش کو دیا اور بولا۔ ''آکاش امرتا رانی کا دیا منکا اپنے پاس رکھنا تمہارے بہت کام آئے گا، امرتا رانی کا بھی انت ہو گیا ہے، اب تم اپنی پتنی کے ساتھ اپنے گھر چلے جاؤ اور کبھی کوئی ایسا وقت آئے تو مجھے یاد کر لینا، میں تمہاری مدد کو پہنچ جاؤں گا۔ اپنی پتنی کا ہاتھ پکڑو اور آنکھیں بند کر لو۔'' آکاش اور نیلم نے جب اپنی آنکھیں بند کر لیں تو انہیں لگا کہ وہ ہوا میں پرواز کر رہے ہوں، پھر ان کے قدم زمین پر ٹک گئے، ایک جھٹکا لگا اور آواز آئی۔ ''اپنی آنکھیں کھول دو۔''

اور جب انہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ وہ اس وقت اپنے گھر میں موجود تھے۔ دونوں پتی اور پتنی کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا، دونوں کی خوشی قابل دید تھی۔

ختم شد



آسیب

ایس امتیاز احمد-کراچی

ہر طرف دلوں کو ہولاتا سناٹا طاری تھا کہ اتنے میں ایک بھیانک اور ڈراؤنی آواز سنائی دی، اس آواز کو سنتے ہی بگھی میں جتا گھوڑا بے قابو ہو کر سرپٹ بھاگا اور پھر موت سے ہمکنار ہوگیا کہ اتنے میں......

گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی اپنی نوعیت کی دلخراش اور دل فگار انوکھی کہانی

وہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، قصبے کی مختصر آبادی میں مائیکل ڈوئیل واحد شخص تھا جوتو ہم پرست نہیں تھا۔وہ مضبوط قوت ارادی کا مالک تھا، لیکن اس کی بیوی سارہ نہ صرف پرلے درجے کی توہم پرست تھی بلکہ کمزوردل بھی تھی۔

اس وقت ڈاکٹر کارموڈی اندرونی کمرے میں سارہ کا معائنہ کررہاتھا اور مائیکل باہر بیٹھا ہوا سوچ رہاتھا کہ اسے اس دائم المریض اور وہمی عورت سے کب نجات ملے گی اگر اس کا بس چلتا تو اسے کبھی کا ٹھکانے لگا چکا ہوتا، لیکن یہ کوئی ایسی آسان بات نہ تھی۔ اس چھوٹے سے قصبے میں قتل کرنے کا کوئی رواج نہیں تھا کم ازکم مائیکل کے علم میں کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا اس لئے قتل کی واردات خواہ کتنی ہی مہارت سے کیوں نہ کی جاتی پورے قصبے کو ہلا دینے کے لئے کافی تھی۔ ذرا سا بھی شبہ خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔سو وہ کوئی ایسی ترکیب سوچ رہاتھا جس سے سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

''مائیکل......'' اس کے کانوں میں ڈاکٹر کی آواز آئی۔''اب تم اندر آسکتے ہو۔''

مائیکل چونک کرڈاکٹر کی طرف مڑا جو دروازے میں کھڑا تھا۔

''سارہ کیسی ہے ڈاکٹر......؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہاری بیوی کا دل بہت کمزور ہے مائیکل۔'' اندر جاتے ہوئے ڈاکٹر کارموڈی نے اسے بتایا۔

''اس کے اعصاب پر ایک نامعلوم سا خوف سوار ہے اسے مکمل آرام کی ضرورت ہے، تقریباً ایک ماہ تک اسے تنہا نہ چھوڑا جائے یہ بہت ضروری ہے۔''

''لیکن ایسا کس طرح ہوسکتا ہے ڈاکٹر کہ میں ہر وقت گھر میں تو موجود نہیں رہ سکتا۔'' مائیکل نے ڈاکٹر کو اپنی مجبوری بتائی۔

''تو پھر کچھ عرصے کے لئے اسے قصبے سے باہر کسی عزیز کے پاس بھیج دو۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''میں اسے کچھ دوائیں دے رہا ہوں۔ انہیں پابندی سے استعمال کراتے رہو اور مریضہ کے آرام کا پورا خیال رکھو۔''

''کیا وہ بالکل ٹھیک ہوجائے گی؟'' مائیکل نے ڈاکٹر سے اس طرح پوچھا کہ اس کی ذہنی کیفیت چہرے سے ظاہر ہوجائے۔

''امید تو ہے۔'' ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ''آسیب کا خوف کوئی معنی نہیں رکھتا ہم جانتے ہیں کہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں نے تمہاری بیوی کو چیک کرلیا ہے، فکر کی ایسی کوئی بات نہیں ہے، سب ٹھیک ہوجائے گا۔ بس تمہاری بیوی کی راتیں آرام سے گزرنی چاہئیں اور اسے ایک لمحے کے لئے بھی تنہا نہ چھوڑا جائے۔ میں کل پھر اسے دیکھنے آؤں گا۔ اب تم اسے تھوڑی دیر کے لئے سونے دو۔''

ڈاکٹر کے جانے کے بعد مائیکل نے کمرے میں داخل ہوکر اپنی بیوی کو دیکھا وہ آرام سے سو رہی تھی۔ وہ واپس پہلے کمرے میں آگیا اور صبح کا اخبار از سر نو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ ایسا نہ کرسکا اس کے خیالات بدستور بھٹک رہے تھے اور وہ سارہ سے چھٹکارا پانے کی فکر میں الجھا ہوا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے تک وہ ایک نارمل آدمی تھا اور اس کے ذہن میں کبھی ایسے مجرمانہ خیالات نے جنم نہیں لیا تھا۔ سارہ اس کے لئے ایک خدمت گزار بیوی تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک کچا عقیدہ رکھنے والی توہم پرست عورت تھی اس نے کبھی اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں دی۔ لیکن اب کچھ عرصے سے کسی نامعلوم خوف کے زیر اثر رہنے لگی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ مائیکل نے پہلے کی طرح اب اس میں دلچسپی لینی کم کردی تھی اور وہ بہت کم وقت گھر پر گزارتا تھا۔ اس کی وجہ دراصل مائیکل کے فارم میں کام کرنے والی نئی لڑکی مولی تھی۔

مولی بے حد شوخ اور دلیر لڑکی تھی اس کے اپنے قصبے کی عام عورتوں سے بے حد مختلف اور جو کہ اب مائیکل کے لئے بیوی سے چھٹکارہ پانے کی خواہش کا اصل سبب بن گئی تھی۔ اس نے مائیکل کی پیش قدمی کا جواب بڑے بھرپور طریقے سے دیا تھا۔ اس وقت بھی وہ بیوی کی بیماری کے تصور کے ساتھ مولی کی گہری سیاہ آنکھوں اور سرخ ہونٹوں کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔

مولی اس قصبے میں ایک ماہ پیشتر آئی تھی۔

لیکن وہ دونوں پہلے ہی ہفتے میں ایک دوسرے کے بے حد قریب آگئے تھے۔ مولی اور سارہ میں اتنا ہی فرق تھا کہ جتنا کسی مرجھائے ہوئے پھول اور نئی کھلنے والی کلی میں ہوتا ہے۔

مائیکل مولی سے قصبے کے مل کی پشت پر ملا کرتا تھا جو ایک ویران جگہ تھی۔ اس لئے ابھی تک قصبے والوں کو ان کی ملاقاتوں کا علم نہیں ہوا تھا۔

رات کے دس بج چکے تھے لیکن مائیکل کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی، وہ ایک کوچ پر سر جھکائے بیٹھا تھا اور مسلسل سارہ کی موت کے امکانات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ان دنوں وہ ذہنی طور پر خاصا پریشان تھا، کیونکہ ڈاکٹر نے ایک بار پھر اسے تنبیہ کی تھی کہ اگر وہ اپنی بیوی کو صحت یاب دیکھنا چاہتا ہے تو اسے نہ صرف ایک ماہ تک مکمل آرام دینا ہوگا بلکہ اس کے لئے مختلف تفریحات کا بھی خیال رکھنا ہوگا پھر اسے ڈاکٹر کا یہ مشورہ یاد آیا کہ اگر ممکن ہوسکے تو وہ اپنی بیوی کو ایک ماہ کے لئے قصبے سے باہر بھیج دے کیونکہ یہاں کا ماحول اور تنہائی اس کے لئے نقصان دہ تھے۔ ''اس کا ذہن اور دل اتنے کمزور ہوچکے ہیں کہ وہ ایک معمولی سا جھٹکا یا صدمہ برداشت نہیں کرسکے گی۔'' اب مائیکل کی ساری سوچ اس بات پر مرکوز ہوگئی تھی کہ وہ سارہ کو قصبے سے باہر کیسے اور کس کے پاس بھیجے۔!

ایک رات جبکہ مائیکل کی پڑوسن للی، سارہ کے پاس موجود تھی اور اسے کھانا کھلا رہی تھی مائیکل اپنے فارم میں کام پر جانے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ ان دنوں اس کی غیر موجودگی

میں اس کے پڑوسی ہی سارہ کا خیال رکھتے تھے۔ گھر سے نکلتے ہوئے بھی اس کے ذہن میں سارہ کی موت کا خیال گردش کرتا رہا تھا، وہ اپنے فارم کے بجائے سید ھا مل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ جس کی پشت پر، وہ اور مولی ملا کرتے تھے اور جس سے اس نے آج بھی ملاقات کا وقت طے کر رکھا تھا۔

چار سو گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جیسے جیسے وہ مل کے نزدیک ہوتا جارہا تھا اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی، اس نے مل کی عقبی دیوار کا نکڑ عبور کیا ہی تھا کہ دو خوب صورت بانہیں اس کے گلے میں حمائل ہوگئیں۔ ایک لمحے وہ چونکا پھر بے اختیار ہنس پڑا۔ وہ مولی تھی۔

''کیا وہ مرگئی؟ اس نے اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

مائیکل ایک جھٹکے کے ساتھ اس سے علیحدہ ہوگیا۔

''ایسامت کہو!''

''کیوں؟'' مولی کے سرخ ہونٹ اس کے چہرے کے نزدیک پہنچ گئے، وہ کہہ رہی تھی۔ ''کیا یہ تمہارے لئے ایک اچھی خبر نہ ہوگی!''

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔'' وہ جیسے چیخ اٹھا۔

''ٹھیک ہے مائیکل۔'' مولی نے ناراض ہوکر کہا۔ ''اب تم مجھ سے نہیں ملوگے۔''

''پلیز مولی۔'' مائیکل نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ آخر سارہ میری بیوی ہے۔''

مولی نے جو اس سے دور ہوگئی تھی ایک بار پھر اپنے بازو اس کے گلے میں ڈال دیئے اور اپنے ہونٹ اس کے کانوں کے قریب لاکر سرگوشی کے انداز میں بولی۔

''سچ بتاؤ مائیکل، کیا تم اپنی بیوی کی موت کے خواہش مند نہیں ہو۔''

''یہ بات نہیں ہے مولی۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

مولی کے سنہرے بال اس کے چہرے پر بکھر گئے تھے۔ اور اس کی گہری سیاہ آنکھیں اندھیرے میں روشن ستاروں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔

''مجھے یقین نہیں ہے مائیکل کہ تم سچ بول رہے ہو۔''

مولی کے بازو کسی شیطانی شکنجے کی طرح اس کے گرد کس گئے تھے، مائیکل کو یوں محسوس ہورہا تھا جیسے مولی کی سیاہ آنکھیں اس کے اندر دیکھ رہی ہوں۔ وہ مولی سے محبت کرتا تھا اس کے حسن سے متاثر تھا، لیکن اس کے باوجود وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے مجرمانہ خیالات کا علم مولی کو ہو۔

اگلی صبح فارم سے واپس جاتے ہوئے اسے ڈاکٹر کار موڈی کی بگھی ملی۔ اور ڈاکٹر نے مائیکل کو اپنے ساتھ بیٹھا لیا تاکہ اسے راستے میں اس کے گھر اتارا جائے۔

''تمہاری بیوی صحت یاب ہورہی ہے۔'' ڈاکٹر نے بات شروع کی۔

یہ سنتے ہی مائیکل کا دل بیٹھ گیا۔

ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ ''اس کے باوجود اگر تم میرے مشورے پر عمل کرلیتے تو تمہیں زیادہ تکلیف نہ ہوتی۔ یہاں کے لوگ بے حد توہم پرست ہیں۔ اگر وہ کچھ عرصے کے لئے ان کے درمیان سے نکل جاتی تو بہتر تھا۔''

ڈاکٹر کار موڈی نے مائیکل کو اس کے گھر کے سامنے اتارا اور آگے بڑھ گیا، مائیکل کتنی ہی دیر اس جگہ کھڑا بگھی کے پیچھے اڑتی گرد کو دیکھتا رہا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ سارہ کو صحت یاب ہونے سے کیسے روکا جاسکتا ہے، وہ مولی کو حاصل کرنے کے لئے دیوانہ ہورہا تھا اور سارہ کی زندگی اس کے اور مولی کے درمیان حائل تھی۔ یہ سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہوتا جارہا تھا۔ پھر جب وہ گھر میں داخل ہوا تو ایک فیصلہ کرچکا تھا۔

مائیکل اندر آیا تو اس نے دیکھا کہ پڑوسن لٹی سارہ کو سوپ پلارہی ہے تمام دن مائیکل خاصا پریشان رہا، دراصل وہ اپنے فیصلے کی تفصیلات پر غور کررہا تھا۔ شام کو جب وہ مولی سے ملا تو اس کی پریشانی اس کی گہری اور تیز نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''مجھے بتاؤ مائیکل کہ تمہاری پریشانی کی اصل وجہ کیا ہے؟''

مولی نے اپنا شاداب جسم مائیکل کے سپرد کرتے ہوئے پوچھا۔

مائیکل کچھ دیر خاموش رہا، پھر فکری مندی سے بولا۔

''ڈاکٹر نے کہا ہے کہ کوئی معمولی سا ذہنی جھٹکا یا صدمہ سارہ کی زندگی کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے، اس نے مجھے آخری بار تنبیہہ کی ہے کہ مجھے سارہ کی صحت کی خاطر اسے قصبے سے کسی دوسری جگہ منتقل کردینا چاہئے۔''

مولی کی سیاہ آنکھیں ایک انوکھے احساس سے چمکنے لگیں۔

''اگر ہم ایسا کوئی جھٹکا دے دیں تو کیسا رہے گا۔'' اس نے سرگوشی کی۔

مائیکل چند لمحے اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتا رہا پھر یکایک بولا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔''

''لیکن یہ کل ہوگا مائیکل۔'' مولی نے اس کے سینے پر اپنا خوب صورت سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

''میں اس کے متعلق تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔'' اس نے مولی کو پوری طرح اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ ہمارے لئے بہترین اور شاید آخری موقع ہے۔''

''یقیناً یہ ایک بہترین موقع ہے ڈارلنگ۔ لیکن میں جاننا چاہتی ہوں کہ کیسے؟'' کچھ دیر بعد مولی نے اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''ایک خوف۔ ایک اچانک جھٹکا'' مائیکل نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ ''سارہ آسیب پر شدت سے یقین رکھتی ہے، وہ کئی بار کسی بھوت کے تصور سے دہشت زدہ ہوچکی ہے، اگر ہم اس کے ساتھ ایسا ہی کوئی خوفناک مذاق کریں تو۔''

پھر مائیکل نے ساری تفصیل مولی کو بتاتے ہوئے کہا۔

''میں کسی رات اسے بگھی پر سیر کروانے لے جاؤں گا، ہم رات گئے واپس لوٹیں گے تو میں اسے بھوتوں کی کہانیاں سنانا شروع کردوں گا اور پھر کسی سنسان مقام پر بگھی کو کھڑا کرکے کچھ دیر کے لئے کسی بہانے اس سے الگ ہوجاؤں گا، اس کے بعد میں ایک سیاہ لبادہ اوڑھ کر اس کے پاس پہنچوں گا، سارہ مجھے دیکھ کر خوف زدہ ہوجائے گی اور یہ یقیناً اس کے کمزور دل کے لئے ایک ایسا جھٹکا ثابت ہوگا جس سے وہ شاید ہی جاں بر ہوسکے۔ اگر ڈاکٹر کارموڈی کی بات میں ذرا بھی صداقت ہے تو۔''

مولی بے اختیار ہنس پڑی۔

''سیاہ لبادہ اوڑھے ہوئے تم کیسے لگو گے۔''

''ہنسومت۔'' مائیکل نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ ایک عمدہ منصوبہ ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اس پر عمل درآمد میرے لئے اتنا آسان نہیں ہوگا۔''

''میں جانتی ہوں مائیکل۔'' مولی نے اس کے گرد اپنے گداز بازوؤں کا حلقہ تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ بھوت بن کر سارہ کو ڈرانے کا کام تم میرے سپرد کردو!''

مائیکل اس تجویز پر اچھل پڑا۔ پھر مولی نے اس سے کہا۔ ''تم کل ہی اس کو کسی رشتے دار کے یہاں چھوڑ آؤ تاکہ ڈاکٹر کو تم سے کوئی شکایت نہ رہے۔''

مائیکل نے یہ مشورہ بھی خوشی خوشی قبول کرلیا۔

دو راتوں کے بعد مائیکل قصبے کے مل کے پیچھے اپنے مخصوص مقام پر مولی سے ملنے پہنچا تو وہ بڑی بے تابی سے اس کی منتظر تھی۔

''کیا تم اسے چھوڑ آئے۔'' مولی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

''ہاں'' مائیکل نے اسے بتایا۔ ''سارہ کی ایک بہن ڈکنن میں رہتی ہے، میں نے جب سارہ کو بتایا کہ ڈاکٹر کارموڈی کے مشورے کے مطابق میں ایک ماہ کے لئے اس کو ایملی کے پاس چھوڑنے جارہا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئی، سفر کے دوران وہ تمام وقت اپنی بہن کی باتیں کرتی رہی کیونکہ وہ بہت عرصے بعد اس سے ملنے جارہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ ''میں خود اسے لینے آؤں گا۔''

اب جس دن میں سارہ کو لینے جاؤں گا ڈاکٹر کارموڈی سے مل کر جاؤں گا تاکہ اسے معلوم ہو کہ میں اسے ایک قصبے سے باہر رکھنے کے بعد واپس لینے جارہا ہوں۔ ہم ایسے وقت ڈکنن سے چلیں گے کہ قصبے تک پہنچتے پہنچتے رات ہوجائے۔ تم اس وقت سیاہ لبادہ اوڑھے ہوئے قبرستان کے آخری

سرے پر موجود ہوگی۔'' مائیکل نے مولی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''جیسے ہی تمہیں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دے تم قبروں کے پیچھے سے نکل کر سامنے آجانا۔ سارہ یقیناً تمہیں دیکھ لے گی، تب تم اپنے حلق سے عجیب وغریب آوازیں نکال کر چیخنا چلانا شروع کردینا۔ یقیناً وہ یہ اچانک صدمہ برداشت نہیں کرسکے گی اور......''

''واہ......'' مولی نے خوشی کے اظہار کے طور پر مائیکل کو اپنے بازوؤں میں بھینچ کر اس کے ہونٹوں پر مہر لگادی۔

ایک ماہ کے درمیانی عرصے میں مولی اور مائیکل ہر رات مل کے پیچھے اپنے مخصوص مقام پر باقاعدگی سے ملتے رہے اور سارہ سے چھٹکارا پانے کے منصوبے کو پختہ کرنے اور اسے عملی شکل دینے کا پروگرام بناتے رہے۔

ایک ماہ بعد مائیکل سارہ کو لینے ڈکنن چلا گیا۔ جس روز اسے واپس لوٹنا تھا مولی نے سرشام ہی اپنے ڈرامے کی تیاری شروع کردی۔

رات کی تاریکی میں قبروں کے درمیان ایک بھوت کی شکل اختیار کرتے ہوئے اسے بالکل خوف محسوس نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ بھوت پریت محض وہمی لوگوں کے ذہن کی اختراع ہیں ورنہ درحقیقت دنیا میں ان کا کوئی وجود نہیں اور مردہ لوگ کسی کو نقصان نہیں پہنچاسکتے۔ یہ اس کا ایمان تھا۔

سڑک کے نزدیک ہی ایک اونچی قبر تھی جس کے پیچھے مولی چھپی ہوئی سارہ اور مائیکل کا انتظار کررہی تھی۔

رات کا اندھیرا بڑھتا جارہا تھا۔ ہیبت ناک سناٹے میں کیڑے مکوڑوں کے سوا اور کسی ذی روح کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ایسے میں دور سے گھوڑے کی ٹاپوں کی مدھم آواز نے مولی کو خبردار کردیا۔ اس نے اپنے ساتھ لائے ہوئے سامان کا جائزہ لیا۔ یہ ایک اونچا سیاہ ہیٹ تھا جو اس نے سر پر پہن کر ایک بڑا سا کالا لبادہ اوڑھ لیا۔ اب وہ رات کی تاریکی میں کسی طویل القامت ڈراؤنے بھوت کا ہیولہ معلوم ہورہی تھی۔

جیسے ہی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نزدیک آئی تو مولی قبر کے پیچھے سے نکل کر اچھلتی کودتی سڑک پر آگئی، وقفے وقفے سے اس کے حلق سے وحشت ناک چیخیں بھی بلند ہورہی تھیں۔

بگھی کا گھوڑا اسے دیکھتے ہی خوف زدہ انداز میں ہنہنایا اور پھر یکایک بدک کر ایک طرف دوڑ پڑا۔

مولی نے اپنا ہولناک کھیل جاری رکھا اسے گھوڑے کی ہنہناہٹ کے ساتھ بگھی کے اندر سے کچھ آوازیں بھی سنائی دیں لیکن وہ اس ڈرامے کو کامیاب انجام سے ہمکنار کرنے کے جوش میں یہ بھی نہ دیکھ سکی کہ بگھی سڑک سے نیچے اتر گئی اور بدحواس گھوڑا اسے گہرے کھڈ کی طرف کھینچے لے جارہا تھا۔

دوسری صبح قصبے میں کہرام مچ گیا تھا۔ پورا قصبہ اس جگہ اُمڈ آیا تھا، لوگوں میں شامل ڈاکٹر کارموڈی بھی تھا۔

''لاش کی حالت بہت خراب ہے اور مائیکل کا چہرہ بری طرح مسخ ہوچکا ہے۔'' کارموڈی نے افسوس کے ساتھ کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گھوڑا آخر مائیکل کے ہاتھوں بے قابو کیسے ہوگیا؟''

''آپ لوگ مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے قصبہ کے آسیب نے مائیکل کی جان لے لی ہے۔'' سیاہ کپڑوں میں ملبوس مائیکل کی بیوہ سارہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''وہ کبھی آسیب کو نہیں مانتا تھا۔ کاش کہ مجھے ایملی نے مزید کچھ دن کے لئے اپنے گھر میں روک لیا ہوتا۔ یقیناً میں اسے آگے بڑھنے سے روک دیتی۔'' سارہ اپنے آنسو پونچھنے کے لئے رکی۔ پھر کہنے لگی۔ ''مجھے یقین ہے کہ وہ اسے دیکھ کر خوف زدہ نہیں ہوا ہوگا کیونکہ وہ آسیب کو نہیں مانتا تھا لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جانور بھی اس کا ہم خیال ہوگا! یقیناً گھوڑا ''آسیب'' کو دیکھ کر بدک گیا ہوگا ورنہ میں جانتی ہوں کہ ٹاکی مائیکل کا پالتو گھوڑا تھا اور وہ کبھی اس کے ہاتھوں سے بے قابو نہیں ہوسکتا تھا۔



ناگ بھون

خالد شاہان لوہار- صادق آباد

اچانک نوجوان کی آنکھوں میں حیرت ناک چمک پیدا ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے جسم سے دھواں اٹھنے لگا، اور جب دھواں چھٹا تو دل کو مسوستا حیرتناک منظر سامنے تھا، نوجوان ایک خوفناک سانپ میں تبدیل ہوچکا تھا۔

دل ودماغ پر حیرت کے پہاڑ توڑتی اور اچنبھے میں ڈالتی انوکھی انہونی اور حیرت ناک کہانی

آج سے چند سال پہلے میں بھی ایک چھوٹی سی حیثیت رکھتا تھا۔ میرا نام محمد کاوش ہے۔ میں اس وقت کے زمیندار دلاور خان کے سب ساتھیوں میں بڑے عہدے پر فائز تھا۔ دشمن میرے نام سے کانپتے تھے۔ میں نے دلاور خان کے لئے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ جن کی وجہ سے دلاور خان میری بہت عزت کرتا تھا۔ ایک بار دلاور خان نے جشن فتح منایا۔ اس فتح کا سہرا بھی میرے ہی سر تھا۔ اس لئے دلاور خان نے مجھے خصوصی حیثیت سے اس میں شریک کیا۔ پھر رقص وسرور کی محفل ہوئی اس میں انمول بھی شریک ہوئی جو کہ دلاور خان کی اکلوتی اور سب سے چہیتی بیٹی تھی۔

خواتین پردے میں تھیں، اس لئے میں تو انمول کو نہ دیکھ سکا۔ لیکن انمول مجھے دیکھتی رہی۔ اور اپنے دل ودماغ میں بسالیا۔

اس کے بعد انمول میرے عشق کی آگ میں سلگتی رہی اور جب اس سے برداشت نہ ہوسکا تو اس نے میرے نام ایک پیغام بھجوایا۔ انمول نے ایک خوب صورت شام کو مجھ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی۔

اس پیغام سے مجھے کچھ شبہ ہوا۔ لیکن میں ایک وفاشعار اور نمک حلال تھا۔ انمول میرے لئے محترم تھی۔ وہ میری آقازادی تھی۔ میں اس کے لئے ایسا تصور کیسے کرسکتا تھا۔

بہر حال انمول کے حکم سے انکار کی بھی میری مجال نہ تھی۔ چنانچہ مجھے جو وقت دیا گیا تھا۔ اس وقت میں مطلوبہ جگہ پر پہنچ گیا۔ چاروں طرف برف پوش پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان پہاڑیوں میں سے ایک کے دامن میں انمول کے خوب صورت خیمے لگے ہوئے تھے۔ آسمان سے نکلے ہوئے چاند نے برف سے ڈھکی پہاڑیوں کو چاندی کے ڈھیر میں بدل دیا تھا۔ ہلکی سنہری چاندنی نے ماحول میں آگ سی لگادی تھی۔ خنک فضا میں اس حسین منظر نے مجھے بے خود کردیا اور میں اس سے لطف اندوز ہوتا رہا اور اس چشمے کی طرف بڑھنے لگا جہاں مجھے پہنچنے کا حکم دیا گیا تھا۔ چشمہ نہ جانے کہاں سے نکلا تھا اور کہاں تک گیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں۔

میں تو چاند کی اس حسین تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ جو چشمے کے کنارے ایک اونچے پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ چاندنی نے سمٹ کر ایک انسانی شکل اختیار کرلی تھی۔

بلاشبہ وہ بے مثال مجسم حسین تھی۔ لمبے لمبے سیاہ بال، دودھ جیسے چہرے پر پیچ وخم بناتے ہوئے، پشت پر سے گزر کر پتھر پر بکھرے ہوئے تھے۔ سانچے میں ڈھلا



جسم ایک عجیب انداز بے خودی سے پتھر پر نصب تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں جھکی ہوئیں۔ یاقوت سے تراشے ہوئے ہونٹ ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے۔ میں بے خود بے ساختہ سا آگے بڑھتا رہا اور پھر ایک دم ٹھٹک گیا۔ یہ ارض حور کون ہے؟

مجھے تو انمول کے حضور میں طلب کیا گیا ہے۔ مگر وہ انمول تو نہیں ہے۔ اگر وہ انمول ہے تو میری گستاخ نگاہیں میرے اوپر عتاب لاسکتی ہیں۔ اس تصور سے ہی میں سنبھل گیا۔ اور میں نے اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لئے زور زور سے قدم زمین پر مارے۔ جس سے وہ چونک پڑی اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس کی نگاہوں میں استقبال تھا۔ لیکن میں اس کی نگاہوں سے نگاہیں نہ ملا سکا۔ میری نظریں فرط رعب سے جھک گئیں۔ میں نے دبی زبان میں کہا۔ ''آپ براہ کرم انہیں میرے آنے کی اطلاع کردیں۔ مجھے انمول کے حضور طلب کیا گیا تھا۔'' اور اس کے لب مسکراہٹ کے انداز میں پھیل گئے۔

''ہمارا نام ہی انمول ہے۔''

نقرئی گھنٹیاں جیسے بج اٹھیں۔ میں انمول کے نام سے واقف تھا۔

حقیقت معلوم ہونے پر اور بھی مودب ہوگیا۔

''انمول صاحبہ کے حکم کے مطابق حاضر ہوں۔'' میں نے بڑے ادب سے کہا۔

''آپ کی دلیری کے چرچے بڑے سنے تھے۔ ابا حضور تو آپ کی قصیدہ گوئی کرتے نہیں تھکتے۔ ہمیں بھی بڑی خواہش تھی۔ دوران جشن آپ کو دیکھا اور بہت متاثر ہوئے۔ لیکن ہم پردے میں تھے، آپ کے مقابل نہ ہوسکتے تھے۔ ہم نے آپ سے ملاقات کی آرزو دبانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے اور مجبوراً ہمیں آپ کو یہاں بلانا پڑا۔ آپ کو ناگوار تو نہیں لگا۔''

''میں انمول صاحبہ کا خادم ہوں۔ اشارے پر جان نثار کرنے کو تیار ہوں۔ بھلا آپ کی دلی خواہش کو رد کیسے کرتا۔'' میں نے کہا۔

''اس وقت ہم ایک شناسا کی حیثیت سے آپ سے ملے ہیں۔ برائے کرم ہمیں صاحبہ کہہ کر نہ مخاطب کریں، ہمارا نام انمول ہے۔''

''میں آپ کے نام کو زبان سے لینے کی جسارت کیسے کرسکتا ہوں۔''

''نور کاوش۔'' انمول نے بے قراری سے کہا۔ ''ہم اس مختصر وقت کو غنیمت جانتے ہوئے شرم و حیا نظر انداز کرتے ہوئے، آپ سے گفتگو کررہے ہیں۔ آپ

ہماری بات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ دوسروں کے لئے ہم کچھ بھی ہوں، آپ کے لئے صرف انمول ہیں۔ کیا آپ انمول کہہ کر نہیں پکار سکتے۔''

''میں اس جسارت سے خود کو معذور پاتا ہوں۔''

''نور کاوش۔ ہم آپ کے لئے صاحبہ نہیں ہیں۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں، ہم آپ سے محبت کرنے لگے ہیں، ہم آپ کو چاہتے ہیں۔'' انمول نے کہا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا۔

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی، انمول کی گفتگو سے میرے اس خیال کی تصدیق ہوگئی تھی۔ لیکن میں اس کے باپ کا نمک خوار تھا۔ میں نمک حرامی نہیں کرسکتا تھا۔ میں انمول سے محبت کرنے کے باوجود اسے حاصل کرنے کی خواہش نہیں کرسکتا تھا۔ وفاداری میرے جسم میں خون بن کر دوڑ رہی تھی۔

انمول کم سن کم عمر اور ناتجربہ کار تھی۔ وہ ناسمجھ دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر اپنا وقار قربان کر بیٹھی تھی۔

لیکن میں ہوش وحواس میں تھا۔ میں جانتا تھا اگر میں انمول کی محبت کا جواب محبت سے دے دوں، تو میری تباہی کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔ بھلا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگ سکتا ہے۔ انمول کے جھکے ہوئے سر اور ڈھکے ہوئے چہرے کو دیکھا تو سوچا۔ ''اس نادان لڑکی کو سمجھانا ضروری ہے۔''

چنانچہ میں نے آواز سنبھال کر کہا۔ ''آقا زادی۔''

''انمول نہیں کہو گے۔'' اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

''میں اپنی حیثیت سے واقف ہوں، آقا زادی، اور اپنی حیثیت کے دائرے سے نکل کر کسی المیے کو جنم نہیں دینا چاہتا۔ آپ ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ آپ آقا زادی ہیں، اگر وقتی طور پر آپ ایسے کسی جذبے سے متاثر ہوگئی ہیں تو اسے بھلانے میں آپ کو دقت نہ ہوگی۔ لیکن میری زندگی برباد ہوجائے گی۔ میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ آپ کے بابا دلاور خان کی نظروں میں الگ ذلیل ہوں گا اور اپنی زندگی سے الگ ہاتھ دھونا پڑے گا۔ آپ میری گردن کاٹ سکتی ہیں۔ مجھے آپ پر زندگی نچھاور کرکے مسرت ہوگی۔ لیکن میں آپ کی محبت قبول کرکے برباد نہیں ہونا چاہتا۔'' میں اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

''میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں آپ کی محبت کو ٹھکرا نہیں سکتا کہ میں آپ کے قدموں کی خاک ہوں۔ میں آپ سے محبت کرکے آپ کو رسوا نہیں کرسکتا۔''

''آپ یہ باتیں ہم پر چھوڑ دیں۔ نور کاوش، میں بابا سے خود بات کرلوں گی، وہ ہمیں بہت چاہتے ہیں اور پھر آپ بھی تو کوئی معمولی انسان نہیں ہیں۔ آپ بابا کی شان وشوکت کے ستون ہیں۔''

''آقا زادی خدا کے لئے میری بات مان لیں۔ مجھے برباد نہ کریں۔'' میں گڑگڑایا۔ اور انمول نے اٹھ کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

''ہم آپ کے بنا نہیں رہ سکتے، نور کاوش، اگر آپ نے ہمیں ٹھکرادیا۔ تو ہم مرجائیں گے۔ ہم خود کو پرانی حویلی کے سانپ سے ڈسوالیں گے۔ یہ ہمارا قول ہے۔''

''آپ جذباتی ہورہی ہیں آقا زادی، اگر آپ مجھے برباد کرنے پر تلی ہوئی ہیں تو ٹھیک رہے، میں آپ پر زندگی وارنے کو تیار ہوں۔ لیکن میری ایک درخواست ہے۔ اگر دلاور خان نے میری اس جرم کی پاداش میں میری گردن کٹوادی تو میری موت کے بعد آپ انہیں بتا دیں گی کہ میں نے نمک حرامی نہیں کی، میں آپ سے محبت کرنے کے باوجود آپ کے حصول کی جرأت نہیں کرسکتا۔ وعدہ کریں۔''

''نور کاوش'' انمول نے اپنا سر میرے سینے سے لگالیا۔

''آپ بالکل فکر نہ کریں، بابا حضور ہم سے بہت محبت کرتے ہیں، وہ ہماری خواہش کو رد نہیں کریں گے۔''

اور میرے بازو خود بخود انمول کے مخمل کی طرح ملائم جسم کے گرد کس گئے اور انمول بے خود ہوگئی۔

کئی منٹ تک ہم ایک دوسرے میں سمائے

رہے۔اور پھر انمول نے مجھ سے پھر ملنے کا وعدہ کیا۔ اس نے کہا۔ ''دوسری ملاقات کے لئے وہ میرے پاس پیغام بھجوادے گی اور دوسری ملاقات میں وہ مجھے یہ خوشخبری سنائے گی کہ اس نے بابا کو راضی کرلیا ہے۔''

پھر میں اس سے رخصت ہوگیا۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا کہ ''کیا میں بھی حقیقت میں انمول سے محبت کرنے لگا ہوں۔'' میں نے اپنے دل میں ایک ایسا تاثر ضرور پایا۔ لیکن اس جذبے میں وہ شدت نہ تھی۔ جو ہونی چاہیے۔ مجھے حسین انمول بے حد پسند تھی۔ لیکن میں اسے ناقابل حصول سمجھتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میری فطرت مجھے اس کی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ میں اپنی آقازادی کی محبت میں گرفتار ہوجاؤں۔

☆......☆......☆

دن گزرتے گئے اور پھر وہ ہی ہوا جس کا شبہ تھا۔ ایک دن دلاور خان کی خلوت میں میری طلبی ہوگئی۔ دلاور خان کئی بار مجھے براہ راست ملاقات کا شرف بخش چکے تھے۔ لیکن یہ ملاقاتیں دیوان عام میں ہوتی تھیں۔ میں آج تک ان کی خلوت میں نہیں گیا تھا۔ لیکن اس شام مجھے خلوت میں بلوایا گیا۔ میں دل میں لاکھوں وسوسے لئے دلاور خان کے سامنے پہنچ گیا۔

میں نے دیکھا کہ دلاور خان کے چہرے پر جلال ہے۔ ان کی آنکھوں میں غصے کی لہر ہے اور مجھے اپنی موت نظر آنے لگی۔ وہاں میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ آج ان کے چہرے کو دیکھ کر مجھے وہ گرم جوشی پیدا نہیں ہوئی جو ہوجاتی تھی۔ میں ادب سے کھڑا رہا۔

''ہم جاننا چاہتے ہیں نور کاوش کہ ہمارے وقار کی موت کب کیوں اور کیسے واقع ہوئی، بالکل سچ جواب کی ضرورت ہے، جھوٹ کے ہم قطعی متحمل نہیں ہوں گے۔ میں وضاحت چاہتا ہوں۔''

''دلاور صاحب۔'' میں پاٹ دار آواز میں بولا۔ نہ جانے میرے اندر وہ بے مثال جرات کہاں سے آگئی تھی۔ کہ میں نے دلاور خان سے سوال کرڈالا۔

''دلاور خان نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ اور پھر اسی پرجلال لہجے میں بولے۔ ''تم جانتے ہو، نور کاوش کہ انمول نے ہمیں سب کچھ بتادیا ہے اور تم اس بات سے ناواقف نہیں ہو۔''

پہلی بار میرے جسم میں ہلکی سی کپکپاہٹ طاری ہوئی، میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آپ کو علم ہے کہ خادم دلاور خان کے وقار پر اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے کے لئے تیار ہے۔ پھر آپ اپنے اس خادم سے اپنے وقار کی موت کا سوال کیوں کرتے ہیں۔''

''ہمیں بتاؤ نور کاوش کہ یہ سب کیسے ہوا؟''

''جشن کے روز انمول نے مجھے دیکھا تھا اور پھر مجھے ان کا پیغام ملا، آقازادی کی حکم عدولی میرے لئے ممکن نہ تھی۔ میں حاضر خدمت ہوا۔ آقازادی مجھے ایسا اعزاز بخشنے لگیں، جس کا تصور بھی میرے لئے نہ تھا، میں نے کہہ دیا کہ غلام اس کا اہل نہیں۔ لیکن معصوم اور ناتجربہ کار انمول میری بات قبول کرنے کو تیار نہ تھیں۔ خادم کے لئے انمول بھی قابل احترام ہیں۔ انمول کے اصرار پر خادم نے عرض کردیا کہ خادم ان کی معصومیت پر اپنی جان نثار کرنے کو تیار ہے۔'' اس کے علاوہ اور کوئی خطا نہیں ہوئی۔ تاہم انمول نے اس غلام کے بارے میں کچھ اور کہا ہے۔ تو غلام اپنے ہاتھوں سے اپنی گردن پیش کرنے کو تیار ہے۔''

''ہمیں تمہاری وفا پر شک نہیں ہے۔ نور کاوش، لیکن انمول کی یہ خواہش ہے وہ معصوم ہے۔''

''میری گزارش ہے کہ میری گردن قلم کرا کے ان کے حضور پیش کردی جائے، میری آنکھیں نکال کر ان کے قدموں میں ڈال دی جائیں، انمول کو بتادیا جائے کہ غلام اسی قابل ہوتے ہیں۔ انہیں کوئی منصب دینا انمول کے شایان شان نہیں۔''

''ہمیں اور شرمندہ نہ کرو نور کاوش ہم تم پر فخر کرتے ہیں۔ ہمیں تم پر اعتماد ہے۔ لیکن انمول ضدی ہے۔ اس نے ہمیں دھمکی دی ہے کہ اگر اس کی خواہش پوری نہ ہوئی تو وہ جان دے دے گی۔ ہمیں انمول سے بے حد پیار ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں اپنا وقار بھی عزیز ہے۔ ہم

چاہتے ہیں نورکاوش کہ تم یہ ملک چھوڑ دو۔ تمہاری تمام زندگی کی تمام عیش وعشرت کی ذمہ داری ہم لیتے ہیں۔''

''غلام کے لئے آپ کا اعتماد ہی کافی ہے۔ آپ کا یہ غلام آج ہی یہ شہر چھوڑ دے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''نہیں ابھی نہیں تم ایک ہفتے تک ہمارے دوسرے حکم کا انتظار کرو گے۔ ہم انمول کے جنون کو پرکھیں گے۔ اور اس کے بعد پھر تمہیں اجازت دیں گے اور تم سوچو گے، نورکاوش کہ ہم کتنے خودغرض ہیں۔ لیکن ہماری مجبوریاں بھی ذہن میں رکھو۔''

''مجھے احساس ہے آقا، میرے لئے یہ اعزاز کیا کم ہے کہ آپ کو میرے اوپر اعتماد ہے۔'' میں نے دلاور خان کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا اور ان کی اجازت سے وہاں سے چلا آیا۔

تیسرے دن میرے پاس خادم پہنچا اور اس نے مجھے دلاور خان کا پیغام پہنچایا کہ دلاور خان نے مجھے فوراً طلب کیا ہے۔ میں فوراً چل پڑا۔ حویلی میں داخل ہونے پر میرا ماتھا ٹھنکا کہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔ اور پھر مجھے معلوم ہوگیا کہ انمول پرانی حویلی میں جانکلی تھی۔ اور پرانی حویلی کے سانپ نے اسے ڈس لیا ہے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا کہ انمول نے اپنا قول پورا کردیا تھا اور اس کی موت کا ذمہ دار میں تھا۔

میں شرمسار سا دلاور خان کے سامنے پہنچ گیا۔ دلاور خان غم سے نڈھال بیٹھا تھا۔'' کچھ کرو۔ نورکاوش کچھ کرو، اس نے اپنی ضد پر قائم رہتے ہوئے وہ کردکھایا ہے جو اس نے کہا تھا۔''

''خادم کی جان حاضر ہے آپ حکم دیں، کیا ڈاکٹر؟''

''سب اپنی کوشش کرچکے ہیں۔ پرانی حویلی کا سانپ جس قدر زہریلا ہے۔ اس کا شاید تمہیں اندازہ نہیں۔ وہاں کی اگی گھاس کھا کر جانور مرجاتے ہیں۔ ہم کیا کریں بتاؤ نورکاوش ہم کیا کریں۔''

میں خود بھی کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن دلاور خان نے خود ہی اس کی پیشکش کردی، اور میں انکار نہ کرسکا۔

حویلی میں کہرام مچا ہوا تھا۔ انمول کا جسم نیلا پڑتا جارہا تھا۔ ڈاکٹر پریشان تھے۔

دلاور خان نے کہا۔ ''اگر سانپ اس کا زہر چوس لے تو اس کو بچایا جاسکتا ہے۔ جاؤ نورکاوش کسی ایسے سپیرے کو تلاش کرو جو اس سانپ کو انمول کا زہر چوسنے پر آمادہ کرسکے۔''

میں باہر نکل آیا۔ میں نے یہ کام دوسرے لوگوں سے کرنے کو کہا اور میرے قدم خودبخود پرانی حویلی کی طرف اٹھ گئے۔ نہ جانے کیوں میں ذہنی طور پر سخت پریشان تھا۔ اگر انمول کو کچھ ہوگیا تو اس کا ذمہ دار میں ہوں گا۔ اگر دلاور خان مجھے معاف کربھی دیتے تب بھی میں خود کو مجرم گردانتا۔

پورے شہر میں سپیروں کی تلاش جاری تھی۔ ابھی انمول کے ڈسے جانے کی اطلاع عام نہیں ہوئی تھی۔ میری دلی خواہش تھی کہ وہ سانپ مجھے مل جائے اور کسی طرح میں اسے انمول کا زہر چوسنے پر آمادہ کرلوں۔

لیکن میں جانتا تھا کہ یہ خواہش حماقت کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ تاہم غیرارادی طور پر میں پرانی حویلی کی جانب بڑھتا گیا۔ اس نئی حویلی سے پرانی حویلی صرف ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ یہ حویلی آثار قدیمہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ نئی حویلی کو بنے ہوئے کافی عرصہ ہوچکا تھا۔ لیکن پرانی حویلی کے کھنڈرات اب بھی باقی تھے۔ کیونکہ یہ اس خاندان کی نشانی تھی۔ پرانی حویلی بالکل ویران تھی اس میں جگہ جگہ گھاس اگی ہوئی تھی اور اسی حویلی کے ایک حصے میں وہ سانپ موجود تھا۔

میں اس حویلی میں داخل ہوگیا۔ میرا ذہن سخت پریشان تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ میں کھنڈرات میں اسی سانپ کو تلاش کررہا تھا۔ میں کھنڈر کے ایک ٹوٹے ہوئے ستون کے پاس سے گزر رہا تھا کہ میری نگاہ ایک طرف اٹھ گئی۔ سامنے ایک شخص بیٹھا تھا۔ فقیروں کے سے کپڑے پہنے ہوئے، لمبے لمبے بال اور عجیب سا چہرہ نہ جانے مجھے اس کا چہرہ اتنا عجیب سا کیوں لگا تھا حالانکہ وہ ایک درمیانی عمر کا ایک قبول صورت

انسان تھا۔ ''شاید یہ کوئی فقیر ہے جو بھٹکتا ہوا ادھر آ نکلا ہے اور یہ سانپ کی موجودگی سے لاعلم ہوگا۔ ورنہ اس طرح نہ بیٹھتا۔ میں نے سوچا اسے اس خطرناک کھنڈر کے بارے میں بتادوں۔ جو اس سانپ کا مسکن ہے۔''
اور میں اس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرانے لگے۔
''شاید تم فقیر ہو۔'' میں نے کہا۔
''ہاں تمہارا خیال درست ہے۔''
میں نے صاف آواز میں کہا۔ ''یہ کھنڈر خطرناک ہے۔ یہاں ایک زہریلا سانپ رہتا ہے۔''
''فقیروں کو کون نقصان پہنچا سکتا ہے۔'' اس نے شان بے نیازی سے کہا۔
''اس سانپ نے دلاور خان کی بیٹی انمول کو ڈس لیا ہے اور اس وقت وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے۔''
''اور تم شاید اس سانپ کی تلاش میں آئے ہو۔'' اس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔
''ہاں تمہارا خیال درست ہے پر تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' میں نے حیرت سے کہا۔
''فقیروں سے کون سی بات چھپی ہوتی ہے۔'' اس نے اسی انداز میں کہا۔
''تب تو تم اس سلسلہ میں ہماری مدد کر سکتے ہو۔'' میں نے بے اختیار کہا۔
''کیوں نہیں انمول کا زہر آسانی سے اتر سکتا ہے۔ خواہ کتنے ہی خطرناک سانپ کا زہر ہو۔'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا اور میں بے چین ہوگیا ...
''اگر تم اس سلسلے میں کچھ مدد کر سکتے ہو، تو خدا کے لئے ہماری مدد کرو، میں تمہاری جھولی جواہرات سے بھر دوں گا۔ آج تم فقیر ہو کل غنی کہلاؤ گے، خدا کے لئے ہماری مدد کرو۔''
''فقیروں سے دولت کی بات کر کے اس کی توہین مت کرو نوجوان، دولت تو ہمارے لئے حقیر سی شے ہے، ہاں کچھ اور چیزیں ہوتی ہیں جن کے ہم بھی محتاج ہوتے ہیں، اگر تم مجھ سے ایک وعدہ کرو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔''
''میں تیار ہوں تم جلدی بتاؤ؟ انمول کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ اگر اسے کچھ ہوگیا تو بہت سی زندگیاں تباہ ہو جائیں گی۔'' میں نے کہا۔
''اسے کچھ نہیں ہوگا یہ میرا وعدہ ہے۔ مگر معاہدہ پہلے۔''
''جلدی بتاؤ، کیا معاہدہ ہے۔'' میں نے بے صبری سے کہا۔
''ایسے نہیں۔'' مجھے یقین ہے کہ تم اس معاہدے سے پھرنے کی کوشش کرو گے۔ میں ایسی ضمانت چاہتا ہوں جس سے پھر انکار نہ ہو سکے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
''میں قول کا پکا اور زبان کا سچا ہوں۔ ہم لوگ اپنے قول سے نہیں پھرتے۔'' میں نے غصے سے کہا۔
''ٹھہرو۔'' اس نے کہا۔ اور ستون کے عقبی حصے سے گزر کر نہ جانے کس طرف چلا گیا۔ میں بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا پتھر تھا۔ جسے اس نے بڑے احترام سے دونوں ہاتھوں میں تھاما ہوا تھا۔ وہ پتھر سامنے کئے آگے بڑھا اور میرے قریب پہنچ گیا۔ ''یہ مقدس پتھر ہے۔ جو کوئی اس پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا ہے اور وہ اپنے عہد کی تکمیل کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ ورنہ ہزاروں سانپ اس کے جسم سے لپٹ کر اس کے خون کا ایک ایک قطرہ چوس جاتے ہیں۔ تم اس پتھر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ جو وعدہ کرو گے پورا کرو گے۔''
میں نے پوچھا۔ ''کیسا وعدہ؟''
''یہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تمہارا کام کروں گا۔'' انمول کی زندگی تمہارے لئے بہت قیمتی ہے۔ اسے بچانے کے لئے تم اپنی جان دینے کے لئے تیار ہو تو وہ شرط معمولی ہے۔ تم ہچکچا کیوں رہے ہو۔''
''ٹھیک ہے۔ پر میں ایک مسلمان ہوں، اس لئے پتھر کی قسم نہیں کھا سکتا، مجھے اپنے رب کی قسم ہے میں عہد

کرتا ہوں اگر انمول کی زندگی بچ گئی تو میں تمہاری ہر شرط قبول کروں گا۔''

''شکریہ۔'' اس نے کہا اور دوبارہ اندر چلا گیا۔ پھر رکھ کر دوبارہ آیا اور بولا۔ ''میں تیار ہوں۔'' میں اسے لے کر نئی حویلی کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد اندر سے بلاوا آ گیا۔ دلاور خان نے ہم دونوں کی پذیرائی کی۔

''انمول کون سے کمرے میں ہے؟'' اس نے پوچھا۔ اور دلاور خان ہمیں لے کر اس کمرے کی طرف چل پڑا۔

''دوسرے لوگوں کو کمرے سے ہٹادیا جائے۔ پچاس گز سے زیادہ قریب کسی کو بھی رہنے کی اجازت نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

اور جب دوسرے لوگوں کے ساتھ میں بھی نکلنے لگا تو اس نے آواز دے کر مجھے روک لیا۔ ''تمہیں میری مدد کے لئے یہاں رکنا ہوگا۔'' اس نے کہا۔ دلاور خان کو مجھ پر اعتماد تھا۔ اس لئے وہ بھی باہر نکل گئے اور اس نے اندر سے کمرہ بند کرلیا۔ پھر وہ آگے بڑھ کر انمول کی مسہری کی طرف آ گیا۔ انمول کا شیشے کی طرح چمکدار جسم نیلا ہو چکا تھا۔ بڑا خوفناک زہر تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے یہ فقیر کیا کرتا ہے۔ یہ زہر اتار بھی سکے گا یا نہیں۔

فقیر نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''اب جبکہ کہ تم عہد وفا کرنے کی قسم کھا چکے ہو، تو یہ سمجھو کہ میرے تمام راز تمہارے ہو گئے۔ میری حقیقت اگر تمہیں معلوم ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ آج نہیں تو کل مجھے تم پر اپنی اصلیت ظاہر کرنی ہے اور اب یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے کہ تم عہد نباہ کر میرے دوست بنو گے۔ یا عہد شکنی کر کے میری دشمنی مول لو گے۔ بہر حال میری سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ تمہیں میرا راز فی الحال راز ہی رکھنا ہوگا۔''

''کون سا راز؟'' میں نے پوچھا۔

تب اس نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے، اس کا منہ چھت کی طرف ہو گیا۔ اور پھر میں نے اس کے جسم سے عجیب سا دھواں خارج ہوتے دیکھا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھتا چلا جا رہا تھا۔ اور دھواں تیزی سے بلند ہو رہا تھا۔ پھر اس کے جسم پر سیاہی دوڑنے لگی۔ اس کا چہرہ تاریک ہونے لگا اور پھر چند ساعت کے بعد میرے حلق سے دہشت کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

فقیر کی جگہ اب وہاں ایک سیاہ رنگ کا بہت بڑا سانپ جھوم رہا تھا۔ جس کی جلد عام سانپوں سے زیادہ چمکدار اور خوب صورت تھی۔ اس کی جسامت بھی عام سانپوں سے بڑی تھی۔

میں نے بمشکل خود کو سنبھالا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ پھر مجھے زیادہ سوچنے کا موقع نہ ملا۔ وہ لہراتا ہوا انمول کی مسہری کی طرف بڑھا۔ اور اس کا آدھا جسم مسہری کے اوپر پہنچ گیا۔ پھر وہ انمول کے زخم کو بغور دیکھتا رہا، پھر جھومتے ہوئے اس نے اپنا منہ اس زخم پر جیسے چپکا دیا۔ شاید وہ انمول کے زخموں سے زہر چوس رہا تھا۔

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی اسے اور کبھی انمول کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے چہرے سے نیلاہٹ یوں غائب ہو رہی تھی جیسے نیلے رنگ پر گلابی رنگ کیا جا رہا ہو۔ چند منٹ تک وہ زہر چوستا رہا پھر اس نے زخم پر سے منہ ہٹا لیا۔ اور شرابی کی طرح جھومنے لگا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اسے نشہ ہو گیا ہو۔ اس کے بعد وہ مسہری سے ہٹ گیا۔ اور سیدھا زمین پر لیٹ گیا۔ میں نے کسی سانپ کو کبھی ایسا لیٹتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس طرح وہ لیٹا ہوا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں نشے کی سی کیفیت تھی۔ اب وہ انسانی شکل میں آ رہا تھا۔ اور چند لمحات کے بعد میرے سامنے وہی فقیر لیٹا ہوا تھا۔ ''مجھے سہارا دو۔'' اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

اور میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے ہاتھ کے سہارے سے اسے اٹھایا اور وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ ''چلو باہر چلو۔''

میں سہارا دے کر اسے باہر لے آیا۔ باہر سب لوگ ہمارے منتظر تھے۔ خود دلاور خان بھی ان میں موجود

تھا۔ انہوں نے بے چینی سے انمول کا پوچھا۔

''اندر تشریف لے جایئے دلاور خان صاحب، انمول صاحبہ ٹھیک ہوگئی ہیں۔'' میں نے کہا۔

اور دلاور خان تیزی سے اندر لپکا۔ اور میں فقیر کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ''تم چاہو تو ابھی یہاں رک سکتے ہو، کل صبح مین اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا۔ جہاں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔'' اس نے کہا۔

میں نے اس کی شکل دیکھی وہ بڑے پراسرار انداز میں مسکرا رہا تھا۔ بہرحال میں حویلی میں واپس آ گیا۔ میری عقل خبط ہو رہی تھی میں غور کر رہا تھا کہ ایک انسان سانپ کیسے بن گیا۔ اس سلسلے میں، میں نے روایات تو سنی تھیں۔ لیکن آج میری ذہنی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ مجھے اس عہد کا بھی احساس تھا۔ جو میں نے ایک سانپ سے کیا تھا۔ نہ جانے مجھ سے وہ کیا کام لینا چاہتا تھا۔

اندر آ کر مجھے اطلاع ملی کہ انمول ہوش میں آ گئی ہیں اور اور شدید پیاس لگ رہی ہے۔ اور طبیب اس کے لئے شربت خاص تیار کر رہے ہیں۔

پھر دلاور خان نے مجھے ایک بار پھر اپنی خلوت خاص میں بلا کر میری عزت افزائی کی، انہوں نے انمول کی زندگی بچانے پر میرا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا۔ ''میں ان کی اب عزت بچالوں۔ اور فوراً یہ ملک چھوڑ دوں۔''

جس پر میں نے کہا۔ ''میں آپ کے حکم کے لئے تیار ہوں۔ لیکن تھوڑی سی مہلت مجھے درکار ہے۔ بہرحال میں اپنے مکان میں نہیں رہوں گا۔ اور جتنے دن بھی یہاں گزاروں گا گمنامی کی زندگی گزاروں گا۔''

مجھے اس بات کی اجازت مل گئی اور میں وہاں سے چلا آیا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ انمول سے مجھے انسیت ضرور ہوگئی تھی۔ لیکن اسے عشق نہیں کہا جا سکتا۔ اس نے میرے لئے جان دینے کی کوشش کی تھی۔ اس بات سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ لیکن دلاور خان کا وقار بھی مجھے عزیز تھا اور میں خود وہاں سے جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے عہد کا بھی احساس تھا۔ میں نے سانپ کی خواہش کو بھی پورا کرنا تھا۔

دوسرے دن میں صبح کو پرانی حویلی کی طرف چل پڑا۔ میرے جسم پر سادہ لباس تھا۔ تاکہ لوگ میری طرف متوجہ نہ ہوسکیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اس کھنڈر نما حویلی میں داخل ہو چکا تھا اور وہاں پہنچ گیا جہاں پر میں پہلی بار اس فقیر سے ملا تھا۔ میرے پہنچنے کے چند منٹ بعد ہی وہ اسی ستون کے پیچھے سے برآمد ہوا اور مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ''بیٹھو دوست مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لئے کرسی مہیا نہیں کر سکتا۔ نہ ہی تمہیں اپنی رہائش گاہ میں لے جا سکتا ہوں۔ کیونکہ وہاں تم داخل نہ ہو سکو گے۔'' اس نے ایک پتھر کی طرف اشارہ کر کے کہا اور میں اسی پتھر پر بیٹھ گیا۔

''انمول تو ٹھیک ہے نا۔''

''ہاں وہ ہوش میں آ گئی تھی۔ اس کے بعد مجھے اس کی کیفیت کے بارے میں علم نہیں۔''

''وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ نہ جانے وہ یہاں کیوں آ گئی تھی۔ پوری حویلی میں چکراتی پھر رہی تھی۔ پھر وہ میرے بل کے نزدیک آ گئی میں تو اپنی فطرت سے مجبور ہوں، لیکن خیر اس ذکر کو چھوڑو، ہاں تو کیا تم اپنے عہد پر قائم ہو؟''

''کیا تم مجھے عہد شکن سمجھتے ہو۔''

''کیا تم میری اس شرط سے ناراض ہو۔''

''نہیں ابھی تو مجھے تمہاری شرط معلوم ہی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''تو سب سے پہلے تم میری دوستی قبول کرو۔ دوستوں کی حیثیت سے ہم ایک دوسرے کے زیادہ کام آ سکتے ہیں۔''

''میں پہلے تمہاری وہ شرط معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ تمہاری شرط ایسی ہو کہ ہماری دوستی برقرار نہ رہ سکے۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

''دوست بن کر میں تم سے ایسا کوئی کام نہ لوں گا۔ جس سے تمہاری دل شکنی ہو۔ تمہیں دوست بنانے سے پہلے میں تمہارے دل میں بھی کوئی شک نہیں رہنے دینا

چاہتا۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم دیکھ چکے ہو کہ میری اصلیت کیا ہے۔

میں سانپ ہوں اور کچھ ایسی قوتیں رکھتا ہوں جو تمہارے پاس نہیں ہے۔ لیکن تم انسان ہو۔ اشرف المخلوقات، بلاشبہ تم ایسی بہت سی قوتیں رکھتے ہو، جو ہمارے پاس نہیں ہیں۔ مجھے تمہاری وہی قوتیں درکار ہیں۔ میں تمہاری ان قوتوں سے کام لے کر اپنے ایک دشمن کو ہلاک کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''جو انسان نہیں بلکہ سانپ ہے'' اس نے پراسرار لہجے میں کہا۔

اور میں حیران رہ گیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا۔ ''میں تم سے کئے گئے عہد کا یہی صلا چاہتا ہوں، اس کے بعد بھی تم میری دوستی قبول کرو گے یا نہیں۔''

''کیا تمہارے دشمن کو ہلاک کرنا میرے اختیار میں ہے۔''

''ہاں ورنہ میں تمہیں تکلیف نہ دیتا۔ میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔ میں خود بھی اس میں ہلاک ہوسکتا ہوں۔ لیکن ایک عہد کے تحت ایک دوسرے پر وار نہیں کرسکتے۔''

''تمہارا دشمن کہاں ہے؟''

''ہماری سلطنت میں۔ میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔''

''وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''تمہاری دنیا سے دور ہے۔ سب سے الگ تھلگ لیکن وہ ہے اسی زمین میں اور تمہیں بغیر کسی تکلیف کے وہاں لے جانا میرا کام ہے۔''

میں گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ ''مجھے یہاں سے جانا تو ہے اور پھر میں اس لئے وعدہ بھی کر چکا ہوں۔ اگر اس کا ساتھ رہے تو کتنا اچھا ہے۔ اس طرح کم از کم مصروفیت تو ہوگی۔ اور میں اس چھن جانے والی چیزوں کے غم سے بھی محفوظ رہوں گا۔ چنانچہ میں نے حامی بھرلی۔

''کیا اب بھی میں تمہاری دوستی کے قابل نہیں ہوں۔'' اس نے پوچھا۔

''اب ہم دوست ہیں۔ میں نے کہا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیئے۔ اس نے محبت سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس کے چہرے پر خوشی کے آثار تھے اور پھر وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''اب میں دیکھوں گا کہ بوڑھا ناگ راج کس قدر چالاک ہے۔ اس کی تمام سازشیں ناکام ہوجائیں گی اور میری کھوئی ہوئی گدی واپس مل جائے گی۔

حکومت کی ہوس اور اس کے حصول کے لئے سازشیں تم انسانوں تک ہی محدود نہیں ہیں دوست بلکہ روح کو بھی حکومت کی چاٹ پڑ جائے تو وہ اس کے لئے دوسروں کو نیچا دکھاتی ہے۔ ہماری بھی ایک بستی ہے۔ ناگ بھون میں جو کہ سانپوں کی دنیا کہلاتی ہے۔ ہم بھی اپنی بستی کے حکمران ہوتے ہیں اور یہ منصب ہمیں قدرت کی طرف سے ہی بخشے جاتے ہیں۔ ناگوں کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ جن کے حکمران بھی ناگ ہوتے ہیں اور پھر یہ حکومت نسل در نسل ملتی ہے اور اس بستی کی حکمرانی پشت در پشت سے میری نسل کے پاس تھی۔ میرا باپ بھی حکمران تھا۔

لیکن ناگ راج ہزار سال سے اس آگ میں سلگ رہا تھا کہ بے شمار قوتیں رکھنے کے باوجود وہ حکومت کیوں نہیں کرسکتا۔ ہمارے بزرگوں کے دور میں اس کی ایک نہ چلی۔ لیکن میرے باپ کے انتقال سے پہلے اس نے اپنی بیٹی کی مدد سے ایک سازش کی۔ اس کی بیٹی سانپوں کے قبیلے کی سب سے حسین ناگن تھی اور بلاشبہ میں اس ناگن سے اپنا دل ہار بیٹھا تھا۔ حکمرانی کے لئے اس کا پاکیزہ ہونا بھی لازمی ہوتا ہے۔ اس میں کچھ صفات ہوتی ہیں۔ جن سے وہ دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے۔ تاہم عشق کرنا کوئی بری بات نہیں۔

میں ناگ راج کی بیٹی ناگنی کے عشق میں گرفتار ہوگیا۔ وہ بھی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ میرے سامنے بجلیاں گراتی رہی۔ میں اس سے شادی کرسکتا

تھا۔ لیکن حکمران بننے کے بعد۔

پھر میرے باپ کا انتقال ہوگیا اور مجھے حکمران بنانے کی تیاری ہونے لگی۔ جس دن مجھے حکمران بنایا جانا تھا۔ ناگ راج کی بیٹی ناگنی اچانک دربار میں پہنچ گئی۔ اس نے رو رو کر سب کو بتایا کہ ایسا حکمران بنایا جائے جس کے دور میں کسی ناگن کی عزت محفوظ نہ رہے۔ اس نے میرے اوپر الزام لگایا کہ میں نے زبردستی اس کی عزت لوٹی ہے اور میں اس قابل نہیں کہ حکمران بنایا جاؤں۔

ناگنی سے میری چاہت کے اور بھی بہت سے گواہ موجود تھے۔ انہوں نے اس بات کی تصدیق کردی کہ میں ناگنی کو پسند کرتا ہوں۔ میں ایسا بدحواس ہوا کہ اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ مجھے ناگنی کی بے وفائی کا بہت صدمہ ہوا تھا۔ اگر وہ چاہتی تو میں اس کے کہنے سے اسے حکومت دے دیتا۔ وہ اپنے باپ کو حکمران بناسکتی تھی۔ لیکن اس نے میرے ساتھ بے وفائی کی تھی اور میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں نے اس کی بات کی تردید بھی نہ کی۔ اگر کوئی عام سانپ ایسی حرکت کرتا تو اسے موت کی سزا دی جاتی اور اسے آگ میں کودنا پڑتا۔ جو دیوتا کا غار کہلاتا ہے۔

لیکن میں حکمران نسل سے تھا اور حکمران ہونے والا تھا اس لئے میرے ساتھ یہ رعایت کی گئی کہ مجھے اس بستی سے نکال دیا گیا اور پھر میرے نکلنے کے بعد کون تھا۔ جو حکومت کا طلبگار ہوتا سوائے ناگ راج کے، لوگوں نے اسے حکمران بنادیا اور میں نادم ہوکر دربدر پھرنے لگا۔ مجھے ناگنی کی بے وفائی کا صدمہ تھا۔ میں نے وہ بستی چھوڑ دی۔ اور نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا۔

میرے دل میں آتش انتقام دہک رہی تھی۔ لیکن میں خود ناگ راج سے انتقام نہیں لے سکتا تھا۔ اب میں تمہاری مدد سے اپنی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

میں حیرت اور دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ کیسی عجیب کہانی تھی۔ ایک انوکھی دنیا کی کہانی جہاں سانپ رہتے ہیں۔ جہاں سانپوں کی بادشاہت تھی۔

لیکن سانپوں کی حکومت میں ایک انسان کا گزر کیسے ہوسکتا تھا۔

''میں خوفزدہ بھی تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرے دل کے انتہائی گوشوں میں ایک خواہش مچل رہی تھی۔ اس انوکھی دنیا کو دیکھنے کی خواہش اور خوف و دلچسپی کی کشمکش میں، میں نے اس کے کام کو کرنے کی حامی بھرلی۔ اس نے نہایت گرم جوشی سے میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔'' وہ مجھے اپنی دنیا میں کیسے لے جائے گا؟''

جس کے جواب میں اس نے کہا۔ ''میں تمہیں بتاچکا ہوں کہ بعض قوتیں تم سے بڑھ کر ہمارے اندر ہیں اور بعض جگہوں پر تم ہم سے آگے ہو، میں انہی قوتوں سے کام لوں گا، تم فکر نہ کرو اور سفر کے لئے کب تک تیار ہوسکتے ہو، یہ بتاؤ۔''

''جب تم کہو۔'' میں نے کہا۔

''پھر ہم کل روانہ ہوں گے۔'' اس نے کہا۔

دوسرے دن میں کچھ سامان لے کر خاموشی سے پرانی حویلی میں پہنچ گیا۔ میں نے دلاور خان کو اپنی روانگی کی اطلاع دینے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ اب میں اس ملک کو ہمیشہ کے لئے چھوڑے جارہا تھا۔ اگر اس کام کو کرکے میں زندہ بھی بچ گیا تو میں یہاں آنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

وہ میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ہلایا۔ اور پھر پرانی حویلی سے نکل آیا۔ آج اس نے لباس بھی عمدہ پہن رکھا تھا اور چہرے کی بشاشت سے کافی اچھا لگ رہا تھا۔ راستے میں چلتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔ ''مجھے تمہاری بستی والوں کے بارے میں معلوم تو ہوگیا ہے لیکن ابھی تک تمہارے نام سے واقف نہیں ہوں۔''

''ارے ہاں اتفاق سے تمہیں میں اپنا نام بتانا بھول گیا تھا۔ میرا نام ناگ ہے۔''

''اب کیا پروگرام ہے ناگ؟ ہم کہاں چل رہے ہیں؟''

بندر گاہ، جہاں ایک جہاز اس بندر گاہ سے لنگر اٹھانے والا ہے۔ ہم اس سے سفر کریں گے۔ جہاز تو ایک دوسرے ملک کو جاتا ہے لیکن پہلے وہ میری سرزمین کے پاس سے گزارے گا پھر اور کہیں۔'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا اور میں خاموش ہوگیا۔

میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیا کرے گا۔ اور ہم بندر گاہ پہنچ گئے۔ جہاز پر سامان لادا جا چکا تھا۔ جہاز سے سفر کرنے والے مسافر اس پر پہنچ گئے تھے اور اب ان کی آخری چیکنگ ہو رہی تھی۔ جب سارا کام مکمل ہوگیا تو ناگ نے میرا ہاتھ پکڑا اور ڈیک سے گزر کر جہاز پر جانے والا تختے پر چڑھنے لگا۔ جہاز کا کپتان اپنے آدمیوں کو ہدایت دے رہا تھا اور تختہ اٹھایا جانے والا تھا۔

ہم دونوں کو دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ ضرور کوئی اعتراض کرے گا میں نے سوچا۔ جہاز کا کپتان ہمارے سامنے پہنچ گیا اور بولا۔ ''آپ کون ہیں اور جہاز پر کیوں آئے ہیں۔''

''مسافر ہیں آپ کے جہاز سے سفر کریں گے۔''

ناگ نے کپتان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور میں نے عجیب سی پراسرار روشنی اس کی آنکھوں سے خارج ہوتی ہوئی محسوس کی۔ کپتان پتھر کے بت کی طرح ساکت ہوگیا تھا وہ ناگ کی آنکھوں سے نظریں نہ ہٹا سکا۔ ''آپ ہمارے لئے فوری انتظام کریں گے۔'' ناگ نے کہا۔ اور کپتان اس کے ساتھ چل پڑا۔ پھر اس نے خصوصی کیبن کا بندوبست ہمارے لئے کردیا۔ اور ہم اس میں مقیم ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد جہاز نے لنگر اٹھا دیئے۔

میں حیرت زدہ تھا۔ لیکن اس وقت وطن سے جدا ہونے کا غم بھی تھا۔ جس نے مجھے افسردہ کردیا تھا۔ ناگ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں جس دنیا میں لے جا رہا ہوں وہ تمہاری دنیا سے زیادہ دلکش ہے۔ ناگن اپنے حسن میں بے مثال ہیں۔ وہ بڑی چاہت سے تمہارا استقبال کریں گی۔ اس کے علاوہ وہاں تمہیں ہر وہ نعمت میسر ہوگی جس کو تم پسند کروگے پھر بھی تمہارا اس دنیا سے دل اکتا جائے تو تم اپنی دنیا میں واپس آسکتے ہو۔ میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔'' میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

جہاز سفر کرتا رہا۔ کپتان تو ہمارے حکم کا غلام تھا اور دوسرے لوگوں کو بھی ناگ نے طابع کرلیا تھا۔ اور سب اس کے حکم پر دوڑے دوڑے پھرتے تھے۔

جہاز کا سفر جاری رہا اور پھر ایک سیاہ لکیر سمندر میں نمودار ہوئی ناگ بولا۔ ''آہ میرے دوست میں تقریباً سات سو سال بعد دوبارہ اپنی سرزمین دیکھ رہا ہوں۔''

''سات سو سال'' اور میں حیرت سے اچھل پڑا۔

''ہاں میرے دوست تمہیں حیرت کیوں ہوئی۔ ہماری عمریں ایسی ہی ہوتی ہیں۔''

میں حیرت زدہ اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

''لکیر نمایاں ہوتی جارہی تھی۔ پھر وہ زمین صاف نظر آنے لگی۔ جہاز اسی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر وہ سمندر میں لنگر انداز ہوگیا۔ کپتان نے لوگوں کو بتایا کہ ''جہاز کی کچھ مرمت کرنی ہے۔ اس لئے آج رات جہاز یہاں رکے گا۔''

رات کی تاریکی میں اس نے ہمارے لئے ایک کشتی کا انتظام کردیا اور ہماری کشتی خاموشی سے وہاں سے روانہ ہوگئی۔

وہ بڑا خوفناک جزیرہ تھا۔ رات کی تاریکی نے اسے حد سے زیادہ بھیانک بنادیا تھا۔ مجھے تاریکی میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ کئی بار ٹھوکر لگی تو ناگ نے کہا۔ ''میرا خیال ہے تمہیں تاریکی میں چلنے میں دقت ہو رہی ہے۔ اس لئے رات آرام کرنے کے بعد صبح چلیں گے، پھر ہم ایک جگہ پر سوگئے۔

صبح میری آنکھ کھلی تو مجھے کچھ سرسراہٹیں سنائی دیں۔ میں چونک پڑا۔ میں نے اردگرد نظر دوڑائی تو میرا جسم پسینے سے تربتر ہوگیا۔ ہم سے کچھ فاصلے پر بے شمار سانپ اپنے چوڑے پھن پھیلائے گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے ہمت کرکے سوئے ہوئے ناگ کو جگادیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھا تو میں نے ان سانپوں کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے ان سانپوں کو دیکھا تو اچھل کر رہ گیا۔ چند لمحے وہ غصے سے انہیں دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''یہ سب نمک حرام ناگ راج کے سپاہی ہیں۔ اور ہمیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔ ان لوگوں سے جنگ کرنا مناسب نہیں۔ ہم ان کے ساتھ چلتے ہیں، بعد میں کوئی ترکیب کریں گے۔ میں دیکھوں گا کہ یہ ہمارا کیا بگاڑتے ہیں۔ مگر سنو۔'' یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور کوئی چیز اگل دی۔ یہ اس کا منکا تھا۔ اسے کپڑے سے صاف کرکے اس نے وہ میری طرف بڑھا دیا۔ اور بولا۔ ''تم اسے نگل لو۔ اس طرح یہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا پائیں گے۔''

میں نے وہ منکا نگل لیا۔ منکا نگلتے ہی میری شخصیت ہی بدل گئی۔ میں اپنے اندر بے پناہ قوت محسوس کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ہم دونوں کھڑے ہوگئے اور سانپوں کے دائرے میں آگے بڑھنے لگے۔ ہمارا رخ اس بڑے پہاڑ کی طرف تھا۔ جس کا رنگ دوسرے پہاڑوں کی طرح سیاہ نہ تھا۔

پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر ہم ایک بہت بڑے غار کے دہانے میں داخل ہوگئے۔ جس سے ڈھلوان شروع ہوتی تھی، تمام سانپ بدستور حلقہ بنائے ہمارے ساتھ چل رہے تھے۔ نہ جانے کتنی گہرائی میں جاکر ہم یکدم کھلی فضا میں پہنچ گئے اور میں وہاں کا منظر دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ کیونکہ ایسی حسین وادی میں نے کبھی بھی نہیں دیکھی تھی۔ ایسا دل کش سبزہ زار روئے زمین پر شاید کہیں ہوگا۔ چاروں طرف بہار رقصاں تھی۔ چشمے ابل رہے تھے۔ آبشاریں گر رہی تھیں۔ پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہاں کوئی گھر نہیں تھا۔ ظاہر ہے وہ چٹانوں کے باسی تھے۔ انہیں مکانوں کی کیا ضرورت تھی۔ ہمارے پہرے دار سانپ ہمیں لئے ہوئے ایک بہت بڑی چٹان کے پاس پہنچ گئے۔ چٹان میں ایک سوراخ تھا۔ وہ سب وہاں رک کر پھنکارنے لگے۔

ناگ دانت پیستا ہوا چٹانی دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی، چٹان اندر سے کھوکھلی تھی اور اندرونی حصہ بالکل صاف ستھرا تھا۔ اس کی عقبی سمت میں باریک سوراخ تھے۔ جن سے ہوا اندر آرہی تھی۔ پھر نہ جانے کس چیز سے چٹانی دروازہ بند کردیا گیا اور ہم وہاں قید ہوگئے۔

''مقدس پتھر کی قسم مجھ پر لاگو ہے۔ نور کاوش تم پر نہیں۔ تم ان میں سے کسی بھی سانپ کو ہلاک کرسکتے ہو۔ اگر ایک لاکھ سانپ بھی تم سے لپٹ کر تمہیں کاٹنا شروع کردیں تو تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ کیونکہ میرا آبائی منکا تمہارے جسم کے اندر موجود ہے۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ ہم حالات کا انتظار کریں گے۔ پھر تمہارا کام شروع ہوگا۔

سنو! نور کاوش جس وقت بھی تمہارا سامنا ناگ راج سے ہو۔ تم اس پر جھپٹ کر اسی وقت ختم کردینا، اس کے بعد کے حالات میرے تابع ہوں گے، پھر کسی کی مجال ہے جو مجھ سے انحراف کرے۔''

''ٹھیک ہے میں تمہارے کہنے پر عمل کروں گا۔'' میں نے کہا۔

رات ہوگئی تھی۔ جس کا اندازہ سوراخوں کی تاریکی سے ہوا۔ اچانک میرے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ میں اپنی قوت آزماؤں، شاید میں اس چٹان کو ہٹا سکوں، جس نے راستہ بند کیا تھا۔ میں چٹان کی طرف بڑھا۔ بلاشبہ بے شک وزنی چٹان تھی۔ لیکن میں نے منکا نگلنے کے بعد اپنے جسم میں جو قوت محسوس کی تھی۔ وہ بھی کم نہ تھی۔ میں نے چٹان پر قوت آزمائی شروع کردی اور ناگ اچھل کر کھڑا ہوگیا، وہ حیرت سے چٹان کو کھسکتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے بھی اندازہ نہ تھا کہ منکے نے میرے جسم میں بے پناہ طاقت پیدا کردی تھی۔ چٹان دوسری طرف لڑھک گئی اور دروازہ کھل گیا۔

''بہت خوب میرے دوست میں نہ کہتا تھا کہ کچھ قوتیں تمہاری ہیں، کچھ ہماری، ہم جیسے دس سانپ بھی مل کر اس دروازے کو نہیں کھول سکتے، آؤ ہماری مشکل وقت سے پہلے حل ہوگئی ہے، اب میں سب سے پہلے اس خبیث ناگن سے ملوں گا۔ جس نے اپنے باپ کے ساتھ مل کر میرے خلاف سازش کی تھی۔ آؤ۔''

ہم چٹانیں پھلانگتے چلے گئے۔ پھر ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ جگہ جگہ ہیرے رکھے ہوئے تھے۔ جن کی روشنی سے یہ حصہ منور تھا۔ ناگ نے میرا شانہ دبایا اور میرے کان کے قریب منہ کرکے بولا۔ ''دیکھ رہے ہو اس قتالہ کو وہ سامنے ناگنی ہے۔ اس علاقے کی سب سے حسین ناگن، حسن میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

اور میری نگاہ اس طرف اٹھ گئی۔ بلاشبہ وہ بہت حسین تھی۔ ''میں اس سے ملنے جارہا ہوں۔ اس سے بات کروں گا اور پوچھوں گا کہ میں اب اس کے باپ کے ساتھ کیا سلوک کروں۔ تم یہاں بے فکر ہوکر کھڑے رہو۔''

ناگ نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف کردیئے اور اس کے جسم سے دھواں خارج ہونے لگا۔ چند لمحوں بعد وہاں اب ایک زبردست سانپ موجود تھا۔ وہ ناگن کی طرف رینگنے لگا۔ جونہی وہ وہاں پہنچا۔ وہاں موجود ناگنوں میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ سب وہاں سے بھاگ گئیں اور سارا میدان وہاں سے خالی ہوگیا۔ وہاں صرف ناگ کی محبوب ناگنی ہی رہ گئی تھی۔

ناگ آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ اب ناگنی کا پھن پوری طرح پھیل گیا تھا۔ پھر میں نے ناگن کو ناگ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ ناگ سے لپٹنے کی کوشش کررہی تھی۔ لیکن ناگ پیچھے ہٹ گیا۔ وہ دونوں آمنے سامنے چند منٹ تک موجود رہے اور پھر میں نے ناگنی کو ناگ سے لپٹتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ دونوں میری طرف بڑھنے لگے۔ میں سنبھل کر کھڑا ہوگیا۔ وہ دونوں میرے قریب آگئے۔

ناگ پھر انسانی شکل اختیار کرنے لگا اور جب وہ انسان بنا تو میں بری طرح اچھل پڑا۔ یہ وہ ناگ نہیں تھا۔ جو کہ اب تک میرے ساتھ رہا تھا۔ وہ بہت خوب صورت نوجوان تھا۔ پھر اس نے ناگنی کی طرف رخ کرکے کہا۔ ''ان سے کوئی پردہ نہیں انسانی شکل میں آجاؤ۔'' اور وہ بھی انسانی شکل میں آگئی۔ وہ بھی کافی خوب صورت تھی۔

ناگ نے مجھ سے کہا۔ ''اس نے مجھے ایک اور ہی کہانی سنائی ہے۔ میرے دوست اس نے کہا ہے کہ اس کے باپ نے اسے بھی دھوکا دیا ہے اس نے اپنے باپ کے کہنے پر یہ سازش کی تھی۔ کیونکہ اس کے باپ نے یہ کہا تھا کہ حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد وہ اس کی اور میری شادی کردے گا، تاکہ ان دونوں سے جو اولاد پیدا ہو وہ اس علاقے کا حکمران بنے۔ جب کہ دوسری شکل میں ناگ کے قبیلے کی ناگن کے جسم سے پیدا ہونے والی اولادیں اس قبیلے کی حکمران بن سکتی ہیں۔ اس نے ناگنی کو یہی سمجھایا تھا۔ اور ناگنی اپنے باپ ناگ راج کی باتوں میں آگئی۔ لیکن ناگ راج نے وعدہ خلافی کی اور اپنی بیٹی کو بھی دھوکہ دیا۔ یہ آج تک میرا انتظار کررہی تھی۔ ناگنی نے مجھے بتایا ہے کہ کل ہمیں ناگ راج کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اور قبیلے بھر کے سانپ وہاں ہوں گے۔ تب وہ اپنے باپ کی سازش کا انکشاف کرے گی۔ یہ میری وکالت کرے گی۔ جب اصلیت سامنے آئے گی تو اس کا کوئی بھی حامی نہ رہے گا۔ پھر تم اسے ہلاک کردینا۔''

''لیکن کیا دوسری فرار ہونے والی ناگنیں اسے ہوشیار تو نہ کردیں گے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں وہ سب اس کی سہیلیاں ہیں۔''

اس کے بعد ہم دوبارہ اسی قید خانے میں واپس آگئے۔

دوسرے دن ہمیں سانپوں کے دربار میں پیش کیا گیا۔ یہ ایک بہت بڑا پہاڑ تھا۔ جس کے بارے میں صحیح اندازہ نہ ہوتا تھا کہ اسے کھوکھلا کیا گیا ہے یا قدرتی طور پر یہ ایسا ہی ہیں۔

بہرحال ایسا عظیم الشان دربار کسی آنکھوں نے کہاں دیکھا ہوگا چاروں طرف جواہرات چمک رہے تھے۔ رنگارنگ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ آج تمام سانپ انسانی شکل میں تھے۔ ایک شاندار کرسی میں وہ منحوس شکل

والا ناگ راج بیٹھا تھا۔
ہمیں اس چبوترے پر پہنچادیا گیا جو انصاف کے لئے بنایا گیا تھا۔ ناگ کے کہنے کے مطابق میرے اندر موجود منکے کی وجہ سے میرے اندر وہ ہی خوشبو پیدا ہوگئی تھی جو دوسرے سانپوں سے آرہی تھی۔ اس لئے سب مجھے ایک سانپ ہی سمجھ رہے تھے۔
ناگ راج نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ ''معزز بزرگو! ایک طویل عرصے کے بعد یہ گناہ گار ناگ پھر ہمارے علاقے میں چلا آیا ہے۔ کیا یہ بات ہماری قدیم روایات کا مذاق اڑانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ کیا ناگ نے ہمارے بزرگوں کی توہین نہیں کی۔ کیا اسے بھی آگ کے غار میں نہ ڈال دیا جائے۔ میں نے آپ سب لوگوں کو اس لئے بلایا ہے کہ قدیم روایات کا مذاق اڑانے والے ناگ کو آگ میں ڈالنے کے سلسلے میں آپ لوگوں کا کیا مشورہ ہے۔''
''بزرگو! میں ناگ جس خاندان کے پشتوں سے اس علاقے پر حکمران رہا ہے۔ اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا ہوں۔''
''اتنے طویل عرصے کے بعد ناگ کو اپنی صفائی پیش کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔'' ناگ راج بولا۔
''اس لئے کہ اس وقت مجھے اس کا موقع نہ دیا گیا تھا۔ تم نے صرف حکومت پر قبضہ کرنے کا سوچا تھا۔ جس کے لئے تم نے یہ سازش کی اور وقتی طور پر کامیاب بھی ہوگئے۔ مگر اب میں تمہاری سازش بے نقاب کرکے رہوں گا۔ معزز بزرگ مجھے اجازت دیں۔'' ناگ نے کہا۔
''اجازت ہے۔'' بوڑھے سانپوں کی آواز آئی۔
''میں مجرم نہیں ہوں، ناگ راج صرف حکومت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ میں ناگ راج کی بیٹی سے محبت کرتا تھا۔ پر میں نے گناہ نہیں کیا۔ ناگ راج نے ناگنی کو ورغلا کر میرے خلاف بیان دلوایا تھا اور پھر ناگ راج نے اپنی بیٹی کو بھی دھوکہ دیا ہے۔ اور اسے میرے ساتھ شادی کروانے کا وعدہ کرکے وہ بات اس کے منہ سے کہلوائی تھی۔''
''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' ناگ راج غضب ناک ہوکر گرجا۔
''اس کی بیٹی موجود ہے اس سے مقدس پتھر کی قسم کھلوا کر پوچھا جائے۔'' ناگ نے کہا۔
''یہ جھوٹ بول رہا ہے اسے موت کی سزا دی جائے گی۔'' ناگ راج گرجا۔
''بیٹھ جاؤ ناگ راج، اس نے مقدس پتھر کا نام لیا ہے، تو اسے صفائی کا موقع ملے گا۔'' بوڑھے سانپوں نے کہا۔ اور ناگ راج بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔
''ناگ کا بیان درست ہے۔ بزرگو! میرے باپ نے مجھ سے دھوکہ کرکے یہ الفاظ کہلوائے تھے۔ مقدس پتھر کی قسم ناگ پاک ہے۔ میں پاک ہوں۔'' ناگنی نے کہا۔
''اور پھر وہاں ایک کہرام مچ گیا۔ تمام سانپ شور مچانے لگے۔
''میں حکمران ہوں، مجھے کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ کون ہے۔ جو مجھے نقصان پہنچا کر آگ سے بچ سکتا ہے۔ اسے گرفتار کرلو اسے آگ کے غار میں ڈال دیا جائے۔ خبردار کسی نے مجھے ہاتھ لگایا تو فنا کردوں گا۔ کوئی آگے نہ آئے۔'' ناگ راج نے تلوار نکال لی۔ اور تمام سانپ پیچھے ہٹ گئے۔
اسی وقت ناگ میرے قریب کھڑے ہوئے نیام سے تلوار نکالی۔ اور میری طرف بڑھ کر بولا۔ ''اپنا فرض ادا کرو میرے دوست۔''
مین تلوار لے کر آگے بڑھا۔ میرے جسم میں چنگاریاں دوڑ رہی تھیں۔ اور میں بھوکے شیر کی طرح ناگ راج کی طرف دیکھ رہا تھا۔
''یہ گناہ ہوگا کہ کوئی سانپ کسی سانپ کو ہلاک نہیں کرسکتا اس سے تباہی نازل ہوگی اور سانپوں کی بستی ناگ بھون تباہ ہوجائے گی۔'' بوڑھے سانپوں نے خوفزدہ ہوکر کہا۔
''میرا دوست سانپ نہیں ہے۔''

ناگ کی بات سن کر ناگ راج پھر اچھل پڑا۔ ''اگر یہ بات ہے تو پھر میں بھی اس سے نمٹ لوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ مقابلہ پر آ گیا۔

تلوار میرے لئے کھلونا تھی، پھر میں نے فیصلہ کن وار کر کے ناگ راج کا سر تن سے جدا کر دیا۔ دوسرے لمحے وہ سانپ کی شکل میں بدل گیا۔ اس کا سر ایک طرف پڑا تھا۔ اور باقی جسم دوسری طرف، ناگ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ اور پھر نوجوان سانپوں نے مجھے اور ناگ کو کندھوں پر اٹھالیا۔

حکومت بدل گئی۔ ناگ نے ناگنی سے شادی کرلی، اس نے میری کافی خاطر مدارت کی۔ مجھے اتنا معلوم نہیں تھا کہ میں نے وہاں کتنا عرصہ گزارا، عجیب ہی دنیا تھی۔

مجھے انمول کی بھی یاد آرہی تھی۔ اس کی یاد آتے ہی میرا اس دنیا سے دل اچاٹ ہوگیا اور اس کے بعد ناگ سے میں نے اجازت مانگی اور ناگ نے مجھے وہاں سے جانے کی اجازت بڑی مشکل سے دی اور ساتھ میں اس نے ہیرے جواہرات کی ایک بری تھیلی میرے حوالے کرنا چاہا تو میں نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔

تو ناگ بولا۔ ''ٹھیک ہے بس یاد رکھنا میرا منکا احتیاط سے اپنے پاس رکھنا اور جب بھی میری مدد کی ضرورت ہو۔ فوراً بلا سکتے ہو۔''

اس کے بعد میں اپنی دنیا کی طرف چل پڑا۔ اور پھر میں اپنے وطن پہنچ گیا ابھی میں بحری جہاز سے اتر کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ کوئی مجھ سے لپٹ گیا اور زارو قطار روتا رہا۔ میں حیران و پریشان سے اٹھ کر دیکھا تو وہ دلاور خان تھا۔ اس کی حالت کافی خراب تھی۔

وہ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''مجھے معاف کر دو، نور کاوش میں خود غرض تھا۔ میں جانتا نہیں تھا کہ میری بیٹی انمول تمہیں اتنا چاہتی ہے۔ تمہارے جانے کے بعد اس نے تمہارا پوچھا۔ جب تم نہ ملے تو اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔ وہ قریب المرگ ہے۔ میں اپنی بیٹی کے بنا نہیں رہ سکتا۔ تمہیں میں نے بہت تلاش کروایا۔ پر تم نہ ملے۔ ابھی میرے ساتھ حویلی چلو اور انمول کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاؤ۔''

میں دلاور خان کے ساتھ چل پڑا۔ جب میں انمول کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں سب موجود تھے۔ پر سب کے چہرے اداس تھے۔ انمول اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اور کافی کمزور ہوگئی تھی۔

میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنی کمزور آنکھیں کھول دیں اور اس کے ہونٹوں سے نکلا۔ ''نور کاوش'' یہ کہہ کر نہ جانے اس کے جسم میں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی کہ وہ اپنے بستر سے اٹھی اور دوڑ کر میرے گلے لگ گئی اور زارو قطار روتی رہی۔

میری آنکھیں بھی نمناک ہوگئی تھیں۔ روتے روتے وہ اچانک میرے سینے سے لگی اور اس کی آواز بھی بند ہوگئی۔

یہ دیکھ کر میں نے چلا کر کہا۔ ''انمول...... انمول...... میں واپس آ گیا ہوں۔ دیکھو اپنی آنکھیں کھولو۔'' اور یہ کہہ کر میں بھی اسے سینے سے لگا کر روتا رہا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ انمول کو بس میرے دیدار کا ہی انتظار تھا۔ جیسے ہی اس کا دیدار مکمل ہوا۔ اس کی روح نے اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔

دلاور خان نے دیکھا کہ کافی دیر ہوگئی ہے اور نور کاوش نے ابھی تک انمول کا جسم نہیں چھوڑا۔ تو وہ آگے بڑھا اور نور کاوش کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ''بس اب صبر کرو۔ جو اللہ کو منظور تھا، وہ ہوگیا۔''

مگر یہ کیا۔ دلاور خان کا ہاتھ لگتے ہی انمول سمیت نور کاوش فرش پر ڈھے گیا۔

نور کاوش بھی اپنی جان انمول پر قربان کر چکا تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ مرتے وقت بھی دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں تھے۔ سب کی آنکھیں نمناک تھیں۔



قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

گھروندے خوشیوں کے مسمار ہو گئے
پیار میں ہم بھی مجبور ہو گئے
پھول بچھاتے رہے تھے تیری راہوں میں
فاصلے زندگی کی راہ میں دیوار ہو گئے
(محمد اسلم جاوید۔فیصل آباد)

چاک دامن کو جو دیکھا تھا ملا عید کا چاند
اپنی تصویر کو کہاں بھول گیا عید کا چاند
ان کی ابروئے خمیدہ کی طرح تیکھا ہے
اپنی آنکھوں میں دیر چھپا عید کا چاند
(محمد اسحاق انجم۔کنگن پور)

تلاشِ خواب سے چاہو جو خوب تر کرنا
زمیں نوروں، ستاروں کا پھر سفر
کہ سیکھ جاؤں میں بھی دھوپ کو شجر کرنا
میرے خدا! کبھی اتنا بھی معتبر کرنا
(انوری رمضان۔پنڈ دادنخان)

وہ جن کو اپنا محافظ سمجھ رہے تھے ہم
وہی تو لوگ ہیں شب خون مارنے والے
(عروج ماہین طحٰہ۔سرگودھا)

مقید کر دیا سانپوں کو کہہ کر یہ سپیروں نے
یہ انسانوں سے انسانوں کو ڈسوانے کا موسم ہے
(سنبل ماہین طحٰہ۔سرگودھا)

زندگی کی خواہش میں ہم نے مر کر دیکھا
لوگ سوچتے ہیں جو وہ، ہم نے کر کے دیکھا
(شگفتہ ارم۔راولپنڈی)

کاش ایسا بھی ہو قیمت نہ ادا کرنی پڑے
اور مل جائے مجھے کوئی خوشی آپ ہی آپ
(ردا انعام۔لاہور)

کتنی نفرت ہے اسے میری محبت سے
اس نے اپنے ہاتھ جلا ڈالے میری تقدیر مٹانے کے لئے
(محسن عزیز حلیم۔کوٹھا کلاں)

نفرت کے بازار میں جینے کا اپنا ہی مزہ ہے محسن
دوست رلانا نہیں چھوڑتے اور ہم مسکرانا نہیں چھوڑتے
(عبدالحلیم بھٹی اینڈ محسن۔کوٹھا کلاں)

یاد آؤں تو بس اتنی سی عنایت کرنا
اپنے بدلے ہوئے لہجے کی وضاحت کرنا
تم تو چاہت کا سمندر ہوا کرتی تھی
کس سے سیکھا ہے محبت میں ملاوٹ کرنا
(محمد اسحاق انجم۔کنگن پور)

کوئی پہر ایسا گزرا نہیں ہے
تیرے بارے میں جب سوچا نہیں ہے
ہمیں سب لوگ سمجھاتے ہیں آکر
اسے کوئی بھی کچھ کہتا نہیں ہے
(تسکین فاطمہ۔قصور)

اس نے ہمیں بھلا دیا تو کوئی شکوہ نہیں
جن کو دل کی چوکھٹ پر بٹھاؤ انہیں بہت اختیار ہوتے ہیں
(عبدالکریم۔کوٹھا کلاں)

تم حقیقت عشق ہو یا فریب میری آنکھوں کا
نہ دل سے نکلتے ہو اور نہ زندگی میں آتے ہو
(انجم کاشان۔سرگودھا)

ہونٹوں سے تیرے ہونٹوں کو بوسا دیا میں نے
بنا کے تیری تصویر تجھے چھولیا میں نے
یہ تیرا کنگن ہار سنگھار میں ہی تو ہوں
کیا بھلا تجھ سے خود کو جدا کیا میں نے
(احسان سحر۔میانوالی)

منکشف ہوتی ہے ہر روز کوئی بات نئی
روز کھلتا ہے تیرا پیار بھی سازش کی طرح
نرم ٹہنی پہ نئے پھول کی صورت ہوں وصی
آ مجھے توڑ کے رکھ دے کسی بارش کی طرح
(وصی شاہ۔انتخاب۔راجہ باسط۔راولپنڈی)

☆☆



مرے دکھ پہ شہر ستم رو پڑا
لکھے لفظ جب بھی، قلم رو پڑا
یہ دل اس کے در کی طرف چل پڑا
تھی وہ شدت غم صنم رو پڑا
مرے قلب و جاں نے جو صدمے سہے
کچھ ایسا کیا صبر، غم رو پڑا
کوئی چیخ اٹھا، مری روح میں
جو باقی تھا میرا بھرم، رو پڑا
یہ جنگ و جدل ساری بے سود تھی
وجود زیاں پہ عدم رو پڑا
تڑپ خانم اسی مرے دل کی تھی
ہوا سجدہ حیراں، حرم رو پڑا
(فریدہ خانم۔۔۔لاہور)

خشک آنکھوں میں کوئی خواب بھی آسکتا ہے
ہم سے ملنے کوئی مہتاب بھی آسکتا ہے
دل کے دریا سے گزرنا ہے سنبھل کر تجھ کو!
راستے میں کوئی گرداب بھی آسکتا ہے
اس لئے رکھی ہیں کچھ ہم نے بچا کر خوشیاں
پھر کوئی دیدہ پرآب بھی آسکتا ہے
غم کے ٹھہرے ہوئے دریا کا بھروسہ کیا ہے
کسی لمحے کوئی سیلاب بھی آسکتا ہے
ہم اسی آس پہ بیٹھے ہیں لئے ساحل پر
ساتھ لے کر کوئی اسباب بھی آسکتا ہے
اے مرے غم کے سمندر ذرا آہستہ چل
بھول کر کوئی تہہ آب بھی آسکتا ہے
کام ہمت سے ذرا لے کر ترے ہاتھ حکیم
اب کوئی گوہر نایاب بھی آسکتا ہے
(حکیم خان حکیم۔۔۔۔کامل پور موسیٰ)

بھٹکے ہوئے راہی کو منزل کب ملے گی
یہ پرآشوب غم کی شام کب پھر ڈھلے گی
بے تاب تھے تجھ سے پھر ملاقات کے لئے
نہ جانے وفائے شمع کب پھر جلے گی
ہم تمنا میں جس کی فریب کھاتے رہے ہیں
میرے ساتھ صبا تیرے چمن کی کب چلے گی
ہر کوئی جیتا ہے اپنی انا کے لئے جہاں میں
راس نہ آئی تیری بے رخی یہ دنیا کب بدلے گی
خاموش ہیں میرے گلستاں کے یہ سارے نظارے
ایک بار مسکرا دو میری زندگی میں بہار کب آئے گی
واجد ہر کوئی جیتا ہے خوشیوں کے لئے اپنی
اپنا دل جلا کے دیکھا ہم نے قسمت میں تیرگی کب ملے گی
(پروفیسر واجد نگینوی۔۔۔۔کراچی)

اور کچھ نہ ملا ہمیں پھر رسوائیاں ملیں
مانگی تھیں چاہتیں ہمیں پہ جدائیاں ملیں
رہتے تھے زمین پہ آسماں کی تمنا میں
اونچائی کی تھی آرزو مگر گہرائیاں ملیں
محفل میں رہتے تھے ہم بجھے بجھے سے
بہت چاہا تھا ہو دوست کوئی تنہائیاں ملیں
دیوانگی ہی تو ہے جو دھندلکے میں رہے برسوں
انسان کی جگہ پھر ہمیں تو پرچھائیاں ملیں
مسلے گئے کچھ اس طرح پھول پاؤں تلے
تھا جن کا ہمیں انتظار پھر وہ شہنائیاں ملیں
ملنے کو تو بہت ہی ملے تھے زمانے میں جاوید
کسی میں نہ پھر وہ ہمیں رعنائیاں ملیں
(محمد اسلم جاوید۔۔۔فیصل آباد)

یہ کیسی عجب ہے دیکھ میرے یار زندگی
ہاتھ آتی نہیں کسی کے طرح دار زندگی
غیروں سے وفا داریوں کے وعدے خوب ہوئے
مگر ہوئی نہ کبھی خود سے وفادار زندگی
جو شاہوں کا شہنشاہ تھا اب ہے گلیوں میں پھر رہا
پہلے کبھی نہ ہوئی تھی ایسی لاچار زندگی

ہر شخص نے دل و جان سے لوٹا مجھے خوب
کیوں کہتے ہو میں نے گزاری بے کار زندگی
کھا کر ٹھوکریں در بدر کی بے شمار
ہوگئی اب عشق سے بیدار زندگی
اس بے وفا کے لئے کری قربان سر عام
اب صائم تم سے بہت ہے شرمسار زندگی
(ظہور احمد صائم۔ لاہور)

تیری رحمتوں کے دیار میں تیرے بادلوں کو پتا نہیں
ابھی آگ سرد نہیں ہوئی، ابھی اک الاؤ بجھا نہیں
میری بزم دل تو اجڑ چکی، مرا فرش جاں تو سمٹ گیا
سبھی جا چکے، مرے ہم نشیں، مگر اک شخص گیا نہیں
در و بام سب نے جلا لئے، سبھی روشنی میں نہا لئے
میری انگلیاں جھلس گئیں مگر اک چراغ جلا نہیں
غم زندگی تیری چاہ میں شب زندگی تیری راہ میں
جو اجڑ گیا وہ لیا نہیں جو بچھڑ گیا وہ ملا نہیں
(شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈوالہ یار)

جلائے ہمیں مار ڈالے یہ دنیا
سارے غصے ہم پہ نکالے یہ دنیا
نہیں کرتے کوئی گلہ پھر بھی ہم
جی بھر کے ہم کو ستائے یہ دنیا
بکھرتے ہیں ہم تو بکھرنے دے ہم کو
ہمیں نہ منیر اب سنبھالے یہ دنیا
پلٹ کر نہ دیکھیں گے ہم اب کے پیچھے
کریں لاکھ اندھیرے اجالے یہ دنیا
اب کسی کام کا نہیں دل یہ میرا
کرے نہ دل میرے حوالے یہ دنیا
پلٹتے نہیں چل پڑیں ہم جو آگے
ہمیں لاکھ بار آزمالے یہ دنیا
ساغر نہیں چاہیے مجھ کو اب شہرتیں
چھپائے نہ میرے رسالے یہ دنیا
زہر وہ دیا اس نے جس کا کوئی تریاق نہیں
زہر پلائے نہ امرت پیالے یہ دنیا
(منیر احمد ساغر۔ میاں چنوں)

آگ لگ جائے دوست داری کو
غم ہی آتے ہیں غم گساری کو
اپنی خوشبو کے سنگ بھیجا تھا
تحفہ ہجر زخم کاری کو
جب ہمیں دل پہ اختیار نہیں
کیا کریں ایسی اختیاری کو
وقت رک جائے آنکھ بند ہو جائے
چین آجائے بے قراری کو
اک فقط خواب وصل جنس فراق
کیا دیا اپنے انتظاری کو
دل کی باتیں بیاں کریں انوری
توڑ دیں رسم پردہ داری کو
آگ لگ جائے دوست داری کو
(انوری رمضان۔ پنڈ دادنخان)

اے جذبہ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے
منزل کے لئے دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے
اے دل کی خلش چل یونہی سہی چلتا تو ہوں انکی محفل میں
اس وقت مجھے چونکا دینا جب رنگ پہ محفل آجائے
اے رہبر کامل چلنے کو تیار تو ہوں پہ یاد رہے
اس وقت مجھے بھٹکا دینا جب سامنے منزل آجائے
ہاں یاد مجھے تم کر لینا، آواز مجھے تم دے دینا
اس راہ محبت میں کوئی درپیش جو مشکل آجائے
(عروج سنبل ماہین۔ سرگودھا)

اک عرصہ ہوا تمہیں دل سے بھلائے ہوئے
پھر کیوں خواب میں آجاتے ہو؟
مدت ہوئی تیرا چہرا بھلائے ہوئے
پھر کیوں سامنے آتے ہو تم؟
تمہیں چاہا تھا بہاروں کے موسم میں
پھر کیوں خزاں میں لوٹ آتے ہو تم؟
میرے دامن میں جو دکھ بھرے تم نے
زخم کیوں پھر سے دکھانے آتے ہو تم؟
بس کر اب لوٹ جاؤ تم
کہ محبت پھر سے نہ ہو گی
(مدثر بخاری۔ شہر سلطان)

نفسا نفسی کا ہے عالم سب ہوئے نا آشنا
بحشر زعم خرد میں کون کس کا آشنا
اجنبی تہذیب کا لباس ہے ہر جسم پر
ہر کوئی اقرار سے اپنی ہوا نا آشنا
آرزو مندی کو ظرف آگہی درکار ہے
پہلے ہونا چاہیے ہم کو تمنا آشنا
باب الفت کا مدرس ہے وہی اس دور ہیں
جو نہیں حرف محبت سے ذرا سا آشنا
میں نے بھی باد صبا کے ہاتھ بوسے دیئے
لمس گیسو سے تیرے دست صبا تھا آشنا
عشق صادق تو ہے عنقا اور غالب ہے ہوس
آج کی محبتوں سے کہاں امتیاز لیلیٰ آشنا
(ایس امتیاز احمد۔کراچی)

منزل بھی نہ ملی رستے بھی کھو گئے
ہم اس کی تلاش میں کیوں دیوانے سے ہو گئے
اس نے کہا تھا آؤں گا میں لوٹ کے اک دن
اس کا رستہ دیکھتے دیکھتے ہم کو زمانے ہو گئے
سفر کے شروع میں چلے تھے دونوں اک ساتھ
نظر لگ گئی کسی کی یا پھر مقدر ہی سو گئے
چلتے چلتے پاؤں میں چھالے سے پڑ گئے
اب تو سب یار دوست بھی بس افسانے سے ہو گئے
اکیلے ہی گھر بنانے کو تنکے چنتا رہتا ہوں
سارے سپنے وہ سارے خواب جانے کہاں کھو گئے
(طارق محمود۔کامرہ اٹک)

لفظوں میں محبت کا رنگ کیسے بھر لیتے ہو
وہ کہتے ہیں تم شاعری کیسے کر لیتے ہو
دل خوشی سے کھلنے لگتا ہے جب کبھی
تم میری غزل کے آئینے میں سنور لیتے ہو
گلاب بھی مجھ پر رشک کرنے لگتے ہیں
جب تم میرا نام ہونٹوں پر لیتے ہو
یہ دل تو کیا پتھر بھی موم ہوجاتا ہے
جب تم اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لیتے ہو
کیا تمہیں ڈر ہے اس کو بھول جانے کا
احسان جو تم اس کو لکھ کر محفوظ کر لیتے ہو
(احسان سحر.....میانوالی)

مرے درد و غم کا ہیں درماں ترے شہر کے لوگ
ہیں گرچہ بہت تنگ داماں ترے شہر کے لوگ
ٹھہرنا پڑے گا ہمیں آج گلیوں میں شب بھر
گھروں میں نہیں رکھتے مہماں ترے شہر کے لوگ
اگر اس طرح دین سے دور رکھیں گے خود کو
یقیناً رہیں گے پریشاں ترے شہر کے لوگ
چلو چل کے دیکھیں یہاں کون ایسا ہے جس پر
دل و جان کرتے ہیں قرباں ترے شہر کے لوگ
کہاں بیچ آئے رواداری مہرو محبت
سلوک و وفا اور ایماں ترے شہر کے لوگ
انہیں اپنی شہ رگ کا خوں ہم پلائیں تو پھر بھی
نہیں مانتے کوئی احساں ترے شہر کے لوگ
یہ دنیا برا ہم کو کہتی ہے کہنے دو اس کو
ہمارے لئے ہیں دل و جاں ترے شہر کے لوگ
محبت کیا جانیں ہیں پتھر کے دل ان کے شہزاد
کچل دیتے ہیں دل کے ارماں ترے شہر کے لوگ
(آصف شہزاد.....فیصل آباد)

دیوانہ وار حال ہمارا ہے ان دنوں!
زلفوں کو آج کس نے سنوارا ہے ان دنوں!
امید کا ہر اک سہارا ہے منقطع
اک تیری ذات ہی کا سہارا ہے ان دنوں
گرداب میں ہے کشتی عمر رواں ابھی
حد نظر سے دور کنارا ہے ان دنوں
کیا جانئے خراب تمنا نے کس لئے
تجھ کو بحال زار پکارا ہے ان دنوں
ظلمت کدے میں میرے چراغاں ہے آج کل
ہر ہر مژہ پہ ایک ستارا ہے ان دنوں
مظہر شکایت غم ایام کیا کروں!
ہر ناگوار مجھ کو گوارا ہے ان دنوں
(محمد عثمان علی۔میاں چنوں)

☆☆

حسین کتنی شام ہے
میرے لبوں پہ جام ہے
بھلا کسی سے کیا گلہ
یہ بے رخی تو عام ہے
میں اس کو بھول جاؤں اب
یہ اس کا اک پیام ہے
مرے لبوں پہ آج بھی
بس ایک اس کا نام ہے
ہمارے دل میں آج بھی
تمہارا احترام ہے
جہاں میں ہیں تیرے نقش پا
وہیں میرا قیام ہے
تو جس طرف بھی کے چلے
یہ دل تیرا غلام ہے
ملا ہے زخم پیار میں
وفاؤں کا انعام ہے
تو ایسے رو رہا ہے کیوں
کیا آخری سلام ہے
میں رانا حق پرست ہوں
وفا ہی میرا کام ہے

(قدیر رانا۔ راولپنڈی)

ہجرتیں پھر بحال کرتے ہیں
دشت ہم سے سوال کرتے ہیں
اک صدی جی لیے جدا تجھ سے
اب چلو ہم وصال کرتے ہیں
بات بے بات روٹھتے ہیں کیوں؟
آپ بھی تو کمال کرتے ہیں
عشق کے راستے بڑے دشوار
ہر کسی کو بے حال کرتے ہیں
تم کو ہم اک مثال کر دیں گے
عشق ہم بے مثال کرتے ہیں
دشمنی غیر تو نہیں کرتے
یار ہی یہ کمال کرتے ہیں
خواب آنکھوں سے دور رکھ مریم
یہ ہی جینا محال کرتے ہیں

(آمنہ سحر۔ اٹک)

جو بھی ہم کو پسند ہوتے ہیں
وہ بڑے ارجمند ہوتے ہیں
کس قدر قیمتی ہیں وہ ساغر
میکدے جن میں بند ہوتے ہیں
ہم کو دیوانہ مت کہو لوگو
ہم بڑے ہوش مند ہوتے ہیں
رہ نشینوں کا احترام کرو
ان کے درجے بلند ہوتے ہیں
لوگ رسم وفا کے اے قمر
کس طرح کار بند ہوتے ہیں

(چوہدری قمر جہاں علی پوری۔ ملتان)

کبھی جو ہم نہیں ہوں گے
کہو کس کو بتاؤ گے؟
وہ اپنی الجھنیں ساری
وہ بے چینی میں ڈوبے پل
وہ آنکھوں میں چھپے آنسو
وہ حسین ملاقاتیں
کیسے پھر تم بھول جاؤ گے؟
کبھی جو ہم نہیں ہوں گے
کہو کہ کس کو بتاؤ گے؟؟
بہت بے چین ہو جاؤ گے
بہت تنہا رہ جاؤ گے!
ابھی بھی تم نہیں سمجھے!
ہماری ان کہی باتیں
میری جب یاد آئے گی
بہت تم کو رلائے گی
بہت چاہو گے پھر بھی تم
ہمیں نہ ڈھونڈ پاؤ گے
کبھی جو ہم نہیں ہوں گے
ہاں! کبھی جو ہم نہیں ہوں گے

(سیدہ صباشرمین۔ جاتی)

نئے موسموں کی رت جگاتی ہے
پرانے زخم یاد دلاتی ہے
ہر وقت بچھڑنے والوں کی
یہ پل پل یاد دلاتی ہے
ہر شب کو سونے سے پہلے
کچھ نئے خواب دکھاتی ہے
راج، ہجر کے ماہ و سال کے بعد
دیکھو عید بھی آتی ہے

(سید عبادت راج۔ ڈی، آئی، خان)

ہم روز صبح کو ملتے تھے
نئے پھول بھی اس دن کھلتے تھے
تم روز مجھے یہ کہتی تھی!
ہم کب تک ملیں گے اس طرح
میں سن کے چپ ہو جاتا تھا
تو آہستہ سے رو دیتی تھی
یہ یادیں ہیں ان لمحوں کی
ان لمحوں میں ہم ساتھ رہے
خوشیوں سے بھرے جذبات رہے
آج ملنے کو ترستے ہیں
آنسو آنکھوں سے برستے ہیں
کبھی ملیں گے ہم اس طرح
جیسے ماضی میں ہم ملتے تھے
یہ خواب ہی رہ جائے گا
تب وکی پگلا مر جائے گا
تم لوٹ کے پھر آؤ گی
حد سے زیادہ پچھتاؤ گی

(یاسر وکی۔ دیپالپور)

کچھ تو کرے آج
ورنہ دنیا کردے گی
تجھ کو کل محتاج
دریاؤں کا حال
ہم سے کب پوشیدہ ہے
خالی لوٹا جال
چھوٹا سا ہو گھر
جس میں راحت ملتی ہو
جنت سے بڑھ کر
چھنکتی سی آواز
دل کو دھڑکا دیتی ہے
سائل کی آواز
اب ہے جس کا راج
وقت آنے پر پھر ہوگا
ہم سب کا محتاج
دنیا کی یہ ریت
دولت جس کو حاصل ہو
ہوگی اس کی جیت
(ایس۔امتیاز احمد۔کراچی)

رونقیں اب کہاں
تیرے بازار کی
کھینچتی ہے کشش
اک ترے پیار کی
واہ کیا شان ہے
تیرے دربار کی
(آصف شہزاد۔فیصل آباد)

بہت ناراض ہیں احباب میرے
کہ میرے ساتھ ہیں سب خواب میرے
میں تن پر خاک وخون پہنے ہوئے ہوں
یہی ہیں اطلس و کمخواب میرے
میں ہوں تو دور کی تاریکیوں میں
مگر سب زخم ہیں مہتاب میرے
مری ہستی سمندر کی طرح ہے
مرے اندر ہیں سب گرداب میرے
(مسیر قدیر بھٹی.....راولپنڈی)

محبت پھر محبت ہے
کبھی دل سے نہیں جاتی
ہزاروں رنگ ہیں اس کے
عجب ڈھنگ ہیں اس کے
کبھی صحرا، کبھی دریا، کبھی جگنو، کبھی آنسو
ہزاروں روپ رکھتی ہے
بدن جھلسا کے جو رکھ دے
کبھی وہ دھوپ رکھتی ہے
کبھی بن کر یہ اک جگنو
شب غم کے اندھیروں میں
دلوں کو آس دیتی ہے
کبھی منزل کنارے پر
پیا سا مار دیتی ہے
اذیت ہی اذیت ہے
مگر یہ بھی حقیقت ہے
محبت پھر محبت ہے
کبھی دل سے نہیں جاتی
(لاہوتی عماد.....آھدی موڑ دولتالہ)

روشنی پیار کی
میرے دلدار کی
ہے بہار آفریں
لالی رخسار کی
ہم تو بس ٹھیک ہیں
تو سنا پار کی
اک جھلک نہ ملی
تیرے دیدار کی
بھول پائے نہ ہم
بات اقرار کی
چاند بھی مانگے ہے
دلکشی یار کی

رنج اتنے کیوں یار دیتے ہو
میری خواہشوں کو مار دیتے ہو
ہمیں تو اک لفظ نہیں لکھتے
غیروں کو تم خط ہزار دیتے ہو
ہمارے نام خزاں کی رت کرکے
زمانے کو رت بہار دیتے ہو
کسی کے لگاتے ہو پھول کالر میں
مجھ کو کانٹوں کے ہار دیتے ہو
ہمیں تو دے نہ سکے دکھ بھی اپنے
لوگوں کو خوشیاں اُدھار دیتے ہو
بنا کے آئینہ پتھر پہ مار دیتے ہو مجھے
منیر یہ کس خطا کی سزا بار بار دیتے ہو
(منیر احمد ساغر.....میاں چنوں)

دُنیا والوں سن لو فسانہ میرا
کیسے چھلکا وفا کا پیمانہ میرا
اشک لے کر میں کیسے روانہ ہوا
گر کے ٹوٹا جب آشیانہ میرا
ساحل سامنے تھا اور میں پیاسا رہا
برا لگا سمندر کو بھی آنا میرا
آنسو چھلکے پلکوں کے سہارے
کتنا رویا یہ دل دیوانہ میرا
سحر کی لے کر امید شب گزاری میں نے
پھر دن کے اجالے میں بکھرا یارانہ میرا
سیر تم سب مل کر اب ماتم کرو
پرواز اب ہوگا جنازہ روانہ میرا
(محمد بشیر احمد پرواز.....جنڈانوار)

☆☆



پرہول سناٹا

راشد نذیر

نوجوان کی آنکھوں سے روشنی کی لکیر نکلی اور خوبرو حسینہ کی آنکھوں میں پیوست ہوتے ہی خوبرو حسینہ بے سدھ ہوگئی اور پھر نوجوان نے لڑکی کی گردن پر اپنے نوکیلے دانت گاڑ دیئے کہ اتنے میں لڑکی کی چیخ نے قرب و جوار کو دہلا کر رکھ دیا۔

رات کے سناٹے اور خوفناک گھپ اندھیرے میں جنم لینے والی دل پر خوف کا سکہ بٹھاتی کہانی

اس کے چاروں طرف اندھیرا تھا...... اور تھا بھی اس حد تک کہ اسے اپنا آپ ہی دکھائی نہیں دے رہا تھا......!!

اس گہری اتھاہ تاریکی میں وہ خود کو بھی دیکھنے سے قاصر تھا...... لیکن...... اس کے باوجود وہ کسی قسم کی گھبراہٹ یا بے چینی میں مبتلا نہیں تھا...... ہاں......!! اس نے نہایت آرام سے خود کو سنبھالتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی...... کچھ نہ کچھ ضرور حائل تھا...... لیکن اندھیرے کی وجہ سے وہ اس رکاوٹ کو دیکھنے سے قاصر تھا......

پھر اس نے مزاحمت کی تھی اور پھر یہ مزاحمت ذرا سی کوشش کے بعد بارآور ثابت ہوئی اور وہ اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہوگیا......

پھر وہ اسی اندھیرے کا جزو بن کر چلتا رہا...... چلتا رہا...... تھوڑی دیر بعد ہی چاند کی پھیلی ہوئی روشنی

میں اسے درختوں کے سائے دکھائی دیئے..... ان ہی درختوں کے درمیان سے ایک راستہ نکل رہا تھا.....!!

خاموش درختوں کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے وہ چند لمحوں کے بعد اس اندھیرے ماحول سے باہر نکل آیا.....

یہ ایک چوڑی سڑک تھی..... دونوں اطراف میں کھمبوں پر بلب جل رہے تھے..... ان کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ سامنے مکانوں کی قطاریں موجود تھیں.....

اور پھر یہ سب کچھ اسے جانا پہچانا سا دکھائی دیا..... ہاں.....!! یہ اس کا اپنا ہی علاقہ تو تھا.....!! لیکن..... لیکن اس سے پہلے وہ کہاں تھا.....؟

کوئی جواب نہ ملا تو وہ کندھے جھٹک کر آگے بڑھ گیا..... تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنی گلی میں داخل ہوگیا۔ جس میں اس کا گھر تھا۔

یہاں چبوترے پر حسب روایت اس وقت بھی کاموچاچا اور رحیم بھائی بیٹھے ہوئے تھے..... وہ ان کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔

لیکن آج اسے حیرت تھی کہ وہ دونوں ہی اسے نظرانداز کر گئے تھے..... پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔

''حیرت ہے.....!!'' وہ بڑبڑایا۔

عین اسی وقت کاموچاچا کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''ہاں بھئی..... تم ٹھیک ہی کہتے ہو..... بس بہانہ ہوتا ہے..... جس کی جتنی لکھی ہوتی ہے..... وہ اس سے ایک لمحہ بھی زیادہ نہیں گزار سکتا.....!!''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو.....'' یہ رحیم بھائی کی آواز تھی۔ ''لیکن جو کچھ ہوا، وہ انتہائی ناقابل یقین تھا..... وہ بے چارہ تو اپنے کام سے کام رکھتا تھا..... صبح گھر سے نکلتا تھا تو رات گئے گھر میں گھستا تھا.....!!''

اس کے قدم جم سے گئے۔ یہ کس کا ذکر ہو رہا تھا۔ ''گلی میں کیا کسی کا انتقال ہوگیا ہے.....؟'' اس نے سوچا۔ عین اسی وقت کاموچاچا کی آواز ابھری۔

''ہاں..... اور کرتا بھی کیا.....؟ کرائے کا مکان تھا..... چلو مانا کہ بچے نہیں تھے..... لیکن بیوی تو تھی..... اور پھر گھر کے اخراجات اس مہنگائی کے دور میں کہاں پورے ہوتے ہیں..... آہ.....!! بس اب تو ذکر ہی رہ گیا ہے..... بے چارہ کس طرح روزانہ آ کر میری آواز پر میری طرف لپکتا تھا..... عادت کا بھی بہت اچھا تھا.....!!''

وہ ایک بار پھر الجھن میں پڑ گیا..... کیونکہ جو کچھ وہ دونوں کہہ رہے تھے، اس میں اسی کی زندگی کا عکس دکھائی دے رہا تھا.....

پھر اس نے کندھے جھٹکے اور اپنے گھر کی طرف بڑھا..... دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ بے دھڑک اندر داخل ہوگیا.....

☆.....☆.....☆

وہ اس وقت کچن میں تھی، اور اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ خاص طور پر کوئی ڈش تیار کر رہی ہے..... اس کے چہرے پر انتہائی مسرت کے خوشگوار تاثرات دکھائی دے رہے تھے.....

''اوہ.....'' اس نے سوچا۔ ''شاید رضیہ میرے لئے کوئی خاص ڈش تیار کر رہی ہے.....''

یہ خیال آتے ہی اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی..... اتفاق سے رضیہ کسی کام سے کچن سے نکل کر برابر والے کمرے میں چلی گئی.....

شاید اب تک رضیہ کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی..... وہ اسی انداز سے مسکراتا ہوا کچن میں داخل ہوگیا..... پھر اس نے محسوس کیا کہ اسے بھوک تو قطعی نہیں ہے..... اس کے باوجود اس نے آگے بڑھ کر چولہے پر رکھی ہوئی دیگچی کا ڈھکنا ہٹا دیا۔

''لیکن پھر دوسرے ہی لمحے وہ پیچھے ہٹ گیا۔

''ارے..... یہ تو پائے پک رہے ہیں..... رضیہ کو معلوم تو ہے کہ میں پائے نہیں کھاتا..... مجھے تو ان کی خوشبو سے بھی چڑ ہے..... پھر اس نے آج پائے کا سالن کیوں بنایا.....؟ اور وہ بھی اتنا خوش ہو کر.....؟؟''

ابھی وہ اسی الجھن میں تھا کہ عین اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ وہ چونک اٹھا اور فوراً ہی

کچن سے باہر نکل آیا۔

عین اسی وقت رضیہ برابر والے کمرے سے نکلی اور تیزی سے دروازے کی طرف لپکی......

''اس وقت کون آ گیا......!'' وہ کھڑے کھڑے سوچ رہا تھا۔ ''اوہ...... ہاں...... یہ تو شاید میرے آنے کا وقت ہو......'' یقیناً رضیہ یہی سمجھی ہوگی کہ میں آیا ہوں...... لیکن...... میں تو گھر میں ہی ہوں......!!''

عین اسی وقت رضیہ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''آ رہی ہوں...... آ رہی ہوں......!!''

دروازہ ایک بار پھر کھٹکھٹایا گیا تھا...... پھر رضیہ نے دروازہ کھول دیا اور پھر فوراً ہی ایک جوان آدمی اندر آ گیا...... اس نے پھر خود ہی پلٹ کر دروازہ بند کیا تھا......

اس کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ وہ پتھر کا بت بن کر اس اجنبی آدمی کو دیکھ رہا تھا جو رضیہ کو مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

''ارے بھئی...... دروازہ ذرا جلدی کھولا کرو......'' اس آدمی نے کہا۔

''کیوں...... کیا ہوا......؟'' رضیہ کی آواز سنائی دی۔

''گلی میں کسی نے دیکھ لیا، تو کیا ہوگا......؟'' وہ آدمی مسکرایا۔ ''ابھی فی الحال کچھ دنوں تک تو ہمیں راز داری رکھنا پڑے گی......!!''

وہ حیرت اور غصے کے عالم میں ان کی باتیں سن رہا تھا...... اس کے دل میں آئی کہ وہ آگے بڑھ کر ابھی اور اسی وقت اس جوان آدمی کا گریبان پکڑ لے......

لیکن پھر وہ خود ہی اپنے ارادے سے باز رہا...... ابھی اسے اور بھی بہت کچھ سننا تھا...... معلوم تو ہو کہ آخر یہ کیا چکر تھا......!!

چنانچہ اس نے ادھر ادھر دیکھا...... چھپنے کی کوئی جگہ ڈھونڈ رہا تھا، تاکہ اطمینان سے ان دونوں کی باتیں سن جائیں...... وہ شدید غصے کے عالم میں تھا...... لیکن اسے ابھی خود کو قابو میں رکھنا تھا......!!

پرانے سامان میں ایک میز بھی رکھی ہوئی تھی...... اس نے جلدی سے پیچھے ہٹ کر اس پرانی میز کی آڑ لے لی...... جہاں سے وہ آسانی کے ساتھ ان دونوں کی گفتگو سن سکتا تھا......

پھر وہ دونوں بھی وہاں نہیں رکے تھے...... رضیہ اس جوان آدمی کو کچن سے ملحق کمرے میں لے آئی تھی...... دونوں باتیں کرتے ہوئے اس کے قریب سے گزرتے چلے گئے۔

وہ ہڑبڑا کر میز کے عقب سے نکل آیا...... وہ دونوں کمرے میں جا چکے تھے......

''اب...... اب کیا کروں......؟'' اس نے سوچا......

پھر وہ اس کمرے کے قریب سے گزرتا چلا گیا...... اسے یاد آ گیا کہ اسی کمرے سے ملحق ایک بڑا سا اسٹور بھی ہے...... جس کا ایک دروازہ برابر کے کمرے میں بھی کھلتا تھا......!!

وہ جلدی سے اسٹور میں داخل ہو گیا...... یہاں اندھیرا تھا، لیکن اسے کیا کرنا تھا...... وہ ملحق دروازے کی طرف آیا...... یہاں ان دونوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''بہرحال...... اب تو کوئی ایسا ڈر نہیں رہا کہ ہماری جان پر بن آئے......'' یہ رضیہ کی آواز تھی۔ ''لیکن پھر بھی احتیاط اچھی چیز ہے......!''

''ہاں......!'' آدمی کی آواز آئی۔ ''جو کچھ ہوا ہے...... وہ محض حادثہ ہی رہے، تو اچھا ہے...... جمال ایک شریف آدمی تھا...... بس اتفاقیہ ہو گیا تھا جو ہونا تھا......!!''

''اتفاقیہ......!!'' رضیہ ہنسی۔ ''یہ کہو کہ سب کچھ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا ہے......''

''آہستہ بولو...... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں......!'' آدمی کی آواز آئی۔ ''سب کو یہی معلوم ہے کہ جو کچھ بھی ہوا وہ محض غلط فہمی تھی...... موٹر سائیکل سوار کسی اور کو مارنے آئے تھے اور زد میں وہ آ گیا......!!''

''اور یہی وجہ ہے کہ تحقیقات کے باوجود بھی پولیس والوں کے ہاتھ کچھ نہ آسکا......!'' رضیہ ہنسی تھی۔
''یہ قتل ایک اتفاقیہ حادثہ بن کر رہ گیا...... ہاں...... ایک غلط فہمی...... جس نے ایک شریف آدمی کی جان لے لی......!!''
''تم...... تم بہت ہی ظالم ہو......!!'' وہ آدمی بھی ہنسا۔ ''بے خوف اور نڈر......!!''
''کیا کروں......!'' رضیہ نے ایک طویل سانس لی تھی۔ ''کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے...... تم شروع سے ہی میری محبت کا مرکز تھے...... اور میری شادی ہوجانے کے بعد بھی تم نے مجھے یاد رکھا...... اور خود شادی نہیں کی......!!''
''ہاں...... کیونکہ میں جانتا تھا کہ ہم کبھی نہ کبھی ایک ضرور ہوں گے...... نہ جانے کیوں میرے دل سے ہمیشہ یہی آواز آتی تھی کہ تم صرف اور صرف میری ہو...... صرف میری......''
''ہاں شاید......!'' رضیہ کی آواز آئی۔ ''اب ہم بہت جلد شادی کرلیں گے......!!''
''ارے......'' شاہد چونکا تھا۔ ''یار کچھ کھانے کا انتظام بھی ہے...... سخت بھوک لگی ہوئی ہے......!!''
''ہاں......!'' رضیہ چہک کر بولی۔ ''تمہیں پائے بہت پسند ہیں نا...... میں نے وہی بنائے ہیں......!!''
''ارے واہ......'' شاہد اچھل ہی تو پڑا تھا۔ ''واہ میری جان...... تم میرا کتنا خیال رکھتی ہو......!''
پھر شاہد اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے کانوں میں ایسی آواز آئی تھی کہ وہ دہل کر رہ گیا...... اس نے اسٹور کی دیوار تھام لی تھی۔
''ارے...... ارے...... یہ کیا کررہے ہو......'' رضیہ کی آواز آئی۔
''تمہیں پیار کررہا ہوں...... ابھی اتنا حق تو ہے نا میرا...... باقی پھر...... شادی کے بعد......!!''
دونوں ہی ہنس پڑے تھے اور وہ اسٹور میں کھڑا ہوا پیچ وتاب کھا رہا تھا...... اب معاملہ اس کی برداشت سے باہر ہوچکا تھا...... لیکن...... لیکن ابھی اسے خود کو روکنا تھا...... یہ سب کچھ برداشت کرنا تھا......
کیونکہ اسے اپنی بیوی سے بہت محبت تھی......
اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی اور کے سامنے وہ اسے ذلیل کرے یا پھر ایک اجنبی شخص کے سامنے اپنی بیوی کو شرمندگی کے سمندر میں ڈبودے......!!
ان دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی...... اس کا بیشتر حصہ وہ سمجھ نہیں سکا تھا...... لیکن بہرحال ولی طور پر اس کے لئے انتہائی دکھ کا باعث تھی کہ رضیہ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور سے معاشقہ لڑا رہی تھی...... وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ...... رضیہ ایسا بھی کرسکتی ہے......
پھر وہ اسٹور میں ہی ایک طرف سر پکڑ کر بیٹھ گیا...... اوہ......!! کتنے کٹھن لمحات تھے یہ......!! تھوڑی دیر گزری تھی کہ پلیٹوں اور چمچوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں...... شاید دونوں کھانا کھا رہے تھے......
اس دوران وقفے وقفے سے ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں...... اور اس کے دل پر انگارے لوٹ رہے تھے...... آخرکار جوان آدمی کی آواز ابھری۔
''اچھا بھئی...... اب میں چلوں......!!''
''اوں ہوں...... آج رک جاتے......!!'' یہ رضیہ کی آواز تھی۔
اس کا دل ہی دہل گیا...... اف......!! یہ کس قدر ہولناک الفاظ تھے۔
''نہیں رضیہ......!'' وہ ہنسا۔ ''جہاں اتنا صبر کیا ہے...... وہاں تھوڑا سا اور کرلو......''
''میرا یہ مطلب نہیں تھا......'' وہ جلدی سے بولی۔ ''دراصل اب تنہائی مجھے کاٹنے کو دوڑتی ہے...... پورے گھر میں اس طرح تنہا رہنا بھی تو ٹھیک نہیں ہے......!''
''ہوں......!'' جوان آدمی کی آواز آئی۔ ''یہ بات بھی ٹھیک ہے...... اچھا...... میں کل سے یہیں آجایا کروں گا...... لیکن موقع دیکھ کر...... تاکہ کسی کی نظر مجھ پر

نہ پڑے......!!''
''اوہو...... تم تو واقعی بہت ڈرپوک ہو......!''
رضیہ ہنسی۔
''یہ بات نہیں ہے...... ڈر اور احتیاط میں بہت فرق ہوتا ہے...... ابھی تازہ تازہ معاملہ ہے...... بات تھوڑی پرانی ہوگی تو پھر سب ہی بھول جائیں گے......!!''
''ہاں...... یہ بھی ٹھیک ہے......!'' رضیہ کی آواز آئی۔
''اچھا...... اب میں چلتا ہوں......!!''
''کیا کل...... آؤ گے......؟''
''ہاں...... بس آج ہی کا دن گزار لو...... پھر میں کل سے تمہارے ساتھ ہی رہوں گا......!!''
''اچھا...... ٹھیک ہے......!!'' رضیہ کی آواز آئی۔
پھر قدموں کی آہٹ ابھری اور پھر شاہد کمرے سے نکلتا چلا گیا۔
وہ اب بھی سر کو تھامے اسی اندھیرے اسٹور میں بیٹھا ہوا تھا...... اور گزرے ہوئے دنوں کے کئی واقعات اسے یاد آرہے تھے...... اس کی یہ شادی بڑی مشکلوں سے ہوئی تھی......
جہاں کہیں بھی اس کی بات ہوتی تھی، وہ پھر آگے نہیں بڑھ پاتی تھی...... ماں تھی نہ باپ...... اس کی خالہ نے ہی بڑی تگ و دو کے بعد رضیہ کا رشتہ لگوایا تھا...... اتفاق سے وہ بھی بن ماں باپ کے تھی اور اپنی ایک پھوپھی کے یہاں سکونت اختیار کئے ہوئے تھی......
یہاں بات کافی آگے بڑھ گئی...... اس دوران اسے معلوم ہوا کہ رضیہ کا کسی سے چکر چل رہا تھا...... یہ بات اتفاق سے ہی اسے معلوم ہوئی تھی لیکن اس شک کو وہ اپنے دل میں جگہ نہیں دینا چاہتا تھا...... بس وہ یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح رضیہ اس کے گھر میں آجائے...... پھر اسے اپنے اوپر پورا بھروسہ تھا کہ وہ اپنی محبت اور توجہ سے رضیہ کو سب کچھ بھول جانے پر مجبور کردے گا......!!
لیکن اس وقت ان دونوں کی باتیں سن کر وہ حیران رہ گیا تھا...... اسے دلی صدمہ پہنچا تھا...... اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ رضیہ اس کی غیر موجودگی میں کسی اور کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہوگی......
یقیناً وہی عاشق تھا...... جو شادی کے بعد بھی رضیہ سے محبت کا دم بھر رہا تھا...... ہاں...... یہ وہی تھا......!!
ایک بار پھر غصہ اپنے عروج پر پہنچنے لگا...... وہ مٹھیاں بھینچ کر اٹھا اور اسٹور سے باہر نکل آیا...... اب اس کا رخ اس کمرے کی طرف تھا جہاں رضیہ موجود تھی......
وہ کمرے میں داخل ہوگیا...... اس نے دیکھا کہ بیڈ پر رضیہ بے خبر سو رہی تھی......
''اوہ......!'' اس نے سوچا۔ ''اپنے عاشق سے مل کر اسے میرے آنے کا بھی بالکل ہوش نہیں ہے...... کیسے آرام اور چین کی نیند سو رہی ہے......''
اس پر نظر پڑتے ہی وہ غصے کے عالم میں دیوانہ سا ہوگیا...... پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور پھر رضیہ کے سر کے قریب پہنچ گیا...... اس کا چہرہ تمتما رہا تھا......
پھر اس کے ہاتھ اٹھے اور پھر سوئی ہوئی رضیہ کے گلے کی طرف بڑھنے لگے...... آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ قریب ہوتے گئے...... قریب...... اور قریب......!!
☆......☆......☆
شاہد نے اس وقت اپنی دکان آکر کھولی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ اس وقت حسب معمول دکان کی صفائی میں مصروف تھا...... اس کی گفٹ آئٹم کی شاپ تھی...... اور اس کی عادت تھی کہ وہ صبح جلدی اپنی دکان پر آجایا کرتا تھا۔
اس نے صفائی کا کپڑا ایک طرف رکھا اور ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔
''ہیلو...... میں شاہد بول رہا ہوں......!''

''میں...... رضیہ ہوں شاہد......!'' دوسری طرف سے گھبرائی ہوئی سی آواز آئی۔ ''کیا تم گھر پر آسکتے ہو......؟''

''ابھی...... اس وقت......؟'' شاہد نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... ابھی......!!''

''کیوں...... کیا ہوا خیریت تو ہے......؟''

''نہیں...... تم آؤ گے تو پھر بتاؤں گی...... فون نہیں بتاسکتی......!!''

''اچھا...... پھر تھوڑی دیر رکو...... ابھی لڑکا آجائے گا تو میں دکان اس کے حوالے کرکے آجاؤں گا......!!'' شاہد نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... لیکن جلدی آؤ گے نا......؟''

''ہاں...... بے فکر رہو......!!''

آدھے گھنٹے بعد ہی انجم آگیا...... یہ لڑکا اس نے رکھا ہوا تھا اور کافی قابل اعتماد اور ایمان دار تھا...... خود شاہد بھی اسی حساب سے اسے تنخواہ دیتا تھا...... دیگر طور پر بھی اس کا کافی خیال رکھتا تھا......

چنانچہ تھوڑی دیر بعد ہی اس کی موٹر سائیکل رضیہ کے گھر کی طرف اڑی جارہی تھی...... علاقے میں پہنچ کر اس نے موٹر سائیکل ایک ہوٹل کے پاس لاک کی اور خود پیدل اس گلی میں گھس گیا جہاں رضیہ کا گھر تھا۔

اتفاق سے گلی سنسان تھی...... وہ بے دھڑک اندر گھستا چلا گیا...... پھر رضیہ کے گھر کے آگے پہنچ کر اس نے دروازے پر دستک دے ڈالی۔

فوراً ہی قدموں کی چاپ سنائی دی اور رضیہ کا چہرہ دکھائی دیا...... شاہد اس کی طرف دیکھ کر چونک اٹھا...... وہ برسوں کی بیمار دکھائی دے رہی تھی...... پریشان چہرہ، اڑی اڑی رنگت اور بکھرے ہوئے بال...... یہ سب کچھ دیکھ کر وہ بوکھلا اٹھا۔

''یہ...... یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے......؟'' اس کے منہ سے نکلا۔ ''رات کو تو میں تمہیں اچھا خاصا چھوڑ کر گیا تھا......!!''

''اندر آجاؤ...... کوئی دیکھ لے گا......!!'' رضیہ نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

''شاہد کو جیسے ہوش آگیا تھا...... وہ جلدی سے اندر آیا...... اور پھر دروازہ بند کرکے رضیہ کی طرف مڑا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں...... اب بتاؤ کہ کیا ہوا ہے......؟''

''وہ...... وہ مرا نہیں ہے...... زندہ ہے......!!''

رضیہ کا لہجہ سرسرایا ہوا تھا۔

یہ سن کر شاہد اچھل پڑا...... اور خوف زدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا......؟ یہ...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو......؟''

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں شاہد...... وہ زندہ ہے......!!''

''یہ...... یہ کیسے ہوسکتا ہے......؟''

''آؤ...... اندر آؤ...... میں تمہیں بتاتی ہوں......!!''

یہ کہہ کر رضیہ صحن سے ہوتی ہوئی اس کمرے میں آگئی جہاں وہ رات سو رہی تھی...... شاہد اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا کمرے کے اندر داخل ہوگیا...... پھر وہ بیڈ پر بیٹھ گئی...... شاہد اس کے سامنے آکر سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں...... اب بتاؤ......!!''

''وہ واقعی زندہ ہے شاہد...... تمہارے جانے کے بعد میں برتن وغیرہ دھو کر بیڈ پر لیٹ گئی تھی...... میں چونکہ کافی تھکی ہوئی تھی...... اس لئے جلد ہی مجھے نیند بھی آگئی...... لیکن......''

''لیکن کیا......؟'' شاہد بے چین ہوگیا۔

اسے رضیہ کا خاموش ہوجانا پسند نہیں آیا تھا۔

''رات میں کسی وقت میری آنکھ کھلی تو...... وہ کمرے میں موجود تھا......!'' رضیہ نے بتایا۔ ''اس نے مجھ پر بہت غصہ کیا...... مجھے بری طرح لتاڑا...... اس نے ہم دونوں کی ساری گفتگو چھپ کر سن لی تھی...... وہ اس وقت اسٹور میں چھپا ہوا تھا...... ہاں...... پھر اس

نے ہماری تمام باتیں دہرائیں...... یہاں تک کہ اس نے یہ بھی بتایا کہ میں نے پائے کا سالن بنایا تھا......!!''

شاہد حیرت میں ڈوب کر اس کی باتیں سن رہا تھا...... پھر یکایک اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر بولا۔

''بڑا شاندار خواب تھا جو تم نے دیکھا واہ......!!''

''خواب......؟'' رضیہ چونکی۔ ''کیا مطلب......؟''

''بھئی ظاہر ہے کہ تم نے خواب ہی دیکھا ہے......'' وہ مسکرایا۔ ''کیونکہ جس شخص کی تم بات کر رہی ہو...... اسے موٹر سائیکل سواروں نے آ کر باقاعدہ گولیاں ماری تھیں اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا۔ پھر لوگوں کے ہجوم میں اس کا جنازہ ہوا اور اسے دفنا دیا گیا...... اب تم اگر یہ کہو گی کہ وہ تم سے کمرے میں آ کر باتیں کر رہا تھا، تو ظاہر ہے کہ یہ ایک خواب کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے......؟''

''میری بات کا یقین کرو شاہد......!'' رضیہ کی آواز روہانسی تھی۔ ''پہلے تو وہ واقعی مجھے دکھائی نہیں دیا...... لیکن پھر وہ مجھے اپنے بالکل قریب نظر آیا...... وہ میرے بے حد قریب تھا اور انتہائی غصیلی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا......!!''

''اچھا......'' شاہد ہنسا۔ ''تو پھر وہ کہاں گیا......؟''

''چلا گیا......!'' رضیہ نے آہستہ سے کہا۔ ''وہ پھر چلا گیا......!!''

''کیوں......؟'' شاہد کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔ ''یہ تو اس کا گھر تھا، پھر وہ چلا کیوں گیا......؟''

''اس نے کہا تھا کہ اب میں اس کے لئے ایک اجنبی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی...... اس لئے اس گھر میں اکیلے میرے ساتھ رکنا اسے گوارا نہیں تھا...... اس نے کہا کہ کل تمہارا عاشق بھی یہاں موجود ہوگا، تو پھر عین اسی کے سامنے یہاں آؤں گا اور رات گزاروں

عورت

☆ روتی ہوئی عورت اور ہنستے ہوئے مرد پر کبھی بھروسہ نہ کرو۔

☆ عورت کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ بہت جلد اعتبار کر لیتی ہے۔

☆ عورت اس پھول کی مانند ہے جو کانٹوں میں رہ کر بھی خوشبو بکھیرتی ہے۔

☆ عورت جس سے پیار کرتی ہے اس پر اپنی جان بھی وار دیتی ہے۔

☆ عورت اور محبت لازم و ملزوم ہیں۔

☆ جہاں عورت نہ ہو وہاں فرشتے نہیں آتے۔

☆ اگر مرد کو آنکھ تصور کر لیا جائے تو عورت اس کی خوشبو ہے۔

☆ خوبصورت عورت لال مرچ سے ہوشیار رہو۔

☆ عورت ایک ایسی کتاب ہے جس کا ہر صفحہ نئے رنگ کا ہوتا ہے۔

☆ عورت اتنی مقدس ہستی ہے جس سے نبی پاکؐ، اور اولیائے کرام پیدا ہوئے۔

(انتخاب: رانا حبیب الرحمٰن، لاہور)

گا......!!''

''بہت خوب......!'' شاہد مسکرایا۔ ''یہ بھی تم نے خوب کہا......!''

''کیا تم میرا مذاق اڑا رہے ہو......؟'' دفعتاً رضیہ نے اسے گھورا۔

''ارے نہیں بھئی......!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں بھلا تمہارا مذاق کیوں اڑاؤں گا...... رات ہونے میں اب صرف بارہ گھنٹے تو باقی ہیں...... میں آجاؤں گا اور اسے دیکھ لوں گا......!!''

''نہیں...... مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آیا......!!'' رضیہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ بات تم اس وقت کہہ سکتی ہو کہ جب میں رات میں نہ آؤں۔'' وہ پھر مسکرایا۔ ''تم بے فکر رہو...... میں رات میں ضرور آؤں گا۔ اور اس سے ملاقات کروں گا...... اب مجھے یہ بتاؤ کہ میں جاؤں......؟''

''ہاں...... جاؤ......!!'' رضیہ نے سر ہلایا۔

شاہد جانے لگا لیکن پھر دروازے کے قریب پہنچ کر رکا اور رضیہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''اور ہاں...... آج رات کا کھانا میری طرف سے...... کل تم نے میری دعوت کی تھی اور آج میں تمہاری دعوت کروں گا...... ٹھیک ہے......؟؟''

رضیہ پھیکے سے انداز میں مسکرانے لگی...... پھر شاہد باہر نکلا اور گھر کا دروازہ...... خود بہ خود ہی بند ہوگیا...... حالاں کہ رضیہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں تھی!!

☆......☆......☆

رات کو گیارہ بجے کے بعد شاہد کافی محتاط انداز میں گلی میں داخل ہوا...... چبوترا خالی پڑا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں روزانہ جمنے والی محفل برخاست ہو چکی تھی...... اسے بھی ان ہی لوگوں کا دھڑکا رہتا تھا کیونکہ جب وہ لوگ یہاں بیٹھے ہوتے تھے تو گلی میں ہر آنے جانے والے پر ان کی نظر رہتی تھی۔

وہ لوگ آپس میں باتیں بھی کرتے رہتے تھے اور اردگرد کے ماحول سے بھی باخبر رہتے تھے...... اگر دیکھا جائے تو یہ ایک اچھی اور فائدے مند عادت تھی۔ اس سے گلی میں داخل ہونے والا کوئی بھی مشکوک شخص فوراً ہی ان کی نظروں میں آجاتا تھا۔

اور ظاہر ہے کہ یہ بات خود شاہد کے لئے بھی نقصان دہ تھی...... کیونکہ فی الوقت تو وہ رضیہ سے کھلے عام ملاقات نہیں کرسکتا تھا...... اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ابھی حال ہی میں رضیہ کے شوہر کو قتل کردیا گیا تھا۔

اب یہ اور بات تھی کہ اس قتل کے پیچھے خود شاہد کا ہی ہاتھ کارفرما تھا...... لیکن یہ بات صرف اور صرف رضیہ کو معلوم تھی...... جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ بہت ہی رازداری اور کامیابی سے ہوا تھا...... یہاں تک یہ معاملہ سامنے آگیا تھا کہ رضیہ کے شوہر کا نام جمال ہے اور جس دہشت گردی کا وہ نشانہ بنا تھا، اس کا مرکز بھی جمال نامی ایک لڑکا تھا...... اور یوں یہ جمال صرف دھوکے میں مارا گیا۔

لیکن حقیقت یہی تھی کہ اسی جمال کو مارا گیا تھا...... تاکہ شاہد اور رضیہ ایک ہوسکیں...... ان کی یہ محبت کافی پرانی تھی...... لیکن جب جمال پوری طرح رضیہ کی زندگی میں داخل ہوچکا تب ان دونوں کی آپس کی محبت مزید بھڑکی...... اور پھر فیصلہ یہ ہوا کہ جمال کو کسی طرح راستے سے ہٹایا جائے...... تاکہ پھر یہ دونوں شادی کرکے اپنی نئی زندگی کا آغاز کرسکیں......!!

شاہد نے دروازے پر دستک دی تو وہ کھلتا چلا گیا...... کسی قدر حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ اندر داخل ہوگیا...... اس کے ہاتھ میں ایک شاپنگ بیگ تھا...... جس میں وہ ہوٹل سے کھانا لیتا ہوا آیا تھا...... رضیہ صحن میں ایک کرسی پر اس طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کے سر کی پشت کرسی سے ٹکی ہوئی تھی...... وہ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی شاہد نے اسے آواز دی تو وہ چونک اٹھی۔

''تم کس قدر لاپرواہ ہوگئی ہو...... رات کے اس

وقت دروازہ کھول کر بیٹھی ہو...... اگر کوئی آ جاتا تو پھر کیا ہوتا......؟''

یہ سن کر رضیہ عجیب سے انداز میں مسکرائی اور بولی۔

جسے آنا تھا وہ آ گیا...... اور جسے جانا تھا، وہ چلا گیا......!!''

''اوہ...... تو تمہیں یقین آ گیا......؟'' شاہد مسکرایا۔

''کس بات کا......؟'' رضیہ نے پوچھا۔

''یہی کہ رات جو کچھ تم نے دیکھا تھا...... وہ خواب تھا......؟''

''لیکن میری اس بات سے رات والی بات کا کیا تعلق......؟'' رضیہ نے حیرت سے پوچھا۔

''اچھا چھوڑو...... تم یہ بتاؤ کہ کیا وہ صاحب آ گئے......؟'' شاہد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی نہیں......!'' رضیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ابھی تو اس کے آنے میں وقت ہے......!!''

''اوہو...... تو باقاعدہ ٹائم دیا گیا ہے......؟''

''ہاں......!'' رضیہ سنجیدگی سے بولی۔ ''رات بارہ بجے کا......!!''

شاہد نے گھڑی کی طرف دیکھا اور بولا۔

''ٹھیک ہے...... ابھی آدھا گھنٹہ پڑا ہے...... مجھے سخت بھوک لگی ہے...... کیوں نا پہلے کھانا کھایا جائے......؟''

یہ سن کر رضیہ نے اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

''تم کھالو...... مجھے تو بالکل بھوک نہیں ہے...... ہاں البتہ میں تمہیں کھانا نکال کر دے دیتی ہوں......!!''

''یہ کیا بات ہوئی......؟'' شاہد کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ''دونوں مل کر کھائیں گے......!!''

''میں نے کہا نا کہ مجھے بھوک نہیں ہے...... تم کھالو......!''

''شاید تمہارے دل میں خوف نے اپنی جگہ بنالی ہے......؟'' شاہد نے غور سے اس کی طرف دیکھا......

اس وقت بھی رضیہ کے چہرے پر عجیب سی مردنی چھائی ہوئی تھی...... آنکھیں ویران تھیں، چہرہ فق ہلکی سی جنبش سے کپکپاتے ہوئے ہونٹ اس بات کے غماز تھے کہ وہ کسی اندرونی خلفشار میں مبتلا ہے......

پھر شاہد خاموشی سے کھانا کھاتا رہا...... ویسے وہ بار بار اس کا جائزہ لے رہا تھا...... خود شاہد سے بھی زیادہ نہ کھایا گیا...... آخری نوالہ لیتے وقت وہ بول اٹھا۔

''کاش...... تم بھی میرے ساتھ ہی کھا لیتیں، تو میرا بھی صحیح طور سے پیٹ بھر جاتا......!!''

رضیہ نے کوئی جواب نہیں دیا...... شاہد کے چہرے پر جھلاہٹ کے آثار نمایاں ہوئے لیکن پھر فوراً ہی اس نے خود پہ قابو پایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''اب یہ بتاؤ کہ تمہارا کیا پروگرام ہے......؟''

''کیسا...... پروگرام......؟'' رضیہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''بھئی...... شادی کا......!!''

''شادی......!!'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

''ہاں...... کیوں...... تم افسردہ کیوں ہوگئیں......'' شاہد نے اسے گھورا۔

''اب ہماری شادی کہاں ہوسکے گی......!'' وہ تاسف بھرے انداز میں بولی۔ ''یہ آرزو تو اب خواب ہو کر رہ گئی ہے۔''

''تم کسی وہم میں مبتلا ہوگئی ہو۔'' شاہد بولا۔

''یہ خواب نہیں...... بلکہ خواب وہ ہے جو تم نے کل رات میں دیکھا تھا...... آؤ...... کمرے میں چلتے ہیں......!!''

''ہاں...... چلو......!!'' رضیہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''ویسے بھی اس کے آنے کا ٹائم ہونے والا ہے......!''

شاہد نے اسے گھورا...... بولا کچھ نہیں...... پھر وہ اٹھ کر کمرے میں آ گئے تھے...... تھوڑی دیر بعد شاہد نے کہا۔ ''اگر تمہیں نیند آ رہی ہے، تو تم سو جاؤ......!!''

''نہیں......!'' وہ بولی۔ ''آؤ...... باتیں کرتے ہیں......!!''

''تمہاری طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی تم آرام کرو......!!''

''اب تو آرام ہی آرام ہے......!!'' وہ ہنسی۔

''کیونکہ جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا...... اب اور مزید کچھ نہیں ہوسکتا۔''

''ہاں...... یہ تو ہے......!'' شاہد خوش ہو کر بولا۔ ''اب ظاہر ہے کہ ہمیں اپنی نئی زندگی کا آغاز کرنا ہے......!''

''زندگی......!!'' رضیہ عجیب سے انداز میں بولی۔ ''یہ...... کیا ہوتی ہے......!!''

''کیا مطلب ہے تمہارا......؟'' شاہد نے اسے گھورا۔ ''کیا تم مذاق کے موڈ میں ہو......؟''

''کیا وقت ہوا ہے......؟'' رضیہ نے اس کی طرف توجہ دیئے بغیر پوچھا۔

''بارہ بجنے والے ہیں......!'' شاہد نے گھڑی کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

''ہوں...... بس وہ آنے ہی والا ہے......!!'' رضیہ بڑبڑائی۔

''یہ سب بکواس ہے رضیہ......!'' شاہد سنجیدگی سے بولا۔ ''وہ مر چکا ہے...... اور اس کی واپسی کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی...... اسے میں نے اپنے ہاتھوں سے دفن کیا ہے اور......''

عین اسی وقت کس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ شاہد کی بات درمیان میں ہی رہ گئی...... وہ بھول گیا کہ کیا کہہ رہا تھا...... اس نے حیرت سے رضیہ کی طرف دیکھا۔

جواباً وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''تم یقین نہیں کر رہے تھے...... اب کہو......؟؟''

☆......☆......☆

یہ حقیقت تھی کہ اس دستک کی آواز سے شاہد کا دل ہل کر رہ گیا تھا۔ لیکن پھر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھالا اور رضیہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''ہوں...... اگر واقعی وہ کسی وجہ سے زندہ رہ گیا ہے...... تو آج اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا...... تم جاؤ اور اسے اندر لے آؤ...... میں یہیں موجود ہوں...... تم بہانے سے اسے ادھر ہی لے آؤ......!!''

رضیہ اٹھ کھڑی ہوئی...... ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی تھی...... رضیہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے...... شاہد فوراً بولا۔

''تم گھبراؤ مت...... لے آؤ اسے یہاں......!! جاؤ......!''

رضیہ نے اس کی طرف دیکھا اور پھر باہر چلی گئی...... شاہد اب چوکنا ہوگیا تھا...... اس نے ایک کرسی اٹھا کر دروازے کی آڑ میں رکھ دی اور اس پر بیٹھ گیا......

اس نے اب جو کچھ بھی کرنا تھا فوری طور پر کرنا تھا...... نہ تو وقت تھا اور نہ ہی اس کے پاس مہلت تھی۔ عین اسی وقت قدموں کی چاپ ابھری اور وہ سنبھل کر بیٹھ گیا......

اگلے ہی لمحے رضیہ اندر داخل ہوئی...... لیکن شاہد یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ اکیلی تھی...... جمال اس کے ساتھ نہیں تھا۔

وہ اس کی طرف متوجہ تھی...... وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور سوالیہ انداز میں رضیہ سے مخاطب ہوا۔

''وہ...... کہاں ہے......؟''

یہ سن کر رضیہ مسکرائی اور بولی۔

''یہ رہا...... میرے ساتھ......!!''

شاہد نے حیران ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ لیکن آس پاس تو کیا دور دور تک کوئی نہ تھا...... اس نے آخر کار رضیہ کی طرف دیکھا۔

''کیا تم مذاق کر رہی ہو......؟''

''نہیں......!'' رضیہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''یہ مذاق کا وقت نہیں ہے...... بارہ بج چکے ہیں......!!''

''تو پھر...... ! مطلب کیا ہے تمہارا......؟'' شاہد الجھن میں پڑ گیا۔ ''جمال کہاں ہے......؟''

"یہ رہے میرے ساتھ......!" رضیہ نے اپنے برابر میں اشارہ کیا۔ "کیا تم کو دکھائی نہیں دے رہے......؟"

"نہیں......!!" شاہد کے منہ سے نکلا۔

رضیہ ہنس پڑی اور بولی۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ پہلے مجھے بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے......لیکن پھر...... میں نے انہیں دیکھ لیا......!"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں......!!"

"میں ابھی سمجھا دیتی ہوں......!" یہ کہہ کر رضیہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔

شاہد غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا......لیکن پھر جو کچھ ہوا...... اسے اس کی بالکل بھی توقع نہیں تھی...... اچانک ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی گردن کسی شکنجے میں پھنس گئی ہو...... اسے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔

وہ لڑکھڑایا......اس نے اپنی گردن چھڑانے کی بھرپور کوشش کی، مگر ناکام رہا...... گھٹن...... شدید گھٹن......اور پھر تاریکی چھاگئی۔

کمرے میں شاہد کا جسم مردہ پڑا تھا اور اس کے علاوہ وہاں کوئی اور موجود بھی نہیں تھا......پھر اچانک ہی کمرے کی لائٹ بند ہوگئی اور ہر طرف گہرا اندھیرا چھا گیا......گہرا اور ہولناک اندھیرا......!!

☆......☆......☆

چبوترے پر حسب معمول کامو چاچا اور رحیم بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن آج ان کے چہروں پر وہ تازگی اور بشاشت نہیں تھی۔ وہ تو اس وقت بڑے جوش و خروش سے ملکی حالات پر تبصرہ کر رہے ہوتے تھے...... لیکن اس وقت دونوں ہی خاموش تھے......!!

پھر کافی دیر بعد کامو چاچا کی آواز نے اس سناٹے کو توڑا۔

"ناقابل یقین...... حیرت انگیز......!!"

"ہاں...... کامو......!!" رحیم بھائی نے سر ہلایا۔ "کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پے در پے اس گھر سے تین افراد کی لاشیں اٹھ جائیں گی......!!"

"یار...... میں تو پہلے ہی کہہ رہا ہوں کہ یہ گھر ہے ہی خراب اس میں کافی عرصے سے برے اثرات ہیں...... جب جمال نے یہ گھر لیا تھا، تو میں اس وقت بھی اس سے یہی بات کرنا چاہتا تھا......لیکن پھر میں نہ جانے کس خیال سے خاموش ہی رہا......!!"

"ان باتوں کو کون مانتا ہے آج کل......!!" رحیم بھائی بولے۔ "اگر تم جمال کو بتا دیتے، تو وہ ضرور تم پر ہنستا اور تمہارا مذاق اڑاتا......!!"

"ہاں......لیکن اب بھی تو دیکھ لو......!!" کامو چاچا سرسراتے ہوئے لہجے میں بولے۔ "کیا انجام ہوا......کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ......!!"

"یار...... باتیں کرتے ہوئے بھی ہول آرہا ہے...... وہ منظر بار بار میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہے ہیں......!" رحیم بھائی نے جھرجھری سی لی۔

"سنا ہے کہ شاہد نامی آدمی کی تو اچھی خاصی دکان تھی...... اچھا کاروبار تھا اس کا......!!"

"ہوں...... لیکن وہ یہاں آیا کیوں تھا......؟" رحیم بھائی کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"اب کیا کہا جا سکتا ہے......بہرحال اسے شاید موت کھینچ لائی تھی......!!"

"واقعی یار......!!" رحیم بھائی نے جھرجھری لی۔ "دیکھو...... پرسوں رضیہ اپنے بستر پر اس حالت میں ملی کہ اس کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی...... اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا...... اور...... اب کل شاہد کی لاش بھی اسی حالت میں پائی گئی......!!"

دونوں پھر خاموش ہوگئے تھے......ایک بار پھر قبرستان کا سا سناٹا طاری ہوگیا تھا......وہی قبرستان...... جہاں دو دن پہلے جمال کی روح برآمد ہوئی تھی......!!!



انگارے

شہزادہ چاند زیب عباسی

قسط نمبر: 01

دل گرفتہ دل شکستہ ناقابل فراموش ناقابل یقین سے دو چار عجیب و غریب حیرت سے روشناس کراتی تحیر انگیزی میں سب سے آگے خوفناک وادی کے نشیب و فراز میں دندناتی اور ذہن سے محو نہ ہونے والی شاہکار کہانی۔

حیرت وخوف کے گرداب میں غوطہ زن اپنی مثال آپ تحیر انگیز ایڈونچر کہانی

ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پہنے جیل کے احاطے میں چلنے والا قیدی نمبر آٹھ سو تین دراز قد اور ورزشی جسم کا مالک تھا۔ سر اور داڑھی مونچھوں کے بال بڑھے ہوئے اور بے ترتیب تھے۔ انگاروں کی طرح دہکتی آنکھیں اور چیچک کے پرانے داغ اس کے سیاہ چہرے کو مزید خوف ناک بنا رہے تھے۔ اس کے دائیں بائیں جیل کے چار محافظ بھی چل رہے تھے محافظوں کے چہروں پر چھایا ہوا خوف وہراس صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ان کا خوف بے جا نہ تھا سزائے موت کا یہ مجرم کوئی عام قیدی نہ تھا۔ اقبال عرف بالا تھا۔ ڈکیتی، اغوا برائے تاوان اور قتل جیسے سنگین جرائم کے متعدد مقدمات مختلف پولیس اسٹیشنوں میں اس کے نام درج تھے۔

بالا درندہ صفت شخص تھا۔ جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ انسانی خون اسے گھٹی میں ملا ہے۔ دوران قید جیل میں بھی اس نے دو قیدیوں کو معمولی سی تلخ کلامی کی وجہ سے قتل کر دیا تھا قیدیوں سمیت جیل کا تقریباً تمام عملہ اس سے خوف زدہ تھا۔ پولیس ڈپارٹمنٹ کے ذہین اور بہادر انسپکٹر راحیل احمد نے اسے اس وقت گرفتار کیا تھا جب بالا سر عام اپنے ایک مخالف کو قتل کر کے موقعہ واردات سے فرار ہو رہا تھا۔

عدالت نے اسے پھانسی کی سزا سنا دی تھی اور پھر اس کی رحم کی اپیل بھی مسترد ہو چکی تھی، ڈیتھ وارنٹ بھی آ چکا تھا، آج کی رات بالا کی زندگی کی آخری رات تھی۔

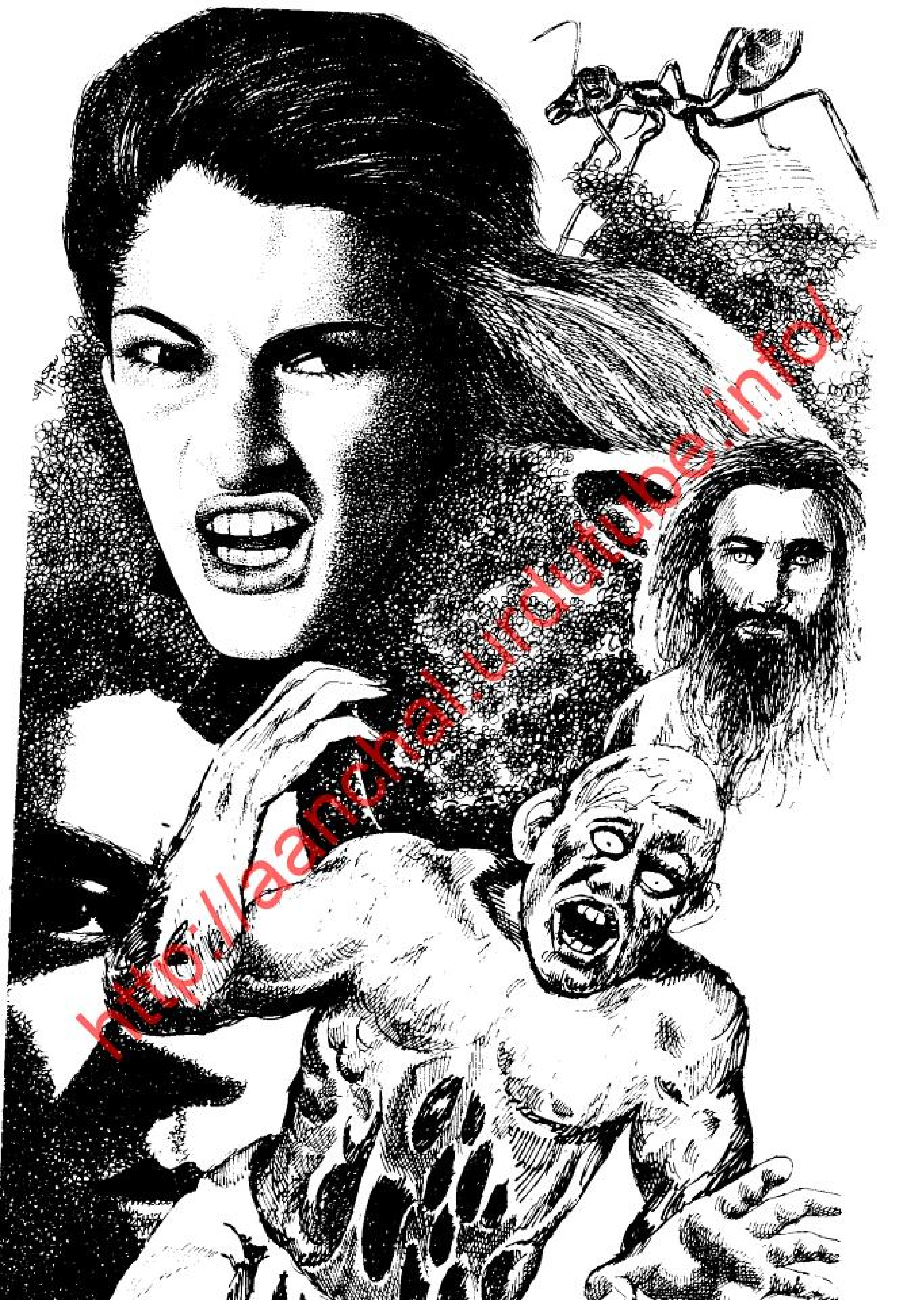
بالا کو کال کوٹھری میں پہنچا کر سنتری وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اور بالا کال کوٹھری کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد قدموں کی چاپ سن کر اس نے سر اٹھایا سنتری کے ساتھ ایک باریش شخص سلاخوں کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھوں میں چند کتابیں اٹھا رکھی تھیں بالا اٹھ کر کھڑا ہوا اور سنتری کے اشارے پر سلاخوں کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

''کون ہے یہ؟'' اس نے استفساریہ نگاہوں سے سنتری کی طرف دیکھتے ہوئے ناگوار لہجے میں پوچھا۔

''یہ مولانا آفتاب صاحب ہیں آخری وقت تمہاری ان سے ملاقات تمہارے لئے سود مند رہے گی۔'' سنتری نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''میں کسی سے بھی نہیں ملنا چاہتا۔'' بالا بپھر کر غراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

''بیٹا تم جاؤ اسے میں سمجھالوں گا۔'' باریش شخص مسکرایا اور سنتری کندھے اچکاتا ہوا ایک طرف چل دیا۔



اور بالا آفتاب احمد کو غصے سے دیکھنے لگا۔

"سنو بالا میرے پاس وقت کم ہے اس لئے میری بات غور سے سنو۔ چند گھنٹوں بعد تمہیں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ مگر میں تمہیں بچا سکتا ہوں پر اس کے لئے میری ایک شرط ہے۔ تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔" وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔

"مجھے تمہارا کون سا کام کرنا پڑے گا اور تم مجھے کیسے بچا سکتے ہو؟" بالا نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔ اس نے اس شخص کو پاگل سمجھ لیا تھا اور اسے اس کی باتوں پر قطعی یقین نہیں تھا لیکن اپنے آخری وقت میں اس شخص کی بے سروپا گفتگو سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔

"میں کام تمہیں یہاں سے رہائی دلانے کے بعد بتاؤں گا پہلے تم صرف مجھ سے وعدہ کرو اور رہا یہ سوال کہ میں تمہیں کیسے بچاؤں گا یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" آفتاب احمد نے جواب دیا۔

بالا سوچنے لگا۔ "لگتا ہے یہ شخص واقعی پاگل ہے۔" پھر خود ہی اپنی اس سوچ کی تردید کی۔

اپنے حلیے اور گفتگو سے وہ شخص معزز اور بردبار دکھائی دے رہا تھا۔ "پاگل اس طرح کے تو نہیں ہوتے اور پھر دنیا میں کچھ بھی تو ناممکن نہیں۔ مجھے تو ویسے بھی پھانسی پر چڑھ جانا ہے تو اس کی بات مان لینے میں کیا حرج ہے۔ اور اگر اس نے جھوٹ کہا تو بھی مجھے کیا فرق پڑے گا۔ اور اگر اس کی بات سچ نکلی، اس کی شرط میرے لئے مشکل ہوئی تو یہاں سے نکلنے کے بعد میں صاف انکار کردوں گا اور پھر بھلا یہ عام شخص میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ زیادہ اونچا اڑا تو اسے بھی قتل کردوں گا۔" بالا نے سوچا۔

"کیا سوچنے لگے؟ سنتری کے آنے سے پہلے جواب دو۔" آفتاب نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہاں سے آزاد ہوتے ہی میں تمہاری ایک تو کیا ہر شرط مانوں گا۔" بالا نے جواب دیا۔

اور آفتاب احمد نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک زرد رنگ کا کیپسول نکال کر بالا کو دیا۔ "میری بات دھیان سے سنو۔ اس کیپسول کو احتیاط سے چھپا کر رکھو۔ جیسے ہی وہ تمہیں پھانسی گھاٹ لے جانے کے لئے اس کال کوٹھری میں آئیں۔ تم فوراً ہی یہ کیپسول نگل لینا۔ لیکن یہ خیال ضرور رکھنا کہ کوئی تمہاری یہ حرکت دیکھ نہ لے۔"

"لیکن یہ کیپسول کھانے سے میری رہائی کا کیا تعلق ہے؟" بالا نے استعجاب انگیز حیرت سے پوچھا۔

"یہ تم خود دیکھ لوگے" اتنے میں وہی سنتری اس طرف آتا دکھائی دیا۔ تو آفتاب احمد نے گفتگو کا موضوع بدل کر اسے دین کی باتیں سمجھانے لگا۔ اور کچھ دیر بعد سنتری کے ساتھ ہی رخصت ہوگیا۔

بالا دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا وہ جتنا سفاک اور درندہ صفت سہی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا۔ موت کے تصور سے ہی اس کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی۔

صبح ساڑھے چار بجے کے قریب قدموں کی چاپ سن کر اس نے جلدی سے لباس میں پوشیدہ وہ کیپسول نکالا اور تھوک کے ساتھ نگل گیا۔ قدموں کی آواز دروازے پر آ کر رک گئی۔ یہ دو سنتری اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیلر تھا۔ وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چلتا ہوا پھانسی گھاٹ تک جا پہنچا۔ وہاں جیلر ڈاکٹر اور دیگر اہلکار موجود تھے۔ بالا کو تختہ دار پر کھڑا کردیا گیا۔ جلاد لیور کے پاس تیار کھڑا تھا۔

موت کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر بالا کی حالت غیر ہونے لگی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ آفتاب احمد نامی باریش شخص یا تو پاگل تھا، یا پھر اس نے بالا کے ساتھ مذاق کیا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے اور سر پر کالے رنگ کا غلاف اس طرح چڑھا دیا گیا، کہ اس کا پورا چہرہ چھپ گیا تھا اور پھر اس کے گلے میں پھندا بھی ڈال دیا گیا بالا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

اچانک اسے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس

ہوئی۔ اس سے پہلے کہ جیلر جلاد کو لیور کھینچنے کا مخصوص اشارہ کرتا۔

بالا ڈگمگایا اور پھندے سے جھول گیا۔ ''اسے کیا ہوا؟''

جیلر چیخا اور بالا کی طرف لپکا۔ ''اس کے سر سے پھندا اور غلاف اتارتے ہیں۔'' جیلر دھک سے رہ گیا بالا کے منہ سے نیلے رنگ کا جھاگ نکل رہا تھا آنکھیں پتھرا چکی تھیں اور جسم بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ ''یہ، یہ اسے کیا ہو گیا؟'' جیلر گھبرا گیا۔ اور ڈاکٹر کو اسے چیک کرنے کو کہا۔

ڈاکٹر نے لاش کا معائنہ کیا اور بولا۔ ''لگتا ہے کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔''

جیلر کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ اسے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا تھا۔ پھانسی کے مجرم کا پھانسی سے قبل زہر خوانی سے مر جانا اسے مصیبت میں ڈال سکتا تھا۔ نہ صرف اس کی ملازمت چلی جاتی بلکہ اسے سزا بھی ہو سکتی تھی اس کا کیریئر تباہ ہو جاتا۔ تصور میں خود کو اسی جیل میں قید دیکھ کر وہ کانپ اٹھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اس کا حل بھی سوچ لیا۔

جیلر نے ڈاکٹر سمیت وہاں موجود تمام افراد کو اعتماد میں لیا اور متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ کسی کو سچائی بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہی ظاہر کیا جائے گا کہ بالا کو پھانسی دی جا چکی ہے۔ انہیں امید تھی بلکہ یقین تھا کہ بالا کا کوئی وارث سامنے نہیں آئے گا۔ اور اگر خدانخواستہ کوئی آ بھی گیا تو اس کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکل جائے گا۔

پھر صبح ایک نجی اسپتال کی ایمبولینس جیل کے گیٹ پر رکی ایمبولینس میں ڈرائیور کے علاوہ ایک ادھیڑ عمر کلین شیو شخص بھی موجود تھا۔ اس کے پاس بالا کی لاش کی حوالگی کے آرڈر تھے لہٰذا خاموشی سے بالا کی لاش اس کے حوالے کر دی گئی۔

ایمبولینس تیز رفتاری سے اپنا سفر طے کرتی ہوئی کئی گھنٹوں بعد ایک پہاڑی علاقے میں داخل ہوئی اور ایک وسیع و عریض دو منزلہ عمارت کے گیٹ پر جا رکی۔ ڈرائیور کے ہارن بجاتے ہی گیٹ کھلا اور ایمبولینس اندر داخل ہو گئی۔ ایمبولینس کے رکتے ہی دو افراد ایک طرف سے آئے اور اسٹریچر اتار کر ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے۔ اور بالا کی لاش کو اسٹریچر سے بیڈ پر منتقل کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکل گئے۔ کمرے میں ایک 35 سالہ شخص کھڑا تھا جبکہ ایک طرف دبلا پتلا بوڑھا شخص آلتی پالتی مارے بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ سو سال سے زائد اس بوڑھے شخص کا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا اور گلے میں مختلف اقسام کی مالائیں اور ماتھے پر قشقہ تھا۔

دسمبر کے اس سرد موسم میں بھی اس بوڑھے شخص کے جسم پر فقط ایک لنگوٹی ہی موجود تھی وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بوڑھا شخص سنسکرت زبان میں کوئی منتر پڑھ رہا تھا کمرے میں کھڑے شخص نے ایک طرف رکھی میز پر سے انجکشن اٹھایا اور بالا کی کلائی کی رگ میں لگا دیا۔

حیرت انگیز طور پر پانچ منٹ بعد ہی بالا کے جسم میں تحریک پیدا ہوئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''میں کہاں ہوں؟ اور تم کون ہوں؟'' وہ اطمینان سے ایک طرف رکھی کرسی پر بیٹھا۔ اور اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں ڈاکٹر انور ہوں۔ رہا یہ سوال کہ اس وقت تم کہاں موجود ہو تو فی الحال یہ بتانا ضروری نہیں بہرحال اتنا اطمینان رکھو کہ تم اب جیل میں نہیں بلکہ میری ذاتی رہائش گاہ میں ہو۔ تم نے جیل میں مجھ سے معاہدہ کیا تھا وعدے کے مطابق میں تمہیں جیل سے زندہ سلامت نکال لایا ہوں۔ اب تمہاری باری ہے کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو۔ اور یقین جانو تمہیں اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ صرف ایک معمولی کام کے عوض تمہاری ساری زندگی عیش و آرام سے گزرے گی۔ ویسے بھی یوں سمجھ لو کہ یہ تمہارا نیا جنم ہے۔ تم قانون کے کاغذات میں مر چکے ہو۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' بالا نے پوچھا اسے اس بوڑھے شخص پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ جوان دونوں سے بے نیاز نامانوس زبان میں کچھ پڑھ رہا تھا۔

ڈاکٹر انور نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا سگریٹ نکال کر لبوں سے لگایا اور لائٹر سے سگریٹ سلگا کر بولا ''تمہیں معمولی سا کام کرنا ہوگا۔ صورتحال کو سمجھنے کے لئے میں تمہیں مختصر الفاظ میں اپنی سرگزشت سناتا ہوں۔ ہم جدی پشتی رئیس ہیں میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا وہ جس مسافر بردار طیارے پر اندرون ملک کے ایک شہر جارہے تھے وہ طیارہ کریش ہوگیا اور بہت سے دوسرے مسافروں کے ساتھ میرے والدین بھی جاں بحق ہوگئے۔ میں نے مغربی ممالک سے تعلیم حاصل کی مجھے سیر وسیاحت کا بھی شوق تھا۔ میں ملک ملک نگر نگر گھومتا انڈیا جا پہنچا۔ جہاں میری ملاقات اس پراسرار پجاری پرتاب بھشن سے ہوئی جو بہت ہی شکتی شالی تھا۔

میں اس کے چمتکار سے بہت متاثر ہوا اور اسے اپنے ساتھ چلنے کی پیش کش کی۔ اور اسے لے کر یہاں آ گیا۔ ایک روز جب میں پرتاب کے ساتھ جنگل میں گھوم رہا تھا تو وہاں ہمیں ایک عجیب وغریب عفریت کی گلی سڑی لاش ملی یہ نوفٹ سے زائد قد کا تھا انسان سے مشابہ، اس عفریت کے ریچھ کے پنجے جیسے پاؤں تھے تب پرتاب نے کہا کہ ''وہ اس عفریت کو زندہ کرکے اپنے تابع کرسکتا ہے۔''

میں یہ حیرت انگیز تجربہ کرنے کو تیار ہوگیا۔ اور اس عفریت کی لاش کو اس عمارت میں منتقل کردیا گیا پرتاب کے کہنے کے مطابق اس عفریت کو زندہ کرنے کے لئے ایک ایسے درندہ صفت شخص کی ضرورت ہے جو سورج گرہن کی ایک مخصوص ساعت میں پیدا ہوا ہو۔ ایک کٹھن جاپ کے بعد انہوں نے تمہاری نشاندہی کی تب میں اپنے تعلقات اور اثر ورسوخ کی بدولت مولوی کے میک اپ میں تم سے ملا۔ اور تم سے وعدہ لینے کے بعد تمہیں اپنا ایجاد کردہ ایک کیپسول دیا۔

اس کیپسول کی یہ خاصیت ہے کہ اسے کھانے والا کچھ دیر بعد اس طرح دکھائی دیتا ہے کہ جیسے وہ زہر خوانی سے مرچکا ہو۔ تمہاری ڈیڈ باڈی حاصل کرنے کے بعد تمہیں اس کا توڑ کرنے کے لئے ایک مخصوص انجکشن لگادیا گیا اور تم ہوش میں آ گئے اب تمہیں اپنا وعدہ پورا کرنا ہے۔ یقین جانو تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بلکہ بہت سے فوائد حاصل ہوں گے۔'' ڈاکٹر انور کرسی سے اٹھا اور ٹہلنے لگا۔

بالا جو بیڈ سے اتر چکا تھا تند لہجے میں بولا۔ ''ڈاکٹر شاید تم ذہنی توازن کھو بیٹھے ہو۔ اور پاگل ہوگئے ہو۔

اس لئے بے سروپا اور فضول باتیں کررہے ہو میں اس طرح کے فضول کاموں میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس لئے جارہا ہوں اور ہاں میرے راستے میں مت آنا ورنہ تم مجھے جانتے ہی ہو کسی انسان کی جان لینا میرے لئے معمولی سی بات ہے۔''

اسی وقت وہ ہڈیوں کا پنجر پرتاب اپنی جگہ سے اٹھا اور بالا کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی نظریں اس پر جمادیں اس کی آنکھیں تھیں کہ دہکتے ہوئے انگارے جن میں اس قدر مقناطیسی قوت تھی کہ بالا کوشش کے باوجود نظر نہ پھیر سکا۔ ''تم وہی کروگے جو ہم کہیں گے ویسے بھی تم انور سے وچن کرچکے ہو تمہیں اپنے اس وچن کا پالن کرنا ہوگا۔'' اس کی آواز بھاری اور گونج دار تھی۔

بالا کوشش کے باوجود انکار نہ کرسکا۔ نہ جانے اس بوڑھے میں ایسا کیا تھا کہ بالا جیسے اپنی جگہ سحر زدہ سا ہوگیا۔

وہ اسے ساتھ لئے ہوئے عمارت کی عقبی سمت جا پہنچے۔ یہاں ایک کنواں تھا پرتاب نے بالا کو کنویں کی منڈیر پر چڑھنے کا حکم دیا منڈیر پر رسی کی بنی ہوئی سیڑھی لٹک رہی تھی پھر بالا اس سیڑھی کے ذریعے کنویں میں اتر گیا۔ اس کے بعد باری باری پرتاب اور انور بھی اس کے پیچھے کنویں میں اترے۔ کنویں کی تہہ خشک تھی

اور دائیں سمت سرنگ نما ایک راستہ تھا۔ جس کا اختتام ایک کمرے میں ہوا۔

اس کمرے میں چارپائی چار کا خلا تھا۔ یہ کمرے کے عین وسط میں تھا جو یقیناً کسی تہہ خانے میں جانے کا راستہ تھا۔ یہاں بھی رسی کی بنی ہوئی ایک سیڑھی لٹک رہی تھی بیس فٹ نیچے ایک وسیع ہال تھا۔ جہاں اس قدر بساند اور بدبو تھی کہ بالا کا دل الٹنے لگا۔ ایک طرف بڑی سی میز پر جو کہ تقریباً دس فٹ لمبی اور چھ فٹ چوڑی تھی، نوفٹ طویل قامت ایک انسان نما عفریت کی گلی سڑی لاش پڑی تھی اس کا سارا جسم ریچھ کی طرح بالوں سے بھرا ہوا تھا اور اس کے ریچھ سے مشابہ چار پنجے تھے اگلے پنجوں میں درانتی کی طرح لمبے ناخن تھے ناک کی جگہ سوراخ تھے اور منہ مگرمچھ سے مشابہ تھا اس عفریت کے جسم سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔

''اس کے برابر لیٹ جاؤ۔'' پرتاب نے حکم دیا۔

اور بالا نہ چاہنے کے باوجود بھی سحرزدہ سا عفریت کی لاش کے قریب لیٹ گیا۔ پرتاب نے اس کے قریب کھڑے ہو کر با آواز بلند کوئی منتر پڑھنا شروع کردیا۔

بالا نے اپنا جسم ان دیکھی زنجیروں میں بندھا محسوس کیا اب وہ اپنے جسم کو معمولی سی جنبش بھی نہ دے سکتا تھا۔ پھر پرتاب نے منتر پڑھتے ہوئے میز کے نیچے پڑا مٹی کا پیالہ اٹھایا اور خنجر دوسرے ہاتھ میں تھام کر اس کی کلائی پر کٹ لگا دیا۔ بالا کا خون بہنے لگا۔ اس نے پیالہ آگے کیا اور خون پیالے میں گرنے لگا کچھ دیر بعد جب پیالہ خون سے بھر گیا۔ تو اس نے انگلیوں سے خون عفریت کے جسم پر چھڑکنے کے بعد بچا ہوا خون عفریت کے کھلے منہ میں ڈال دیا پھر عفریت کا دائیاں ہاتھ پکڑ کر اسے بالا کے سینے پر رکھ دیا اور منتر پڑھنے لگا۔

بے حس و حرکت ہونے کے باوجود بالا کے حواس بخوبی اپنا کام کررہے تھے۔ پھر بالا نے ناقابل یقین منظر دیکھا۔ عفریت کے جسم میں جنبش ہوئی اور وہ اٹھ بیٹھا۔ اس خوفناک صورت بلا نے چاروں طرف سر گھما کر دیکھا اور زوردار چیخ ماری، اس کی چیخ شیر کی دھاڑ سے مشابہ تھی۔

بالا کے ہوش وحواس ساتھ چھوڑ گئے اور ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔

☆......☆......☆

عدنان، سلمان اور بریرہ اس بلند و بالا برفانی پہاڑ پر ہزاروں فٹ کی بلندی پر آگے بڑھ رہے تھے وہ تینوں کوہ پیمائی کے شوقین تھے اور ملک کی بہت سی مشکل ترین پہاڑی چوٹیاں سر کرچکے تھے ان کا تعلق پاکستان کے مختلف علاقوں سے تھا۔ عدنان اور بریرہ کزن تھے اور اپر کلاس فیملی سے تعلق رکھتے تھے جبکہ سلمان مڈل کلاس فیملی کا فرد تھا ان کی دوستی نیٹ پر ہوئی تھی اور پھر وہ اکثر مہمات میں ساتھ جانے لگے۔ ''یار میرے خیال میں کہیں قیام کرلیا جائے تو بہتر ہے۔'' سلمان نے سردی سے کپکپاتے ہوئے کہا۔

''یہ جگہ مناسب نہیں خیمہ گاڑنے کے لئے کوئی مناسب مقام ڈھونڈنا پڑے گا۔ ان بلند و بالا برفانی پہاڑوں پر طوفان کا کوئی بھروسہ نہیں۔'' عدنان بولا۔

کچھ دیر بعد اس کی پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی اور تیز ہوائیں چلنے لگیں اور ساتھ ہی ساتھ گڑگڑاہٹ کی گونج دار آواز سنائی دی۔ عدنان کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔

''کیا ہوا؟'' سلمان نے پوچھا۔

''جلدی کرو کسی محفوظ مقام تک پہنچو۔'' عدنان چلایا اور ایک بلند و بالا تکونی چٹان کی آڑ میں دبک گیا۔ یہ تکونی چٹان کافی آگے نکلی ہوئی تھی سلمان اور بریرہ بھی ہانپتے کانپتے اس کے قریب پہنچ گئے۔ عدنان کا یہ اندازہ بھی درست ثابت ہوا۔ گڑگڑاہٹ کی قیامت خیز آواز کے ساتھ برفانی تودا چٹان کے اوپر سے لڑھکتا ہوا نشیب میں چلا گیا۔ ان تینوں کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے موت انہیں چھو کر جاچکی تھی ان کی قسمت اچھی تھی

جو اس بلند و بالا تکونی چٹان کی آڑ میں دبک گئے تھے ورنہ ہزاروں ٹن برفانی تودے کے نیچے دب جانے کے باعث ان کی لاشیں بھی کسی کو نہ ملتیں۔

اس وقت بھی ان کے جسم نصف کے قریب برف میں دھنس چکے تھے۔ کچھ دیر بعد جب وہ اٹھے تو حیران رہ گئے۔ ایوالانچ کے گزر جانے سے ماحول ہی تبدیل ہوگیا تھا جگہ جگہ برفانی تودوں کے ڈھیر پڑے تھے تکونی چٹان کے دائیں سمت ایک غار کا دہانہ بھی نظر آرہا تھا جبکہ انہیں اچھی طرح یاد تھا طوفان آنے سے پیشتر یہاں کوئی بھی غار نہیں تھا۔

''یہ غار کیا ہے؟'' بریرہ حیرت زدہ لہجے میں بولی۔ ''چلو چل کر دیکھتے ہیں۔''

''ہوسکتا ہے یہ غار رات گزارنے کے کام آجائے۔'' عدنان نے غار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ غار کا دہانہ کسی سرنگ کی طرح تنگ تھا اس لئے انہیں جھک کر چلنا پڑا یہ غار شیطان کی آنت کی طرح لمبا تھا جو آگے جاکر کشادہ ہوگیا وہ تینوں غار میں کافی آگے آچکے تھے لیکن یہاں گھپ اندھیرا تھا۔ سمان نے اپنے بیگ سے ٹارچ نکال کر روشن کرلی۔ وہ آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ غار کا جائزہ بھی لے رہے تھے غار ان کی توقع کے برعکس صاف ستھرا تھا۔ ایک طرف پرانی سی بوسیدہ چٹائی اور مٹی کے چند برتن رکھے تھے دوسری طرف سات آٹھ بڑے بڑے ٹرنک تھے جن میں تالے لگے ہوئے تھے اس سے کچھ فاصلے پر لکڑی کا ایک تابوت تھا، وہ حیرت زدہ سے تابوت کے قریب چلے گئے تابوت کی خستہ حالی ظاہر کررہی تھی کہ وہ برسوں پرانا تابوت ہے اس پرانے تابوت میں اوپر کی طرف چند سوراخ تھے۔

وہ کچھ دیر حیرت سے تابوت کو دیکھتے رہے پھر سمان نے بسم اللہ پڑھ کر تابوت کا ڈھکن اٹھایا تو انہیں ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی، ڈر اور خوف سے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ تابوت میں ایک تیس پینتیس سالہ نوجوان کی لاش پڑی تھی گندمی رنگت کے حامل اس خوش شکل نوجوان کی آنکھیں اس طرح بند تھیں کہ محسوس ہورہا تھا کہ وہ گہری نیند سورہا ہے۔

سمان نے ڈرتے ڈرتے اس کی کلائی تھامی تو اسے حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا نوجوان کی رگوں میں زندگی کی حرارت موجود تھی۔

اچانک تابوت میں لیٹے نوجوان کے بدن میں جنبش ہوئی اور وہ اٹھ بیٹھا۔ ان تینوں کا تو یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں غار کا پراسرار ماحول اور پھر تابوت میں موجود لاش کا اٹھ کر بیٹھنا یہ سب طلسمی باتیں لگ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ تینوں خواب دیکھ رہے ہوں۔ وہ ششدر کھڑے سکتے کے سے عالم میں اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ڈر اور خوف سے ان کا برا حال تھا۔ اور دل تیزی سے اس طرح دھڑک رہے تھے کہ گویا ابھی پسلیوں سے باہر آجائیں گے جبکہ تابوت میں بیٹھا نوجوان بھی انہیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

اس کے جسم پر موجود لباس اگرچہ بوسیدہ تھا لیکن زمانہ قدیم کا دکھائی دیتا تھا۔ پھر وہ تابوت سے باہر نکل آیا۔

سمان نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

''انسان ہوں بھئی اور الحمدللہ مسلمان ہوں۔ نام میرا شاہ زین ہے۔ آپ بتائیں آپ لوگ کون ہیں؟ اور بابا غلام حسین کہاں گئے؟ میں رات کو جب سویا تھا تو وہ اسی غار میں موجود تھے۔''

''بابا غلام حسین کون ہیں؟ ہم انہیں نہیں جانتے، میں سمان ہوں اور اسلام آباد میں رہتا ہوں اور یہ بریرہ اور عدنان ہیں دونوں کزن ہیں اور کراچی کے رہائشی ہیں۔ ہمیں کوہ پیمائی کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ اتفاقاً اس غار پر نظر پڑی تو ہم فطری تجسس کے تحت اندر داخل ہوگئے۔'' سمان اپنا اور اپنے ساتھیوں کا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔

وہ حیرت سے چند لمحوں تک انہیں دیکھتا رہا۔ پھر قدرے توقف سے کہا۔ ''یہ اسلام آباد اور کراچی کہاں ہیں۔'' میری معلومات کے مطابق ہندوستان میں نہ تو اس نام کی ریاست ہے اور نہ ہی کسی علاقے کا ایسا نام ہے۔'' شاہ زین کے جواب سے ان کی حیرت مزید دو چند ہوگئی۔

''تم کس دنیا میں رہتے ہو یہ ہندوستان کے نہیں پاکستان کے شہر ہیں اور یہ برفانی پہاڑ پاکستان کی حدود میں ہے۔'' سلمان بولا۔

شاہ زین مزید حیران ہوگیا اور پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ''پاکستان! میں نے تو اس ملک کا کہیں نام نہیں سنا یہ کہاں واقع ہے؟'' سلمان کا دل چاہا کہ بے اختیار اپنا سر پیٹ ڈالے اور سر کے بال نوچنے لگے۔ بول چال سے مہذب نظر آنے والا نوجوان پاگلوں کی طرح اوٹ پٹانگ باتیں کررہا تھا۔

اس بار سلمان نے غصے سے کہا۔ ''تم کس دنیا میں رہتے ہو جو پاکستان سے واقف نہیں پاکستان 14 اگست 1947ء کو وجود میں آیا اور اب 2010ء ہے۔''

اس بار حیرت سے اچھلنے کی باری شاہ زین کی تھی۔ ''میں تو چند گھنٹے پہلے سویا تھا اور اب جاگا ہوں جبکہ جو تم کہہ رہے ہو تو اس حساب سے میں سو (100) سال سے زیادہ سوتا رہا ہوں۔ کہیں تم لوگ مجھ سے مذاق تو نہیں کررہے۔''

سلمان تپ گیا۔ ''مذاق ہم نہیں تم کررہے ہو بھلا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی سو سال تک سوتا رہے اور پھر زندہ بھی ہو اور تم اس طرح تر و تازہ ہو گویا رات میں سوئے تھے اور صبح جاگے ہو سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟'' اس نے شاہ زین کو کڑے تیوروں سے دیکھا۔

''لگتا ہے اس نے شراب پی رکھی ہے۔'' عدنان نے کہا اور آگے بڑھ کر اس کا منہ سونگھنے کی کوشش کی۔

شاہ زین نے لاحول پڑھتے ہوئے اسے ناگواری سے پرے دھکیلا۔ ''میں الحمدللہ مسلمان ہوں۔ اور شراب حرام ہے۔''

''اچھا تو شاہ زین صاحب تم خود ہی بتاؤ تم کون ہو؟ اور یہ کیا چکر ہے؟'' سلمان زچ ہوگیا تھا۔

''کیا یہ 1890ء نہیں ہے۔'' اس نے دوبارہ پہلے والا سوال دہرایا۔

اس بار سلمان نے واقعی اپنا سر پیٹ ڈالا۔ ''لگتا ہے تم ہمیں بھی پاگل کردوگے۔ اب اگر دوبارہ اس قسم کی کوئی بات کی تو میں تمہارا سر پھاڑ دوں گا۔'' سلمان غضب ناک لہجے میں بولا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر کہا۔ ''میرا نام شاہ زین ہے اور تعلق ہندوستان کی ایک ریاست جے پور سے ہے۔ یہ سن 1890ء کا قصہ ہے ہندوستان پر انگریز قابض تھے جے پور میں مسلمان بہت کم اور ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ اس کے باوجود ان میں محبت اور بھائی چارہ تھا۔ اور یہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں کام آتے تھے میرے والد صاحب انتقال کرچکے تھے۔ گھر پر صرف میں والدہ اور چھوٹی بہن سکینہ تھی۔ میں گزر بسر کے لئے گاؤں والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا میں اکثر بکریوں کو لے کر دور دراز جنگل میں نکل جاتا تھا۔ دن بھر بکریاں چراتا اور مغرب کے وقت گھر چلا جاتا۔

میں فطرتاً نڈر تھا۔ ہاں البتہ مجھ میں ایک خامی تھی میں دینی معاملات سے دور رہتا تھا نماز مجھے یاد نہیں شاید ہی میں نے ان دنوں پڑھی ہو اسی طرح ماہ و سال بیتنے لگے اور میں لڑکپن سے نوجوانی کی حدود میں داخل ہوگیا مجھ میں صرف ایک ہی خوبی تھی میں ہر ایک کے دکھ درد میں کام آتا تھا نوجوان ہونے کے بعد بھی میرے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

اس روز میں حسب معمول بکریاں چرانے جنگل گیا ہوا تھا شام کو واپس لوٹنے لگا تو اچانک موسم تبدیل ہوگیا اور سر شام ہی اندھیرا پھیل گیا وہ رات بہت ڈراؤنی اور خوف ناک تھی طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں اور بادلوں کی گرج چمک دل دہلا رہی تھی میں اس سب

سے بے نیاز بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ برگد کے ایک گھنے اور بڑے درخت کے نیچے کھڑا تھا کہ اچانک میری نظر ایک ستر اسی سالہ نحیف ونزار بوڑھے پر پڑی جو موسم کی سنگینیوں سے بے نیاز لکڑیوں کا ایک بھاری گٹھڑ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا حلیئے اور لباس سے وہ کوئی ہندو سادھو لگ رہا تھا میری فطری رحم دلی عود کر آئی۔

''رکئے بابا۔'' میں آگے بڑھا اور گٹھڑ اٹھا کر اپنے شانے پر رکھ لیا۔

''رہنے دو بالک اپنا بوجھ مجھے خود اٹھانے دو۔ میری خاطر کشٹ مت اٹھاؤ۔'' سادھو نے کہا۔

''نہیں باباجی آپ بتائیں لکڑیاں کہاں پہنچانی ہیں۔''

بوڑھے نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور آگے چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک کٹیاں سامنے آ گئی اور میں سادھو کے پیچھے پیچھے کٹیا میں داخل ہو گیا کٹیا میں ایک مشعل روشن تھی۔ میں نے سادھو کے اشارے پر لکڑیوں کا گٹھڑ ایک طرف رکھ دیا۔ ''بیٹھو بالک بھوجن کرلو۔''

''نہیں باباجی بکریاں جنگل میں کھڑی ہیں۔ موسم بھی خراب ہے اماں پریشان ہوں گی۔ مجھے گھر جانا ہے آپ بس پانی پلا دیں۔'' میں ایک طرف بچھی چٹائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''بالک تم نے سادھو جگدیش کی سیوا کی ہے بھگوان تمہاری رکھشا کرے گا اور بکریوں کی فکر چھوڑ دو وہ باحفاظت رہیں گی۔'' سادھو مسکرایا اور زیرلب کچھ پڑھا۔

اگلا ہی لمحہ حیرت انگیز تھا نہ جانے کیسے اور کہاں سے اس کے ہاتھ میں گلاس آ گیا جس میں کوئی مشروب تھا۔ اس نے گلاس میری طرف بڑھایا وہ مشروب اتنا لذیذ تھا کہ کئی دنوں تک اس کا ذائقہ منہ سے نہیں گیا۔ ''باباجی یہ شربت؟'' میں نے پوچھنا چاہا۔

''کچھ باتیں آنے والے سمے کے لئے بھی رہنے دو بالک۔'' سادھو نے کہا اور میں اس سے رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد میں اس سادھو سے کئی بار ملا کبھی میں اس کے لئے پھل توڑ کر لے جاتا اور کبھی لکڑیاں کاٹ کر لے جاتا اور کئی بار اس کی کٹیا کی صفائی بھی کی۔ ایک روز معمول کے مطابق جب میں اس کی کٹیا میں تھا اور سادھو مرگ چھالہ پر بیٹھا کوئی منتر پڑھ رہا تھا اس کی آنکھیں اس وقت بند تھیں اس نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''میں تمہیں کچھ دان کرنا چاہتا ہوں میں کوئی معمولی پنڈت پجاری نہیں۔ پاربتی کا مہان سیوک ہوں میرے پاس بہت سی ایسی شکتیاں ہیں کہ اگر میں چاہوں تو اس کٹیا کے بجائے کسی محل میں رہ کر راجہ مہاراجاؤں جیسی زندگی بسر کر سکتا ہوں اور چاہوں تو کسی کام کے لئے بھی نہ ہلوں صرف زبان ہلانے کی دیر ہے میری مطلوبہ شے میرے سامنے ہوگی۔'' وہ سادھو سچ کہہ رہا تھا

اس کا تجربہ مجھے اسی روز ہو گیا تھا جب خود بخود اس کے ہاتھ میں گلاس آ گیا تھا۔ بعد میں مجھے اس سادھو نے بتایا کہ وہ صرف ہاتھ پیر ہلانے کے لئے چھوٹے موٹے کام کرتا ہے۔''

''سنو نوجوان میرے قبضے میں ایک مہان شکتی ہے جو میں تمہیں دان کرنا چاہتا ہوں۔'' سادھو نے کہا۔

''باباجی میں نہ تو ان باتوں پر یقین رکھتا ہوں اور نہ ہی مجھے کسی ماورائی قوت کی ضرورت ہے۔ اور میں آپ کی خدمت کسی صلے یا مفاد کے لئے نہیں انسانیت کے جذبے سے کرتا ہوں اور پھر یہ جنتر منتر میرے مذہب میں گناہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''بالک مجھے تمہارے وچار اچھے لگے جو منش اپنے دھرم کا نہیں وہ کسی کا نہیں۔ مگر منش کے وچار کچھ بھی ہوں۔ آنے والے سمے میں وہی ہوتا ہے جو اس کے بھاگ میں لکھا ہوتا ہے۔'' سادھو خاموش ہو گیا۔

میرے روز مرہ کے معمولات اسی طرح کے تھے۔ کچھ روز بعد جب میں اس سادھو کی کٹیا میں گیا تو اسے مرگ چھالہ پر بے حس وحرکت پڑے پایا۔ اس کا

جائزہ لیا تو پتہ چلا وہ مرچکا ہے۔ تب میں نے گاؤں جا کر ہندو برادری کو اطلاع دی انہوں نے سادھو کا کریا کرم کیا۔

حالات معمول پر آچکے تھے اور میں اس سادھو کو بھول چکا تھا، ایک روز میں بکریاں چراتے ہوئے اس مقام سے گزرا جہاں سورگباشی سادھو کی کٹیا تھی۔ کہ اچانک کوئی چیز میرے شانے پر آگری اس شے کا وزن چھوٹے بیر یا کنکر کی مانند ہوگا۔ میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنے شانے کو جھاڑ کر چند قدم مزید آگے بڑھا تب مجھے محسوس ہوا کوئی شے میرے دائیں کندھے پر رینگ رہی ہے یہ چھپکلی یا اس سے مشابہ تھی۔

میں نے ہاتھ اپنے کندھے پر مار کر اس شے کو جھاڑنے کی کوشش کی مگر نہ ہی میں اسے جھاڑ سکا اور نہ ہی پکڑ سکا وہ جو کوئی شے تھی میرے دائیں کندھے سے رینگتی ہوئی بائیں کندھے پر آچکی تھی۔ اور میرے کندھے پر چل رہی تھی میں نے قمیض تک اتاری اور جھاڑنے کے بعد دوبارہ پہن لی مگر وہ چیز بدستور اپنی جگہ پر موجود تھی۔ کوشش کے باوجود جب میں اس پر قابو نہ پا سکا تو میں نے اسے اپنا وہم جانا لیکن چند قدم چلنے کے بعد اس کا لمس بدستور اپنے جسم پر پا کر میں بے چین ہوگیا اور سر گھما کر اپنے بائیں کندھے پر نظر ڈالی تو دھک سے رہ گیا، یہ تین یا چار انچ کا ایک بونا تھا بالکل بچوں کی گڑیوں کی طرح جو اپنے ننھے منے پاؤں سے میرے بائیں شانے پر چہل قدمی کررہا تھا۔ میں نے اس 3 انچ کے بونے کو پکڑنے کی دوبارہ کوشش کی مگر ناکام رہا۔

میں عجیب شش وپنج میں مبتلا ہو چکا تھا۔ یہ کوئی خواب نہیں جیتی جاگتی حقیقت تھی۔ میں اسے دیکھ سکتا تھا محسوس کرسکتا تھا اس سے نجات حاصل کرسکتا تھا۔ ''کیا یہ تین انچ کا بونا کوئی ماورائی کردار ہے؟'' یہ سوچتے ہی خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے میں چند لمحے ساکت کھڑا اس ماورائی کردار سے ڈرتا رہا پھر بکریوں کو ہانکتا ہوا آگے بڑھا۔

وہ بونا اب آلتی پالتی مار کر میرے کندھے پر اس طرح بیٹھ چکا تھا جیسے وہ میرا کندھا نہیں اس کے باپ کی جاگیر ہو۔ میں نے نظریں گھما کر دیکھا وہ خبیث میری بدحواسی پر مسکرا رہا تھا۔ میں اس بونے کو دیکھ سکتا تھا محسوس کرسکتا تھا مگر نہ ہی اسے پکڑ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے اوپر سے اتار سکتا تھا عجیب بات تو یہ تھی کہ میں سخت خوف زدہ ہو چکا تھا یہ بڑی سنگین صورتحال تھی جو کہ میں کسی کو اس بونے کے بارے میں بتا بھی نہیں سکتا تھا سننے والا یا تو مجھے پاگل سمجھتا یا دیوانہ۔

پھر میں نے سوچا ہوسکتا ہے کہ جیسے میں اس منحوس بونے کو دیکھ سکتا ہوں۔ اسے دوسرے بھی تو دیکھ لیں گے۔ یہ سوچتے ہی میں مطمئن ہوگیا میں گھر جا کر ماں کو یہ بات بتا سکتا تھا وہ کسی پیر فقیر سے بات کر کے مجھے اس پراسرار نادیدہ وجود سے نجات دلا سکتی تھیں یہ سوچتے ہی میں مطمئن ہوگیا میں گھر پہنچنے کے لئے تیز تیز چلنے لگا ابھی میں چند قدم ہی چلا تھا کہ مجھے کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور میں گرتے گرتے بچا۔

یہ نریندر تھا ٹھاکر جے چند کا بیٹا ہر ایک سے بلاوجہ الجھنا اور لڑائی جھگڑا اس کی فطرت تھی گاؤں کے لوگ بالخصوص غریب اور نچلی ذات والے ان دونوں باپ بیٹے سے کتراتے تھے۔ دونوں متعصب باپ بیٹا مسلمانوں سے تو خاص طور پر بیر رکھتے تھے جے چند گاؤں کا مکھیا اور دولت مند شخص تھا اس وقت وہ راستے میں درخت سے ٹیک لگائے اور پاؤں پسارے بیٹھا تھا میں اپنے خیالات میں گم تھا اس لئے راستے پر دھیان نہ دے سکا۔ اور اس کی ٹانگ سے ٹھوکر لگنے کے باعث لڑکھڑا گیا تھا۔

وہ غضب ناک ہوکر اٹھا اور پھر میری طرف انگلی تان کر بولا۔ ''ملیچھ آنکھیں ہیں کہ بٹن دیکھ کر نہیں چل سکتا۔''

میں نے نظریں جھکا کر کہا۔'' نریندر بابو ناراض نہ ہوں، میں اپنے خیالات میں مگن یہاں سے گزر رہا تھا اس لئے آپ کو دیکھ نہ سکا۔'' میں معذرت

کر کے آگے بڑھا ہی تھا کہ اس نے مجھے گریبان سے پکڑ لیا اور گالیاں بکنے لگا۔

اسی وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے کندھے پر موجود بونا کسمسا رہا ہو۔ میں نے سر گھما کر دیکھا۔ بونا کسی چھپکلی کی طرح میری گردن سے چپک چکا تھا اس کے چھوٹے چھوٹے بازو میری گردن سے لپٹے ہوئے تھے پھر پہلی بار اس کی آواز مجھے سنائی دی۔ اس کی آواز کسی بچے کی طرح تھی وہ کہہ رہا تھا۔ ''اس خبیث کی بکواس سننے کی ضرورت نہیں اس کا منہ توڑ دو، یہ نہیں کر سکتے تو اس کا گلا دبا دو۔''

ادھر نریندر کا اشتعال بڑھتا جا رہا تھا وہ گالیاں بکتے ہوئے بولا۔ ''ادھر ادھر کس باپ کو ڈھونڈ رہے ہو۔ ذلیل انسان اس کے ساتھ ہی اس نے میرے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا۔

غالباً وہ بونا اسے نہیں دکھائی دے رہا تھا اور نہ ہی اسے بونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ''شاہ زین یہ کمینہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' اس کی آواز مسلسل میرے دماغ میں گونج رہی تھی نہ تو میں ایسا کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی میرا ایسا کوئی ارادہ تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود میرا ہاتھ گھوما اور میں نے زوردار گھونسہ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑایا میں نے اس کے چہرے پر حیرت اور بے یقینی کے تاثرات دیکھے میرا دماغ میرے کنٹرول میں نہیں تھا یقیناً یہ سب بونے کی ماورائی قوت کا کمال تھا۔ میں نے خود کو زمین پر جھک کر ایک بڑا سا پتھر اٹھاتے دیکھا اور پھر وہی پتھر نریندر کی کنپٹی پر دے مارا تو وہ بے اختیار دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر گرا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہو گیا۔ اس کے سر سے بھل بھل خون بہہ کر مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔

پھر میں نے بونے کو غائب ہوتا دیکھا۔ میرے اوسان خطا ہو چکے تھے اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا گھبراہٹ کے مارے میرے ہاتھ اور پاؤں کانپ رہے تھے یہ زندگی میں میرے ہاتھوں پہلا غیر ارادی قتل تھا۔ بلاشبہ یہ سب اس منحوس بونے کی کارستانی تھی جو اس وقت میرے دماغ پر قابض ہو گیا تھا۔

میں پاگلوں کی طرح بھاگا اور اپنے گھر جا کر دم لیا۔ گھبراہٹ میں مجھے یہ بھی ہوش نہ رہا تھا کہ میرے ساتھ لوگوں کی بکریاں بھی ہیں۔ خیریت گزری کہ ماں اور بہن اپنے کمرے میں تھے۔ میں جاتے ہی اپنے کمرے میں گھسا اور چارپائی پر لیٹ کر لحاف اوڑھ لیا۔

دسمبر کا مہینہ تھا سخت سردی کے باوجود مجھے پسینے آ رہے تھے۔ میں سخت خوف زدہ تھا اور دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ پتہ نہیں پتھر لگنے کے بعد نریندر زندہ بھی تھا یا نہیں۔ کیا پتہ وہ مر گیا ہو کیوں کہ بھاگنے سے پہلے میں نے اس کے جسم کو بے حس و حرکت ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن اگر وہ بچ گیا تو میری خیر نہیں تھی اس کا باپ کوئی معمولی انسان نہیں تھا مجھے سولی پر چڑھا دیا جاتا۔ میں ان ہی سوچوں میں غلطاں خوف سے لرزتا جا رہا تھا پریشانی اور ڈر سے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔

چند گھنٹوں بعد مجھے اپنے سینے پر کچھ رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہی منحوس بونا تھا۔ ''خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔'' میں رو دینے والے انداز میں بولا۔

وہ اپنے چھوٹے چھوٹے پاؤں پر چلتا ہوا میری گردن پر آ کر بیٹھ گیا۔ ''مجھ سے بات کرنے کے لئے تمہارا بولنا ضروری نہیں میں انسانی سوچوں تک کو پڑھ لیتا ہوں تم دل ہی دل میں جو بولو گے میں سن لوں گا۔ ویسے بھی رات کے اس پہر تمہارے گھر والوں نے تمہیں بولتے ہوئے سنا تو تمہیں پاگل سمجھنے لگیں گے۔'' اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''تم کون ہو؟ اور آخر مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' میں نے اس بار اسے دل میں مخاطب کیا۔

''میں منچو ہوں۔ اس کرہ ارض میں انگنت مخلوقات ہیں ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جن کے

بارے میں انسان کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں بھی ایک ایسا ہی ماورائی وجود ہوں سادھو جگدیش نے کٹھن جاپ کرکے مجھے حاصل کیا تھا۔اور پھر وہ مجھے تمہیں دان کرنے والا تھا۔ مگر تم نے انکار کردیا وہ تمہارے بے لوث انسانیت کے جذبے سے بہت متاثر تھا۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ اس کے انتم سنسکار کے بعد میں تمہارے پاس چلا جاؤں اور تمہارا خیال رکھوں۔ اس طرح میں تم تک آ گیا اب یہ سمجھ لو کہ میں تمہارا دوست بھی ہوں اور غلام بھی اور سنو نریندر کی وجہ سے مت ڈرو وہ اب اس سنسار میں نہیں۔ اس کی آتما پرلوک سدھار گئی ہے۔ اس کے قتل میں تمہارا نام آنا تو دور کی بات ہے کوئی تمہارے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

اس کی باتیں سن کر میرے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے۔''تم میرا پیچھا نہیں چھوڑ سکتے خدا کے لئے چلے جاؤ مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔''

منچو ٹہلتے ہوئے میرے بیٹھنے پر آیا اور سر کے نیچے اپنا دایاں بازو رکھ کر لیٹ گیا پھر بولا۔''یہ ممکن ہے ویسے تم اتنا گھبرا کیوں رہے ہو میں تمہارے بہت سے مشکل کاموں میں تمہارے کام آ سکتا ہوں۔ آنے والے وقت میں تم مجھ پر ناز کروگے۔''

میں نے جھنجلا کر اسے ہاتھ سے دھکیلنے کی کوشش کی مگر مجھے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی اور میرا ہاتھ ہوا میں لہرا کر رہ گیا۔ منچو تین انچ کا بونا پراسرار ماورائی وجود جو کوئی ٹھوس جسم نہ رکھتا تھا۔ وہ مجھ پر اپنا تسلط جما چکا تھا۔ اب نہ جانے آگے کیا ہوتا یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا تھا۔

بہرحال کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند نہیں آرہی تھی بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے اتنی ہمت نہ تھی کہ اٹھ کر رسوئی کا رخ کرتا۔ جہاں یقیناً ماں نے میرے کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ رکھا تھا۔ شاید وہ بھی میری کیفیت بھانپ چکا تھا۔ وہ انگڑائی لے کر اٹھا اپنا دایاں ہاتھ فضاء میں گھمایا۔ اگلا ہی لمحہ حیرت انگیز تھا۔ میرے قریب مختلف اقسام کے پھلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میں نے بمشکل چند سیب کھائے اور دیگر پھل گھر والوں کے لئے سنبھال کر رکھ دیئے۔ پیٹ بھرنے کے بعد میں بے سدھ ہو کر بیٹھ گیا۔

اب میری منچو سے دوستی ہو چکی تھی، میرا ڈر اور خوف ختم ہو چکا تھا، ہم اکثر دل کھول کر ایک دوسرے سے باتیں کرتے مجھے کسی بھی قسم کی چیز کی ضرورت ہوتی۔ تو منچو کو اشارہ کرنے کی دیر تھی۔ وہ چیز فوراً ہی میری دسترس میں آجاتی۔

ایک روز میں منچو سے پوچھا۔''کیا میرے علاوہ کوئی بھی تمہیں نہیں دیکھ سکتا۔''

''مجھے صرف گیانی اور شکتی شالی منش ہی دیکھ سکتا ہے اور پھر وہ شخص دیکھ سکتا ہے جس کے جسم پر میں موجود ہوتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

دوسری صبح نریندر کی خون آلود لاش دیکھ کر گاؤں میں کہرام مچ گیا پولیس میں رپورٹ درج کروادی گئی لیکن نریندر کا قاتل نہیں پکڑا گیا۔ اور پکڑا بھی کیسے جاتا قتل میرے ہاتھوں ہوا تھا مگر قاتل منچو تھا۔

جے پال متعصب پولیس آفیسر تھا اس نے بڑی پھرتی دکھائی اچھوت گھرانوں اور مسلمانوں کو تنگ کیا مار پیٹ مگر سب لاحاصل رہا۔ نریندر کے قاتل کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ میں نے بکریاں چرانے کا کام چھوڑ دیا تھا۔

منچو کی بدولت روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ ہر وقت میری جیبیں بھری رہتیں۔

ایک روز میں جنگل میں گھومتے پھرتے دور نکل گیا۔ اتفاق سے اس وقت منچو میرے ساتھ موجود نہ تھا کبھی کبھار وہ چند گھنٹوں کے لئے غائب ہو جایا کرتا تھا اس نے بھی کبھی نہیں بتایا کہ کہاں جاتا ہے اور نہ ہی میں نے پوچھنا ضروری سمجھا ہاں البتہ ایسے وقت میں جب میں اسے پکارتا تو وہ فوراً حاضر ہو جاتا۔

چلتے چلتے میں اچانک ٹھٹھک کر رک گیا کچھ فاصلے پر ایک ننگ دھڑنگ سادھو ایک طرف آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا سادھو کے جسم پر بھبھوت ملا ہوا تھا۔

اور سامنے ایک حسین وجمیل لڑکی پڑی تھی جس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے وہ کسمسا رہی تھی اور غوں غوں کی آوازیں نکال رہی تھی۔

غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر باندھ دیا گیا ہے قریب ہی ایک ترشول پڑا تھا۔ کچھ فاصلے پر لکڑیوں کا ڈھیر چتا کی لکڑیوں کی طرح بچھا ہوا تھا جیسے شمشان گھاٹ میں مردے کے لئے لکڑیاں بچھا کر چتا تیار کی جاتی ہے۔ میں دم سادھے اس سادھو کی طرف دیکھ رہا تھا جو نہ جانے آنکھیں بند کئے کون سا منتر پڑھ رہا تھا۔

میں خاموشی سے سادھو کی پشت پر جا پہنچا اور ایک طرف جا کر کھڑا ہوگیا۔ دراصل میں دیکھنا چاہتا تھا کہ سادھو کا مقصد کیا ہے۔ پھر کچھ دیر بعد وہ اپنی جگہ سے ہلا ترشول اٹھایا لڑکی کے قریب پہنچ کر ترشول والا ہاتھ سر سے بلند کر کے اشلوک پڑھنے لگا وہ اپنے عمل میں اس قدر مگن تھا کہ میں جو اس کی پشت پر کچھ ہی فاصلے پر موجود تھا اسے میری موجودگی کا احساس تک نہ ہوا بظاہر یہی لگ رہا تھا وہ اپنے کسی مکروہ عمل کی تکمیل کے لئے اس لڑکی کی جان لینا چاہتا ہے۔

میں نے لمحہ بھر میں فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اس لڑکی کو بچاؤں گا۔ لیکن کیسے یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ برق سرعت سے نیچے پڑا ایک نوکیلا پتھر اٹھایا اس سے پہلے کہ اس خبیث سادھو کا ترشول والا ہاتھ جنبش کرتا۔ میں نے بسم اللہ پڑھ کر پتھر اس کی طرف پھینکا پتھر سیدھا اس کے سر پر لگا اور وہ لہولہان ہو کر گرا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔

اچانک مجھے اپنے دائیں کندھے پر بوجھ محسوس ہوا۔ سر گھما کر دیکھا تو منچو بیٹھا مجھے متوحش نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ''یہ کون تھا؟ اور کیا کر رہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ کالے جادو کا ماہر پرتاب بھوش ہے۔ جو اپنی شکتیوں میں اضافے اور ماورائی قوتوں کو قبضے میں کرنے کے لئے اس لڑکی کی بلی دے رہا تھا۔ یہ کوئی معمولی پجاری نہیں بہت ہی شکتی شالی ہے اور تمہارے لئے یہ بہتر ہوا کہ پتھر لگنے سے اس کا عمل رائیگاں ہوگیا اور یہ بے ہوش ہوگیا۔ اب یہ ہوش میں آتے ہی تمہارے لئے مصیبت کھڑی کردے گا۔ بہتر یہی ہے کہ جلدی سے یہاں سے نکل چلو۔'' منچو کو میں نے پہلی بار اس قدر ہراساں دیکھا تھا۔

میں آگے بڑھا لڑکی کے ہاتھ پاؤں کھولے۔ اور منہ سے کپڑا نکال دیا وہ اب سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ''گھبراؤ مت اب یہ شیطان تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ مگر تم کون ہو؟ اور اس کے ہتھے کیسے چڑھیں؟'' اس نے آنکھیں بند کیں پھر گہرے گہرے سانس لے کر تازہ ہوا پھیپھڑوں میں اتار کر ہراساں لہجے میں بولی۔ ''پر تو تم کون ہو؟''

''میں شاہ زین ہوں جنگل کے ساتھ والے گاؤں کا باسی۔''

''میں سونیتا ہوں ٹھاکر جے چند کی بیٹی اپنے گھر کے ساتھ باغ میں ٹہل رہی تھی کہ اچانک یہ کھشش نمودار ہوا اور نہ جانے مجھ پر کیا جادو کیا کہ مجھے ہوش نہیں رہا۔ اور پھر ہوش آیا تو خود کو یہاں بندھا ہوا پایا۔

راستے میں چلتے ہوئے میں نے اسے بتایا کہ پرتاب بھوش اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتا تھا میں اسے اس کے گھر کے قریب چھوڑ کر چلا گیا۔

اس کے بعد چند بار پھر میری ملاقات سونیتا سے ہوئی۔

وہ مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی پلکیں لرزنے لگ جاتی تھیں۔

ایک روز میں نے اسے سر راہ حال دل کہہ ڈالا۔ یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ آگ دونوں طرف لگی ہوئی تھی۔ لیکن ہم دونوں کو سونیتا کے پتا جے چند کا بھی خوف تھا۔ اس لئے ہم ملاقاتوں میں احتیاط برتا کرتے تھے۔ ہم ملتے وقت ایک دوسرے سے مناسب فاصلہ رکھتے

پیاس

عالیہ توصیف



اس کی پچھلی ساری زندگی ایک فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔ وہ کیا تھی اور کیا ہوگئی ہے گھر سے گھر تک کے سفر میں وہ پاتال کیسے پہنچ گئی۔

یاسیت اس کی روح میں اتر گئی تھی۔ وہ جس تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی اس کا نتیجہ منہ کے بل گرنے کی صورت میں ہی نکلنا تھا۔ وہ بھی ایسے ہی گری تھی۔ رخت سفر سے پہلے منزل کا تعین کرنے کے باوجود اگر وہ حاصل نہ ہو تو انسان موت تک پیاسا ہی رہتا ہے، سفر کے آغاز پر وہ دریا کی پیاسی تھی اور اختتام پر سمندر کی پیاسی ہے، چھوٹے مدار سے نکل کر بڑے کی مسافر بن گئی تھی، اس کی طلب بدل گئی تھی۔ اور ایسے حالات میں سمندر بھی پیاس نہیں بجھا سکتا، لب دریا بھی زبان پیاسی ہی رہتی ہے۔

قیمت -/200 روپے

تھے۔ سونیتا دین اسلام سے پہلے ہی متاثر تھی کچھ میں بھی اسے سمجھاتا رہا اور پھر ایک روز اس نے مسلمان ہونے کی خواہش ظاہر کردی اور میں نے اسے کلمہ پڑھایا۔ مجھے اس کے مسلمان ہوجانے سے بہت خوشی تھی۔

☆......☆......☆

کچھ دنوں بعد جب میں اپنے کمرے میں سورہا تھا۔ نصف شب کے قریب کسی کی لرزہ خیز چیخ سے میری آنکھ کھل گئی چیخنے کی آواز ماں جی کے کمرے سے آئی تھی۔ میرے سینے پر سویا ہوا منچو بھی جاگ چکا تھا اسی وقت ایک دوسری چیخ سنائی دی میں آواز پہچان گیا یہ آواز میری بہن کی تھی میں دوڑتا ہوا ان کے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔

اچانک دروازہ کھلا اور تو ایک نوفٹ کے قریب عجیب الخلقت عفریت باہر نکلا اس کے ہاتھ اور پاؤں کے پنجے ریچھ سے مشابہ تھے۔ اور وہ انسانوں کی طرح تن کر کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر ریچھ ہی کی طرح لمبے اور گھنے بال تھے ناک کی جگہ سوراخ اور ناخنوں کے ناخن درانتی کی مانند لمبے اور مڑے ہوئے تھے جن سے خون ٹپک رہا تھا میں ششدر کھڑا اس بلا کو دیکھ رہا تھا مجھ میں ہلنے جلنے کی سکت نہ تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے زمین نے میرے پاؤں پکڑلئے ہوں۔ پھر اس عفریت نے دھاڑتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ منچو نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی سے عفریت کی طرف اشارہ کیا عفریت چیختا ہوا گرا اور ساکت ہوگیا۔ اور پھر میری آنکھوں نے ایک اور ناقابل یقین منظر دیکھا۔

عفریت کی جسیم لاش خودبخود غائب ہوگئی۔ میں دھڑکتے دل سے ماں جی کے کمرے میں داخل ہوا تو میرا دل جیسے اچھل کر میرے حلق میں آگیا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔ ماں جی اور میری بہن کی ادھڑی ہوئی خونچکاں لاشیں فرش پر پڑی تھیں۔ کمرے کا فرش ان دونوں کے خون سے سرخ ہورہا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح اپنے سر کے بال نوچنے لگا اور چیختے چلاتے ہوئے رورہا تھا مجھے کچھ ہوش ہی نہ رہا تھا اس عفریت نے میری دنیا اجاڑ دی تھی۔

گاؤں والے بھی ان کی لاشیں دیکھ کر ششدر رہ گئے تھے ان دونوں کو سپرد خاک کردیا گیا میں ہروقت گم صم سا گھر میں پڑا رہتا۔ نہ کھانے کا ہوش تھا اور نہ پینے کا تیسرے چوتھے روز جبکہ میں کمرے میں اداس لیٹا تھا تین انچ کا منچو میرے سینے پر کھڑا تھا۔

اچانک اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''شاہ زین وہ عفریت پرتاب بھوش کا غلام تھا اور اس نے اس عفریت کو تم سب کو ختم کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ تمہاری ماں اور بہن کے بعد وہ عفریت تمہیں بھی مارنا چاہتا تھا کہ میری مداخلت سے اس کا انت ہوگیا۔ اور لاش غائب ہوکر پرتاب بھوش کے پاس چلی گئی۔ میں نے تم پہلے بھی بتایا تھا کہ وہ بہت خطرناک پجاری ہے۔ وہ میرے بارے میں بھی جان چکا ہے۔ اب تمہاری جان کو پہلے سے بھی زیادہ خطرہ ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم اس علاقے سے کہیں بہت دور چلے جاؤ اور اپنے دھرم کے کسی مہاپرش سے ملو۔ ہوسکتا ہے وہ اس کا کوئی اپائے بتائے۔''

''اب میں جی کر بھی کیا کروں گا مرنے دو مجھے۔'' میں اکتائے ہوئے انداز میں بولا۔

مگر منچو مجھے قائل کرنے کی کوششوں میں لگا رہا بالآخر اس نے مجھے منالیا۔

دوسرے روز میں صبح سویرے گھر سے نکلا اور ایک طرف چل دیا۔ منچو بدستور میرے کندھے پر موجود تھا میں چلتے ہوئے آخری بار اپنے گاؤں اپنے علاقے کو مڑمڑ کر بار بار حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک میرے سامنے سونیتا آگئی۔ ''کہاں جارہے ہو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے پہلی بار اسے اپنی روداد سنا ڈالی وہ حیرت اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات سے میری سرگزشت سنتی رہی پھر بولی۔ ''شاہ زین ہمارا جینا مرنا ساتھ ہے جئیں گے تو ساتھ اور مریں گے تو ساتھ، میں

بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔''
میں نے اسے سمجھانا چاہا مگر وہ نہ مانی مجبور ہو کر میں نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔
سرِ شام ہی ہم دونوں اس برفانی پہاڑ پر پہنچ چکے تھے کہ اچانک منجو مضطرب نظر آنے لگا۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے اسے دل میں مخاطب کیا۔
''شاہ زین تم دونوں خطرے میں ہو۔ پرتاب بھوش سونیتا کے پتا جے چند اور گاؤں کے بہت سے مسلح افراد کے ساتھ یہاں پہنچنے والا ہے۔ سب اس بات پر مشتعل ہیں کہ تم ہندو لڑکی کو ساتھ لے کر بھاگ گئے، سونیتا کی وجہ سے ہندو برادری تمہارے خلاف پرتاب بھوش کے ساتھ متحد ہو چکی ہے۔''
کچھ دیر بعد اس کی بات کی تصدیق ہوگئی۔ اچانک شور و غل کی آوازیں آنے لگیں مڑ کر دیکھا تو ششدر رہ گئے یہ گاؤں کے درجنوں افراد تھے۔ جن کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں لاٹھیاں اور بندوقیں تھیں سب سے آگے جے چند اور پرتاب بھوش تھے۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر بھاگنے لگے دشمنوں کا غول بھی چیختے چلاتے ہوئے ہمارے پیچھے تھا۔
اچانک پے در پے چند فائر ہوئے۔ سونیتا کربناک انداز میں چیخی اور نیچے گر کر تڑپنے لگی۔ سونیتا میں چیختا ہوا اس سے لپٹ گیا مگر اس کا جسم بے حس و حرکت ہو چکا تھا اب جینے کی تمنا بھلا کسے رہی تھی۔ میں کھڑا ہو گیا اور غضب ناک نگاہوں سے شیطانوں کی اس ٹولی کی طرف دیکھا۔ جو میری طرف دوڑتے ہوئے آرہے تھے جبکہ میں مرنے کے لئے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر چکا تھا۔
اچانک تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ اور ہر طرف دھند سی چھا گئی۔ اور میں ہوش و خرد سے محروم ہو گیا مجھے جب ہوش آیا تو میں اسی غار میں پڑا تھا۔ میرے قریب ہی سفید داڑھی والے بابا جی بیٹھے تھے۔
''بابا جی انہوں نے سونیتا کو مار ڈالا اب میں بھی جینا نہیں چاہتا۔'' میں سسکتے ہوئے اٹھا۔

''سنو شاہ زین ہر انسان اپنی باری میں اس دنیا سے جاتا ہے۔ نہ ہی کوئی وقت آنے پر موت سے بچ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی وقت سے پہلے مر سکتا ہے اور وہ لڑکی جو تمہارے ساتھ تھی کلمہ پڑھ چکی تھی اس کا نام عائشہ رکھا گیا تھا اسے سپردِ خاک کر دیا گیا ہے ہر انسان کی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ اپنی آئندہ زندگی اللہ کی عبادت میں بسر کرو۔ ضرورت مندوں کے کام آؤ۔ انسانیت کی خدمت کرو تاکہ تمہارے نیک اعمال کا پلڑا بھاری ہو۔ دنیا کی زندگی ویسے بھی مختصر ہے۔ ہمیشہ کی زندگی کے لئے تیاری کرو۔'' بابا کے سمجھانے کا انداز بہت ہی دل نشین تھا۔
''بابا جی منجو کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''وہ بونا یہاں نہیں آسکتا بلکہ اس غار میں کوئی بھی ماورائی قوت داخل نہیں ہو سکتی۔''
میرے شب و روز اسی غار میں بسر ہونے لگے۔ میں بابا حسین سے علم دین حاصل کرنے لگا میں ہر وقت عبادت میں مشغول رہتا۔
ایک روز انہوں نے مجھے ایک خنجر دیا اور پنڈلی سے باندھنے کا حکم دیا پھر ایک شربت کا گلاس میری طرف بڑھایا جسے میں نے ایک ہی گھونٹ میں پی لیا۔
بابا حسین نے کہا۔ ''انسان بہت کچھ سوچتا ہے اپنی ذہنی بساط کے مطابق اور مستقبل کی بے شمار منصوبہ بندیاں کرتا ہے لیکن ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ کچھ دیر بعد تم سو جاؤ گے میری بات دھیان سے سنو۔
اس غار میں سونا اور جواہرات موجود ہیں جو اس قدر بیش قیمت ہیں کہ کوئی انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا جب تم جاگو گے تو میں تمہیں نہیں ملوں گا اور اس غار میں تمہیں دو لڑکے اور ایک لڑکی ملے گی تم یہ خنجر ان میں سے ایک کے لڑکے کے حوالے کر دو گے اس لڑکے کے نام کا پہلا حرف س سے ہوگا۔''
انہوں نے ایک تیز دھار خنجر مجھے دے دیا۔ پھر کہنے لگے۔ ''دوسرے روز اسی غار میں محمد الیاس نامی

بزرگ آئیں گے تم ان کی امانت یہ خزانہ ان کے حوالے کردو گے وہ اس خزانے کو اصل حق داروں تک پہنچانے کا انتظام کریں گے۔ اور آئندہ بھی تم انہی سے ہدایات لوگے اور دینی تعلیم حاصل کرو گے اور ایک بات کا دھیان رکھنا۔ بنا کسی تفریق کے وقت پڑنے پر تم ہر مصیبت زدہ انسان کی مدد کرنے کی کوشش کرو گے خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔''

شاہ زین یہاں تک کہنے کے بعد رکا تابوت تک گیا اندر ہاتھ ڈال کر خنجر نکالا اور سمن کے ہاتھ میں تھما دیا ''تم نے اپنا نام سمن بتایا تھا تمہارے نام کا پہلا حرف س سے آتا ہے اپنی امانت سنبھالو۔''

سمن نے اس سے خنجر لیا اور اپنی پنڈلی سے باندھنے لگا۔

''پھر کیا ہوا؟'' بریرہ نے بے صبری سے پوچھا۔

وہ شاہ زین سے متاثر نظر آرہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔

پھر بزرگ نے سورہ کہف پڑھنا شروع کی۔ تلاوت سنتے سنتے مجھ پر غنودگی چھانے لگی تھی اور پھر میں سوگیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں اس غار میں پڑے تابوت میں لیٹا تھا۔ اور تم تینوں میرے سامنے تھے۔'' شاہ زین نے اپنی روداد مکمل کی۔

''گویا یہ سب ٹرنک خزانے سے بھرے ہوئے ہیں۔'' سمن نے پوچھا۔

''کیا آپ ہمیں یہ خزانہ دکھا سکتے ہیں؟'' عدنان بولا۔ اس کے لہجے میں اب شاہ زین کے لئے احترام تھا۔

''نہیں یہ جن کی امانت ہے وہی اس کے تالے بھی کھول سکتے ہیں۔'' شاہ زین نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''یار بھوک لگ رہی ہے کھانا تو نکالو ویسے بھی شاہ زین کی الف لیلوی داستان حیات سنتے سنتے رات ہوگئی ہے۔'' عدنان نے کہا اور بریرہ نے کھانے کے سیل بند ڈبے نکالے کھانے کے بعد انہوں نے تھرماس سے چائے نکال کر پی اور پھر کمبل اوڑھ کر سوگئے۔

صبح سمن نے فجر کی نماز پڑھنے کے بعد سب کو جگایا۔ اور نماز پڑھنے کی تاکید کی ناشتہ کرنے کے بعد سمن نے شاہ زین کو بھی ساتھ چلنے کو کہا تو اس نے انکار کردیا اور بولا۔ ''میں بابا محمد الیاس کا انتظار کروں گا اور زندگی رہی تو انشاء اللہ ضرور ملوں گا۔''

وہ شاہ زین سے رخصت ہوکر غار سے نکلے ہی تھے کہ گڑگڑاہٹ کی زوردار آواز سنائی دی مڑ کر دیکھا تو غار کے دہانے کا نام ونشان تک نہ تھا۔ جہاں پہلے غار تھا وہاں اب چٹان موجود تھی۔

''حیرت انگیز اگر یہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے نہ ہوا ہوتا تو ہمیں یقین نہ آتا ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔'' سمن نے کہا، اب وہ باتیں کرتے ہوئے واپسی کے لئے قدم بڑھا رہے تھے۔ اس برفانی پہاڑ کے راستے کافی دشوار تھے ویسے بھی اس پہاڑ پر برفانی طوفان اور تودوں کے گرنے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا تھا۔ اس سے پہلے بھی اس پہاڑ پر ان کا برفانی تودہ سے واسطہ پڑ چکا تھا اس لئے وہ اپنا سفر محتاط انداز میں کر رہے تھے۔ یونہی چلتے رہے وہ اس برفانی پہاڑ سے ہوتے ہوئے ایک دیہی علاقے میں پہنچے وہاں سے مسافر بس کے ذریعے ایک سرسبز پہاڑی علاقے میں پہنچے تو شام ہوچکی تھی انہوں نے وہیں رات گزارنے کا فیصلہ کیا اور کسی مناسب جگہ یا سرائے کی تلاش میں پیدل چلنے لگے۔

ابھی وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ اچانک انہیں تین رائفل بردار افراد نے گھیر لیا وہ شکل وصورت اور لباس سے مقامی دکھائی دیتے تھے۔ ''کون ہو تم؟ اور کیا چاہتے ہو؟'' سمن نے پوچھا۔

''فی الحال تو اپنے بیگ اور اگر اسلحہ ہے تمہارے پاس تو ہمارے حوالے کردو آگے چل کر یہ بھی بتادیں گے کہ ہم تم سے کیا چاہتے ہیں۔'' ان میں سے ایک نے کرخت لہجے میں کہا۔

''دیکھو ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ تم لے لو اور

ہمیں جانے دو۔‘‘ عدنان نے انہیں پیشکش کی وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ لٹیرے ہیں اس قسم کے بے ضمیر افراد ہر جگہ ہوتے ہیں جو ذرا سی مزاحمت پر راہ گیروں کو جان سے بھی مارنے سے دریغ نہیں کرتے۔

ان میں سے ایک آگے بڑھا اور رائفل کی نال عدنان کی پیشانی سے لگادی۔ ’’اب خاموش رہنا ورنہ بھیجا اڑادوں گا۔‘‘ وہ سفاک لہجے میں غرایا۔

انہیں ان کے سامان سے محروم کردیا گیا جامہ تلاشی میں صرف ۔۔۔ن کے لباس میں سے پسٹل نکلا جسے انہوں نے قبضہ میں لے لیا لیکن وہ اس کی پنڈلی سے بندھے خنجر تک رسائی نہ حاصل کرسکے، انہوں نے ویسے بھی ان کی باریک بینی سے تلاشی نہ لی تھی ۔۔۔ن کا پسٹل لائسنس یافتہ تھا۔ جو اس نے حفاظت کی غرض سے لے رکھا تھا وہ مارشل آرٹ کا ماہر بھی تھا۔ اس نے سیلف ڈیفنس کی باقاعدہ تربیت بھی حاصل کررکھی تھی۔ اس کے والد پاکستان آرمی میں حاضر سروس کرنل تھے اور وہ اپنے والدین کا اکلوتا اور لاڈلہ بیٹا تھا۔ اس لئے بھی اس کی غیر نصابی سرگرمیوں پر پابندی نہیں تھی ۔۔۔ن جانتا تھا کہ اس وقت مزاحمت بیکار ہے جدید اسلحہ کے سامنے مارشل آرٹ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے اور پھر یہ ایک دیہی علاقہ تھا جہاں شام ہوتے ہی سناٹا چھا جاتا تھا کسی مقامی فرد کا راستے میں ملنا محض اتفاق ہی ہوسکتا تھا۔

وہ انہیں گن پوائنٹ پر لئے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کا یہ سفر ایک پرانی عمارت کے سامنے اختیار پذیر ہوا۔ یہ کوئی پرانے زمانے کا ریسٹ ہاؤس تھا۔ جسے ان غنڈوں نے اپنی غیر قانونی سرگرمیوں کا مرکز بنا رکھا تھا۔ ریسٹ ہاؤس گرد وغبار اور جالوں سے اٹا ہوا تھا ایک دو جگہ ان کا سامنا پھڑ پھڑاتی ہوئی چمگادڑوں سے بھی ہوا۔ جو اپنے مسکن میں انسانوں کو آتا دیکھ کر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اڑ گئیں۔

ان تینوں کو گرد آلود فرش پر بیٹھا دیا گیا۔ جبکہ تینوں رائفل بردار ان کی طرف رائفلیں تانے کھڑے رہے۔

۔۔۔ن سوچ رہا تھا کہ یہ لٹیرے ان سے سامان اور نقد رقم تو چھین ہی چکے ہیں پھر انہیں یہاں لانے کا کیا مقصد ہے؟ پھر اسے اپنے اس سوال کا جواب بھی مل ہی گیا۔

ان میں سے ایک آگے بڑھا اور بریرہ کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے جانے لگا۔ ’’اسے چھوڑدو‘‘ ۔۔۔ن اور عدنان نے مزاحم ہونا چاہا مگر ان کی کنپٹیوں سے رائفلوں کی نال آ لگی۔ جبکہ ان کا ساتھی چیختی چلاتی بریرہ کو کمرے سے باہر لے گیا۔ ان دونوں کا خون غصے سے کھول رہا تھا۔ خاص کر عدنان کی حالت بہت بری تھی بریرہ اس کی کزن تھی اور اس کی ذمہ داری پر گھر سے باہر نکلی تھی وہ جانتا تھا کہ بریرہ کو اگر کوئی نقصان پہنچا تو اس کے والد ابرار احمد اور بریرہ کے دونوں بھائی عدنان کو زندہ درگور کردیں گے یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ ان تین رائفل برداروں کے سامنے بے بس تھے۔

ابھی بریرہ کو گئے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اس غنڈے کی کربناک چیخ سنائی دی جو بریرہ کو کمرے سے باہر لے گیا تھا۔ اس کے فوراً بعد ہی بریرہ کی چیخ بھی ان کی سماعت سے ٹکرائی۔ ’’یہ کیا ہوا؟‘‘ بریرہ کا ایک ساتھی حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

اس وقت بریرہ چیختی چلاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور ’’عفریت عفریت‘‘ کہتی ہوئی لہراتی ہوئی گری اور بے ہوش ہوگئی۔ عدنان اسے جھنجھوڑ کر ہوش میں لانے لگا۔ جبکہ ان میں سے ایک رائفل لہراتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک طویل قامت دیوہیکل عفریت دروازے سے اندر داخل ہوا اس عفریت کے جسم پر ریچھ کی طرح لمبے اور گھنے بال تھے۔ ہاتھ اور پاؤں ریچھ کے پنجوں سے مشابہ تھے۔ ہاتھوں کے ناخن درانتی کی طرح لمبے اور مڑے ہوئے تھے۔ اس کے منہ اور دانتوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ وہ ششدر کھڑے اس عفریت کو دیکھ رہے تھے۔ شاہ زین

نے بھی اپنی سرگزشت میں ایک ایسی ہی داستان سنائی تھی۔ جس میں اس قسم کے عفریت جیسی بلا کا ذکر تھا لیکن شاہ زین کے بقول وہ عفریت تو مر چکا تھا۔ پھر دوسرا اس قسم کا عفریت کہاں سے آیا؟

خوف کے ساتھ ساتھ سمن کے ذہن میں یہ سوال بھی تھا کہ عفریت کے حلق سے لرزہ خیز چیخ بلند ہوئی اور اس نے دروازے کے قریب کھڑے ایک بدمعاش کو گردن سے پکڑ کر کسی کھلونے کی طرح اٹھالیا اور دوسرے ہاتھ کے ناخنوں سے اس کا سینہ ادھیڑ ڈالا، بدمعاش کی آخری چیخیں کربناک تھیں، کمرے کا فرش اس کے خون سے رنگین ہونے لگا۔

اپنے ساتھی کا عبرتناک انجام دیکھ کر بچ جانے والا بدمعاش ہوش میں آگیا اور سمن اور عدنان کو بھول کر رائفل کا رخ اس عفریت کی طرف کرکے ٹریگر دبادیا۔ تڑتڑاہٹ کی گونج دار آواز سے گولیاں اس بلا کے جسم میں پیوست ہوگئیں یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں خوف سے پھٹنے لگیں کہ گولیوں سے بننے والے عفریت کے جسم کے زخم تیزی سے بھر رہے تھے۔

پھر عفریت نے لاش دیوار پر دے ماری اور رائفل بردار کو کھلونے کی طرح دبوچ کر وہ عفریت چشم زدن میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

بریرہ ہوش میں آچکی تھی، ڈر اور خوف سے خزاں رسیدہ پتے کی طرح وہ کانپ رہی تھی۔ عدنان اور سمن کی حالت بھی اس سے کم مختلف نہ تھی۔ وہ دونوں بھی ڈرے اور سہمے ہوئے تھے اس خونی بلا نے ان کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے تینوں بدمعاشوں کو پل بھر میں زندگی سے محروم کردیا تھا۔ سمن نے کچھ دیر بعد کمرے میں پڑی ایک رائفل عدنان کو تھمائی اور دوسری رائفل خود سمن نے اٹھالی۔ بریرہ نے بھی اس کے اشارے پر کوریڈور میں پڑی لاش کے قریب سے رائفل اٹھالی تھی۔ ”جلدی یہاں سے نکل چلو۔ یہ نہ ہو کہ اس بار وہ بلا ہم تینوں کو مار ڈالے۔“ سمن نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ تینوں دوڑتے ہوئے ریسٹ ہاؤس سے باہر نکلے اور کچھ دیر بعد قریب کی آبادی میں داخل ہوگئے، عدنان سمن کے اشارے پر قریبی مکان کا دروازہ بجانے لگا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر مضبوط جسم شخص نے باہر جھانکا۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں دیکھ کر وہ چونک گیا اور اپنے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سمن نے تیزی سے کہا۔ ”سر ہم ڈاکو نہیں۔ ایک دیوہیکل عفریت ہمارے پیچھے ہے، ہمیں پناہ چاہئے۔“

ادھیڑ عمر شخص نے کچھ دیر سوچنے کے بعد انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ انہیں لئے ہوئے ایک بڑے کمرے میں داخل ہوا کمرے میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ”بیٹھو“ ادھیڑ عمر شخص نے کہا اور سمن اور عدنان ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ جبکہ بریرہ دوسری چارپائی پر جا بیٹھی۔

”اب بتاؤ کیا ہوا تمہارے ساتھ؟“ ادھیڑ عمر شخص نے پوچھا وہ اب تک کھڑا تھا۔ شاید ان کی طرف سے مشکوک تھا۔ ویسے بھی طویل مسافت اور بھاگ دوڑ سے ان کے حلئے مشکوک ہوچکے تھے۔ سمن نے تفصیل سے اسے اب تک پیش آنے والے واقعات سنا ڈالے جسے وہ حیرت اور دلچسپی سے سنتا رہا۔

اپنی روداد کے اختتام پر سمن نے کہا۔ ”یہ وہی خطرناک عفریت لگتا ہے جسے شاہ زین نے سو سال پہلے مار ڈالا تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ پھر یہ عفریت زندہ کیسے ہوگیا؟“

ادھیڑ عمر شخص نے جیب سے سگریٹ نکالا اور سلگا کر بولا۔ ”میں ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر راحیل احمد ہوں۔ اس سے پہلے میں شہر میں تھا ریٹائرمنٹ کے بعد گاؤں آگیا بیوی کا پچھلے سال انتقال ہوچکا ہے اور صرف ایک ہی بیٹی ہے۔“ وہ اپنا تعارف کرواکر گہرا کر کا سگریٹ کا کش لگایا اور بولا۔ ”وہ خونی بلا جس کے بارے میں تم لوگوں نے بتایا ہے میرا بھی اس سے واسطہ پڑچکا ہے۔ یہ بلا چند ماہ پہلے یہاں وارد ہوئی

ہے۔ اس دوران کئی لوگ اس کا شکار ہوگئے، یہ عفریت اپنے شکار کو ساتھ ہی لے جاتا ہے پھر کوئی پتہ نہیں چلتا کہ وہ شخص کہاں گیا اور اس پر کیا گزری۔ گولیاں اس پر بے اثر ہیں۔''

ابھی وہ باتیں کرہی رہے تھے کہ باہر سے ایک دلکش نسوانی آواز سنائی دی۔''پاپا رات کے اس پہر آپ کس سے باتیں کررہے ہیں؟'' پھر وہ لڑکی جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی، سمان بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ وہ دیوانوں کی طرح اس لڑکی کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس حسین چہرے کو کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ ابرش تھی۔ کالج میں اس کی کلاس فیلو جسے دیکھتے ہی وہ دل ہار بیٹھا تھا اس نے ابرش کی آنکھوں میں بھی ان دنوں اپنے لئے پسندیدگی بھانپ لی تھی۔ لیکن اظہار محبت کی نوبت آنے سے پہلے ہی وہ اچانک غائب ہوگئی۔

کلاس فیلوز نے بتایا کہ وہ گاؤں چلی گئی ہے اس کی یہ کیفیت اپنے ساتھیوں اور راحیل احمد سے مخفی نہ رہ سکی۔ عدنان نے کھنکارا تو سمان ہوش میں آگیا راحیل احمد کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ کر وہ شرمندہ ہوگیا۔''سوری سر! دراصل ابرش میری کلاس فیلو رہ چکی ہے۔ اس لئے انہیں اچانک یہاں اپنے سامنے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔''

اس کی وضاحت سے راحیل احمد کے چہرے کے تاثرات نارمل ہوگئے۔''ابرش بیٹا ان کے لئے چائے بنالاؤ۔'' راحیل احمد نے کہا اور ابرش کمرے سے باہر نکل گئی۔

چائے پینے کے بعد بریرہ ابرش کے کمرے میں چلی گئی۔ جبکہ سمان اور عدنان اسی کمرے میں لیٹ گئے۔ خوف کے مارے عدنان کو نیند نہیں آرہی تھی۔ جبکہ سمان کی نیند تو ابرش کو دیکھتے ہی اڑ چکی تھی۔

صبح ناشتہ کرنے کے بعد انہوں نے طے کیا کہ اس عفریت کی تلاش میں نکلیں گے جو انتہائی بے رحمی سے انسانی زندگیوں کو نگل رہا تھا۔ راحیل احمد بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔ راحیل احمد، عدنان اور سمان جب پہاڑی جنگل میں داخل ہوئے تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں وہی رائفلیں موجود تھیں جو انہوں نے ریسٹ ہاؤس سے اٹھائی تھیں۔

سمان آتشیں اسلحہ کے استعمال میں مہارت رکھتا تھا جبکہ عدنان کو بھی انہوں نے کسی حد تک رائفل چلانا سکھا دیا تھا۔ وہ جنگل میں چلتے ہوئے ایک آبشار کے قریب پہنچے جو بہتی ہوئی پچاس فٹ نیچے دریا میں گر رہی تھی۔ چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی اور ارد گرد گھنے درخت تھے۔

اچانک ایک درخت کی آڑ سے وہ عفریت نکلا تو ان تینوں نے لاک پن ہٹائی اور ٹریگر دبا دیئے۔ تڑتڑاہٹ کی آواز کے ساتھ کئی گولیاں اس عفریت کے جسم کے مختلف حصوں میں لگیں۔ مگر اس کے باوجود جب وہ عفریت ان کے پیچھے دھاڑتا ہوا دوڑا۔ تو وہ جان بچانے کے لئے واپس بھاگے عدنان ان دونوں سے پیچھے تھا پھر انہوں نے دوڑتے ہوئے عدنان کی چیخ سنی تو مڑ کر دیکھا وہ عفریت عدنان کو ٹانگوں سے پکڑ کر الٹا لٹکائے ایک درخت کے تنے پر مار رہا تھا۔

سمان اور راحیل احمد رکے مڑ کر عفریت کے

روشن صرف سارے

☆ نماز پڑھا کرو اس سے پہلے کہ تمہاری نماز پڑھی جائے۔

☆ تجربہ سب سے بڑا اور بہترین استاد ہے۔

☆ کچھ ایسی خواہش نہ کرو جو زندگی میں پوری نہ ہوسکے۔

☆ غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہیں۔

☆ کسی سوال کا جواب معلوم نہ ہو تو لاعلمی کا اظہار کردینا نصف علم بہتر ہے۔

(عثمان غنی۔ پشاور)

سر کا نشانہ لے کر گولی چلا دی دونوں گولیاں اس عفریت کی پیشانی میں لگیں انہوں نے اپنی آنکھوں سے عفریت کی کھوپڑی کو چٹختے دیکھا۔ لیکن اسکے باوجود جب عفریت نے دھاڑتے ان کی طرف جست لگائی تو وہ بھاگنے کے لئے مڑے ہی تھے کہ عفریت نے راحیل احمد کو دبوچ لیا۔ اور اسے اٹھائے ہوئے نشیب میں دوڑنے لگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ عفریت راحیل احمد کو دبوچے پچاس فٹ نیچے دریا میں چھلانگ لگا چکا تھا۔

جب ...ن دریا کے کنارے پہنچا تو عفریت کا نام ونشان نہ تھا۔ وہ اپنے دو ساتھیوں کو کھو کر گھر پہنچا، یہ جانتے ہی کہ راحیل احمد عدنان سمیت عفریت کا شکار ہو چکا ہے۔

ابرش شدت غم سے پاگل ہوگئی اور سسک پڑی۔ روتی ہوئی بریرہ بھی جب اسے سنبھالنے میں ناکام رہی تو ...ن آگے بڑھا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر مخاطب ہوا۔ ''ابرش حوصلہ رکھو میں وعدہ کرتا ہوں چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے میں اس عفریت کو ختم کرکے دم لوں گا۔'' اس کے لہجے میں چٹانوں کا سا عزم تھا۔

علاقے میں سخت خوف وہراس پھیل گیا تھا۔ اور یہ خدشہ ظاہر کیا جارہا تھا کہ کہیں یہ عفریت دوسرے علاقوں کا بھی رخ نہ کرلے، پولیس کمانڈوز جدید اسلحہ سے لیس اس علاقے میں چاروں طرف پھیل گئے لیکن وہ عفریت دوبارہ نہ ہی کسی کو نظر آیا اور نہ ہی اسے کوئی ڈھونڈ سکا، دس بارہ روز وہ بڑی سرگرمی سے اس عفریت کو ڈھونڈتے رہے۔ مگر انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تب یہ فرض کرلیا گیا کہ وہ عفریت یہ علاقہ چھوڑ چکا ہے۔

پھر ایک روز اس گاؤں کی ایک لڑکی رضوانہ رات کو سوتے ہوئے گھر سے غائب ہوگئی ایک بار پھر پولیس کی دوڑیں لگ گئیں ...ن صبح ہوتے ہی پولیس کے جوانوں کے ساتھ اس عفریت کو ڈھونڈنے نکل جاتا اور رات گئے گھر لوٹتا۔

ایک روز جب وہ معمول کے مطابق جنگل میں عفریت کی تلاش میں گیا ہوا تھا، ادھر بریرہ اور ابرش گھر سے باہر کے درختوں کے درمیان ٹہلتے ہوئے محو گفتگو تھیں کہ اچانک ایک طرف سے وہ دیو ہیکل عفریت نمودار ہوا تو وہ دونوں چیخیں اور جان بچانے کے لئے ایک طرف دوڑیں۔ بھاگتے ہوئے ابرش راہ میں آنے والے پتھر سے ٹھوکر لگنے کے باعث گری اس کے اٹھتے اٹھتے عفریت اس تک پہنچ چکا تھا۔ عفریت نے اسے اپنے پنجوں میں دبوچ کر کندھے پر ڈالا تو وہ بے ہوش ہو چکی تھی وہ عفریت ابرش کو اٹھائے ہوئے جنگل سے ہوتا ہوا دریا میں کودا اور کسی ماہر تیراک کی طرح تیرتا ہوا دوسرے کنارے پر پہنچا اور بھاگتا ہوا دور دراز ایک عمارت میں داخل ہو گیا عمارت کی عقبی سمت جاکر وہ ایک کنویں کی منڈیر پر جا چڑھا اور اندر کود گیا۔ اتنی بلندی سے کودنے کے باوجود بھی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

وہ اطمینان سے چلتا ہوا ایک کمرے میں جا پہنچا۔ یہاں بھی خلا تھا۔ خلا میں بیس فٹ نیچے ایک ہال نما کمرہ نظر آرہا تھا جس میں درجنوں انسانی جسم کٹے پھٹے ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے۔ اس نے ابرش کو اٹھا کر نیچے ہال نما کمرے میں لاشوں کے ڈھیر پر پھینکا اور چند لمحے اس کے بے حس وحرکت جسم کو دیکھتا رہا پھر مڑ کر ایک طرف چل دیا۔

ادھر ابرش کو ہوش آیا تو خود کو لاشوں کے ڈھیر پر پڑے پایا اس ہال نما کمرے میں درجنوں انسانی لاشیں پڑی تھیں کچھ لاشیں صحیح سلامت تھیں اور بہت سی کٹی پھٹی تھیں۔ کمرہ انسانی خون سے سرخ ہو رہا تھا وہ خود بھی خون میں لت پت ہو چکی تھی ڈر اور خوف سے اس کا برا حال تھا لیکن پھر بھی اس نے چیخنے کی حماقت نہیں کی ویسے بھی اس عفریت کے ہتھے چڑھ جانے کے باوجود بھی اس کا اب تک زندہ رہنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ لاشوں کی بدبو اور بساندا تنی

زیادہ تھی کہ اسے الٹی آنے لگی۔ بڑی مشکل سے خود
پر قابو رکھتے ہوئے سرکتی ہوئی لاشوں کے ڈھیر سے
اتر کر فرش پر کھڑی ہوگئی اور اردگرد کا جائزہ لینے
لگی۔ اس ہال نما کمرے کوئی کھڑکی یا دروازہ نہیں تھا
اوپر چھت کی طرف دیکھتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق
میں آ گیا چھت میں خلا تھا لیکن چھت کی بلندی بھی کم
از کم بیس فٹ تھی اور اوپر چڑھنے کے لئے کسی بھی قسم
کی رسی یا سیڑھی نہ تھی وہ مایوس ہو کر گھٹنوں میں سر دے
کر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد اچانک کسی کے کراہنے کی آواز
سنائی دی وہ چونک کر اٹھی ایک طرف اٹھارہ انیس سالہ
لڑکی لاشوں کے قریب پڑی کراہ رہی تھی گویا یہاں زندہ
انسانی وجود بھی موجود تھا۔ یہ سوچتے ہی اس کی رکی ہوئی
سانسیں بحال ہوگئیں اور وہ اس لڑکی کے پاس جا بیٹھی۔
وہ بھی اسے دیکھ چکی تھی وہ لڑکی رضوانہ تھی جو چند روز قبل
گھر سے اچانک غائب ہوگئی تھی۔ ''ابرش تم؟'' اس
کے منہ سے بے اختیار نکلا پھر قدرے توقف سے سرگوشی
نما آواز میں بولی۔

''ادھر میرے قریب آ کر لیٹ جاؤ۔''

ابرش اس کے برابر جا کر لیٹ گئی ''سنو! نہ ہی
اٹھنے کی کوشش کرنا اور نہ ہی بولنے کی حماقت کرنا ورنہ
ہم دونوں ماری جائیں گی۔ جو بھی بات کرنی ہو سرگوشی
میں کرو۔'' رضوانہ نے دوبارہ سرگوشی کی۔

''یہ بلا ان لاشوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے
؟'' ابرش نے پوچھا۔

''مجھے یہ عفریت چند دن پہلے اٹھا کر لے آیا تھا
۔ یہ انسان کو زندہ یا مردہ اس تہہ خانے میں پھینک دیتا
ہے اور جب جی چاہتا ہے یہیں بیٹھ کر انسانی گوشت
سے پیٹ بھرتا ہے۔ ان چند دنوں میں، میں نے اتنے
خوف ناک مناظر دیکھے ہیں کہ ڈر کے مارے میرے
دل کی دھڑکن رکتے رکتے رہ گئی۔'' رضوانہ نے جواب
دیا اور ہانپنے لگی وہ واقعی باہمت لڑکی تھی جو پچھلے چند دنوں
سے ان لاشوں کے درمیان اتنے خوف ناک ماحول میں
بھوکی پیاسی زندگی کی بقاء کی جنگ لڑ رہی تھی۔

ابھی وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں کہ
اوپر سے آہٹ سی سنائی دی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے
کوئی بھاری بھرکم جانور چل رہا ہو۔ دونوں دم
سادھے ساکت پڑی رہیں اور آنکھیں بند کرلیں۔
ابرش نے معمولی سے پپوٹے وا کئے اور خلا کی طرف
دیکھا وہ جسیم غیر انسانی مخلوق اندر جھانک رہی تھی۔
پھر وہ عفریت تہہ خانے میں کودا اور ان کے قریب سے
گزرتا ہوا آگے بڑھا، کچھ دور پڑی ایک لڑکے کی
لاش کا بازو پکڑ کر عفریت نے زور سے کھینچ کر اوپر کیا
اور کھانے لگا۔

ابرش خوف کے مارے خزاں رسیدہ پتے کی
طرح لرزنے لگی۔ وہ تو ان کی قسمت اچھی تھی کہ عفریت
کی پشت ان کی طرف تھی۔

قریب تھا کہ ابرش خوف سے چیخ
پڑتی۔ رضوانہ نے غیر محسوس انداز میں ابرش کے
ہونٹوں پر اپنی دائیں ہتھیلی جما کر اس کا چہرہ اپنی طرف
موڑ دیا۔ تاکہ وہ اس بھیانک منظر کو دوبارہ نہ دیکھ
سکے۔ گوشت اور ہڈیاں چبانے کی آواز انہیں دہشت
میں مبتلا کر رہی تھی خوف کے مارے وہ پسینے پسینے
ہوگئیں زندگی کی جو امید قائم تھی وہ دم توڑنے لگی وہ یہ
سوچ کر ہی لرز رہی تھیں کہ عنقریب یہ بلا ان کے
جسموں کو بھی اسی طرح چیر پھاڑ کر کھا رہی ہوگی۔
عفریت کچھ دیر اس لاش سے پیٹ بھرتا رہا۔ پھر اٹھا
اور ان کے قریب پہنچ کر چند لمحوں کے لئے رکا اور ان کی
طرف دیکھتا رہا۔ ان دونوں نے ڈر کے مارے سانس
تک روک لی تھی چند لمحے وہیں رکے رہنے کے بعد اس
عفریت نے بندر کی طرح چھلانگ لگائی اور ناقابل
یقین انداز میں خلا کے پار چھت پر پہنچ گیا اور وہ دونوں
سوچنے لگیں آخر کب تک اس عفریت سے بچی رہیں
گی۔ یہاں سے فرار مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔

آج یا کل کبھی نہ کبھی انہیں اس خوف ناک
عفریت کی خوراک بن جانا تھا۔ اور پھر کچھ کھائے پیے

بغیر وہ کب تک زندہ رہ سکتی تھیں۔ دن تو کسی نہ کسی طرح گزر گیا لیکن رات کا مہیب سناٹا پھیلتے ہی ان کے خوف میں مزید اضافہ ہوگیا گھپ اندھیرے کے باعث کچھ دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا ان دونوں کو ایسا لگ رہا تھا کہ ان درجنوں لاشوں میں سے کوئی مردہ اٹھ کر ابھی انہیں دبوچ لے گا۔ ان کے خوف کا اندازہ وہی انسان لگا سکتا ہے جس نے کسی تنہا کمرے میں کسی مردے کے ساتھ رات گزاری ہو اور یہاں ایک دو نہیں درجنوں کٹی پھٹی انسانی لاشیں موجود تھیں اور پھر اس عفریت کا خوف الگ تھا۔ وہ کافی دیر تک ایک دوسرے سے جڑی بیٹھی رہیں۔

ابرش جب سے اس تہہ خانے میں ہوش میں آئی تھی۔ اس وقت سے ہی مسلسل یہاں سے نکلنے کی ترکیبیں سوچ رہی تھی۔ بالآخر اس نے ایک منصوبہ بنا ہی لیا ترکیب اگرچہ مشکل محنت طلب تھی اور کامیابی کے امکانات بھی ففٹی ففٹی تھے اس کے باوجود بھی رضوانہ ترکیب سنتے ہی تیار ہوگئی گہرے پانی میں ڈوبنے والا اس وقت تک ہاتھ پیر ضرور چلاتا ہے جب تک اس کی سانسوں کا تسلسل برقرار رہتا ہے وہ بھی زندگی بچانے کے لئے جدوجہد کر رہی تھیں اور مل کر ایک ایک کر کے لاشیں اٹھا کر خلا کے نیچے ایک دوسرے کے اوپر رکھتی جا رہی تھیں تہہ در تہہ درجنوں لاشوں کو اٹھا کر خلا کے نیچے رکھنے میں دو تین گھنٹے صرف ہوگئے لیکن وہ تھکن سے چور چور ہو چکی تھیں گرتے پڑتے کوشش کر کے وہ لاشوں کے ڈھیر پر کھڑی ہوگئیں اب بھی فاصلہ کم از کم دس فٹ تھا۔

ابرش کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔ ”تم میرے کندھے پر پاؤں جما کر کھڑی ہو جاؤ اور اچک کر خلاء سے نکلنے کی کوشش کرو۔“

دبلی پتلی رضوانہ ابھی ابرش کے کندھے پر چڑھنے کی کوشش کر ہی رہی تھی کہ اچانک اوپر دھپ کی آواز سنائی دی اور خلاء میں دو آنکھیں چمکتی دکھائی دیں۔

دونوں خوف کے مارے ادھر ادھر گر پڑیں گرتے گرتے باوجود انتہائی کوشش کے رضوانہ چیخ پڑی اور اس کے ساتھ ہی وہ عفریت اوپر سے لاشوں کے ڈھیر پر کودا۔ ابرش نیچے گرتے ہی سمٹ کر لیٹ گئی جبکہ رضوانہ اٹھ کر ایک طرف بھاگی اور راہ میں حائل ایک لاش سے ٹکرا کر گر پڑی۔

عفریت غراتے ہوئے دوڑا اور چیختی چلاتی رضوانہ کو دبوچ لیا اس کی بلی کی طرح چمکتی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھیں پھر اس نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے درانتی نما ناخنوں سے رضوانہ کا سینہ ادھیڑ ڈالا رضوانہ کے حلق سے نکلنے والی آخری چیخیں لرزہ خیز تھیں پھر اس عفریت نے رضوانہ کی لاش ایک طرف پھینکی اور ابرش کی طرف بڑھا، عفریت کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر ابرش کی گھگھی بندھ گئی اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اٹھ کر بھاگتی اس کے وجود میں سے جیسے خوف کے باعث جان نکل چکی تھی وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس عفریت کو اپنی طرف بڑھتا دیکھتی رہی اور پھر اس عفریت نے اسے دبوچ لیا اور تہہ خانہ ابرش کی چیخوں سے گونج اٹھا۔

☆......☆......☆

ادھر سمن کو جب پتہ چلا کہ عفریت ابرش کو اٹھا کر لے گیا ہے تو اس کے پاؤں تلے سے جیسے زمین سرک گئی وہ الٹے پاؤں دوڑتا ہوا ابرش کے گھر پہنچا بریرہ نے روتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ گھر سے باہر درختوں کے پاس موجود تھیں کہ اچانک عفریت وہاں آ پہنچا اور بھاگتے ہوئے اچانک گرنے والی ابرش کو اٹھا کر چشم زدن میں غائب ہوگیا۔

ابرش کا دکھ پورے گاؤں کو تھا لیکن سمن کے تو جیسے دل و دماغ میں آگ لگی ہوئی تھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں پکڑ کر دبوچ لیا ہو، وہ ابرش کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ اس عفریت کے ہاتھوں شکار ہونے والے انسان کی لاش بھی نہیں ملتی وہ لوگوں کے منع کرنے کے باوجود اسی وقت عفریت کی

تلاش میں نکل کھڑا ہوا وہ جنگل میں عفریت کو ڈھونڈتا ہوا دریا تک جا پہنچا کیوں کہ اس سے پہلے وہ راحیل احمد کی لاش کو لے کر عفریت کو دریا میں کودتا دیکھ چکا تھا وہ دریا کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا پل پر پہنچا ہی تھا کہ اس نے دریا کی دوسری طرف موجود اس عفریت کو دیکھ لیا۔ اس نے شانے سے رائفل اتارنے کی حماقت نہیں کی کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ گولیاں اس عفریت پر بے اثر ہیں۔ اس نے سوچا بہتر یہی ہے کہ عفریت کا خاموشی سے پیچھا کر کے اس کے ٹھکانے تک پہنچے اس نے جھکے جھکے انداز میں پل پار کیا۔

عفریت کا تعاقب کرنے کے لئے اسے دوڑنا پڑ رہا تھا دریا سے کافی فاصلے پر عفریت ایک مکان کے دروازے پر لمحہ بھر کے لئے رکا اور پھر آگے بڑھ گیا وہ عفریت کا پیچھا کرتے ہوئے اس کے مکان کے قریب سے گزرا تو مکان پر نصب بورڈ پر اس کی نظر پڑی جس پر لکھا تھا ڈاکٹر انور کلینک آگے ڈگریوں کی تفصیل درج تھی وہ سوچنے لگا۔ ''یہ کون خبطی ڈاکٹر ہے۔ جس نے اس ویرانے میں کلینک کھول رکھا ہے۔'' لیکن یہ وقت ان باتوں پر غور و فکر کرنے کا نہیں تھا وہ اس عفریت کا پیچھا کر کے اس کا ٹھکانہ دیکھنا چاہتا تھا۔

چلتے چلتے وہ عفریت رکا اور مڑ کر دیکھا اس پر نظر پڑتے ہی عفریت کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ ---ن نے شانے سے رائفل اتار کر عفریت کا نشانہ لیا اور لگاتار دو فائر کئے عفریت کے جسم کو جھٹکا سا لگا مگر وہ پھر بھی غراتے ہوئے ---ن کی طرف بڑھا۔ ---ن نے ایک بار پھر ٹریگر دبایا مگر کھٹ کی مخصوص آواز ابھری اس نے جھنجلا کر رائفل ایک طرف پھینکی اور اپنی جگہ پر تن کر کھڑا ہو گیا عفریت کی آنکھوں میں بھی شاید حیرت تھی کہ یہ انسان اس سے ڈر کر بھاگنے کے بجائے تن کر کیوں کھڑا ہے۔

انسانی جذبات سے عاری وہ عفریت یہ نہیں جانتا تھا کہ موت سے شرط لگا کر خندق پھلانگنے والے خندق کی گہرائی اور چوڑائی نہیں ناپتے وہ غراتا ہوا ---ن کی طرف بڑھا وہ اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر نکال کر ہاتھ میں لے چکا تھا۔ ادھر عفریت نے دھاڑتے ہوئے اسے ایک ہاتھ سے کسی کھلونے کی طرح اٹھالیا اور دوسرے ہاتھ کے ناخنوں سے اس کا سینہ ادھیڑنا چاہا۔

مگر ---ن نے چشم زدن میں خنجر عفریت کے گلے میں اتار دیا۔ عفریت دھاڑتا ہوا پشت کے بل گرا اس کے گلے سے خون بہنے لگا تھا لیکن گرتے گرتے بھی عفریت کے ناخن اسے زخمی کر چکے تھے ---ن نے عفریت کے گرتے ہی اس کے گلے میں پیوست خنجر نکالا اور پے در پے کئی وار اس کے سینے پر کرنے کے بعد خنجر دوبارہ پنڈلی سے باندھ کر وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور نفرت سے اس عفریت کے ساکت جسم کو دیکھنے لگا۔ جس نے ابرش کو اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا تھا۔

اچانک عفریت کے جسم میں تحریک پیدا ہوئی اس کے جسم کے زخم تیزی سے بھر رہے تھے۔

---ن ششدر رہ گیا اور مڑ کر تیزی سے بھاگا عفریت غراتا ہوا اٹھا اور اپنے شکار کے پیچھے دوڑا وہ کلینک والی عمارت کے سامنے سے گزرنے لگا تو دروازہ کھلا دیکھ کر اندر جا گھسا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا عفریت اسے اس عمارت میں گھستا دیکھ کر واپس مڑ گیا۔

ایک کمرے میں روشنی دیکھ کر ---ن اندر داخل ہوا سامنے صوفے پر ایک پینتیس سالہ شخص بیٹھا تھا۔ ---ن کو زخمی دیکھ کر وہ بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''کیا ہوا تمہیں اور یہ زخم کیسے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ کسی نے تمہیں ناخنوں سے بری طرح نوچا کھسوٹا ہے۔''

''سر! میری اس خونی عفریت سے مڈبھیڑ ہوئی تھی بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔'' ---ن نے جواب دیا اور ڈاکٹر کے اشارے پر صوفے پر بیٹھ گیا اور مختصر الفاظ میں اسے اپنی روداد سنا ڈالی۔

ڈاکٹر چند قدم پیچھے ہٹا اور خوف زدہ نظروں سے ---ن کو دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا؟'' ---ن نے استعجاب آمیز حیرت

سے پوچھا۔

''تمہاری زندگی خطرے میں ہے اس عفریت کے ناخن زہریلے ہوتے ہیں اور یہ زہر آہستہ آہستہ انسان پر اثر انداز ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر باتیں کرنے کے دوران اس کے زخموں پر مرہم کر کے انجکشن بھی لگا چکا تھا۔

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' سمن نے پوچھا۔

''گھبراؤ مت کچھ دیر کی بات ہے پھر تمہیں سکون مل جائے گا۔'' ڈاکٹر انور معنی خیز لہجے میں بولا۔

اچانک سمن کو چکر آنے لگے اور پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ اسے ڈاکٹر کی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اس نے گھبرا کر اٹھنا چاہا مگر دوبارہ صوفے پر گر پڑا اور ڈوبتے ہوئے لہجے میں بولا۔'' یہ مم...... مجھے کیا ہو رہا ہے؟''

ڈاکٹر ہنسا۔'' میں نے تمہیں خواب آور انجکشن لگا دیا ہے۔ تم پہلے باہمت انسان ہو جو اس عفریت سے ٹکرانے کی غلطی کرنے کے باوجود زندہ بچ نکلے لیکن اب نہیں بچو گے وہ عفریت ہماری تخلیق اور خواب ہے۔''

سمن کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا گویا وہ نادانستگی میں اس جنونی ڈاکٹر کے ہتھے جا چڑھا تھا۔

ادھر ڈاکٹر ہذیانی انداز میں بولتا چلا جا رہا تھا۔'' اب میں تمہیں اسی عفریت کے حوالے کر دوں گا۔''

اچانک دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔'' کون ہو سکتا ہے؟'' ڈاکٹر انور بڑبڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ سمن خواب آور انجکشن کے زیر اثر ڈوبتے ہوئے ذہن سے سوچ رہا تھا گویا ڈاکٹر انور کا اس عفریت کے ساتھ کوئی نہ کوئی لنک ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ایک بار اگر وہ بے ہوش ہو گیا تو پھر یہ خبیث ڈاکٹر یا تو اسے عفریت کے حوالے کر دے گا یا پھر جان سے مار ڈالے گا اسے جو کچھ کرنا تھا فوراً ہی کرنا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ بے اختیار پنڈلی کی جانب رینگ گیا خنجر کا دستہ ہاتھ میں تھام کر اس نے خنجر نکالا اور بڑی مشکل سے بائیں بازو پر خنجر کی دھار لا کر چرکا لگایا، اس کے اس اقدام کا خاطر خواہ اثر ہوا تکلیف کی شدت سے اس کی بند ہوتی آنکھیں کھلنے لگیں اور خواب آور انجکشن کے اثرات اس کے اعصاب پر سے زائل ہونے لگے۔

اسی وقت اس نے کمرے کی طرف آتے قدموں کی چاپ سن کر خنجر والا ہاتھ بائیں پہلو کے نیچے رکھ دیا۔ اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

ڈاکٹر انور چلتا ہوا اس کے قریب آیا ہی تھا کہ سمن برقی سرعت سے اچھلا، ڈاکٹر انور کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سمن کا زوردار گھونسہ اس کے جبڑے پر پڑا اور وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑایا اس کے سنبھلنے سے پہلے سمن ایک پاؤں کی ایڑی پر گھوما اور ڈاکٹر انور کی کنپٹی پر کک رسید کی اس بار انور کراہتا ہوا گرا سمن نے جست لگائی اور اس کی گردن اپنے دائیں بازو کی گرفت میں لے کر تیز دھار خنجر اس کی شہ رگ پر رکھ دیا اور پوچھا۔'' دروازے پر کون تھا؟''

گاؤں کا ایک شخص تھا جس کا بھائی بیمار تھا میں نے اسے دروازے پر ہی میڈیسن دے کر ٹال دیا۔'' ڈاکٹر بھنچی ہوئی آواز میں بولا۔

سمن نے اس کی گردن پر مضبوطی سے لاک لگانے کے ساتھ خنجر کا دباؤ اس قدر سخت رکھا ہوا تھا کہ ڈاکٹر کی گردن سے خون کے چند قطرے ٹپک پڑے تھے جس سے وہ ہراساں ہو چکا تھا وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ذرا سی بھی مزاحمت کی تو سمن اس کا نرخرہ کاٹ ڈالے گا۔

''اب بتاؤ عفریت کا ٹھکانہ کہاں ہے اور اصل چکر کیا ہے؟ کیوں کہ تمہاری باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ تمہارے اس عفریت سے لنک ہیں اور ہاں جھوٹ بولنے کی کوشش مت کرنا ورنہ جان سے جاؤ گے۔'' وہ سفاک لہجے میں بولا۔

''یہ سب مہاراج پرتاب بھوش کا کمال ہے کچھ عرصہ پہلے انڈیا میں میری ملاقات مہاراج پرتاب سے ہوئی تھی میں اس سے متاثر ہو کر اسے اپنے ساتھ پاکستان لے آیا یہاں جنگل میں اس عفریت کی لاش ملی پرتاب کے بتانے پر کہ وہ اسے زندہ کر کے اپنا تابع

کر سکتا ہے میں نے اس کا ساتھ دینے کی حامی بھرلی۔ سزائے موت کے ایک قیدی بالا کو جیل سے نکالنے کے بعد پرتاب بھوش نے جادو کے منتر سے اس عفریت کو زندہ کردیا۔ اب وہ عفریت ہمارے اشاروں پر چلتا ہے اور پرتاب کا غلام ہے۔''

''پرتاب بھوش کہاں ہے؟'' سمن نے پوچھا۔

''وہ ایک جاپ کے لئے کہیں دور گیا ہوا ہے۔''

سمن نے خنجر ڈاکٹر کی شہ رگ سے ہٹادیا ویسے بھی ڈاکٹر زیر ہوچکا تھا اور اس کے ساتھ تعاون کررہا تھا۔ ''اس عفریت پر کوئی بھی ہتھیار اثر نہیں کرتا اس کا کیا راز ہے اور اس کا ٹھکانہ کہاں ہے؟'' سمن نے پوچھا اور بے خیالی میں دو قدم پیچھے ہٹا اور یہی اس کے حق میں بہتر ثابت ہوا سرکی آواز کے ساتھ ایک خنجر سرسراتا ہوا آیا اور سمن کے قریب سے گزرتا ہوا سامنے دیوار سے جاٹکرایا۔

سمن نے جست لگائی اور رول کرتا ہوا صوفے کی پشت پر جاپہنچا، اسی وقت ایک دوسرا خنجر سنناتا ہوا آیا اور اس جگہ سے گزر کر دیوار سے جاٹکرایا۔ جہاں چند لمحے پہلے سمن موجود تھا۔ بساط کا رخ پلٹتا دیکھ کر ڈاکٹر نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل گیا۔

سمن پھرتی سے اٹھا تو اسے ایک سایہ دکھائی دیا۔ وہ کمرے کی کھڑکی کے قریب کھڑا تھا جس کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ سمن باہر کی طرف بھاگا وہ چھ فٹ سے نکلتا ہوا کسرتی بدن کا شخص تھا جو بیرونی دروازے سے باہر نکل چکا تھا شاید ڈاکٹر دیہاتی کو رخصت کرنے کے بعد بیرونی دروازہ مقفل کرنا بھول گیا تھا۔ اس لئے وہ شخص باآسانی گھر میں داخل ہوگیا اور سمن کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ یہ شخص یقیناً بالا ہوگا ڈاکٹر کو ڈھونڈنے سے بہتر ہے بالا کو قابو کیا جائے۔ یہ سوچتے ہی وہ اس شخص کے پیچھے دوڑا۔

بالا اسی راستے پر دوڑ رہا تھا جہاں اس نے عفریت کا پیچھا کیا تھا پھر وہ آگے پیچھے بھاگتے ہوئے وہیں سے گزرے جہاں سمن اور عفریت کے درمیان معرکہ ہوا تھا وہ دونوں ہی دوڑتے وقت محتاط تھے۔

رات کافی بیت چکی تھی اندھیرے میں اس پہاڑی علاقے میں دوڑنا مشکل کام تھا۔ بھاگتے بھاگتے بالا درختوں کے ایک جھنڈ میں جا گھسا۔ سمن جب درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوا تو بالا گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا۔

☆......☆......☆

ادھر ابرش کو جیسے ہی عفریت نے دبوچا وہ ڈر اور خوف سے چیخ پڑی۔ عفریت نے اس کا جسم ادھیڑنے کے لئے اپنے درانتی نما ناخن آگے بڑھائے ہی تھے کہ خلا میں سے کسی نے چلا کر کہا۔ ''رک جاؤ۔''

حیرت انگیز طور پر عفریت نے اپنے ہاتھ روک دیئے۔ پھر کسی نے رسی کی سیڑھی اندر لٹکائی اور نیچے اترنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ موجود تھی۔ نیچے اتر کر اس نے ٹارچ کی روشنی سے ابرش کا جائزہ لیا۔ اور عفریت کو حکم دیا۔ ''اب تم جاؤ۔''

عفریت نے سدھائے ہوئے جانور کی طرح سر جھکایا۔ اور رسی کی سیڑھی چڑھتا ہوا تہہ خانے سے باہر نکل گیا۔

دراز قد اور ورزشی جسم کے مالک سیاہ چہرے والے اس شخص کے چہرے پر موجود چیچک کے پرانے داغ اسے مزید خوفناک بنا رہے تھے اس کی انگاروں کی مانند دہکتی آنکھوں میں خوشی تھی۔ ''کک کون ہو تم؟'' ڈری سہمی ابرش نے پوچھا۔

''مجھے بالا کہتے ہیں۔ تم نے دیکھا کیسے اس عفریت نے میرا حکم مانا۔'' وہ بولتے ہوئے اس کے قریب آگیا۔

''میرے قریب مت آنا۔'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

''کیوں کیا تم نے اپنے اوپر ٹیکس لگا رکھا ہے۔'' وہ خبیثانہ انداز میں ہنسا۔ اور ہاں تمہارا شاید کوئی رشتے دار یا جاننے والا ہے جو عفریت کو تلاش

کرتا پھر رہا ہے جلد ہی وہ بھی عفریت کے ہاتھوں مارا جائے گا وہ بے وقوف سمجھتا ہے کہ عفریت کو مارنا آسان کام ہے لیکن وہ شاید یہ نہیں جانتا کہ اس عفریت پر کسی بھی قسم کا ہتھیار اثر نہیں کرتا کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ عفریت کی جان میرے اندر ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں اسے کوئی نہیں مار سکتا اور اب تم زیادہ نخرے مت دکھاؤ اور راضی خوشی میری بات مان لو ورنہ مجھے زبردستی کرنا پڑے گی۔'' وہ ابرش کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''نن، نہیں..... خدا کے لئے مجھے جانے دو۔'' وہ رونے لگی۔ اور بالا نے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا۔

ابرش خود کو بچانے کے لئے مزاحمت کرنے کے ساتھ ساتھ چیخ بھی جا رہی تھی لیکن اس کی یہ مزاحمت اس چڑیا کی طرح تھی جسے باز دبوچ چکا ہو۔

ابرش کو مزاحمت کرتا دیکھ کر بالا نے اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا، وہ چیختی ہوئی ایک طرف گری اور بالا نے اس پر چھلانگ لگا دی اور چیختی چلاتی ابرش پر حاوی ہونے لگا۔

☆......☆......☆

بالا درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو چکا تھا۔ کوشش کے باوجود جب سمن اسے تلاش نہ کر سکا تو اندازے سے آگے بڑھنے لگا کچھ دیر بعد اسے دور سے ایک وسیع و عریض عمارت دکھائی دی تو وہ دوڑنے لگا، عمارت کے دروازے پر پہنچ کر اس نے جیب سے موبائل فون نکالا اور انسپکٹر عادل کا نمبر ڈائل کیا، انسپکٹر عادل کا اس علاقے پر کافی رعب و دبدبہ تھا پچھلے دنوں عفریت کی تلاش میں وہ پولیس پارٹی کے ساتھ سمن سے بھی متعارف ہو چکا تھا اس نے سمن کو اپنا فون نمبر دے کر کہا تھا کہ۔''جب بھی اسے عفریت کے ٹھکانے کا سراغ ملے تو وہ اسے بلا جھجک فون کر دے۔''

دوسری طرف سے کال ریسیو ہوتے ہی اس نے انسپکٹر عادل کو اس عمارت کا محل وقوع بتا کر کہا کہ''اسے یقین ہے یہ عمارت ہی اس عفریت کا مسکن ہے۔''

وہ رابطہ منقطع کر کے احاطے میں داخل ہوا تو اسے عمارت کے کمروں میں کوئی بھی ذی نفس دکھائی نہ دیا وہ دوبارہ احاطے میں آ گیا اسے نہ جانے کیوں یہ یقین تھا کہ یہ عمارت ہی اس عفریت کی کمین گاہ ہے اور پھر اس ویرانے میں اس وسیع و عریض کا جواز بھی تو نہ تھا وہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا عمارت کے عقبی سمت جا پہنچا تو اسے چاند کی روشنی میں ایک کنواں نظر آیا، وہ آگے بڑھا اور منڈیر پر چڑھ کر اندر جھانکا تو چونک پڑا۔ رسی کی سیڑھی منڈیر سے اندر کنویں میں لٹکی ہوئی تھی رسی کی سیڑھی کا کنویں میں لٹکنا اسے کھٹک گیا۔

''ضرور کوئی خاص بات ہے۔'' یہ سوچتے ہی وہ اللہ کا نام لے کر کنویں میں اتر گیا، سرنگ میں چلنے کے بعد وہ ایک دوسرے کمرے میں پہنچا تو وہاں کمرے کے وسط میں چارپائی جار کا خلا تھا یہاں بھی رسی کی ایک سیڑھی لٹک رہی تھی ابھی اس نے سیڑھی پر پہلا ہی قدم رکھا تھا کہ اسے ابرش کی چیخ سنائی دی پھر تو جیسے اس کے جسم میں بجلی سی بھر گئی اس نے وہیں سے چھلانگ لگائی اور لاشوں کے ڈھیر پر جا گرا۔

قریب ہی ایک دراز قد قوی ہیکل شکل ابرش پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

سمن کے بدن کا سارا خون سمٹ کر آنکھوں میں اتر آیا اس نے بالا کو کالر سے پکڑ کر گھسیٹا اور زوردار گھونسہ اس کے چہرے پر رسید کیا۔

بالا پیچھے کی طرف لڑکھڑایا، ابھی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ سمن نے اچھل کر اس کے سینے پر جمپ سائیڈ کک رسید کی۔

بالا لاشوں کے ڈھیر سے نیچے گرا تو سمن نے اس کے اٹھنے سے پہلے ہی اس پر چھلانگ لگائی اس بار بالا نے دونوں گھٹنے جوڑ کر اسے ایک طرف اچھال دیا اور خود اٹھ کر تیزی سے رسی کی سیڑھی پر چڑھنے لگا۔

ابرش چیخی۔''سمن یہ بالا ہے اسے پکڑو! عفریت کی جان اس کے اندر ہے۔''

(جاری ہے)